اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا

تیرہ شاہکار افسانے

عنایت اللہ

حمیدی
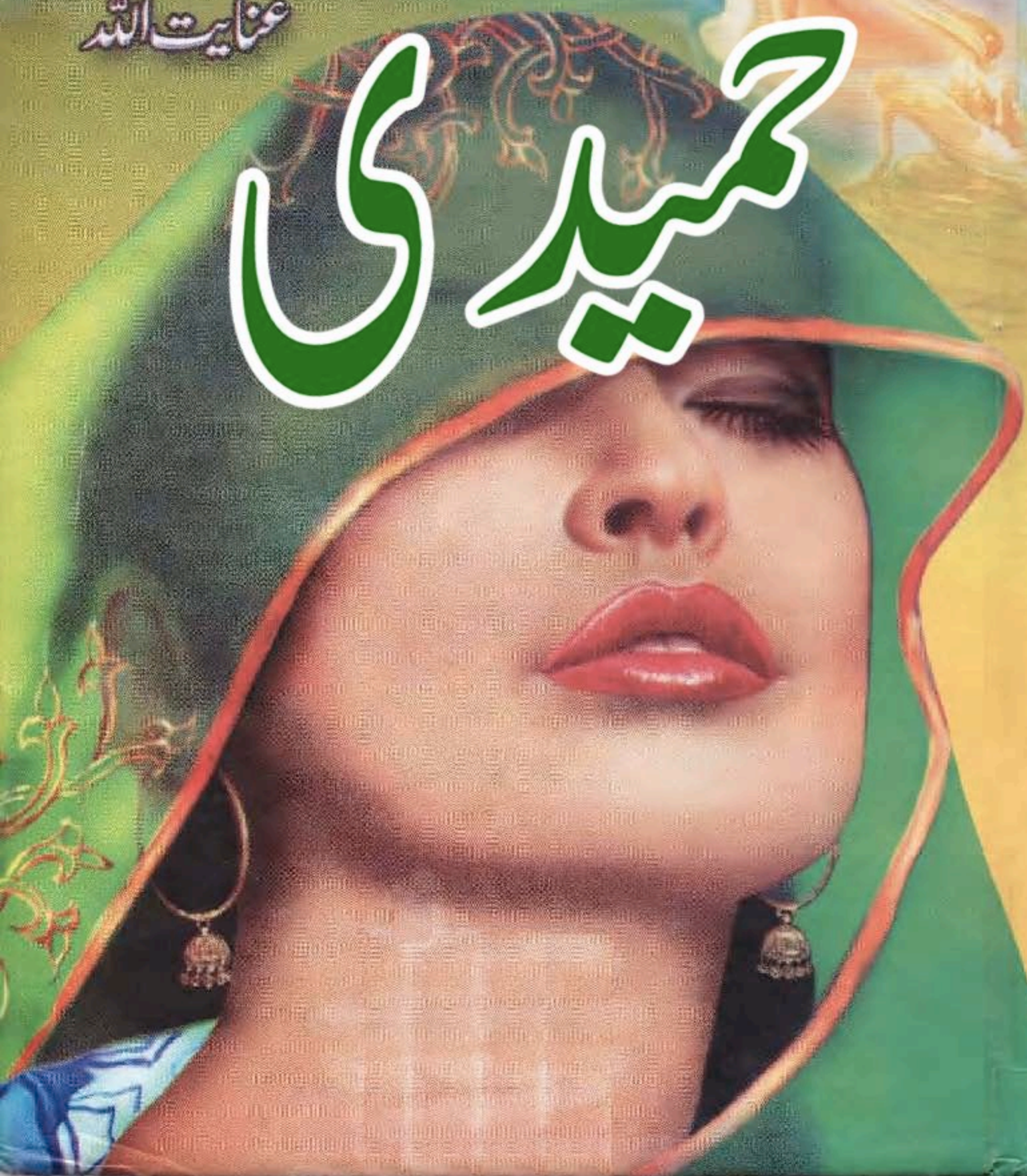
فہرست

عنایت اللہ۔۔۔ ایک خاموش ادبی طوفان

میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ ہم گڑھی شاہو کی ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔ یہ مکان حاجی کے مکان کے نام سے مشہور تھا۔ اس گھر کا مالک حاجی تھا اور بہت اچھا ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھا۔ حاجی کے داماد محمد منشا یاد (آج کل بہت اچھے افسانہ نگار) جو اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ جب بھی کبھی حاجی کو ملنے آیا کرتے تھے تو ایک جملہ وہ ہر مرتبہ کہا کرتے تھے کہ رات کو جس پہر بھی آؤ، گڑھی شاہو کے دو گھروں میں مدہم سی روشنی جلتی نظر آتی ہے۔ ایک چوہدری محمد انور ایڈووکیٹ اور دوسرے عنایت اللہ کے گھر کی۔

آج پہلی مرتبہ عنایت اللہ (والد صاحب) کے فن پر قلم اٹھا رہا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا اور پھر ان کی وفات تک میں نے انہیں چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے لکھتے دیکھا۔ عنایت اللہ افسانہ نگاروں کی برادری میں ہمیشہ اجنبی رہے ان کی افسانہ نویسی میں حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت انہوں نے اس گروہ میں اہم اور منفرد حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے زیرِ نظر افسانوں کے مجموعے ...... ''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا'' ...... میں شامل افسانے ہمارے معاشرتی زندگی کے بعض بڑے دلچسپ پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے گرد و پیش کو بغور دیکھا ہے ان کے ہاں خلوص ہے، فنی بصیرت ہے اور زندگی اور اس کے گوناگوں مظاہر کو دیکھنے اور برتنے کا شعور ہے۔ وہ مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں، حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے آس پاس کی پھیلی ہوئی وسیع کائنات میں سے اپنے ڈھب کا مواد اخذ کر کے بڑے سلیقے سے ناولٹ کا تانا بانا تیار کر لیتے ہیں۔ ہر کامیاب ناول نگار کا زندگی کے بارے میں ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جس کے حوالے سے وہ زندگی کو پہچانتا ہے۔ صاحبِ فن کا یہی خلوص فن کو زندگی عطا کرتا ہے۔ عنایت اللہ کے ہاں اس خلوص کی بھی کمی نہیں ہے۔ چاہے امرتسر کی شہری زندگی ہو جو ''اکھاڑے'' میں پائی جاتی ہے یا پھر ''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا'' کا دیہاتی ماحول ہو۔ عنایت اللہ کے خلوص اور زندگی کے بارے میں ہمدردانہ نقطۂ نظر کا جگہ جگہ پتا ملتا ہے۔ معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں کو، انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کو، کرداروں کی نفسی حالت کو، غرض زندگی کے ہر روپ کو وہ بڑے پیار سے اپنی گرفت میں لیتے ہیں، اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور کبھی کبھی اپنا ذاتی ردِعمل بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ''کفارہ'' میں جیل خانے کی زندگی کا نقشہ انہوں نے فنی چابک دستی سے کھینچا ہے اور جیل کی زندگی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے لیکن وہ اپنے اعتقادات کے پُرشور مبلغ نہیں ہیں اس لیے ان کے ناولٹ ناولٹ ہی رہتے ہیں وعظ بن کر نہیں رہ جاتے۔

لکھنے والے عام طور پر زندگی کے پورے گھیر کو نہیں دیکھتے اس کے کسی ایک پہلو کو لے کر اسی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ عنایت اللہ کے ہاں یہ عیب نہیں ہے۔ شہری اور دیہاتی دونوں طرح کی فضا میں زندگی اپنی پوری رنگارنگی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ عرشو نائن اور اس کے ذاتی مسائل دیہات کی زندگی کے دوسرے مسائل سے ایک گہرا علاقہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اکھاڑے کا شرابا حیوان سہی وہ بھی اپنی ذات سے باہر کی دنیا کا حصہ ہے۔ مولوی قادر حسین بھی محض ذہنی تصادم کی روداد نہیں ہے۔ امام مسجد کی حیثیت اس کی ذات کو باہر کی دنیا سے مربوط کرتی ہے۔ گویا ہر کردار کی داستان اس کا ذاتی فعل ہو کر نہیں رہ جاتی اس کی کڑیاں ہماری معاشرتی زندگی کے بنیادی رجحانات سے جا ملتی ہیں۔ اسی سے وہ فنی توانائی جنم لیتی ہے جس سے اچھا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ عنایت اللہ کے افسانوں کا یہ مجموعہ اسی طرح کی توانائی رکھتا ہے ان کے ہاں زندگی کا تنوع بھی ہے اور جذبات کی بوقلمونی بھی۔ کبھی کبھی ان کے کردار جذبات سے مغلوب بھی ہو جاتے ہیں اور واقعات کی رفتار بھی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ (یعنی واقعات میں سنسنی خیزی پیدا ہو جاتی ہے)

لیکن یہ صرف کبھی کبھار ہوتا ہے ورنہ عام طور پر عنایت اللہ سنبھل کر لکھتے ہیں اور کہانی کے اجزا کو باہم مربوط کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا سب سے کامیاب ناولٹ ''کفارہ'' ہے۔ ''رات کا بھید'' عرشو نائن کا جاندار کردار ہے۔ ''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا'' کا مولوی قادر حسین دوسرا عظیم کردار ہے جس نے اپنی جذباتی زندگی کے مدوجزر کو اعلیٰ انسانی اقدار کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اسی طرح باقی کردار بھی اپنی اپنی قربانی پیش کرتے ہیں۔ مولوی قادر حسین، عرشو نائن، شرابا اور آفتاب علی ہماری زندگی کے کردار ہونے کے علاوہ ایک علامتی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار کے آئیڈیل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عنایت اللہ زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں ایثار زندگی کی بنیادی قدر ہے۔ ہر شیطان سے شیطان شخص کے دل میں بھی نیکی کبھی نہ کبھی بیدار ہوتی ہے۔ وحشی انسان اپنی بربریت کے باوجود انسانی فطرت کی نیکی سے کنارہ کش نہیں رہ سکتا۔ عنایت اللہ کا یہ معیاری انسان ہر ناولٹ میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے ان کرداروں کو انسانی کردار ہوتے ہوئے بھی مثالی اور علامتی کردار قرار دیتا ہوں۔

مجھے یقین ہے یہ کہ مجموعہ او اور اے لیول کے نصاب میں ضرور شامل کیا جائے گا۔

شاہد جمیل

ماہنامہ ''حکایت'' لاہور

19 مارچ 2007ء

اصلی نسلی فریب کار

تادمِ تحریر میں نے عنایت صاحب کی تمام تحاریر تو نہیں پڑھیں مگر جو بھی تحریر پڑھی ہے انہیں سلام کیا ہے۔ اب میں نے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا'' پڑھا ہے تو ہر کہانی پڑھنے سے پہلے سلام کیا ہے۔ مجھے تو یہ کتاب ان کے فن کی تلچھٹ محسوس ہوئی ہے جہاں ہمہ رنگ و بو قوام کے تمام اجزائے ترکیبی گاڑھے ہو بیٹھے ہیں۔

اس مجموعے میں جو کہانیاں پیش کی گئی ہیں، کوئی بھی کہانی پڑھ کر ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ کہانی کارکو غمِ دوراں اور فکرِ روزگار نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ''اکھاڑا'' ایک برق رفتار کہانی ہے اور اس کی یہ رفتار پے در پے رونما ہونے والے واقعات و حالات میں بھی مسلسل برقرار رہتی ہے۔

''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا'' چونکہ نیکی و بدی میدانِ فکر و عمل میں برسرِ پیکار ہے لہٰذا بات طول پکڑتی چلی گئی ہے۔ بشری تقاضے کس طرح انسان اور شیطان تشکیل دیتے ہیں، اس کی کہانی کا موضوعِ خاص ہے جو ایک سحر کار ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔

عنایت اللہ کا فنی و فکری جائزہ لینے کے لیے یہ کتاب محققین کی مددگار اور اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔

اس کتاب کی ہر کہانی میں آپ کو ایک جنگجو کردار ضرور ملے گا، کم سے کم ایک کردار ایسا ضرور ہوگا جو مٹی سے مادھو میں ماس کا دل لئے تڑپ رہا ہوگا۔ ان کہانیوں نے اپنا ماحول، کردار اور مقام الغرض سب کچھ یوں تخلیق کیا ہے کہ کائنات یک مشت ہو کر سامنے آتی ہے تو معرکہ خیر و شر کا کربلا باطنِ انسان میں سے صاف چھلکتا ہے۔

نفسیاتی دبستانِ تنقید کے قارئین، ماہرین اور طلبا کے لیے یہ کتاب ایک اہم دستاویز ثابت ہوگی۔ مزید برآں کڑے سے کڑا انتخاب بھی کیا جائے تو اسے سہل طور پر گریجویشن نہیں تو پوسٹ گریجویشن یا تحقیقی امور کے نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

عنایت اللہ اگر بہت بڑے قلم کار نہ ہوتے تو بہت بڑے فریب کار ہوتے۔

اور پھر ان کے فریب سے بچ نکلنا بھی محال ہوتا جس طرح ان کے قلم سے منہ موڑنا محال ہے کیوں کہ وہ انسانی نفسیات، فرد اور سماج کا تعلق و رویہ علت و معلول کا رشتہ بہت حد تک جان چکے تھے۔ ایسے شخص کے فریب سے بچ نکلنا محال ہوتا ہے...... لیکن اس کتاب میں انہوں نے نہ تو کوئی فریب دیا ہے اور نہ حاشیہ آرائی کی ہے۔ انہوں نے ایک خورد بینی کیمرا لے کر بولتی، رنگین اور ورلڈ سکوپ فلمیں بنا کر پیش کی ہیں۔ اس قلم کار کی اپنے قارئین سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اس نے کوئی فلم ایڈٹ نہیں کی، کوئی فریب نہیں دیا۔

عنایت اللہ بڑے فریب دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہونے کے باوجود اگر ہمیں فریب نہیں دیتے تو ایسے اصلی نسلی فریب کار کا کیا کہنا۔

حامد مشہود
16 اپریل 2007

اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا

''یا قہار، یا جبار، یا علی مشکل کشا، یا حسن یا بوتراب، یا قہار، یا جبار!'' تسبیح کے دانے تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے گر رہے تھے۔ قادر حسین کا دل کہیں زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نمازی کبھی کے گھروں میں جا کر سو گئے تھے۔ گاؤں کی فضا میں چاندنی کا خنک سکوت طاری ہو چکا تھا۔ کتے بھونک بھونک کر سو گئے تھے۔ دور سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک گیدڑی کی ڈراؤنی سی ہوک سوئے ہوئے، سکوت کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ گیدڑی کی آواز پر قادر حسین کا تیزی سے دھڑکتا ہوا دل بیٹھ بیٹھ جاتا تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ یہ کریہہ آواز اس کے کانوں میں نہ گھسے۔ اس نے یا قہار، یا جبار، یا علی مشکل کشا..... کا ورد بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ شہادت کی انگلی اور انگوٹھا تسبیح کے دانوں کو تیزی سے پیچھے پھینکنے لگے لیکن گیدڑی، چیختی چلاتی، کرب و اضطراب کی ہوک بلند کرتی گاؤں کے قریب آ گئی تھی۔ گیدڑی کی چیخیں منحوس ہوتی ہیں..... قادر حسین نے یہ بھی چاہا کہ بڑوں کے اس قول کو نہ مانے لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ گیدڑی کی آواز اس کے اعصاب میں زہر کی طرح سرایت کرتی جا رہی تھی اور وظیفے کی روانی میں خلل پیدا ہونے لگا تھا۔ دو تین کتے یکبارگی بھونک اٹھے۔ مسجد کے پچھواڑے اسے کتوں کے سرپٹ بھاگنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ گیدڑی کی منحوس ہاؤ ہو بند ہو گئی۔ قادر حسین نے دل ہی دل میں کتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا، حالانکہ کتوں سے اسے پرانا بیر تھا۔ لڑکپن میں ایک شام وہ کسی کے کھیت میں خربوزے چرانے گیا تھا تو دو کتوں نے نہ صرف اسے خربوزوں کے قریب جانے سے ہی نہ روکا بلکہ اس کی ٹخنوں سے اونچی شلوار پھاڑ کر گھٹنوں تک پہنچا دی تھی۔ اس روز کے بعد وہ ہر کتے کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا کرتا تھا لیکن آج

رات اس نے دل ہی دل میں کتوں سے سمجھوتہ کرلیا۔

قادر حسین وظیفے میں منہمک ہوگیا۔ رات پھر سوگئی۔ وظیفے کے ورد میں ندی کی روانی پیدا ہوگئی۔ تسبیح کے دانے مسکین اور مہین سی ٹک ٹک کرتے مسجد کے حجرے کی مختصر سی فضا میں لطیف مگر پُر اسرار سارا تعاش پیدا کرنے لگے۔ نصف شب کا چاند آسمان کی وسعتوں کو پُر نور بنا رہا تھا کہ نورانی وسعت ایک بار پھر یوں مرتعش ہوئی جیسے کوئی اکیلا دکیلا بچہ جھیل کے کنارے بیٹھا چھوٹی چھوٹی کنکریاں پھینک رہا ہو___ ''ٹٹ ٹٹ، ٹیوں ٹیوں، ٹٹ ٹیں ٹی ٹیوں ٹیوں، ٹٹ ٹیں ٹی ٹٹ ٹیں ٹی''۔

قادر حسین نے آسمان کی طرف دیکھا لیکن حجرے کی چھت نے اس کی نگاہوں کو دیئے کی ناچتی ہوئی روشنی میں الجھا دیا۔ پیاسی ٹیٹری، دور اوپر فضاؤں کی مرمریں وسعتوں میں پانی تلاش کر رہی تھی___ ''بارش برسے گی''___ قادر حسین کے سینے میں شگفتگی سرایت کرنے لگی لیکن یہ تاثر زیادہ دیر قائم نہ رہا اس کی ہستی میں لہریں اٹھنے لگیں۔ مہیب سوچیں، سیلاب کا شور اور وہ ایک بار پھر بے چین ہونے لگا۔

یہ گاؤں تین بار چناب کے عتاب کی زد میں آچکا تھا اور ایک بار اس مسجد کا بائیں طرف والا مینار بھی شہید ہوگیا تھا۔ قادر حسین نے ''یا قہار یا جبار یا علی مشکل کشا...... کا ورد اور تیز کر دیا۔ حجرے کا تھکا تھکا سا سہما ہوا ماحول گونجنے لگ گیا___ ''ٹیٹریاں بول رہی ہیں بیڑیوں کے رسے ڈھیلے کر آؤ''___ آٹھ نو برس پہلے کی ایک آواز اس کے گرد منڈلانے لگی تسبیح کے دانے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ جب رات کو ٹیٹریاں بولتی ہیں تو مانجھی ساحل پر بندھی ہوئی کشتیوں کے رسے لمبے کر آتے ہیں۔ سیلاب کی یہ نشانیاں قیامت کی علامت سے کیا کم ہوں گی...... ''یا حسن یا بوتراب، یا قہار، یا جبار'' کی تال ٹوٹنے لگی لیکن قادر حسین نے وظیفے کے ترنم کو تھام لیا۔ ٹیٹری آگے نکل گئی تھی۔ ''ٹٹ ٹیں ٹی'' کی گونج چاندنی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

گونج چاندنی میں اور قادر حسین وظیفے میں ڈوب گیا۔ رات کے لمحات تسبیح کے دانوں کے ساتھ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ رات کی خاموشی اور وظیفے کے تاثر نے قادر حسین کو مخمور سا کر دیا۔ وہ وجد میں آ گیا۔ خارجی ماحول میں اب گیدڑ کی کریہہ ہوک تھی نہ ٹیٹری کی پیاسی آوازیں۔ استاد نے بتایا تھا کہ وظیفے کی قبولیت کا وقت رات کے پچھلے پہر

سے شروع ہوتا ہے۔ وہ وقت شروع ہو چکا تھا۔ ضرورت یکسوئی کی تھی لیکن ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ قادر حسین کے داخلی ماحول سے یوں اٹھنے لگی جیسے دور سے آندھی کے ہراول کے جھونکے چلے آرہے ہوں۔ قادر حسین کی انگلیاں دانوں سے اور ذہن ایک رومان انگیز مگر درد آلود تصور سے کھیلنے لگ گیا۔ زبان وظیفے کے الفاظ دہرانے میں مصروف تھی۔ یکسوئی میں خلل پیدا ہونے لگا لیکن قادر حسین جھنجھلایا نہ خوفزدہ ہوا سے پیر استاد کا کوئی قول یاد نہ آیا۔ ایک لذت، ایک سرور، اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا چلا گیا۔ حجرے کی دیوار پر دیئے کی لرزاں و رقصاں لو میں اسے انوری کا حسین اور زہد شکن واہمہ نظر آنے لگا۔ قادر حسین کے ہلتے ہوئے ہونٹوں پر سوئے ہوئے بچے کا زیر لب تبسم نمودار ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے ذہن کے پردوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو مبادا یہ رنگ رنگیلا تصور نکل بھاگے۔

''یا قہار! یا جبار! علی مشکل کشا! یا حسن یا بوتراب! یا قہار یا جبار!'' زبان الفاظ رک رک کر گرتی ہوئی آبشار کی طرح بہائے جا رہی تھی۔ شہادت کی انگلی اور انگوٹھا اپنے کام میں مصروف تھے لیکن قادر حسین خیالوں میں بسائی جنت میں پہنچا ہوا تھا...... انوری...... کوئی دور پار کی بات نہیں۔ دو ہی مہینے گزرے اس نے انوری کو گاؤں سے باہر بڑ کی گھنی چھاؤں میں ترنجن کے جھرمٹ میں دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ چرخوں کی غوں غوں کانچ کی چوڑیوں کے گھنگھروؤں کی تال پر لڑکیوں کا گیت اور اس گیت میں انوری کی الگ تھلگ آواز جیسے بنسری بج رہی ہو۔ قادر حسین رکنا چاہتا تھا لیکن وہ گاؤں کا پیش امام تھا۔ بہو بیٹیوں کو دیکھنے کیونکر رک جاتا۔ تاہم اس کے قدم سُست پڑ گئے تھے اور اس نے ایک نظر چرا ہی لی تھی۔ انوری کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے گیت کے بول پھول کی پتیوں کی طرح جھڑ رہے تھے...... اور بڑ کی گھنیری چھاؤں میں عطر بیز ترنم بکھیر رہے تھے۔

اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا
بھرے ترنجن بیٹھی توں
اک تند پائی نہ جائے
چرخہ کتیا نہ جائے

پونی کھس کھس جائے
ماہل ڈِگ ڈِگ جائے
تند ٹٹ ٹٹ جائے
منکا لتھ لتھ جائے
تے ترکلے دی نوک
ہتھیں چبھ چبھ جائے
اج کی ہویا اے مائے
سانوں پتہ نیوں ہائے
اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا

غوں، غوں، ٹک، چھن، چھنن، چھک، غوں، غوں، ٹک چھنن چھنن، بھرے ترنجن بیٹھی توں، ''یا قہار، یا جبار، یا علی مشکل کشا یا حسن یا بوتراب، یا قہار، یا جبار''___ وظیفے کے الفاظ ترنجن کے ترنم اور سُر تال پر رقص کرنے لگے۔ دانے ناچ رہے تھے۔ شہادت کی انگلی اور انگوٹھا نئے جوش اور نئے دلولے سے ناچ کی تھاپ پر متحرک ہو گئے۔ دیئے کی لو حجرے کی جھکی چھت پر محوِ رقص تھی۔ ماحول پر وجد تاری ہو گیا۔

قادر حسین نے انوری کو پہلی بار دیکھا تھا۔ گاؤں میں آئے ہوئے قادر حسین کا وہ تیسرا دن تھا۔ یتیم اور بے آسرا آدمی بیس برس کی عمر تک مسجدوں میں مولویوں کی خدمت گزاری کرتا رہا تھا۔ اس نے بیسیوں بار قرآن ختم کیا تھا۔ فقہ اور حدیث کو ازبر کیا تھا اور کئی سورتیں زبانی یاد کرلی تھیں۔ گزشتہ تین برس سے وہ ایک قصبے کی مسجد کے امام کی شاگردی میں تھا۔ اس امام کو اس نے پیر استاد مان لیا تھا۔ اسی نے اسے یہ وظیفہ بتایا تھا اور ورد کی اجازت دی تھی۔ اس کا استاد آخر چل بسا اور اس کی جگہ دوسرے امام نے لے لی تھی۔ قادر حسین کی عمر بیس برس ہو چکی تھی۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن کم عمری کی وجہ سے اسے اس مسجد کا امام نہ بنایا گیا تھا۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ نئے امام کے اصرار کے باوجود اس مسجد سے نکل آیا تھا اور اپنی کل کائنات ایک قرآن، ایک تسبیح اور جسم و جان اٹھائے جانے کیوں اس گاؤں پہنچ گیا تھا۔ شاید رات بھر کے لیے پناہ ڈھونڈنے اور نور کے تڑکے یوں ہی آگے نکل جانے کو۔ اس نے شام کو مسجد میں ہی ڈیرے ڈال لیے تھے اور اسے معلوم ہوا تھا کہ اس ذرا سی مسجد

میں امام کوئی نہیں، پہلا امام اغوا کے جرم میں گرفتار ہو چکا تھا۔

قادر حسین نے اذان دی اور امامت بھی کرائی تھی کہ نمازیوں نے نمبردار کی منظوری سے متفقہ طور پر اسے مستقل پیش امام بنا لیا تھا۔ اس کی آواز میں اس قدر سوز تھا کہ پیپل کے پتوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جب اس نے پہلی شام کی اذان دی تھی تو اسے معلوم ہی نہ ہو سکا تھا کہ گائے بھینسوں کے نیچے بیٹھی ہوئی دودھ دوہتی عورتوں کے ہاتھ رک گئے تھے اور نمبردار کی بہو دو بھرے ہوئے گھڑے سر پر اور ایک کولھے پر رکھے ہوئے پنگھٹ سے پانچ سات قدم دور یوں رک گئی تھی جیسے اس کی نرم و نازک ہستی سے تین گھڑوں کا بوجھ اٹھا لیا گیا تھا۔ مختصر سے اس گاؤں کی معصومیت مسحور ہو گئی تھی اور زمانہ جیسے رک گیا تھا۔ قادر حسین کی اذان سننے کو۔ پھر گاؤں والوں نے مسجد کے حجرے کی دیواروں پر گاچنی کا لیپ کر کے قادر حسین کو نئی دلہن کی طرح آباد کر دیا تھا۔ نمبردار نے چارخانہ کھیس دیا تھا۔ کرما جولاہا پھٹیوں والی چادر دے گیا تھا۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں نے اسے نیا سرہانہ جس پر کروشئے سے بنا ہوا غلاف تھا، دیا تھا۔ اچھے کمہار نے دو دیے بڑی محنت سے بنا کر ان پر چتر کاری کی اور حجرے میں رکھ گیا تھا۔ مانجھیوں نے کھجوں کے خول کے دو پیالے دیے تھے۔ اکو موچی زری کی جوتی بنا کر لایا تھا اور ہاتھ جوڑ کر کہا تھا___ ''یا پیر استاد خطا معاف تلا جھوٹا ہے اصلی ملنا محال ہے قبول کر لو بہت غریب آدمی ہوں اور دعا کرنا پیر استاد میرے دو بیٹے فوج میں بھرتی ہو کر ڈھاکے بنگالے چلے گئے ہیں۔ ان کی ماں کو آدھے سر کا درد ہوتا ہے۔ رات بھر کراہتی ہے سوتی ہے نہ سونے دیتی ہے کوئی تعویذ، دھاگہ، دم، درود کوئی پھونک، گنڈا کیجیے بیچاری سخت عذاب میں ہے......'' اور اکو نے قادر حسین کے پاؤں چھو لئے تھے...... ''یا پنج تن پاک کے صدقے مولوی صاحب جی......''

قادر حسین اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے کبھی تعویذ نہیں لکھا تھا۔ دم درود نہیں کیا تھا۔ نہ کبھی پھونک ماری تھی اس کے سینے سے جلی ہوئی پھونکیں آہیں بن کر نکلتی تھیں۔ بے بس آہیں، بے اثر، اس نے چاہا تھا کہ اکو موچی کو کہہ دے۔ ''سنو اکو! مجھے فریب نہ دو نہ مجھے فریب دینے پر اکساؤ میں بھٹکا ہوا راہی ہوں پردیسی، تنہا۔ باپ جانے کب مر گیا۔ ہوش سنبھالا ہی تھا کہ ماں کی روح بھی باپ کے تعاقب میں دور دیس سدھار گئی تھی۔ میں نے ماں کی آغوش کی تپش کو تیرہ برس مسجدوں میں بچھی ہوئی خشک گھاس میں

تلاش کیا ہے۔ باپ کی شفقت کو رکوع وسجود میں ڈھونڈا ہے۔ میں نے اذان کے کلمات میں دونوں کو پکارا ہے۔ میں نے قرآن میں اماں ڈھونڈی ہے۔ اکو! میں جوان ہوں لیکن میری جوانی کو بچپن ڈس رہا ہے۔ مجھ پر آسیب سوار ہے۔ میرے بزرگ دوست! تم ہی کوئی دم درود کرو۔ کوئی ایسی پھونک مارو کہ میرے سینے میں جلتی ہوئی آگ بجھ جائے۔ میں گہری کھائی کے منہ میں کھڑا ہوں جس کی تہہ سے مجھے اپنی پکار و فریاد کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ میری آوازیں مجھے بلا رہی ہیں...... اکو! میں اس گاؤں میں محبت کی تلاش میں آیا ہوں۔ وہ محبت کہ جس میں میری ماں کی سانسوں کی تپش ہو جس میں عورت کے لمس کا گداز ہو۔ چند ثانئے کے لیے ہی سہی لیکن محبت سچی ہو، اس جوتی کے تلے کی طرح جھوٹی نہ ہو...... لیکن قادر حسین کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے سر کو لطیف سا جھٹکا دیا تھا۔ اکو موچی سر کی اس جنبش کو وجدانی کیفیت سمجھتے ہوئے مقدس سے رعب تلے دب گیا تھا۔ قادر حسین اسے فریب نہیں دینا چاہتا تھا اکو نے اسے یا پیر استاد، حضور اور یا جناب، کہا تھا اور اس نے پنج تن کا واسطہ دیا تھا، روکنے کے باوجود برتری کے اس احساس نے قادر حسین کے ہونٹوں سے یہ الفاظ دھکیل دیے تھے ___ ''گھر والی کو وضو کرا کے عصر کی نماز کے بعد میرے پاس بھیج دینا''۔

اور عصر کی نماز کے بعد جب اکو کی عمر رسیدہ گھر والی قادر حسین کے حجرے سے نکلی تھی تو اس کا سر درد غائب ہو چکا تھا۔ قادر حسین نے بڑھیا کے سر کو کنپٹیوں سے تھام کر بلند آواز میں آیۃ الکرسی پڑھی تھی۔ غالباً قادر حسین کی سریلی آواز تھی جو بڑھیا کے نحیف اعصاب پر غالب آ گئی تھی کہ وہ سر درد بھول گئی تھی یا یہ بھی تھا کہ بڑھیا نے قادر حسین کے ہاتھ کے لمس میں اپنے بیٹوں کے لمس کا قرار پا لیا تھا جو اس سے بچھڑ کر بنگال چلے گئے تھے۔ آیت الکرسی کا تقدس اور اثر تو اپنی جگہ تھا ہی، کچھ بھی تھا بڑھیا کے آدھے سر کا درد نہیں تھا۔ اس نے مسجد سے نکلتے ہی گھر گھر میں نئے امام کے کرشمے کا چرچا کچھ اس انداز میں کیا تھا کہ کئی عورتوں کو سر میں ہلکے ہلکے درد کی شکایت ہونے لگی تھی۔ اس پروپیگنڈے کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ بڑھیا کا سر درد اپنے ہی پروپیگنڈے کی نذر ہو گیا تھا۔

گاؤں میں قادر حسین کی یہ دوسری شام تھی۔ تیسرے دن وہ ظہر کی نماز کے بعد باہر نکلا تھا اور ٹہلتے ٹہلتے کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ کہاں قصبے کا وہ گھٹا گھٹا ماحول اور کہاں

کھیتوں کی یہ ہریالی اور گندم کی بھرپور جوانی۔ لہلہاتے کھیتوں کے سبزہ زار میں سرسوں کی بھینی بھینی بو اور پیلاہٹ، اس وجد آفرین فضا میں تیرتے ہوئے ترنجن کے گیت، ذرا ہی دور، ہریالی کی اوٹ میں چناب کی خاموش روانی، ساری کائنات جھوم رہی تھی اور بہار کی رُت زہد اور تقویٰ کو کانچ کی چوڑیوں کی طرح توڑ رہی تھی۔ قادر حسین نے اپنے آپ میں لذیذ سی ہلچل محسوس کی تھی۔ اجنبی سا ایک تاثر اس کے رگ و ریشے میں سرایت کرتا جا رہا تھا جیسے اس کی رگوں سے فاسد لہو نکال کر تازہ اور صحت مند خون ڈالا جا رہا تھا۔

پھر اس نے انوری کو دیکھ لیا تھا۔

پھر ہوا یوں کہ جیسے اسے گاؤں کی ہر چیز اور ہر بات میں انوری دکھائی دینے لگی گئی تھی۔

اور پھر اس کی اذان میں وہ سوز و ساز پیدا ہو گیا تھا کہ اسے اپنی آواز دور و بیش کی بہشت سے آتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور وہ بعض اوقات اپنی ہی آواز پر جھوم جھوم جانے لگا تھا۔

اس نے بھی شاید مجھے دیکھا تھا! قادر حسین نے انوری کو پہلی بار دیکھ کر سوچا تھا۔ رات عشا کی نماز کے بعد اس نے حجرے میں بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا اور سرہانے کے نیچے سے چھوٹا سا آئینہ جو اس نے دو سال گزرے قصبے سے تین آنے میں خریدا تھا، نکال کر دیے کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے ایک ایک نقش کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنے آپ کو پہلی بار دیکھ رہا اور پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ موٹی موٹی آنکھیں ساکن جھیل کی طرح جس میں نہ جانے کتنی لہریں سو رہی تھیں۔ گالوں کا نکھرا ہوا رنگ اور ہلکی ہلکی سرخی، ہونٹوں کا سرخی مائل رنگ اور جوانی کے ابھار کو بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے نئی نئی اگتی ہوئی داڑھی ہر جگہ ایک جیسے بال اُگ رہے تھے کہیں کوئی جگہ خالی یا زیادہ بھری ہوئی نہیں تھی۔ یہ اس کا صرف اپنا ہی خیال نہیں تھا بلکہ سب نے کہا تھا کہ نئے مولوی کی داڑھی خوب جچی تلی ہے بھرے بھرے معصوم سے چہرے پر خوب سجتی ہے اس کے انگ انگ سے بیس برس کی جوانی چھلک رہی تھی۔

قادر حسین نے تین انچ ڈیڑھ انچ لمبے چوڑے آئینے میں انوری کی جھلک بھی دیکھی لیکن گلی میں ایک کتے نے بھونک کر یہ طلسم توڑ دیا اور قادر حسین کو بیداری کے خواب سے

جگا دیا تھا۔ اس نے یوں پھرتی سے آئینہ سرہانے کے نیچے چھپا دیا تھا جیسے وہ چھپ چھپ کر گاؤں کی بہو بیٹیوں کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے کھانس دیا ہو۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس کی سانسوں کا تسلسل اکھڑا ہوا تھا اور بہار کی خنک رات میں اس نے جیٹھ ہاڑ کی گرمی محسوس کی تھی وہ مسجد کے صحن میں نکل آیا تھا۔

''یا قہار! یا جبار! یا علی مشکل کشا! یا حسن یا بوتراب یا قہار یا جبار''...... وظیفے کے الفاظ حجرے میں بھنبھنا رہے تھے۔ زبان اور تسبیح کے دانے ایک تال پر رواں تھے اور قادر حسین کا ذہن دو مہینوں کے گزرے ہوئے دنوں کی حسین واردات کی تفصیلات کو از سرِ نو سجا رہا تھا، وہ گزرے ہوئے شب و روز کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک ایک ثانئے کا ذائقہ چکھ رہا تھا۔ تصورات نے ایک اور پردہ اٹھا دیا۔

پانچویں شام عصر کی نماز کے بعد جب وہ حجرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے خواب کا دھوکہ ہوا تھا۔ اسے آج کی رات یاد آ رہا تھا کہ اس نے سر کو جھٹک کر دیکھا تھا اور اسے خاصی مشکل سے یقین آیا تھا کہ حجرے میں انوری بیٹھی ہوئی تھی۔ قادر حسین کو دیکھتے ہی اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حجاب آلود سلام کیا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کے اٹھنے کا انداز بھی ایسا کہ جیسے چناب کی خاموش روانی میں سے جل پری نے باہر آ کر انگڑائی لی ہو۔ قادر حسین اپنے دل کو کہ جس کی دھڑکن تیز اور بے قاعدہ ہو چکی تھی سنبھال رہا تھا اور سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ کیا کہے یا کیا کرے کہ انوری کی نقرئی آواز شرم و حجاب میں ڈوبی ہوئی حجرے میں گونجی تھی اور اسے سنبھالا دے دیا تھا۔

''مولوی صاحب! کبھی کبھی سر میں درد سا ہو جاتا ہے آج صبح اٹھتے ہی ایسا شروع ہوا ہے کہ ابھی تک پھٹ رہا ہے''۔

دوسرے لمحے قادر حسین انوری کے قریب تر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی کو تھامے ہوئے انگوٹھا ایک کنپٹی پر درمیانی انگلی دوسری کنپٹی پر اور ہتھیلی مرمریں پیشانی کو چھو رہی تھی۔ قادر حسین پر کچھ ایسی بے خودی طاری تھی کہ وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ جس سر کو اس نے تھام رکھا تھا وہ درد سے پھٹ رہا تھا وہ انوری کے ان چند ایک سیاہ بالوں کے لمس میں کھو گیا تھا جو اس کے ہاتھ میں گرے ہوئے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے یوں کہ جیسے وہ قادر حسین کے دکھتے ہوئے دل کو سہلا رہے ہوں۔ اس کی نگاہیں انوری کی

کنواری مانگ پر جم گئی تھیں اور خیالات ریشمی بالوں میں الجھ گئے تھے۔ قادر حسین اس جنتِ ارضی سے شاید نہ لوٹتا لیکن انوری کی سرگوشی نے طلسم توڑ دیا تھا......

''درد سارے سر میں ہوتا ہے''۔

اور جیسے بے خیالی میں قادر حسین کے ہونٹوں سے مقدس ترنم پھوٹنے لگا تھا۔ حجرے کا ماحول وجد میں آ گیا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے جھوم رہے تھے۔ عامل کو اپنی آواز اپنی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ انوری اس آواز میں کھو گئی تھی۔ قادر حسین کو معلوم نہ ہو سکا کہ آیۃ الکرسی کے تقدس، تاثر اور ترنم نے انوری کی رگ رگ کو سلا دیا تھا اور اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں تھی اور اس کیفیت نے اس کے سر کا درد چوس لیا تھا۔

''آرام محسوس ہوتا ہے؟''

''جی! درد نہیں رہا''۔

اور دونوں کو یوں لگا تھا جیسے ساکن جھیل پر بہتی ہوئی ناؤ کے قریب چٹان آ گری تھی اور ناؤ مہیب ہچکولے کھانے لگی تھی۔

''تمہارا نام؟''

''انوری!''

''تمہاری آواز بہت سریلی ہے انوری! میں نے تمہیں ترنجن میں گاتے ہوئے سنا ہے''۔۔۔ قادر حسین نے لرزتے الفاظ میں اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کی تھی اور انوری کی مسکراہٹ نے بیگانگی کے پردے چاک کر دیئے تھے۔ کس قدر معصوم اور بے ضرر تھی یہ مسکراہٹ، لیکن قادر حسین کی زاہد ہستی بنیادوں تک ہل گئی تھی۔ اس کی داخلی دنیا میں ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ ایک شور، ایک طوفان، بگولوں کا جلوس، وہ بے بسی کے عالم میں اُڑا جا رہا تھا۔ پرکاہ کی مانند، بے اختیار بے قابو۔ اس کے تخیلات بہک چلے تھے۔ اس نے بہکتے ہوئے تخیلات کو یوں سنبھالنے کی کوشش کی تھی جیسے کوئی تیز ہوا میں بکھر کر اُڑتے ہوئے کاغذوں کو پکڑ رہا ہو۔ جانے ارادتاً یا غیر شعوری طور پر اس کے ہونٹوں سے ایک سرگوشی پھسل گئی تھی۔۔۔ ''انوری!''۔۔۔ اس ہلکی سی آہ نما سرگوشی میں جانے کتنی بھوک جانے کتنی تشنگی کتنی ہی امنگ اور بے چارگی سموئی ہوئی تھی۔

''جی!''

قادر حسین چونک اٹھا تھا۔ گرد و پیش کا ذرہ ذرہ اسے گھور رہا تھا۔ حجرے کے درو دیوار اسے اپنے اوپر طنزیہ قہقہے لگاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ میں سکڑ رہا تھا، جھینپ رہا تھا۔ وہ اپنی سرگوشی کو نگل لینا چاہتا تھا لیکن اسے انوری کی ''جی'' ہڑپ کر چکی تھی اور انوری کی نگاہیں اس کے شباب بھرے خدوخال میں اپنی ''جی'' کا جواب تلاش کر رہی تھیں۔ قادر حسین نے راہِ فرار نہ پاتے ہوئے انوری کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں انوری کی نشیلی آنکھوں سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئی تھیں۔ وہ اس تصادم سے گھبرا اٹھا تھا۔

''کچھ نہیں انوری!...... کچھ نہیں......'' اس نے انگاروں پر بارود کی تہہ جماتے ہوئے اکھڑے ہوئے الفاظ میں کہا تھا___ ''جاؤ انوری!......اب درد نہیں ہوگا___'' اور اس نے اپنے دل کے درد کو بڑی مشکل سے دبا لیا تھا۔

''اللہ آپ کو اجر دے مولوی جی!'' انوری نے اٹھتے ہوئے کہا تھا___ ''خدا آپ کی مرادیں پوری کرے''۔

انوری اٹھ کے حجرے سے نکلی تو قادر حسین کو جسم سے روح نکلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی جب تک اس حجرے کی فضا انوری کی بوباس سے نا آشنا تھی تو یہی حجرہ قادر حسین کے لیے ساری دنیا تھا۔ وسیع اور دور دور تک پھیلا ہوا......اب جب انوری یہاں آ کر چلی گئی تھی تو قادر حسین کو یہی حجرہ گہرے کنوئیں کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خیالوں میں اس کنوئیں کی گھٹن سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ انوری کے ساتھ سائے کی طرح نکل جانا چاہتا تھا۔ ایسے میں اسے برسوں گزرا وہ زمانہ یاد آ گیا تھا۔ جب وہ سامنے برس کی عمر کا تھا تو لوگ اس کی ماں کو اس کی نظروں کے سامنے چارپائی پر اٹھا کر قبرستان میں لے گئے تھے۔ وہ ننھا منا بچہ سہما سہما ڈرا، ڈرا سب کی طرف دیکھتا رہا تھا اور کتنے ہی روز وہ چچا کے گھر ماں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا تھا...... باہر والے دروازے کی دہلیز پر بیٹھا ہوا، کبھی منڈیر پر کھڑے ہو کر قبرستان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے حتیٰ کہ اس کی زندگی مسلسل انتظار بن گئی تھی۔ ایسا تسلسل جو محبت سے محروم رہا آج بھی تیرہ برس گزر جانے کے بعد اس کی رگ رگ میں اور ہر سانس میں وہی پُر ہول کیفیت اور وہی گھٹن زندہ تھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا تھا۔

''انوری! کب آؤ گی؟''___ امام مسجد کے سینے میں سے قادر حسین نے بے ساختگی

اور بے چارگی سے پوچھا تھا۔ یہ سوال اس نے زندگی میں آج دوسری بار پوچھا تھا۔ بچپنے میں ایک دن ماں کی قبر پر اور آج انوری کو جاتے ہوئے دیکھ کر۔

''آؤں گی مولوی جی!''___ انوری کے لہجے میں اب دیہات کی بے تکلفی کا رنگ تھا۔ وہ کہہ رہی تھی___ ''آپ کے لیے مکھن لے کے آؤں گی......ابھی دے جاؤں مولوی صاحب......! نہیں...... صبح سویرے سویرے پراٹھے پر رکھ کر لاؤں گی......'' انوری کی آواز میں بچپن کی جھلک نمایاں تھی۔ ''......اچھا مولوی جی؟'' اور وہ چلی گئی تھی۔

''یا قہار! یا جبار! یا علی مشکل کشا! یا حسن یا بوتراب! یا قہار! یا جبار!''

رات وظیفے کی تال پر گزرتی جا رہی تھی۔ دیے کی لو ناچ رہی تھی۔ قادر حسین ہلتے ہوئے ہونٹوں پر فتح و نصرت کی مسکراہٹ سے جھوم رہا تھا۔ چاندنی پر وجد طاری تھا۔ مرغ اذانیں دینے لگے تھے۔ دور کہیں اکا دکا کتا بھی بھونکنے لگا تھا لیکن قادر حسین کے کانوں میں یہ آوازیں یوں پڑ رہی تھیں جیسے گہری کھائیوں سے اٹھ رہی ہوں...... ہلکی ہلکی گونج بن کر...... وہ وظیفے کے ترنم کے سہارے تصوروں میں بہت اونچا دور پہنچا ہوا تھا۔

انوری صرف دوسری صبح ہی نہیں آئی تھی بلکہ گزرے ہوئے دو مہینوں میں وہ اس کے پاس کوئی دس مرتبہ آئی تھی۔ ہر بار مکھن یا چھاچھ یا گھی میں تیرتا ہوا پراٹھا لے کر آئی تھی...... اور جب بھی آئی تھی تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کر گئی تھی لیکن ان کی باتیں راز داری کی حدوں سے دور رہیں۔ ان کی کسی بھی ملاقات کو چوری کی ملاقات یا ''چھپ چھپ کے ملنا'' نہیں کہا جا سکتا تھا صرف اسی قدر کہ......

''انوری! تم تو بڑا اچھا گاتی ہو''۔

''نہیں مولوی جی آواز تو آپ کی ہے نورے مانجھی کی مُرلی کی طرح''۔

''انوری! قرآن پڑھ لیتی ہو؟''

''تھوڑا تھوڑا...... مولوی جی! مولوی جی! رات میری بکری نے دو بچے دیئے ہیں ایک نر ایک مادہ۔ مادہ تو اتنی خوبصورت ہے کیا بتاؤں مولوی جی! ہرنی ہوتی ہے نا ہرنی۔ اس کی آنکھیں ہرنی کی طرح خوبصورت ہیں اور مولوی جی!......''

''تم نے ہرنی دیکھی ہے انوری؟''

''نہیں جی!''

اور قادر حسین کے ہونٹوں پر یہ الفاظ پہنچ گئے تھے کہ انوری ہرنی کی آنکھیں تمہاری آنکھوں سے کیا دل نشیں ہوں گی...... اور یہ بھی کہنے لگا تھا___ ''انوری! تمہیں تو شاید یہ بھی علم نہیں کہ تم کس قدر خوبصورت'' ___ لیکن وہ کچھ بھی کہہ نہ پایا تھا۔ کچھ اس لیے کہ ابھی ان میں اتنی بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ کچھ اس لیے کہ وہ انوری کے مسکراتے ہوئے باریک ہونٹوں اور ہنستی ہوئی شوخ آنکھوں میں جذب رہتا تھا اور اس لیے بھی کہ اسے احساس تھا کہ وہ گاؤں کا پیش امام ہے۔ گاؤں کی بہو بیٹیاں اس کے پاس آتی ہیں۔ کوئی روک نہیں، ٹوک نہیں۔ وہ اس امانت میں خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لیکن قادر حسین اور ''پیش امام'' کے درمیان جو سمجھوتہ تھا وہ اب متزلزل ہونے لگا تھا بعض اوقات وہ ایک دوسرے کو گھورتے بھی تھے لیکن چوری چھپے۔ ہر بار قادر حسین سر جھکا لیتا تھا لیکن اس کی ہستی میں اعصابی جنگ شروع ہو چکی تھی...... ایک کشمکش کا آغاز...... اس کے سینے میں چنگاریاں سلگنے لگی تھیں، دھواں اٹھنے لگا تھا لیکن اظہاریت کی راہیں مسدود تھیں۔ وہ گاؤں کے بچے بوڑھے سے بے تکلف ہو جانا چاہتا تھا سب کو دل کی لگی کی تفصیلات سنانا چاہتا تھا لیکن راہ میں احترام حائل تھا۔ وہ جس گھر میں جاتا تھا لوگ نیچے ہو بیٹھتے تھے اور اسے چارپائی پر بٹھاتے تھے۔ وہ گاؤں کی ہر عورت کی آغوش میں سر رکھ کر اپنی مرحومہ ماں کی آغوش کی تپش اور بو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی گھر کے ہرے بھرے آنگن کے بیچ بچوں اور عورتوں کے شور و غل میں بیٹھ کر روٹی کے دو نوالے کھانے چاہتا تھا لیکن لوگ اسے اچھے سے اچھا کھانا اور گرم گرم دودھ مسجد میں دے جاتے تھے۔ وہ جس عورت کے قریب سے گزرتا تھا وہ گھونگھٹ لمبا کر کے تعظیماً ایک طرف ہو جاتی تھی۔ وہ جن کی گودیوں میں ماں کا گداز اور قرار ڈھونڈتا تھا وہ اسے اپنا روحانی باپ سمجھتی تھیں۔ عمر خواہ اس کی بیس برس ہی تھی۔ وہ بھی نسوانی آنکھوں میں محبت کی چمک دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی جھک جاتی تھیں اور پلکیں ان پر شرم و احترام کا پردہ ڈال دیتی تھیں۔ قادر حسین جھنجھلا اٹھتا تھا لیکن وہ مذہبی پیشوا تھا۔

اس کے تھکے ہارے، تشنہ اعصاب انوری کے تصور میں ستا لیتے تھے۔ انوری ہی تھی جو اس کے ساتھ دو چار میٹھے بول کہہ سن لیتی تھی گو ان سے قادر حسین کی تشنگی میں پُر لطف سی تلخی کا اضافہ ہو جاتا تھا تاہم......

قادر حسین اپنے آپ میں الجھنے لگا تھا۔ بعض اوقات وہ گم صم ہو جاتا تھا مگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس نے کبھی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ پچھلے جمعہ کے روز جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر وہ حجرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ طرح طرح کے خیالات بگولے بن بن کر اس کا سکون وچین خس و خاشاک کی طرح اُڑانے لگ گئے تھے۔ وہ بستر پر گر پڑنے کے انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا اور لیٹ گیا تھا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور خوابوں کی دنیا میں اس کے خوابوں کی رانی اس کے سامنے موجود تھی لیکن خواب حسین نہیں تھے۔ ہر طرف سیلاب کی خوفناک موجیں درختوں، مکانوں اور انسانوں کو بہائے لیے جا رہی تھیں۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا خوفزدہ نگاہوں سے پانی کی قیامت خیزیوں کا نظارہ کر رہا تھا کہ اس کے سامنے انوری کی لاش بہتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر سیلاب میں کود پڑا تھا۔ اس نے انوری کی لاش کو پکڑ لیا تھا پھر جانے کیا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں ترنجن کے گیت گونجنے لگے تھے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تھا۔ وہ بڑ کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ سیلاب کا نشان تک نہ تھا۔ کوئی انسان آس پاس نہ تھا۔ نہ ہی انوری کی لاش تھی لیکن کوئی لڑکی اکیلی ہی گا رہی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا لیکن وہاں نسوانی آواز کے ترنم کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے اوپر دیکھا تو اسے ایک پرندہ، رنگ رنگیلا، خواب کی طرح حسین شاخ پر بیٹھا دکھائی دیا تھا......

''مولوی قادر حسین! اوپر آ جاؤ پہچانا نہیں؟ میں انوری ہوں''۔

قادر حسین درخت پر چڑھنے لگا تھا کہ منظر پر دھوئیں کا پردہ پڑنے لگا تھا پھر پردہ پانی کی لہروں کی طرح ہلنے لگا اور جب قادر حسین نے آنکھیں مل کر پردے کو نگاہوں سے چاک کرنے کی کوشش کی تھی تو نگاہیں حجرے کی چھت سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھیں۔ اس نے آنکھیں پھر بند کی تھیں، پلکوں کے اندھیرے کا کونہ کونہ چھان مارا تھا لیکن رنگ رنگیلا پنچھی اُڑ گیا تھا۔ درخت تھا نہ درخت کا سایہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا جس میں خواب کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں صدیوں پرانے پنجر کی ہڈیوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں لیکن سپنے کا راگ قادر حسین کے نیم خفتہ جسم کے گرد بجھی ہوئی آگ کی طرح منڈلا رہا تھا۔ قادر حسین نے آہ بھر کر آنکھوں کو یوں ملا تھا جیسے یہ دھواں آنکھوں کو لگ رہا تھا ایک بے کلی، یاس انگیز سی لذت، مسرت کی جھلک لیے ہوئے ایک خوف اور مسکراتی ہوئی اداسی اس کے دل و دماغ پر مسلط تھی، اس نے

اداس سی جماہی لی تھی۔ جوانی کی طوفان بگریبان انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا تھا۔ صحن میں مسجد کا سایہ دیکھا عصر کی نماز کا وقت ابھی بہت دور تھا۔

وہ پھر لیٹ گیا تھا۔ جسم میں جانی پہچانی سی تپش اور پُرسکون سی تکان تھی۔ ذہن کے کونے سے خواب کے تاثرات ابھرنے لگے تھے۔ پھر اس کی کائنات میں آندھی کی چیخیں مہیب سیٹیاں بجانے لگی تھی۔ قادر حسین نڈھال اور بے بس ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو آنکھوں کو پُرنم پایا تھا۔ آندھی کا شور و ہنگامہ تھما تو انوری کا خیال رنگ رنگیلا پنچھی بن کر اس کے تصورت میں اُڑنے لگا تھا۔ اس کی کھوئی کھوئی تشنہ نگاہیں پنچھی کی اُڑان کا تعاقب کر رہی تھیں...... ''انوری!...... انوری!''

''مولوی جی! سلام!''

قادر حسین نے اس نسوانی آواز کو بھی خیالوں کا فریب سمجھا تھا لیکن انوری حجرے کے دروازے پر کھڑی جوتی اتار رہی تھی۔ قادر حسین اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز کی طرح مسکرایا نہیں تھا۔ ''وعلیکم السلام'' نہیں کہا تھا۔ انوری کو بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ صرف اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اس کا انگ انگ خواب کے تاثر سے آزاد ہو کر بیدار ہو گیا تھا...... قادر حسین بیدار ہو گیا تھا لیکن پیش امام سو گیا تھا۔ انوری بیٹھ چکی تھی اور کہہ رہی تھی ___

''مولوی جی! آج شام کھانا نہ کھانا ہمارے گھر مہمان آئے ہیں ہم نے مرغی اور کھیر پکائی ہے آپ کے لیے لاؤں گی......''

''یا قہار! یا جبار! یا علی مشکل کشا! یا حسن یا بوتراب! یا قہار! جبار!'' کی تال اور رفتار میں قادر حسین کو یاد نہیں آ رہا تھا اور نہ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس روز کس طرح سرک کر انوری کے آمنے سامنے اس قدر قریب بیٹھ گیا تھا کہ اس کے گھٹنے انوری کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ اس نے بغیر ارادہ بغیر تمہید اور تیاری کے بے ساختگی سے دونوں ہاتھ آگے کر کے انوری کا دمکتا ہوا چہرہ گالوں سے تھام لیا تھا۔ یوں کہ جیسے اس نے بارگاہِ ایزدی کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے کہ اس کی مرادی انوریں کے حسین چہرے کی صورت میں اس کے ہاتھوں میں آ گری تھیں۔ ملکیت کا جذبہ اور سرور سوچنے کی قوتیں سلب کر چکا تھا۔ اس نے پہلی بار انوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا اور اس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ ان موہنی آنکھوں کا سامنا نہ کر سکے گا لیکن قادر حسین ایک ہی

جھٹکے میں امامت کی زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا اور وہ قدرے نڈر بھی ہو گیا تھا۔ ایک آزاد اور بے خوف سرگوشی اس کے ہونٹوں سے پھسل گئی۔

''انوری!''

''جی!''

''اوہ!...... انوری!''

اس نے اپنا چہرہ آگے بڑھتا ہوا محسوس کیا تھا اور ہاتھوں کی انگلیاں روئی کے گالوں میں دھنستی ہوئی محسوس کی تھیں۔ اس پر ایسی خود فراموشی طاری تھی کہ بن پیئے جھوم رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دل اور دماغ کا رشتہ اس طرح متزلزل ہو چکا تھا جس طرح سیلاب کی موجوں نے درمیان میں آ کر مسجد اور گاؤں کا ناطہ توڑ دیا ہو۔ قادر حسین کی ہستی میں پانی کی طوفانی روانی کا شور تھا اور یہ شور چند الفاظ میں سمٹ آیا___

''انوری تم کتنی اچھی ہو...... اوہ انوری!'' کس قدر بھوک تھی ان الفاظ میں کس قدر درد اور کتنا پیار...... لیکن ''اوہ انوری'' کے الفاظ اس کے منہ سے اتنی زور سے نکل گئے تھے کہ وہ اپنی ہی آواز پر چونک اٹھا تھا۔ طلسم ٹوٹ گیا، سحر جھڑ گیا تھا اور انوری کی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ وہ معصوم تھی، سیدھی سادی دیہاتن۔ یوں تو انوری کی عمر سولہ برس تھی لیکن حرکات اور باتوں کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ جوانی سے لاتعلق تھی لیکن گالوں کے دہکتے ہوئے گلابی رنگ، آنکھوں کی بے چینی اور ہونٹوں کے بے معلوم سے لرزنے سے پتہ چلتا تھا کہ جوانی اس سے لاتعلق نہیں اس نے لاشعوری طور پر بلوغت کو ابھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک بچپنے کو گڑیا کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ بچوں کی طرح شوخ اور چنچل تھی سولہ برس کی کچی عمر میں وہ ''انوری! تم کتنی اچھی ہو'' کے دامن میں ڈھکی ہوئی داستان کو نہ سمجھ سکی تھی۔ وہ خوش تھی۔ بہت ہی خوش کہ امام صاحب اس کے اس قدر قریب آ گئے تھے۔ اب وہ ان سے ہر مراد پوری کرائے گی، ہر بات کے لیے دعا کرائے گی۔

قادر حسین اپنی دنیا میں آ چکا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے انوری سے دو ہاتھ دور ہو گیا تھا جیسے انوری کی نوخیز جوانی نے اسے ڈس لیا تھا۔ وہ شرمسار تھا۔ ڈر رہا تھا۔ ایک خوف اس کے اعصاب پر طاری ہوتا جا رہا تھا۔ دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی

داخلی دنیا کی بے چینی اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں اور ہونٹوں کے لطیف سے رعشہ سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ ماحول سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دل کا چور پکڑ لیا تھا یا کسی چونے اس کا دل پکڑ کر چڑیا کے بچے کی طرح مٹھی میں دبا لیا تھا۔ کچھ بھی تھا اسے یوں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا، یوں نامحرم لڑکی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے تھا۔ احساس گناہ اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ شکست خوردگی کے عالم میں نڈھال ہو گیا تھا لیکن انوری نے اسے سنبھال لیا تھا......

''مولوی جی!''___ انوری نے بچوں کے سے لہجے میں کہا اور قادر حسین کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے___ ''کتنے دنوں سے دل میں ایک بات آتی ہے لیکن کہتے شرم لگتی ہے''۔

''کہو انوری! کیا بات ہے وہ؟''___ قادر حسین سنبھل گیا تھا۔

''اچھا''......کل بتاؤں گی''___ انوری نے رازداں سہیلیوں کے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں ابھی!''___ قادر حسین اب مسکرا رہا تھا۔

''نہیں کل...... سچی کل بتاؤں گی''۔

اور وہ چلی گئی تھی۔ قادر حسین کا سکون وچین جو اس نے ابھی ابھی پالیا تھا انوری کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ اسے گذشتہ جمعہ کی یہ حسین مگر تلخ واردات کی ایک ایک تفصیل یاد آ رہی تھی۔ تسبیح کے دانوں کا لطیف سا تصادم گزرے ہوئے ایک ایک لمحہ کو بے نقاب کر رہا تھا۔ شہادت کی انگلی اور انگوٹھا تسبیح کے دانوں اور رات کے لمحات کو گراتا جا رہا تھا جیسے وہ لمبی رسی میں پڑی ہوئی گانٹھوں کو کھولتا جا رہا تھا۔ وظیفے کے ترنم میں سوز پیدا ہونے لگا۔ قادر حسین کے وجد میں نئی کیفیت پیدا ہونے لگی___ ''...... یا حسن یا بوتراب! یا قہار! یا جبار!''___ قادر حسین جھوم رہا تھا یا حجرہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ بیرونی ماحول سے لاتعلق تھا اس پر اداسیاں مسلط ہونے لگیں۔ تصوروں اور خیالوں کے ہرے بھرے سبزہ زار پر کہر پڑنے لگی۔

انوری کے چلے جانے کے بعد گذشتہ جمعہ کے تیسرے پہر، عصر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے وہ رو پڑا تھا۔ اس کی ہستی میں دو انسان ایک دوسرے کا سامنا کر بیٹھے۔

''مجھے آزاد کر دو...... تم پیش امام ہو...... رحم کرو''۔

''قادر حسین ہوش میں آؤ۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو یوں نہ دیکھو''۔

''مولوی صاحب! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ انوری میری بہو بیٹی نہیں جھوٹ

نہ بولو''۔

''قادر حسین گاؤں والے تیری راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ ان کی عزت......''

''میں ان کی راہ میں دل بچھاتا ہوں لیکن انوری...... امام صاحب!''

''تم گناہگار ہو۔ تم مذہبی پیشوا ہو''۔

''لے جاؤ اپنا مذہب میں پیشوا نہیں، میں بھٹکا ہوا مسافر ہوں، پیاسا ہوں، میں قادر حسین ہوں''۔

''تمہاری زبان دوزخ کی آگ میں جلے گی قادر حسین!'''

''میں اس دنیا میں جل رہا ہوں مولوی صاحب! میں سزا بھگت رہا ہوں گناہ کر لینے دو سزا دی ہے خطا تو کر لینے دو''۔

''اٹھو، اذان کا وقت ہو گیا ہے سائے دو گنے ہو رہے ہیں''۔

''نہیں اٹھوں گا میری جوانی کو آزاد کر دو۔ میرے سینے سے یہ سلیں اٹھا لو۔ میں اذان نہ دے سکوں گا آواز گھٹ رہی ہے''۔

''یہ سلیں گناہ کی ہیں یہ بوجھ جرم کا ہے...... قادر حسین!''___ اسے کوئی قوت جھنجھوڑ رہی تھی___ '''مولوی قادر حسین!......''___ آواز بلند ہو رہی تھی___ ''پیش امام صاحب سائے لمبے ہو گئے ہیں اذان کا وقت گزر رہا ہے۔ قادر حسین! عورتیں دودھ دوہنے کے لیے اذان کا انتظار کر رہی ہیں وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں۔ اٹھو! وقت کا اعلان کرو''۔

دھند...... دودھیا رنگت کا دھواں...... پھر دھواں چھٹا...... پھر منظر کا ایک ایک خط نظر آنے لگا...... پھر قادر حسین مر گیا تھا...... پھر پیش امام بیدار ہو گیا تھا۔

اور جب گاؤں والوں نے اس روز عصر کی اذان سنی تو گاؤں کی گہما گہمی اور ہما ہمی دم بخود ہو گئی تھی۔ پیپل کے لرزتے ہوئے پتے بھی ساکن ہو گئے تھے۔ انوری کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ بکری کے دودھ کی دھاریں گڈوی میں نہیں کچھ زمین پر اور کچھ اس کے دامن پر پڑ رہی تھیں۔ قادر حسین وہی تھا۔ اذان وہی تھی۔ آواز وہی تھی، لیکن سوز نیا تھا۔ اس میں تانپورے کی، گونج بنسری کی لے اور شہنائی کے صحرائی نغمے تھے۔ یوں کہ جیسے کوئی اکیلا دکیلا فرشتہ پا پیادہ کہکشاں کے رستے جاتا ہوا آسمانی راگ الاپ رہا ہو۔ کمالے میراثی نے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر سرگوشی میں کہا تھا___ ''انتر اما لکونس کا ہے ستائی بھیروین میں گر رہی

ہے''۔۔۔ اور بھائی نے دماغ پر زور دے کر کہا تھا۔۔۔ ''مالکونس اور بھیرویں کا ملاپ بہتے پانی کو روک لیتا ہے بڑا مشکل راگ ہے خدا کی دین ہے جسے دے''۔

لیکن انوری بہت چھوٹی تھی وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔ اس کچی بے پرواہ عمر میں وہ کیونکر جان لیتی کہ مؤذن کی آواز میں نوجوان قادر حسین کی آہیں اور گھٹی ہوئی امنگیں رچی ہوئی ہیں۔ انوری کو کون سمجھاتا کہ ابھی ابھی قادر حسین محض اس کی خاطر اپنی ہستی کے پیش امام سے دست و گریباں ہو چکا ہے۔ خیالوں میں ہی سہی لیکن اس کے کردار کا چہرہ خراشوں سے بھرپور ہو گیا تھا۔

مرغ اذانیں دے رہے تھے۔ قادر حسین نے خیالوں اور یادوں کی افراتفری میں جانے کس طرح شاید لاشعوری طور پر یاد رکھا تھا کہ وہ ایک ہزار ایک سو ایک تسبیح پوری کر چکا ہے اور آج رات ورد پورا ہو چکا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے حجرے کے دروازے تک لپکا دہلیز پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں کا جھرمٹ جسے گاؤں والے کرکٹاں، کہتے ہیں۔ ابھی مینار سے ڈیڑھ گز دور تھا۔ صبح کی اذان میں ابھی وقت تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ دیے کی بتی کو تنکے سے آگے کیا۔ حجرے کی ٹمٹماتی ہوئی فضا یکبارگی چمک اٹھی اور قادر حسین گھٹنوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر پھر انوری کی دنیا میں پہنچ گیا۔ نیند سحر کے سکوت میں سو گئی تھی۔

جمعہ کی رات اس نے تڑپتے ہوئے گزار دی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے بیسیوں باتیں کہہ سن ڈالی تھیں۔

''انوری کیا بات کہے گی؟..... قادر حسین! میں تجھے چاہتی ہوں!..... وہ ناراض تو نہیں تھی..... اس نے میرے ہاتھ پرے نہیں کیے تھے..... اس نے اپنے گال چھڑائے نہیں تھے..... وہ مسکرا رہی تھی..... اور کیا کہے گی..... ایسی کون سی بات ہو گی..... مولوی جی! آپ بڑے اچھے ہیں..... مولوی قادر حسین! میرے ماں باپ کے پاس جا کر میرا رشتہ مانگ لو نا دیکھئے نا مولوی جی! میں انہیں کیسے کہوں..... شرم لگتی ہے ناجی!.....''

وہ رات بھی گزر گئی تھی لیکن وہ قادر حسین کی زندگی کی طویل ترین رات تھی پھر گاؤں کی سوئی زندگی کو جگانے دوسرا دن طلوع ہوا تھا اور آہستہ آہستہ گزرنے لگا تھا۔ کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن قادر حسین کی داخلی دنیا میں عظیم انقلاب آ گیا تھا جس کا کسی

کو علم نہیں تھا۔ سورج طلوع ہوا تو قادر حسین سو گیا تھا۔ انوری جانے کس وقت رات والے برتن لے گئی تھی۔ وہ گذشتہ شام اس وقت مرغی اور کھیر حجرے میں رکھ گئی تھی جب شام کی جماعت کھڑی ہوئی تھی۔

مسجد کی منڈیر کا سایہ مسجد کے صحن میں بڑھ رہا تھا لیکن نہایت آہستہ آہستہ، ظہر کا وقت بھی ہو گیا تھا پھر یہ وقت بھی گزر گیا تھا۔ پھر انوری آ گئی تھی۔ انوری کے آنے تک قادر حسین کے ذہن میں سینکڑوں خیال آ آ کر نکل گئے تھے یا ایک ہی خیال سینکڑوں شکلیں بدل بدل کر ذہن میں آتا اور جاتا رہا تھا۔ اس نے ہر خیال کا ذائقہ چکھا تھا۔ کوئی کڑوا کوئی کوئی میٹھا کوئی یونہی سا اور آخر خیالوں میں یہ افراتفری ایک یقین میں سمٹ آئی تھی۔۔۔

''انوری مجھے چاہتی ہے''۔۔۔ اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے اس نے اپنے سامنے جانے کتنے دلائل پیش کیے تھے۔۔۔ ''یہ مرغی اور یہ کھیر، وہ انوری کا ہاتھ تھام کر کہنا کہ مولوی جی! آپ سے ایک بات کہوں گی اب نہیں کل، شرم لگتی ہے۔ میرا اس کے اس قدر قریب ہو جانا گال تھام لینا اور اس کا پیچھے نہ ہٹنا مسکراتے رہنا..... اور جانے کیا کیا۔

پھر انوری آ ہی گئی تھی۔ جب وہ حجرے میں داخل ہوئی تھی تو قادر حسین یوں ہلکے ہلکے پھلکے اور بے تکلف انداز میں اٹھ بیٹھا تھا جیسے انوری اسی حجرے کا جزو تھی اور قادر حسین کی جائز ملکیت۔ قادر حسین نے چاہا تھا کہ دروازہ بند کر لے کوئی دیکھ نہ لے۔ جرم کا ہلکا ہلکا احساس اس کے ضمیر کو دبوچنے لگ گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی انوری اس کے پاس آتی رہتی تھی۔ دروازہ بند کرنے کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔ آج یہ احتیاط کیوں؟ گاؤں والوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو اس کے پاس بیٹھنے سے کبھی نہیں روکا تھا۔ کبھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا پھر یہ احتیاط کیوں؟ قادر حسین نے سر کو جھٹک کر اس خیال سے گلو خلاصی کرا لی تھی اور اس نے انوری کو کہا تھا۔۔۔ ''لاؤ انوری! کل والی بات بتاؤ۔ اب شرم شورم کچھ نہیں''۔۔۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسی اپنائیت اور اپناپن تھا کہ انوری کو مولوی کے روپ میں ایک ہمراز سہیلی نظر آنے لگی تھی۔ پیشتر اس کے کہ شرم و حجاب اس کے اور قادر حسین کے درمیان احترام اور تکلف کی لکیر کھینچ دیتا انوری نے کہا تھا۔

''کسی کے لیے دعا کرانی ہے یا تعویذ لکھ دیجئے''۔

''کسی..... سہیلی کے لیے؟''

"نہیں ....." ـــ جھجک نما شرم ہونٹوں کو چھو ہی گئی اور انوری چپ ہو گئی تھی۔

"اور کس کے لیے؟"

انوری کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کی یا کچھ نہ کہنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کوشش نے اس کے چہرے کا رنگ نکھار دیا۔ آنکھوں میں بے قرار سا خمار انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ اس کا یہ تاثر قادر حسین نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج جبکہ رات کے بطن سے سحر جنم لے رہی تھی۔ قادر حسین کو وہ تاثر یاد آ آ کر سحر کی رعنائیوں کو شرمندہ کر رہا تھا۔ اس حجرے میں کہ جس میں دیا آخری بار بھڑک کر بجھ گیا تھا۔ وہ تاثر ابھی تک زندہ تھا۔ جیسے حجرے کی تیرگی اس سے منور ہو رہی تھی۔

"بتاؤ نا انوری! کس کے واسطے؟" ـــ قادر حسین نے ہجولی بچے کے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"اکبر کے لیے" ـــ انوری کے ہونٹوں سے یہ الفاظ پھسل تو گئے تھے لیکن اس کا جسم پاؤں تک یوں لرز گیا تھا جیسے وہ بھرے ہوئے پستول سے کھیل رہی تھی کہ انجانے میں گولی نکل گئی ہو۔ انوری نے دوپٹے کو سرکا کر پیشانی کو ڈھانپ لیا تھا جیسے حجرے میں اکبر آ گھسا تھا۔ پستول کی گولی قادر حسین کے سینے سے پار ہو چکی تھی۔ اس نے انوری کی طرف یوں دیکھا جیسے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا ہو اور اس کے ساتھ بات کرنے کی ہمت باندھ رہا ہو۔

"اکبر کون ہے؟" ـــ قادر حسین کو اپنی آواز میں بھی بیگانگی محسوس ہو رہی تھی۔ شکست خوردگی کا احساس لیکن انوری ابھی اس عمر میں نہیں پہنچی تھی جہاں انسان کسی کے احساسات اور جذبات کو بھانپ سکتا ہے۔ انوری ابھی ایک ہی جذبے سے آگاہ ہوئی تھی جو اس کے دل و دماغ میں جانے کیسے گھر کر گیا تھا۔ وہ تو اس اپنے جذبے کو بھی بھانپنے سے قاصر تھی۔ اسے وہ صرف محسوس کرتی تھی اور اسے اس نے اکبر کا نام دے رکھا تھا لیکن اکبر کے نام یا تصور کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر شرم کی جھلک نمودار ہو جایا کرتی تھی۔ اکبر اور شرم کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ انوری کو اتنا بھی معلوم نہ تھا وہ تو اس کی نئی اور پرانی بیاہی ہوئی سہیلیوں نے اسے کچھ ایسی باتیں سنا ڈالی تھیں کہ وہ اکبر کے نام سے پُرلطف سا ڈر اور لذیذ سا لرزہ محسوس کرنے لگ گئی تھی۔

"نہ مولوی جی! یہ نہ بتاؤں گی" ـــ انوری نے کہا تھا ـــ "آپ بس اس کے لیے

دعا کیجئے"۔

"نہیں! پہلے بتاؤ کہ وہ کون ہے ...... بھائی ہے؟" ـــ قادر حسین نے مجروح شگفتگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں!"

"ماموں چچا کا لڑکا ہو گا؟"

"نہیں جی!" ـــ بچہ روٹھنے لگا ـــ "آپ تو بس ٹال رہے ہیں"۔

"منگیتر ہو گا؟" ـــ قادر حسین ایسی ہنسی ہنسا جو اس کی اپنی نہیں تھی۔

"ہٹیئے!" ـــ انوری ذرا سی بائیں طرف کو سرک گئی تھی اور شرم آلودگی سے کہا تھا ـــ "آپ بھی چھیڑنے لگے"۔

"تو منگیتر ہے نا! اس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

"ہاں کہہ تو دیا مولوی جی! شرم تو لگتی ہے نا جی!" ـــ انوری کے ہونٹ شاید بے قابو ہو گئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی ـــ "ساونی کٹتے ہی بیاہ ہو جائے گا۔ شرم تو لگتی ہے نا جی! رجو اور زیوراں بھی بس آپ کی طرح چھیڑتی رہتی ہیں ...... منگیتر ہے ...... منگیتر ہے ...... ہاں تو ہے نا! تمہارا تو نہیں ہے ......" ـــ انوری شاید قادر حسین کی موجودگی کو بھول گئی تھی اور وہ لاشعوری طور پر رجو اور زیوراں سے ہم کلام تھی۔ اکبر کا تصور اسے عامل کی طرح مسحور کیے ہوئے تھا اور وہ شرمائے ہوئے بچے کی طرح بول رہی تھی۔ انوری نے مولوی قادر حسین کو قرآن کی ساری سورتیں بھلا دی تھیں۔ وہ بول رہی تھی اور قادر حسین بڑی ہی اونچی چٹان سے ایسا پھسلا کہ لڑھکتا ہی چلا آ رہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز قلابازیاں کھاتی ہوئی اس کے قریب سے تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ انوری چپ ہو گئی تھی۔ شاید اس نے قادر حسین کو جھکی پلکوں کی اوٹ سے دیکھ لیا تھا۔ وہ چپ کیا ہوئی کہ قادر حسین کے گردوپیش پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ وہ زمین پر آ چکا تھا۔ انگ انگ سے شدید درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور دماغ چکرا رہا تھا۔ ایک بگولہ اس کے سینے سے اٹھا پسلیاں جلتے ہوئے مکان کے کواڑوں کی طرح تڑاخ تڑاخ کر کے جل رہی تھیں۔ اس نے انوری کو بھرپور نگاہ سے دیکھا تھا۔ چند ثانئے دیکھا۔ اس کے ہونٹ لرزے، پھر تڑپے، انوری کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ سینے کا بگولہ ہونٹوں کو جلاتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

"انوری! اکبر بازی جیت گیا ہے"۔۔۔ ایک دلدوز اور ہاری ہوئی فریاد کانپتی ہوئی حجرے کی فضا میں گونجی تھی۔

"سچی مولوی جی!" انوری نے جیسے اچھل کر کہا تھا۔ مسرت اور کامرانی اس کے شرمائے ہوئے خدوخال سے پھوٹنے لگ گئی تھی۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے قادر حسین کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اور اکبر اور شرم کا تعلق ایک جھٹکے سے توڑ کر کہا تھا۔۔۔ "مولوی جی! اکبر کبڈی جیت جائے گا؟"۔۔۔ انوری پر مقدس سا رعب طاری ہو گیا تھا وہ سوچنے لگ گئی تھی۔ اسے یہ بھی فخر محسوس ہوا تھا کہ اس قدر پہنچا ہوا بزرگ اس کے ساتھ کس قدر بے تکلف ہے۔ وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکی تھی۔

"مولوی جی! آپ کو کس طرح علم ہو گیا تھا کہ اکبر بڑی عید پر کبڈی کھیلے گا اور میں اس کے جیتنے کی دعا کرانے آئی ہوں؟"

"ابھی ابھی پتہ چلا ہے انوری!۔۔۔۔"۔۔۔ قادر حسین کو ایک اور دھچکا لگا تھا اور اس کے سینے سے آہ نکل گئی تھی۔۔۔ "ہارنے والوں کو سب کچھ پتہ ہوتا ہے انوری! جو تماشائیوں کو معلوم نہیں ہوتا"۔

"مولوی جی! میں آپ کا پیٹ میٹھے سے بھر دوں گی"۔

"اگر اکبر ہار جائے تو کیا ہو جائے گا انوری؟"۔۔۔ قادر حسین نے یونہی سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"نہ مولوی جی! لڑکیاں طعنے دیتی ہیں"۔۔۔ انوری نے روٹھنے کے سے انداز سے کہا تھا۔۔۔ "پچھلی دفعہ اکبر آٹھ آدمیوں کو لے کر پار والوں کے ساتھ کبڈی کھیلنے گیا تھا اور "پڑ" ہار گیا تھا۔ اب اس نے پار والوں کو للکار کر بلایا ہے۔ اس کے ساتھ وہی آٹھ آدمی ہیں۔۔۔۔ مولوی جی! اگر پچھلی دفعہ اکبر نہ گرتا تو "پڑ" گاؤں میں رہتا۔ اکبر ہارا تو ابھی تک سہیلیاں مجھے کہتی ہیں کہ تیرا اکبر مرد ہی نہیں۔۔۔۔ سچی مولوی جی! مسجد میں بیٹھی ہوں دراصل اکبر کا ناف چڑھ گیا تھا ورنہ اللہ پاک کی ذات کے سوا کسی سے گرتا ہی نہیں"۔

"وہ نہیں گرے گا۔۔۔۔ انوری!"۔۔۔ قادر حسین نے پیاسے سے لہجے میں کہا اور پوچھا تھا۔۔۔ "اکبر تمہیں بہت اچھا لگتا ہے؟"

"اور نہیں تو کیا! مولوی جی سچی! وہ اتا اچھا آدمی ہے کہ۔۔۔۔"۔۔۔ انوری کی باچھیں

یوں کھل رہی تھیں جیسے چھ سات برس کی بچی اپنے گڈے کی تعریف کر رہی ہو۔۔۔ "۔۔۔۔ کہ رجو اور زیوراں بھی اسے نظر بھر کر دیکھتی ہیں اور مولوی جی! رجو اور زیوراں بے شرم ہیں کہ اکبر کو دیکھ کر شرما جاتی ہیں۔ شرم تو مجھے لگنی چاہئے نا جی؟۔۔۔۔"

ایک بھاری بھرکم "السلام علیکم" نے ماحول میں گر کر انوری کے تصورات کو درہم برہم کر دیا اور قادر حسین کو ڈوبنے سے بچا لیا تھا۔ دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اکو موچی کھڑا تھا۔ اگر اکو نہ آ جاتا تو قادر حسین انوری کو کہنے ہی لگا تھا کہ آؤ انوری! اس گاؤں کی تاریخ میں اغوا کی ایک اور واردات کا اضافہ کر دیں۔

"اچھا انوری! اب جاؤ"۔۔۔ قادر حسین نے مولویانہ تمکنت سے کہا۔۔۔ "میں نے دعا کر دی ہے"۔

"اللہ آپ کو اجر دے مولوی جی!"۔۔۔ اور انوری چلی گئی تھی۔

"ابھی شاید عصر کا وقت نہیں ہوا"۔۔۔ اکو قادر حسین کے پاس بیٹھے ہوئے کہہ رہا تھا۔۔۔ "بڑی بھاگوان لڑکی ہے۔۔۔۔ انوری۔۔۔۔ مولوی صاحب! آپ کا بال بچہ تو نہیں ہو گا ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے"۔

"نہیں اکو میں نے ابھی شادی نہیں کی"۔۔۔ قادر حسین ٹالنے کے موڈ میں تھا۔

"آپ کے مطلب کی تو یہی ایک لڑکی تھی لیکن اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ اللہ واحد ہے مولوی جی! جب سے آپ نے میری گھر والی کا سر درد ٹھیک کیا ہے دل کرتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کا بیاہ کرا دوں۔ خدا جانے کیوں انوری پر نظر جمتی ہے لیکن اس پر ایک مسٹنڈے کی مہر لگ گئی ہے کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔ اکبر۔۔۔۔"۔۔۔ اکو بولے جا رہا تھا اور قادر حسین اکتا رہا تھا۔۔۔ "ہے تو گناہ مولوی جی! لیکن منہ میں آئی بات رکتی نہیں۔ اگر یہ اکبر مر مرا جائے تو انوری کی برادری میں کوئی لڑکا نہیں رہتا۔ پھر نمبردار سے کہہ کہلا کر انوری کا نکاح آپ سے ہو سکتا ہے"۔

قادر حسین کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے امید کی ہلکی سی جھلک نظر آنے لگی تھی۔۔۔ "اگر اکبر مر مرا جائے"۔۔۔ قادر حسین کے گرد ایک دعائیہ گونج منڈلانے لگی تھی اور اس نے شاید "آمین" کی سرگوشی بھی سنی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سرگوشی اس کی اپنی تھی۔ اس خیال سے وہ سہم گیا تھا۔ گناہ کا احساس اسے ڈرانے لگا تھا۔

جانے اکو کب اٹھا تھا پھر کیا ہوا تھا۔ عصر مغرب اور عشاء کی نماز قادر حسین نے کس طرح پڑھائی تھی۔ ایک عادت سی وہ پوری کرتا رہا تھا لیکن عشاء کی نماز کے بعد جب وہ فارغ ہو کر حجرے میں داخل ہوا تھا تو اس کا ریشہ ریشہ بیدار تھا۔ اعصاب ربڑ کی طرح کھچے تنے ہوئے اور سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ جس پر اس کی اپنی پھونکوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ لیٹ گیا تھا۔ اس نے ذہن کو خالی کر دینا چاہا تھا۔ انوری کے خیال کو ہی اگل دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پیش امام کے سامنے جھکانے کی ہر کوشش کر ڈالی تھی لیکن انوری کا خیال اسے دو حصوں میں کاٹ رہا تھا۔ کردار کی ایک کڑی تڑاخ سے ٹوٹ کر گر پڑی تھی اور شخصیت درمیان سے کٹ گئی تھی۔ وہ اپنے اندر دو لڑتے غراتے ہوئے انسانوں میں سمجھوتہ کرانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن دونوں انسان مست سانڈوں کی طرح ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے تھے۔ داخلی اور خارجی ماحول کسی معاہدے پر جم ہی نہیں رہے تھے۔ ساحل سے ٹکرا کر لوٹتی ہوئی لہریں ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی موجوں سے متصادم ہو رہی تھیں اور یہ تصادم قیامت خیز شور، جھاگ اور دھند اگل رہا تھا۔ قادر حسین نے خیالوں میں دونوں کے درمیان پتھروں کی دیوار کھڑی کر دی لیکن ترنجن کے ایک ہی بول نے دیوار کو کاغذ کی طرح اُڑا دیا۔

اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا

دن میں اُڑتے ہوئے چمگادڑ کی طرح بھولا بھٹکا سا نغمہ حجرے کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ یہ نغمہ لہریں بنیں، لہریں سیلاب بنیں۔ سیلاب پھیلنے لگا۔ شور، مہیب شور، موت کی چیخیں، بدروحوں کے قہقہے اور اس قیامت میں قادر حسین نے رنگ برنگ پنچھی دیکھا۔ وہ تڑپ اٹھا اور اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے گھبرانے لگا تھا۔ حجرے سے وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اکیلا نہیں انوری کو ساتھ لے کر۔

اسے ماضی یاد آیا، دور دور تک تلخیاں ہی تلخیاں۔ برسوں پر پھیلا ہوا سپاٹ ماضی، بے آب و گیاہ نخلستان، نہ سراب کا فریب، لوگ حقائقِ امروز سے گھبرا کر گزرے ہوئے دنوں کی حسین یادوں میں جا ستاتے ہیں اور یہاں یہ عالم کہ قادر حسین گزرے ہوئے دنوں سے گھبرا کر انوری کے وجود میں تسکین ڈھونڈ رہا تھا اور آج کی رات یہ حال کہ وہ انوری کے تصور سے بھاگ جانے کو تڑپ رہا تھا لیکن یہ تصور دامن سے الجھی ہوئی کیکر کی

خاردار شاخ کی طرح اِدھر سے چھٹ کر اُدھر الجھ جاتا تھا۔ دو تین ماہ کی عمر کے بچے نے اپنی مٹھی میں اپنے ہی سر کے بال پکڑ رکھے تھے۔ بال کھچ رہے تھے اور بچہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ شعور تھا نہ تاب کہ مٹھی کھول کر بال آزاد کرا لے۔ بچہ چیخ رہا تھا اور ہاتھ کھینچ رہا تھا۔ ساتھ ہی بال بھی کھنچے آ رہے تھے۔ وہ ماں تیرہ برس گزرے مرگئی تھی جو ہر آزار سے آزاد کرا لیا کرتی تھی۔

بچہ بلبلا اٹھا۔

قادر حسین کو آج کی سحر کیا کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یادوں کا ریلا چلا ہی آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لپک کر ''کرکٹوں'' کو دیکھا۔ صبح کی اذان میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔

آہ وہ رات...... قادر حسین نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر آہ لی اور اس رات کی تفصیلات اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے بیدار ہونے لگیں...... وہ اندر اور باہر کے طوفانوں سے اس قدر گھبرایا تھا کہ وہ بے بس ہو کر دوزانو ہو گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بے تحاشہ رو رہا تھا۔ دماغ سوچ و فکر سے بیزار اور مفلوج ہو چکا تھا۔ زہد و تقویٰ کے تمام سبق انوری کی بے پرواہ مسکراہٹ نے بھلا دیئے تھے۔ تسبیح کے دانے انوری کی نگاہوں کے جادو نے بکھیر دیئے تھے۔ رکوع و سجود کا سرور انوری کے ریشمی بالوں میں کھو گیا تھا اور ''پیش امام'' سوچ میں بیٹھا تھا۔ سر جھکائے ہوئے۔ قادر حسین نے ہاتھ پھیلا دیئے تھے اس کے ہونٹ تڑپے تھے لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ دل اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکا تھا کہ خدا سے کیا کہے اور اس نے اپنے سینے سے نکلی ہوئی ایک جلتی ہوئی آہ سنی تھی جو غیر ارادی طور پر یا کسی جذبے یا کسی انتقامی احساس یا بے چارگی اور شکست خوردگی کے تلخ خیال سے اس کے ہونٹوں سے با آواز بلند آزاد ہو گئی تھی۔

''یا خدا! اکبر مر جائے''۔

قادر حسین کی آواز اس کے اپنے کانوں میں پڑی تو وہ بجلی کی سی سرعت سے پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا تھا جیسے کسی نے اس کے منہ پر گھونسہ دے مارا تھا۔ پھٹی پھٹی خوفزدہ نگاہوں سے اس نے حجرے کی چاروں دیواریں دیکھی تھیں۔

''مولوی قادر حسین؟...... کیا کہا تم نے؟ اکبر مر جائے......'' ـــ جانے حجرے میں

کسی کی طنز بھری آواز گونجی تھی___ ''نہیں نہیں...... میں نے یوں نہیں کہا تھا...... میں نے یوں نہیں سوچا تھا...... میرا مطلب یہ نہ تھا......''___ اس نے دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

پھر اس کمرے میں ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ چھت کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے چھت میں شگاف ہو گیا تھا اور اس میں سے خدا جھانک رہا تھا پھر اسے ڈراؤنی سی ایک صورت نظر آئی تھی پھر صورت غائب ہو گئی تھی اور شگاف میں سے انوری جھانک رہی تھی۔ وہی معصوم سا چہرہ کھلا ہوا مسکراتا ہوا یہ چہرہ غائب ہو گیا تھا لیکن شگاف غائب نہیں ہوا تھا۔ اس میں سے کوئی بول رہا تھا۔

''تم پیش امام ہو؟ مردار!''

''مجھے معاف کر دو''۔

''گاؤں والوں کے تم روحانی باپ ہو......''___ آواز بلند ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ایک نسوانی آواز خلط ملط ہونے لگی تھی___ ''مولوی! آپ کا پیٹ میٹھے سے بھر دوں گی...... گاؤں کی نوجوان لڑکیاں تجھ جیسے مسٹنڈے ہٹے کٹے کے پاس اکیلی دکیلی آتی ہیں...... گاؤں والے خوش ہوتے ہیں انہیں تم پر اعتماد ہے۔ مولوی قادر حسین!...... شیطان!...... مولوی جی! لڑکیاں طعنے دیتی ہیں...... اللہ پاک کی ذات کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرتا...... تُو نے سوچا تھا کہ گاؤں کی تاریخ میں اغوا کی ایک اور واردات کا اضافہ کر دوں؟...... تلخ قہقہہ زہر میں بجھا ہوا...... آوازیں ہی آوازیں جن میں اسے اپنی آواز بھی سنائی دی تھی۔

''انوری! اکبر بازی جیت گیا ہے...... اکبر میرا منگیتر ہے شرم لگتی ہے ناجی! چلی جاؤ لے جاؤ اپنے ترنجن کے گیت، جلا دو ان چرخوں کو...... مجھے میری دنیا لوٹا دو...... تم اکبر کے لیے ہو میں اپنے لیے ہوں......''

وہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر بول رہا تھا لیکن اس کی آواز کی ہلکی سی سسکی بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں بول رہا تھا۔ وہاں بظاہر کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن قادر حسین کی ہستی کے پردوں کے پیچھے ایک ہجوم بپھرا ہوا تھا...... آوازوں کا ہجوم، ہجوم کی آوازیں۔ قادر حسین کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹ رہی تھیں،

بوٹیاں نوچی جا رہی تھیں، گناہ ثواب گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

''یا میرے مولا! یا قہار! یا جبار!......'' اس پر دورہ پڑنے کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی کہ اسے مرحوم استاد کا وظیفہ یاد آ گیا تھا۔ استاد نے اسے کہا تھا کہ یہ وظیفہ سخت کڑے وقت میں پڑھنے کے لیے ہے۔ اس سے آگ کے شعلے بجھ جاتے ہیں۔ سیلاب کا زور تھم جاتا ہے۔ بھونچال کے جھٹکے ساکن ہو جاتے ہیں لیکن اسے معمولی کام کے لیے نہ پڑھا جائے ورنہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔ اسے چالیس روز بلا ناغہ عشاء کی نماز کے بعد پڑھنا ہے اور ہر رات ایک ہزار ایک سو ایک تسبیح پوری کرنی ہے۔ خدا ہر مراد پوری کرے گا۔ دشمن زیر ہو گا مشکل آسان ہو گی۔ خواب میں اشارہ ملے گا اور روزِ محشر اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ہو گا...... اس کے استاد نے اسے بتایا تھا کہ یہ وظیفہ اسے اس کے پیر و مرشد نے عطا کیا تھا۔ اس کے پیر و مرشد ایک بار ڈکیتی کی واردات میں پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے یہ وظیفہ پڑھا تھا اور عینی شاہدوں اور پکے ثبوت کے باوجود پیر صاحب بری ہو گئے تھے۔

قادر حسین نے لپک کر تسبیح اٹھا لی تھی اور ''یا قہار! یا جبار! یا علی مشکل کشا! یا بوتراب! قہار! یا جبار......'' کا ورد اونچی آواز میں شروع کر دیا تھا۔ اس پر ''حال'' طاری ہو گیا تھا۔ رات کا سکوت لرز اٹھا تھا۔ حجرہ بھونچال کے جھٹکوں سے کانپ اٹھا تھا اور ابھی دو ہی تسبیح ختم ہوئی تھیں کہ قادر حسین کے سینے میں آگ کے شعلے بجھ گئے تھے۔ ہستی میں اٹھتے ہوئے سیلاب کا زور تھم گیا تھا۔ ذہن میں بھونچال کے ہچکولے ساکن ہو گئے تھے لیکن اس کا اعمال نامہ؟ اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی یوں پھیلا کر دیکھی تھی جیسے اعمال نامہ دیکھ رہا ہو لیکن اس کی نظریں قسمت کی اس لکیر سے الجھ گئی تھیں جو گزشتہ تیرہ برس سے اسے جُل دیتی آ رہی تھی۔ یہ لکیر رات کی طرح طویل تھی لیکن ٹیڑھی۔

لکیر وہیں رہی رات گزر گئی۔ یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

آج اس وظیفے کی تیسری رات تھی۔ گزشتہ دو راتیں تو اس نے پورے انہماک سے وظیفے کا ورد کیا تھا لیکن آج رات یکسوئی متزلزل ہو گئی تھی شاید اس لیے کہ اس نے شام انوری کو دیکھ لیا تھا۔ جب وہ مغرب کی نماز کا سلام پھیر رہا تھا تو انوری حجرے میں کھانا رکھ کر حجرے سے نکل رہی تھی۔ دوپٹہ پیشانی تک آیا ہوا آنکھیں جھکی ہوئیں۔ قادر حسین کا دائیں طرف کا سلام بائیں سلام سے ذرا لمبا ہو گیا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد تک اس نے بڑی ہمت سے انوری کے خیال کو ذہن میں داخل ہونے سے روکے رکھا تھا لیکن یہ خیال طوفانِ بادو باراں میں کھڑا دروازے پر بے ہنگم دستک دیتا رہا تھا اور رات جب قادر حسین وظیفے میں مگن ہوا تو انوری نہایت آہستہ سے اس کی ہستی میں داخل ہو گئی تھی اور اسے گزرے ہوئے دو مہینوں کی واردات کی ایک ایک تفصیل سنا گئی۔

شب بیداری اور اعصابی کشمکش نے اسے ادھ موا کر دیا۔ اس نے حسبِ معمول اذان دی۔ آج اس کی آواز میں لرزہ تھا اور انوکھا سا سوز جسے صرف گندم کے پکے ہوئے خوشے ہی سن سکے۔ گاؤں والے ابھی سو رہے تھے۔ انہیں ان دنوں جاگنے کی جلدی نہیں تھی۔ فصل پک رہے تھے اور کسان دھوپ کی اس تپش کے انتظار میں تھے جو ان خوشوں کو زرد کر کے ان کے پسینے کے ایک ایک قطرے کی قیمت ادا کرتی ہے۔ قادر حسین نے گذشتہ دو راتوں میں سکون و اطمینان اور دل کی دھڑکنوں کو بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح چن کر پرو لیا تھا لیکن آج وہ موتی پھر بکھر گئے۔ وہ چنتا جا رہا تھا لیکن دانے لڑھکتے ہی جا رہے تھے۔ ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔

دن گزرنے لگے لیکن آہستگی سے۔ قادر حسین اپنے آپ سے برسرِ پیکار رہنے لگا۔ اس کے اندر جو جنگ شروع ہو چکی تھی اس کے شعلے بڑھتے ہی جا رہے تھے اور اس کی دنیا کو بے دردی سے چاٹ رہے تھے۔ اس نے ان شعلوں کو بڑ کی چھاؤں تلے بیٹھ کر گاؤں سے ایک میل دور چناب کی روانی میں پکے ہوئے کھیتوں کی پیلاہٹ میں اور رات زیادہ سے زیادہ دیر وظیفے میں ڈوب کر بجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس نے ایک دو بار یہ چاہا کہ گاؤں سے ہی بھاگ جائے لیکن اس کی اپنی ہی ہستی میں سے کسی نے اٹھ کر اسے پابجولاں کر دیا۔ وہ اپنے آپ میں گم ہوتا گیا۔ اپنے آپ میں الجھتا گیا اور خاموش اور چپ چاپ رہنے لگا۔ رکوع و سجود اور امامت محض عادت بن گئے گاؤں والوں نے پیش امام کی یہ حالت محسوس کی اور ایک دن نمبردار نے پوچھ ہی لیا۔

''مولوی صاحب! کیا بات ہے؟ آپ کچھ......''

''میں ان دنوں چلہ کر رہا ہوں۔ زیادہ بولنے کی اجازت نہیں''۔۔۔ قادر حسین نے مستعار لی ہوئی ایک مسکراہٹ میں جانے کتنے طوفان لپیٹ کر جواب دیا۔

اور نمبردار کا سر تعظیماً جھک گیا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو مولوی قادر حسین دریا کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر جا رہا تھا۔

چناب کے کنارے کنارے وہ خراماں خراماں سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ سر یوں جھکا ہوا جیسے احساسِ گناہ کا بوجھ اس کی ہمت سے زیادہ ہو چلا تھا۔ کندھے بھی ذرا سے آگے ہو گئے تھے۔ وہ بار بار سر کو جھٹک رہا تھا لیکن خیالوں کا ایک غول اس کے شکست خوردہ وجود کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ وہ ان سے پیچھا نہ چھڑا سکا اور یوں دھڑام سے دریا کے کنارے بیٹھ گیا جیسے کتنے ہی کوسوں کی مسافت طے کر آیا ہو اور ابھی منزل کا کچھ پتہ نہ ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ مسجد کے دو مینار دو ہاتھ پر نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ سے بھاگ جانے کو بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن یہ مہم اب اس کے لیے آسان نہیں تھی۔ اس نے دریا کی ہلکی ہلکی لہروں پر نظریں گاڑ دیں اور ذہن خالی کر دینا چاہا مگر کسی کونے میں بیٹھا ہوا کوئی دھیمی سی آواز میں بولا۔۔۔ ''اگر اکبر مر جائے''۔

پھر وہی بات پھر وہی فتور۔ وہ سٹپٹا اٹھا۔ اس نے زمین پر زور سے ہاتھ مارا۔ جیسے یہی زمین اس کے تمام دکھ درد کی ذمہ دار تھی۔ اس کے منہ سے غصے سے لبریز الفاظ نکلے۔۔۔

''نہیں میں نے یوں نہیں کہا تھا...... اکبر نہیں مرے گا انوری اسی کی ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔ میں ان کا مذہبی پیشوا ہوں۔ میں ان سے برتر اور بہت اونچا ہوں''۔۔۔ وہ اٹھا کنارے کی ڈھلوان سے نیچے اتر کر جوتی اتاری اور پاؤں بہتے پانی میں ڈبو دیئے۔ خنکی نے اسے ہلکا سا سکون دیا۔ لطیف سی تسکین یا تسکین کا فریب۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس سکون سے لطف اندوز ہوا لیکن درمیان سے کٹے ہوئے کردار کے دونوں حصے پھر آپس میں ٹکرانے لگے۔ مہیب تصادم دل دہلا دینے والے دھماکے، آوازیں ایک دوسری سے الجھی ہوئی ہنسی، آنسو، قہقہے، نوحہ وزاری، احساسِ گناہ، امامت، مذہب اور محبت۔

قادر حسین نے بے بس ہو کر آنکھیں بند کر لیں چناب کی سبک روانی کی جل ترنگ میں اور پلکوں کے سرمئی دھندلکے میں سے انوری نظر آئی پھر اکبر دکھائی دیا۔ قادر حسین کی پیشانی پر نفرت کی لکیریں نمودار ہوئیں پھر اسے انوری اور اکبر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چناب کی لہروں پر چلتے ہوئے نظر آئے۔ قادر حسین کے دل سے دعا نکلی۔

''یا خدا! اس جوڑے کو ہرا بھرا کر دے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

میں تو راہی ہوں سایہ دیوار گزر جاؤں گا...... یا خدا! اکبر کبڈی جیت جائے...... ہار جائے مرمرا جائے......" ایک اور آواز قادر حسین کی دعاؤں کی کو یوں نگلنے لگی جیسے اُڑتی ہوئی مکڑی پر کوے جھپٹتے ہیں اور ہضم کرتے جاتے ہیں۔ آؤ! انوری...... بھرے ترنجن بیٹھی توں...... میں تجھے کیسے اٹھا کے لے جاؤں...... اغوا؟...... لیکن وہ جانے کو تیار نہ ہوئی تو...... اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا...... کاش! اے کاش! میں یہ سپنا آنکھیں کھول کر دیکھتا۔ گردوپیش کا تو کچھ ہوش رہتا...... اور اب؟...... ہوسکتا ہے کہ ساؤنی کٹنے سے پہلے سیلاب آجائے اور اکبر اس میں بہہ جائے، ڈوب جائے، اس جھناں میں جانے کتنے مہینوال اور کتنی سوہنیاں بہہ گئی ہیں...... لیکن...... لیکن...... میں خود بھی تو کچے گھڑے پر تیر رہا ہوں......

اس گاؤں کو چناب تین بار زیر آب کر چکا ہے۔ اب کے پھر سیلاب آجائے تو کیا ممکن نہیں کہ اکبر اس میں ڈوب جائے؟ اس میں میرا کیا قصور ہوگا...... شرم لگتی ہے ناجی......

اکبر اتنا اچھا ہے کہ...... اوہ؟ یا خدا! انوری کس قدر معصوم ہے۔ اسے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ منگیتر کے نام سے شرم کیوں آتی ہے...... نہیں! انوری اکبر ہی کے لیے ہے۔ مجھے روحانی باپ سمجھتی ہے...... یا خدا اکبر کو انوری کے لیے زندہ رکھیو میرے گناہ بخش دیجئو مولا......"

ایک کچھوے نے سر باہر نکالا اور انسان کو دیکھ کر ڈبکی لگائی "ٹڑنگ" کی آواز سے قادر حسین اپنے آپ میں لوٹ آیا۔ گردوپیش کا جائزہ لیا۔ دریا کی وسعت کو نظروں سے ناپا۔ گہری سانس لی اور اس کے منہ سے سرگوشی نکلی۔ جسے وہ خود بھی نہ سن سکا۔ صرف محسوس کر سکا...... بس آج سے انوری اور اکبر میرے لیے اجنبی ہو گئے ہیں۔ میرا ان سے کوئی لگاؤ نہیں آج سے میں ہمیشہ اکبر کی جیت اور انوری کے دل کی مرادوں کی برآوری کی دعائیں کروں گا...... اس سرگوشی نے اس کے اعصاب سے منوں بوجھ اتار دیا۔ وہ یکبارگی ہلکا پھلکا ہو گیا اور اسے یہ بھی شک ہوا کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔ اس مسکراہٹ میں اس نے روحانی مسرت کی بو بھی سونگھی۔ وہ دریا کے کنارے سے اٹھا۔ جیسے مریض اچھا بھلا ہو کر غسلِ صحت کے لیے چارپائی سے اٹھتا ہے۔

قادر حسین گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا جیسے دریا میں بہتے ہوئے کچے گھڑے کو دیکھ رہا ہو کہ جس میں اس نے تمام تر دکھ درد، دماغی انتشار ذہنی خلفشار

اور احساسِ جرم کو بند کر کے جھناں میں پھینک دیا تھا۔ اس کی گردن عجیب تمکنت اور بے نیازی سے سیدھی ہو گئی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ مسجد کو جاتے ہوئے انوری کو ساتھ لیتا جائے گا۔ اسے سورہ مزمل پڑھائے گا اور اسے ہدایت کرے گا کہ وہ رات سونے سے پہلے تین بار یہ سورہ پڑھ کر اکبر کے گھر کی طرف پھونک مار کر سو جایا کرے۔ ان شاء اللہ فتح ہوگی اور اکبر اور انوری کا بیاہ بخیر و خوبی ہو جائے گا۔ اکبر کے متعلق بھی یہی کچھ سوچا اکبر کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس میں اس نے کوئی خاص بات نہیں دیکھی تھی سوائے اس کے کہ وہ مسجد کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ قادر حسین کے لیے عام سا آدمی تھا لیکن انوری کے ہونٹوں سے اس کا نام سنا تو وہ اس کے لیے کس قدر اہم شخصیت بن گیا تھا۔

دل کے چور نے بہت دنوں کے بعد مولوی قادر حسین کو آزاد کیا۔ شگفتگی عود کر آئی۔ وہ گاؤں کے قریب جوہڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ آ کوڈی کوڈی کوڈ کڈ کڈ کڈ...... اور اس کے ساتھ ہی بے ہنگم غل غپاڑہ بلند ہوا۔ قادر حسین کے قدم رک گئے۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ شام کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ وہ جوہڑ کے ساتھ ساتھ شور و غل کی طرف چل پڑا۔ دیکھا کہ اکبر کی ٹیم کبڈی کی مشق کر رہی ہے۔ قادر حسین کو کھلاڑیوں نے دیکھا نہ تماشائیوں نے۔ وہ ذرا دور کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں اکبر کے جسم پر پڑیں تو تیل اور پسینے کے نہائے ہوئے جسم سے نگاہیں پھسلنے لگیں۔ اس نے اکبر کو آج پہلی بار ننگے بدن دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیا گٹھا ہوا اور متناسب جسم تھا۔ ہر ایک پٹھا یوں کہ جیسے بت تراش نے رات رات جاگ کر محنت کی ہو اور جب اکبر کبڈی دینے گیا تو جس صفائی سے وہ حریف کی گرفت میں آ کر نکلا قادر حسین کو ربڑ کا گڈا یاد آ گیا جسے دوہرا کر کے سر سے پاؤں کے ساتھ لگاؤ اور چھوڑ دو تو وہ "لف" کر کے بجلی کی طرح اچھل کر سیدھا ہو جاتا ہے۔ قادر حسین دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"انوری کو اس کے جسم سے محبت ہے۔ یہ جسم ہے ہی محبت کے قابل ورنہ اس گہری سانولی رنگت اور چہرے مہرے پر کون مرتا ہے......" قادر حسین سوچ میں ڈوبنے لگا۔ اس نے نظریں نیچے کر کے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ بازو اور ہاتھ دیکھے جن کا رنگ سپیدی مائل گندمی تھا جو نہانے کے بعد ہلکا گلابی بھی ہو جایا کرتا تھا...... "لیکن یہ پٹھے؟ اکبر مجھ سے زیادہ خوبرو تو نہیں......"

قادر حسین جو چند لمحے پیشتر یہ سوچ کر گاؤں کی طرف چلا تھا کہ انوری اور اکبر کو سورۂ مزمل پڑھا دے گا اور وہ ہر شر سے محفوظ رہیں گے، چند لمحوں بعد نمبردار کے دروازے کو دھکیل کر اس کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ نمبردار چارپائی پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ وہ پیش امام کو دیکھ کر اس طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے چارپائی نے اسے کاٹ کھایا ہو۔ نمبردارنی سرہانے لانے کمرے کی طرف بھاگی۔

''بیٹھیے بیٹھیے چوہدری جی!''۔۔۔ قادر حسین نے مولویانہ جلال سے کہا۔۔۔ ''نماز کا وقت ہو رہا ہے، میں بس چلا مسجد کو، صرف یہ کہنے آیا تھا کہ صبح سویرے سویرے اذان سے تھوڑا پہلے اگر آدھ سیر تین پاؤ دودھ ہر روز گرم کر کے بھیج دیا کریں تو آپ کو تکلیف تو نہ ہو گی...... ہر روز''۔

''اجی نہیں مولوی صاحب!''۔۔۔ نمبردار نے یوں کہاں جیسے آدھ سیر تین پاؤ دودھ کے بدلے اسے بہشت کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔۔۔ ''اوئے پھجے!''۔۔۔ اس نے نوکر کو آواز دی اور مولوی صاحب کے سامنے اسے ہر صبح اذان سے پہلے ایک سیر گرم دودھ مسجد میں پہنچانے کا حکم دے دیا۔

''دراصل چوہدری جی!''۔۔۔ قادر حسین نے کہا۔۔۔ ''میں ایک چلہ کر رہا ہوں جس میں سوا دو چھٹانک سے زیادہ اناج کھانا منع ہے......''

اور جب دوسری صبح اذان سے پہلے پھجا مسجد میں دودھ دینے گیا تو دیکھا کہ حجرے کے دروازے اور مسجد کے صحن کی درمیانی جگہ پر جہاں نمازی جوتے اتارتے تھے قادر حسین تیل کی مالش کر کے ڈنٹر پیل رہا تھا۔ پھجے کو دیکھ کر وہ یوں چونک اٹھا اور گھبرایا جیسے بڑ کے تنے کی اوٹ سے وہ انوری کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اسے گردن سے آ دبوچا ہو۔

''اوہ تم آ گئے، دودھ لے آئے؟''۔۔۔ قادر حسین نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا لیکن سنبھل گیا اور لہجے میں مولویانہ جھلک پیدا کر کے بولا۔۔۔ ''خشکی بہت ہو گئی ہے جسم کے لیے مالش بڑی اکسیر چیز ہے۔ ایک روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ اونٹنی کے تیل کی مالش فرمایا کرتے تھے''۔

آٹھ دن گزر گئے قادر حسین ہر رات وظیفہ پڑھتا رہا۔ استاد نے اسے بتایا تھا کہ وظیفہ پڑھتے وقت صرف دو چیزوں کو تصور میں رکھا جائے۔ خدا اور مراد۔ قادر حسین خدا کو تو

اپنی بساط کے مطابق سمجھتا تھا لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی مراد کیا ہے...... انوری؟...... اکبر مر جائے؟...... اکبر کبڈی جیت جائے؟...... اکبر اور انوری کا بیاہ ہو جائے؟ یا یہ کہ وہ جن تلخیوں سے دوچار ہے ان سے نجات مل جائے؟ اور وہ صرف مولوی ہی رہے؟ اور شاید یہ کہ اس کی روح سے انوری کا بھوت اتر جائے؟ وہ بغیر فیصلہ کیے وظیفے میں منہمک رہا۔ خدا کا تصور سامنے رکھا لیکن ہر رات یہ ہوا کہ جونہی وہ وجد میں آیا، جونہی وظیفے کا تاثر اور وجدانی سی کیفیت عروج پر پہنچی اور جونہی وہ دنیا سے لاتعلق ہوا، نہ خدا کا تصور رہا نہ مراد کا۔ اس نے خیالوں میں اپنے آپ کو اکبر کے ساتھ کشتی لڑتے ہوئے پایا۔ اسے گراتے ہوئے دیکھا اور انوری ایک طرف جیتنے والے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے بسا اوقات سر کو زور زور سے جھٹکے دیئے، لیکن یہ تصور متزلزل ہو کر یوں جوں کا توں موجود رہا جیسے کسی نے دھوئیں میں ہاتھ مارا ہو۔

''پیش امام'' اور قادر حسین ایک دوسرے سے کھنچنے لگے۔ عداوت بڑھتی گئی۔ قادر حسین نے سمجھوتے اور صلح صفائی کی بہت کوشش کی لیکن بے سود! اس دوران انوری اس کے پاس تین چار مرتبہ آئی۔ قادر حسین نے اسے دل سے اتار دینے کے ہزار جتن کیے۔ اس نے ایک بار یہ بھی چاہا کہ انوری کو کہہ دے کہ وہ آئندہ اس کے پاس نہ آیا کرے لیکن وہ جونہی اس کے سامنے آئی، وہ بے ساختگی سے بول اٹھا۔۔۔ ''اری ڈائن! کل کہاں تھی تُو؟''۔۔۔ اس نے ہر بار انوری کے سامنے بیٹھ کر اس کے چہرے میں کہیں کوئی نقص کوئی خامی نکالنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دل کو فریب دینا چاہتا تھا کہ جس پر تُو مرتا ہے اس کی ایک آنکھ دوسری آنکھ سے چھوٹی ہے یا ناک اس قدر لمبی ہے کہ اچھے بھلے چہرے مہرے کو بھدا بنا دیا ہے یا یہ کہ وہ گنجی ہے، بھینگی ہے، گردن چھوٹی ہے لیکن وہاں کوئی خامی نہیں تھی۔

قادر حسین بلاناغہ ڈنٹر بیٹھک پیلتا رہا اور سیر گرم دودھ پیتا رہا۔ وہ جسم میں ایک آگ جلتی ہوئی محسوس کرنے لگا اس نے دیئے کی لو میں چھوٹے سے آئینے میں کئی بار اپنا چہرہ دیکھا جو سرخی مائل ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی اور گردن کی درمیانی جگہ سوجتی جا رہی تھی اور وہ پٹھوں میں اجنبی سی قوت محسوس کرنے لگ گیا۔

دسویں رات جب وہ وظیفے سے فارغ ہوا تو باہر نکل آیا۔ جیٹھ کی رُت کا آغاز تھا۔ قادر حسین کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ چاند کی بارھویں تھی۔ ماحول پر رومان پرور سکوت

طاری تھا لیکن قادر حسین کی دنیا میں ہنگامے بپا تھے۔ وہ چند ثانئے چاند کی طرف دیکھتا رہا اور جانے اسے کیا ہوا اس نے دائیں ہاتھ کا گھونسہ پوری طاقت سے بائیں ہتھیلی پر مارا اور ہتھیلی نے گھونسے کو روک لیا۔ اس کے دونوں کندھے ہل گئے۔ اس نے یوں دانت پیس لیے جیسے اس کا حریف اس کے سامنے کھڑا اسے للکار رہا تھا۔ قادر حسین مکمل طور پر لاشعور کی گرفت میں تھا۔ وہ تیز خرام مسجد سے نکل گیا گاؤں کی گہما گہمی چاندنی کی نیلگوں چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ قادر حسین کے ہونٹوں سے غصے سے بھری ہوئی سرگوشی نکلی ___ ''اگر بات جسم کی ہے تو انوری کو میں جیت کر رہوں گا'' ___ وہ دوڑنے کی حد تک تیز قدم جا رہا تھا ___ ''آج ہی رات فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے'' ___ وہ چلا ہی جا رہا تھا کہ رک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا لیکن ہاتھ رک گیا۔ اس کا پسینہ نکل آیا، جسم گھبراہٹ سے کانپ اٹھا، نظروں نے اسے کچھ دکھا کر بیدار کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے لاشعور کی گرفت سے اس طرح باہر آ گیا جس طرح اس نے کبڈی میں اکبر کو حریف کی گرفت سے نکلتے دیکھا تھا۔ قادر حسین کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو گئے اس نے تمام قوتیں صرف کر کے پاؤں اٹھائے اور پیچھے ہٹ آیا۔ وہ اکبر کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی حالت اس چور کی سی ہو رہی تھی جو چوری کرنے کمرے میں داخل ہوا ہو اور گھر والوں نے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے اسے اندر قید کر لیا ہو۔ قادر حسین نے کپڑوں کے اندر پسینہ بہتا ہوا محسوس کیا۔ دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اکبر کا کتا مکان سے ذرا پرے سو رہا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لیٹے لیٹے غرایا۔ اگر کتا نہ غراتا تو قادر حسین وہیں پتھر بن جاتا۔ اس نے کتے کی طرف دیکھا اور سرپٹ بھاگ اٹھا۔ وہ مسجد میں آیا تو گھبراہٹ ختم ہو گئی لیکن غصے نے اسے پاگل بنانا شروع کر دیا۔ نیند اچاٹ ہو گئی۔ رات بھر وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔

دوسری صبح اس نے حسبِ معمول ورزش کی، دودھ پیا، اذان دی، نماز پڑھائی لیکن مشین کی طرح، گاؤں کی ہماہمی بیدار ہو کر ماحول پر پھیل چکی تھی۔ بڑ کے درخت نے جوہڑ پر سایہ پھیلا دیا تھا۔ گندم کے پکے ہوئے خوشے گاؤں والوں کا خون اور مسرتیں کئی گنا زیادہ کر رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو چکے تھے، لیکن قادر حسین کے حجرے میں ابھی تک شب تار تھی۔ وہ رات کے واقعہ کا تجزیہ کر رہا تھا لیکن تار الجھتے ہی جا رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر وضو کیا اور سورۂ یاسین پڑھی لیکن سینے کا غبار اٹھ اٹھ کر

آنکھوں کو لگتا رہا۔ اس نے جھنجھلا کر ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ہاتھ وہیں رہنے دیا اور حجرے میں بچھی ہوئی چٹائی پر لیٹ گیا۔ لیٹا ہی تھا کہ سو گیا۔ خواب میں اس نے مرحومہ ماں کو دیکھا۔ مرحوم استاد کو دیکھا۔ دریا کی روانی دیکھی اور تحت الشعور میں ڈھکے چھپے اثرات جو بیس برس تک اس کی ہستی میں آشیانے بناتے رہے تھے، رنگ برنگی چڑیوں کی طرح خواب کی دنیا میں پھدکتے رہے اور قادر حسین کے تھکے ہارے شعور کو سہلاتے بہلاتے رہے۔

وہ شاید ظہر کے وقت تک نہ جاگتا لیکن انوری نے چھاچھ کا پیالہ روٹیاں اور سالن کی رکابی حجرے میں رکھی تو پیالہ رکابی سے ٹکرا گیا۔ قادر حسین کو جگانے کے لیے یہ ہلکی سی ٹھک کافی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، انوری کو دیکھا اور آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔

''آپ سوئیے میں جا رہی ہوں''۔

قادر حسین نے انوری کی قمیص کا کونہ پکڑ لیا اور ہاری ہوئی آواز میں بولا ___ ''بیٹھو تو ذرا۔ اتنے دنوں بعد آئی ہو اور ذرا سا بیٹھتی بھی نہیں''۔

''ماں جلدی آنے کو کہتی تھی'' ___ انوری نے بے تکلفی سے کہا اور بیٹھ گئی۔

قادر حسین پر نیند کا خمار طاری تھا۔ انوری کی مسکراہٹ نے اس خمار میں نشے کی کیفیت بھر دی۔

اس نے انوری کا چھوٹا سا ہاتھ پکڑ لیا اور بے بس پیاسی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگ گیا۔ انوری کی پیشانی کے دونوں کونوں پر کنپٹیوں کے قریب بچپنے اور کنوار پنے کے چند ایک ملائم ملائم چھوٹے چھوٹے بال قادر حسین کے شباب میں زلزلے پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ دوسرا ہاتھ آگے کیا اور ان بالوں کو سہلانے لگ گیا۔

''انوری!'' ___ مخمور سرگوشی۔

''جی!'' ___ شرمیلی مسکراہٹ۔

''تم مجھ سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہو'' ___ جیسے مریض نے نزع کے وقت زیست سے زیرِ لب کہا ہو۔

''آپ کے پاس تو ہوں'' ___ کنوارا قہقہہ۔

''انوری ایک بات پوچھوں؟'' ___ ایک استدعا۔

''ہوں!''

انگلیاں الجھ گئیں۔

''تمہیں اکبر اچھا لگتا ہے کہ میں؟''

''ہٹیئے! آپ بھی چھیڑنے لگے، رجو کی بچی کی طرح...... میں تمہیں بتاؤں گی...... اوئی اللہ...... نہ مولوی جی! اتی زور سے انگلی نہ دبایئے...... اچھا چھوڑ دیئے میں بتاتی ہوں...... اچھا کل بتاؤں گی''۔

''تو میں پھر انگلی میں انگلی رکھ کر دباؤں گا''___ قادر حسین سہیلیوں کے موڈ میں آ گیا۔

''اچھا بتاتی ہوں...... اللہ قسم ہاتھ چھوڑ دیئے ابھی بتاتی ہوں...... آپ بھی اور اکبر بھی''۔

قادر حسین کچھ کہنے لگا تھا کہ انوری بچپنے کی شوخی میں آ گئی اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر، شرما شرما کر اور گردن کو خم دے دے کر کہنے لگی___ ''لیکن وہ بڑا شیطان ہے بس آپ کی طرح انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر پتہ نہیں کیا کیا باتیں کہتا رہتا ہے...... نہ جی وہ نہیں بتاؤں گی...... شرم لگتی ہے نا جی!''

''تم اس کے ساتھ باتیں بھی کرتی ہو، وہ تمہیں ملتا رہتا ہے؟''

''نہ جی! میں تو نہیں ملتی نہ باتیں کرتی ہوں۔ کھیتوں میں جاتی ہوں تو پتہ نہیں کہاں سے آ جاتا ہے اور پاس بٹھا لیتا ہے...... بڑا شرارتی ہے...... اس روز شہر گیا تو میرے لئے بڑے اچھے سفید پیپلا منٹ لایا۔ گول گول ٹکیاں سی منہ میں رکھ کر منہ کے راستے سانس لو تو گلے میں ٹھنڈ لگتی ہے مولوی جی! میں دو ٹکیاں آپ کے لیے لانے لگی تھی پھر نہیں لائی۔ میں نے کہا آپ پوچھیں گے کہ کہاں سے لائی ہو تو میں کیسے بتاؤں گی کہ اکبر نے دی ہیں...... باقی ٹکیاں بڑی بڑی تھیں اور ایک چھوٹی تھی کہنے لگا کہ یہ سب سے آخر میں کھانا۔ میں نے کھیتوں میں جا کر بڑی گولیاں کھائیں۔ رجو ساتھ تھی، دو اس کو بھی دیں۔ جب آخر میں چھوٹی ٹکیا منہ میں ڈالی تو اف اللہ مولوی جی! پکی نبولی سے بھی زہر کڑوی۔ میں نے منہ میں سے نکال کر رجو کو چکھائی تو وہ کہنے لگی کہ یہ بخار کی گولی ہے۔ اسے کونین کہ پتہ نہیں کیا کہتے ہیں۔ رجو کا گھر والا لیس نائک ہے نا جی! وہ اس کے ساتھ لاہور گئی تھی۔ وہاں کہتی

ہے کہ اس نے یہ گولیاں کھائی ہیں......''

قادر حسین سن کم رہا تھا اور انوری کے ہونٹوں، گردن اور آنکھوں کی حرکت کو زیادہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی کس قدر معصوم، کس قدر سادہ اور کس قدر پاکیزہ ہے۔ اسے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ وہ سولھویں برس میں ہے اور سترھواں پورا بھی نہ ہونے پائے گا کہ وہ ماں بن چکی ہوگی۔ اس کی گود میں ایک بچہ کھیل رہا ہوگا۔ بالکل ایسا ہی بچہ جیسی کہ وہ خود ہے۔ وہ ایک ہی جست میں بچپنے سے عورت پنے میں پہنچ جائے گی، جوان ہوئے بغیر۔ قادر حسین نے سوچا کہ سولہ لمبے لمبے سال انوری کے قریب سے ہوا کے جھونکوں کی طرح گزر گئے ہیں اور وہ بچپن کی عمر میں پیچھے رہ گئی ہے۔ قادر حسین نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ورنہ اس نے انوری کو بازوؤں کے گھیرے میں لینے کے لیے بازو اٹھا لیے تھے۔

انوری کہہ رہی تھی___ ''پھر پتہ ہے میں نے کیا کیا مولوی جی! اکبر کی بکری جوہڑ پر پانی پی رہی تھی۔ میں نے اور رجو نے بکری پکڑ کر اس کا منہ کھولا اور کڑوی گولی بکری کے منہ میں ڈال دی''۔

''انوری!''___ قادر حسین ملتجی لہجے میں بولا___ ''سچ کہتی ہو کہ میں بھی تمہیں اچھا لگتا ہوں؟''

''ہاں نا جی!''___ انوری نے باتوں کی روانی میں بلا سوچے سمجھے کہا۔

''انوری! میری ایک بات مان لوگی؟''

''ہاں نا جی!''

''میرے سامنے اکبر کا نام نہ لیا کرو''۔

''کیوں جی؟''___ انوری کے چہرے کا تاثر یک لخت بدل گیا۔

قادر حسین گھبرا گیا۔ کردار کی کمزوریاں آندھی بن کر اس کی ہستی میں پھیل گئیں۔ اس نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا___ ''میرا مطلب ہے کہ...... دیکھو نا انوری! منگیتر کا نام لینا اچھا نہیں ہوتا''۔

''اچھا اب اس کا نام نہیں لوں گی......'' انوری پھر اسی کیفیت میں آ گئی اور ذرا سوچ کر بولی___ ''مولوی جی! آپ اس کے لیے دعا تو کرتے ہیں نا کہ وہ کبڈی جیت

جائے؟''

''ہاں انوری!''___ قادر حسین کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد انوری جا چکی تھی۔

وظیفے کی پہلی رات قادر حسین کی یادوں نے اس کے ذہن میں جو طوفان بپا کیے تھے وہ ایک تلخ ترین تاثر بن کر اس کی شخصیت پر نقش ہو گئے تھے پھر یہ نقش ابھر کر پتھر بنا اور قادر حسین جب بھی چلا اس سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گرا۔

آٹھ دن اور گزر گئے۔ ورزش، مالش، دودھ اور انوری نے اس کے جسم میں بھوتوں کی سی قوت پیدا کر دی لیکن وہ اپنے خلاف جب بھی لڑا چاروں شانے چت گرا۔ اپنے سینے پر بیٹھے ہوئے پیش امام کو وہ کبھی بھی پچھاڑ نہ سکا۔ وہ کتنی کتنی دیر رویا بھی۔ خدا کے حضور گڑگڑایا بھی اور آج رات وہ پھر وظیفہ شروع کرنے سے پہلے خدا کے سامنے دست بہ دعا ہو گیا۔

''یا خدا تیرے بندوں سے محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ میں نے انوری کو بری نگاہ سے تو نہیں دیکھا۔ میں اسے شرعی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ نہیں خدا! اگر اس میں تیری رضا نہیں تو میرا کوئی زور نہیں۔ اسے اکبر کے لیے ہی رہنے دے اور اے ذوالجلال! تجھے خدائی کا واسطہ ہے! مجھے میرا سکون بخش دے۔ اس گاؤں میں آنے سے پہلے تو میں اچھا بھلا تھا''۔

دو روز گزر گئے۔ گاؤں میں ایک آدمی مر گیا تھا جسے قادر حسین نے غسل دیا تھا۔ یہ پہلی میت تھی جو اس نے نہلائی۔ اس کے دل پر ہیبت سی طاری تھی جو آج رات تک بدستور قائم تھی۔ آج رات جب قادر حسین وظیفے پر بیٹھا تو یہ میت بار بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ اس نے ہر بار وظیفے کے ورد کو بلند آواز میں پڑھا اور سر کو جھٹک کر اس بھیانک تصور سے گلوخلاصی کرائی لیکن مکھی کی طرح یہ میت پھر وہیں موجود تھی۔ کرتے کرتے اس لاش نے مرے ہوئے اکبر کی شکل اختیار کر لی۔ قادر حسین نے اب کے سر کو جھٹکا نہ دیا۔ خوف اور ہیبت کی جگہ تسکین کا تاثر پیدا ہونے لگا...... وہ تصوروں میں اکبر کی میت کو نہلا رہا تھا...... زبان ''یا قہار' یا جبار! یا علی مشکل کشا! یا حسن یا بوتراب!'' کے ورد کو حجرے کی فضا میں فوارے کی طرح بکھیرتی جا رہی تھی اور سامنے اکبر کی میت نہا رہی تھی۔

قادر حسین نے وظیفہ ختم ہونے تک سر کو جھٹکا نہ دیا۔ جونہی وظیفہ ختم ہوا، وہ تڑپ

اٹھا۔ وظیفے کی تال کیا ٹوٹی کہ تصور ہی لڑکھڑا گیا، جیسے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والے بچے کے ہاتھ سے باپ کی انگلی چھوٹ گئی ہو۔ قادر حسین کے ذہن میں بے ہنگم شور اور اس شور میں لپٹی ہوئی ایک آواز بلند ہونے لگی...... ''آ کوڈی، کوڈی، کوڈ، کٹڈ کٹڈ کٹڈ......'' وہ گھبرا اٹھا اور سر اور کندھے جھکا کر یوں حجرے سے نکل کر مسجد کے صحن میں آ گیا جیسے حریف نے دبوچ کر اس کا دم نکال دیا ہو۔ اس کا ضمیر ایک جانے پہچانے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ احساسِ جرم اور غصہ اسے دیوانہ بنانے لگا۔

دوسرے دن قادر حسین کھیتوں کی طرف سیر کو جا رہا تھا کہ گاؤں سے باہر اسے اکبر مل گیا۔ اس نے اکبر کو روک لیا اور عجیب متانت اور سنجیدگی سے بازو آگے کر کے کہا___

''میری کلائی دونوں ہاتھوں میں پکڑو''۔

اکبر نے پیش امام کے حکم کی تعمیل کی۔

''اور مضبوطی سے......''___ قادر حسین نے کسی حد تک دانت پیس کر کہا___ ''میں بازو چھڑاؤں گا۔ دیکھتا ہوں تم میں کتنی طاقت ہے''۔

''اوہ مولوی جی!''___ اکبر نے کلائی چھوڑ دی اور فدویانہ ہنسی ہنس کر بولا___ ''آپ مجھے بنی پکڑا رہے ہیں؟''

''ہاں تو اور کیا! لو پکڑو......''___ قادر حسین نے آستین اوپر کرتے ہوئے باقاعدہ چیلنج کر دیا اور کہا___ ''کشتی کر لو، کبڈی کھیل لو''۔

''یا پیر استاد!''___ اکبر نے بدستور ہنستے ہوئے کہا___ ''آپ اشارہ کریں، ہم گناہگار آپ کے قدموں میں لیٹ جائیں گے۔ مولوی صاحب جی! ہماری طاقت تو آپ کی دعا و برکت سے ہے۔ میری منگیتر نے میری جیت کے لیے آپ ہی سے تو کتاب نکلوائی ہے...... وہ دیکھیے بکری چر رہی ہے۔ وہ میں آپ کے لیے پال رہا ہوں۔ جس دن پار والوں سے پڑ جیت جاؤں گا اس دن یہ بکری اور چھبی کی ململ کا صافہ آپ کے قدموں میں حاضر کر دوں گا''۔

اکبر باتیں کر رہا تھا اور قادر حسین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ چاروں شانے چت گر پڑا ہے اور اکبر اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کی کھال نہایت آہستہ آہستہ اتار رہا ہے۔ کھال کے اندر سے اس کا ضمیر ننگا ہو رہا ہے جسے صرف اکبر ہی نہیں سارا گاؤں دیکھ رہا ہے

اور گاؤں والے بہ آوازِ بلند کہہ رہے ہیں ـــــ ''وہ دیکھو پیش امام نے کھال کے اندر کیا کچھ چھپا رکھا ہے!''

قادر حسین کو اسی قدر ہوش تھا کہ اس نے اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور لرزتے ہوئے لہجے میں کہا ـــــ ''اللہ تجھے فتح دے''۔

دو روز بعد وہ نمبردار کے گھر کے سامنے بیٹھا نمبردار کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ اکبر سامنے سے گزر گیا۔ قادر حسین اکبر کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا اور اسی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''چوہدری جی! جی چاہتا ہے کہ میں بھی کبڈی کھیلا کروں''۔

نمبردار کھل کر ہنسا جیسے مولوی صاحب نے انتہائی دلچسپ لطیفہ سنایا ہو۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں چوہدری جی!'' ـــــ قادر حسین کو غصہ آ گیا۔

''مولوی صاحب جی!'' ـــــ نمبردار نے پیش امام کے مزاج کو بھانپتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ـــــ ''آپ کے جسم کو دیکھ کر میرا بھی جی چاہتا ہے کہ آپ کبڈی کھیلیں، کشتی لڑیں، مگدر اٹھائیں اور اکبر کا دایاں بازو بن کر گاؤں کی لاج گاؤں میں رکھیں۔ سارا گاؤں اکبر کے نام کے گیت گاتا ہے۔ وہ گبھرو شیر ہے۔ آپ اس سے کم تو نہیں ہیں۔ آپ ہیں ہی ہنسنے کھیلنے کی عمر میں۔ انیس بیس برس کی عمر تو ہوتی ہے کہ آدمی وٹ پر کھڑا ہو کر شریکوں کی طرفینوں کو للکارتا ہے۔ آپ کی یہ داڑھی مبارک تو لڑکپن کی لوئیں ہیں اور آپ کے یہ پٹھے پھلاہی کی جڑوں کی طرح مضبوط ہیں لیکن مولوی صاحب جی! بے ادبی معاف! آپ پیش امام ہیں۔ عمر میں آپ میرے پوتے ہیں لیکن علم فضل میں آپ میرے باپ ہیں۔ کون ہے جو پیش امام سے کشتی لڑے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈھور ڈنگر بھی رک جاتے ہیں اور رستہ چھوڑ دیتے ہیں...... توبہ...... توبہ...... مولوی صاحب جی! یہ تو آپ قیامت کی نشانیوں کی بات کر رہے ہیں۔ دوسرے دیہات والے کیا کہیں گے کہ کافروں نے پیش امام کو ننگا کر کے اکھاڑے میں اتار دیا ہے۔ نہ مولوی جی! نہ...... آپ ہمارے پیشوا! اس جہان میں بھی اُس جہان میں بھی۔ ہمارے کھڑے فصل نہ جل جائیں''۔

اور نمبردار نے یوں کان کھڑے کر کے پکڑ لیے جیسے قادر حسین اکھاڑے میں اترا اور قیامت آئی اور قادر حسین کے احساسات کا یہ حال کہ جیسے اکبر نے اسے پہلے ہی داؤ میں

پچھاڑ دیا ہو۔ وہ مغموم سا ہو کر اٹھا اور یوں مسجد کی طرف چل پڑا جیسے وہ فی الواقع ''پڑ'' ہار آیا ہو اور تماشائیوں کی ہاؤ ہو اس کا تعاقب کر رہی ہو۔

گاؤں میں ہنگامہ بپا ہونے لگا۔ ہر کوئی مصروف تھا۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ سورج نکلتے ہی گاؤں کا گاؤں خالی ہو جاتا تھا۔ مسجد میں بھی بے رونقی رہنے لگی۔ نمازیوں کی تعداد گر گئی۔ دوپہر تک گاؤں میں بچوں اور ضعیف بوڑھوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ گاؤں کی تمام تر گہما گہمی، سرگرمیاں اور جتھے کھیتوں میں منتقل ہو گئے۔ فصل کٹ رہے تھے۔

فصل کٹ گئے اور دھوپ لگنے کے لیے جگہ جگہ ڈھیر کر دیئے گئے۔ سوائے قادر حسین کے کسی کو علم نہ ہوا کہ پندرہ دن گزر گئے ہیں۔ یہ پندرہ دن قادر حسین کو انوری نظر نہ آئی۔ سولھویں روز دوپہر کے وقت انوری آئی۔

''مولوی جی! پتہ نہیں اتنے دن آپ کو کسی نے سر سواد کی روٹی دی ہو گی یا نہیں۔ ہم تو گندم کاٹتے رہے۔ کل چاچا کا فصل کاٹ کر فارغ ہوئے ہیں۔ اتنے دن آپ کی صورت بھی نہ دیکھی۔ آپ کو کسی نے چھاچھ دی تھی؟...... دودھ بھی؟...... مکھن کسی نے دیا تھا؟...... میں تو سائے ڈھلتے کھیتوں سے لوٹتی تھی اور سچی مولوی جی! کئی دفعہ روٹی کھائے بغیر سو جاتی تھی۔ کیا کریں جی! مرغ کی اذان کے ساتھ اٹھنا پڑتا تھا۔ اللہ برکت دے، اب کے فصل بہت ہوئی ہے''۔

انوری ہلکے پھلکے بھولے بھالے سے لہجے میں اپنی رام کہانی سنا رہی تھی لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ پندرہ دن قادر حسین نے کس طرح گزارے ہیں۔ گاؤں والوں کی سرگرمیاں تو کھیتوں میں منتقل ہو کر پھیل گئی تھیں لیکن قادر حسین کی سرگرمیاں زہریلی الجھنیں بن کر اس کی ذات میں ہی سمٹی ہوئی اس کا انگ انگ کھوکھلا کر رہی تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ تنگ سے حجرے میں تڑپتا ہوا ایک انسان مذہب اور محبت کی خونریز جنگ میں ثالث بنا ہوا خود بھی زخمی ہوتا جا رہا تھا۔ کون جانتا تھا کہ قادر حسین نے ورزش، مالش اور دودھ سے کمائے ہوئے جسم کی زیادہ تر طاقت اپنے آپ کو پچھاڑنے میں صرف کر دی تھی۔ اس نے نیم شب کی آہیں اور صبح گاہی کی دعائیں اپنی دنیا میں لڑتے مرتے ہوئے دو انسانوں، دو متضاد خیالوں، کردار کے دو حصوں میں سمجھوتہ کرانے کے لیے وقف کر دی تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ جب گاؤں کا بچہ بچہ فصل کاٹنے میں مصروف تھا، قادر حسین جگر کے کٹے ہوئے ٹکڑوں

کو جوڑنے میں پسینہ پسینہ ہو رہا ہوتا تھا۔ اس نے خون کا قطرہ قطرہ لگا کر ان ٹکڑوں کو جوڑنے کی سعی کی تھی لیکن ٹکڑے بکھر بکھر جاتے رہے۔ ماضی کی محرومیاں اور شخصیت کی کمزور اور ٹوٹی ہوئی کڑیاں اس کی کشتی کو ڈبو چکی تھیں اور اب وہ خود ڈوب رہا تھا۔

کسے معلوم تھا کہ ایک سیدھی سادی دیہاتن اس کے لیے لاینحل پیچیدگی بن گئی ہے۔

کون جانتا تھا کہ چھوٹی سی انوری اس کے لیے کتنا بڑا سانحہ بن گئی تھی اور کسے خبر تھی کہ انوری کی بظاہر بے ضرر الہڑ جوانی قادر حسین کے لیے کس قدر عظیم آزار بن گئی تھی۔

''انوری! اس بھولے بھالے سے دل میں اکبر کی جگہ مجھے بٹھا''۔۔۔ انوری نے نگاہیں اوپر اٹھائیں جن میں استعجاب کا تاثر چمک اٹھا تھا۔ یہ تاثر قادر حسین کے لیے متوقع تھا۔ وہ سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے بولتا ہی جا رہا تھا۔ جھناں کا بند ٹوٹ گیا تھا۔۔۔

''تیری ان حیرت زدہ نشیلی آنکھوں کی قسم! میں نے تجھ پر زندگی کی راتیں نثار کی ہیں۔۔۔ مجھ سے دور نہ ہٹو! مجھے کہہ لینے دو پھر میرے منہ پر تھوک دینا۔ کہہ دینا تُو مولوی نہیں کافر ہے۔۔۔ نہیں انوری! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ہونے کو بہت کچھ ہو گیا ہے لیکن میری ننھی سی انوری! تم اس قدر مت گھبراؤ۔ میں نے تیرے نام کا چلہ کاٹا ہے۔ میں نے خدا کے تصور میں تیری مسکراہٹیں دیکھی ہیں۔ تیرے اس شرابی مکھڑے کی قسم! میں نے تیرے نام کے سجدے کیے ہیں۔ میں نے کسرت کر کر کے اکبر کے مقابلے میں کبڈی کھیلنے کے لیے جسم کمایا ہے لیکن مجھے کسی نے اکھاڑے میں اترنے نہیں دیا۔ گاؤں والے میری بے ادبی سے ڈرتے ہیں۔۔۔ مت گھبراؤ انوری! یوں سہم نہ جاؤ۔ مجھے آج بہت کچھ کہنا ہے۔ جو آگ تم نے میرے سینے میں لگائی ہے، ذرا دیکھو اس کی تپش کس قدر تیز ہے۔۔۔ میں نے گاؤں کی ماؤں بہنوں سے ماں کا پیار مانگا ہے۔ میں خیالوں میں ان کی گودوں کی طرف لپکا ہوں۔ پیار تلاش کرنے کو، کسی نے میرے دل کی پکار و فریاد کو نہیں سنا۔ انوری! لوگ میرے سامنے تعظیماً جھک جاتے ہیں۔ میرا احترام کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتے۔ میرے ساتھ ہنستے کھیلتے نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام کے احترام سے بہشت ملتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ امام کو کس دوزخ میں جلا رہے ہیں۔ وہ مجھے ملا سمجھتے ہیں۔ خدا کے لیے انوری! تم تو مجھے انسان سمجھو۔۔۔ میں نے دل سے تیرا نام نوچ لینے کے لیے بڑے بڑے جتن کیے ہیں لیکن تیرا خیال میری آرزوؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا ہے۔ ہزار بھلانے پر تجھے

اپنی ذات میں ہی گھومتے پھرتے پایا ہے۔ کہو انوری؟ کچھ تو کہو۔۔۔ اکبر کی جگہ قادر کو دے دو۔۔۔''

''مولوی جی!''۔۔۔ انوری نے حیرت زدہ سرگوشی کی۔۔۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے پہلے تو ایسے کبھی نہیں کہا تھا''۔۔۔ وہ سہمے ہوئے بچے کی طرح رک رک کر بول رہی تھی۔۔۔ ''اکبر کو میں نے دل میں نہیں بٹھایا۔ آپ بھی اسی طرح اچھے لگتے ہیں ناجی''۔

''تو میں تمہارے ماں باپ سے تمہیں مانگ لوں؟''

''رشتہ؟''

''ہاں انوری! رشتہ!''

''اوہ!۔۔۔ مولوی جی!۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔۔۔'' اس نے قادر حسین کے ہاتھ تھام کر سر جھکا لیا اور کہا۔۔۔ ''اب سمجھ گئی ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ بڑی مشکل بات ہے ناجی! ماں باپ نے زبان دی ہوئی ہے۔ میں تو بے زبان ہوں اور مولوی جی! اکبر بھی تو اچھا ہے نا!''۔۔۔ انوری کا لہجہ مغموم ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ ''سچی مولوی جی! وہ اتا اچھا ہے کہ آپ اسے دیکھیں تو کہیں انوری تیرا منگیتر تو بڑا ہی اچھا ہے۔۔۔''

''اوہ انوری!''۔۔۔ قادر حسین ٹپٹا اٹھا اور جھنجھلا کر بولا۔۔۔ ''خدا نے تمہیں یہ حسن دینا تھا تو اس قدر معصوم اور بھولا بھالا نہ بنایا ہوتا۔ تم تو بہت چھوٹی ہو۔ اکبر میں آخر ہے ہی کیا؟ اجڈ گنوار آدمی ہے اور ذرا مجھ پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ اکبر میں کیا کشش ہے۔ بے تکا سا آدمی ہے''۔

''لیکن وہ زندہ ہے ناجی! اس کے سوا میرا بیاہ کسی سے نہیں ہو سکتا۔۔۔'' انوری کا دماغ پہلی بار الجھن میں پڑا تھا۔ صورتِ حال سے نبٹنا اس کے بس کی بات نہیں تھی وہ بلا سوچے سمجھے کہہ رہی تھی۔۔۔ ''اگر ساونی سے پہلے مر جائے تو دوسری بات ہے''۔

''ہاں! اگر وہ مر جائے''۔۔۔ قادر حسین نے جیسے بے خیالی میں کہہ دیا ہو۔

''مولوی جی!''۔۔۔ انوری نے جیسے دلدوز چیخ ماری ہو۔

اس نے قادر حسین کی قمیض کے دامن کو ڈرے ہوئے بچے کی طرح مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے قادر حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں دیکھا جیسے ان بے چین آنکھوں میں پیش امام کو تلاش کر رہی ہو۔ قادر حسین کی آنکھیں جھک گئیں لیکن انوری کی آنکھیں

وہیں جمی رہیں۔ پھر ہونٹ لرزے اور انوری سسک سسک کر رونے لگ گئی۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور روتی رہی۔ قادر حسین اپنے آپ میں آنے لگا۔ انوری کو دم دلاسا دے کر بہلایا۔ انوری چپ ہوگئی۔ قادر حسین کا دل رونے لگ گیا۔

جب انوری جانے لگی تو قادر حسین نے پوچھا۔۔۔ ''انوری روٹھ گئی ہو؟''

''تو اور کیا جی!''

''وہ کیوں؟''

''تو آپ باتیں ایسی کرتے ہیں نا جی!''

''نہ بھئی! یوں نہیں''۔

''اچھا اب نہیں''۔

انوری مسکرا دی، بچپن لوٹ آیا۔ وہ اٹھ کے چلی تو رک گئی۔ اس نے پیاسی پیاسی اور ڈری ڈری نظروں سے جن میں التجا کی جھلک تھی، قادر حسین کو دیکھا۔ قادر حسین کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ شاید انوری کے جانے کو برداشت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

''مولوی جی!''۔۔۔ انوری نے ملتجی انداز میں کہا۔۔۔ ''آپ اکبر کو بددعا تو نہیں دیں گے نا؟''

قادر حسین نے اوپر دیکھا۔ آنسوؤں کی دھند میں اسے انوری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سر کو ہلایا اور زیر لب کہا۔۔۔ ''نہیں''۔

انوری کے نکلنے کی دیر تھی کہ قادر حسین پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔ غصے سے وہ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

''تُو اور اکبر کا مقابلہ کرتا ہے؟''۔۔۔ اسے کوئی کہہ رہا تھا۔۔۔ ''اکبر کہ جو تیرے قدموں میں سر رکھنے کو پھرتا ہے اور تُو اس کے حق پر قابض ہونا چاہتا ہے...... انوری اکبر کے لیے ہے...... تُو اپنے لیے ہے...... پیش امام...... پاپی...... پیشوا اس جہان میں بھی، اُس جہان میں بھی......''

قادر حسین لیٹ گیا اور سر کو زور سے فرش پر پٹخا لیکن ٹوٹے ہوئے کردار کے ٹکڑے چکی کے پتھروں کی طرح ایک دوسرے سے رگڑ کھاتے رہے۔ ایک ساکن، ایک گھومتا ہوا...... مہیب گڑگڑاہٹ۔ قادر حسین کا سکون، احساسات اور جذبات پتھروں کے

درمیان پس رہے تھے۔ چڑچڑاپن اس کا خون پی رہا تھا۔ جانے کب تک اس کی ہڈیاں چرچراتی رہتیں کہ کسی کی ''السلام علیکم'' نے اسے یوں تھام لیا جیسے تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

وہ اٹھ کے نہایا۔ ظہر کی اذان دی۔ آواز کی موسیقی میں دل کا غبار نکال دیا۔ پھر عصر کا وقت آیا۔ وقت گزر گیا۔ قادر حسین دُکھتے ہوئے سر اور جلتے ہوئے دل کو سہلانے کے لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی گندم کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ ان ڈھیروں کو یوں دیکھتا گزر رہا تھا۔ جیسے مقبروں کے دیس میں سے گزر رہا ہو۔ ہر مقبرے پر ایک مجاور بیٹھا ہوا جس کا نام اکبر ہو۔

قادر حسین اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اور اعصاب کو اپنی جگہ پر لانے کے لیے باہر نکلا تھا لیکن ذہنی حالت بگڑتی ہی گئی۔ جو خیال بھی آیا اکبر کے گرد گھومتا ہوا آیا اور اکبر پر ہی ختم ہوگیا۔ جہاں سے ایک اور تصور نے جنم لیا۔ ہر خیال، ہر تخیل اور ہر تصور تلخیوں سے اٹا پڑا تھا۔ کرتے کرتے یہ تلخیاں زہر بن کر اکبر میں سمٹ آئیں اور اکبر بچھو بن گیا جو قادر حسین کے دل و دماغ میں ڈنگ مارنے لگا۔ نفرت اور غصے سے قادر حسین اپنے آپ میں کڑھنے لگا۔ وہ لاشعوری طور پر شام کی نماز کے وقت کا حساب رکھ کر گاؤں کی طرف واپس آ رہا تھا کہ اسے اکبر مل گیا۔ قادر حسین نے اسی قدر حقارت سے وعلیکم السلام کہی جس قدر محبت اور احترام سے اکبر نے ''مولوی جی سامالیکم'' کہی تھی۔

''کدھر چلے اکبر؟''۔۔۔ قادر حسین نے بلامقصد پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر چلتا گیا۔

''میں تو رات کھلیان میں سوتا ہوں مولوی جی! دشمن سجن لگے ہوئے ہیں۔ زمانہ بڑا نازک ہے۔ اب کے فصل بڑے اچھے ہوئے ہیں''۔

اکبر ابھی بول ہی رہا تھا اور قادر حسین اس سے تین چار قدم دور پہنچ چکا تھا، اس کے سینے میں امید و بیم کی بجلی کوند گئی۔۔۔ ''میں رات کھلیان میں سوتا ہوں''۔۔۔ قادر حسین رک گیا۔ اس نے اکبر کو جو اب کھلیان کی طرف جا رہا تھا، غور سے دیکھا اور زیر لب مسکرا دیا۔ انوری کی لرزتی ہوئی آواز اس کے گرد منڈلانے لگی۔۔۔ ''وہ ابھی زندہ ہے۔ اکبر اگر ساونی کٹنے سے پہلے مر جائے تو دوسری بات ہے''۔

''شاید انوری بھی چاہتی ہے کہ اکبر مر جائے''۔۔۔ قادر حسین نے سوچا۔

قادر حسین نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ وہ بجلی کی سرعت سے ہلکا پھلکا ہو گیا۔ دل شگفتگی سے اچھل پڑا۔ جیسے عقل نے سارے مسئلے حل کر دیئے ہوں۔ وہ سینہ تان کر، تیز خرام، فاتح حکمران کی طرح گاؤں کو چل پڑا۔ اس شام قادر حسین کی اذان میں سوز تھا نہ موسیقیت، وقار تھا نہ جلال، رسمی سی اذان تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ مطمئن اور مسرور، وہ اذانوں کی دنیا اور امامت کے بکھیڑوں سے بہت دور نکل آیا تھا۔

رات چاندنی تھی۔ ماحول اس قدر نکھرا ہوا کہ بڑ کے پتوں کے ریشے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ نصف شب کا عمل تھا۔ گیدڑی کی بھیانک ہاؤ ہُو چاندنی کو مرتعش کر رہی تھی۔ کتے بھونک بھونک کر سو گئے تھے۔ مرمریں وسعت میں کہیں دور سے کوہوں، کوہوں کی آواز آ رہی تھی۔ چناب کی روانی کا جلترنگ صاف سنائی دے رہا تھا اور قادر حسین گندم کے دو ڈھیروں کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ ڈھیروں کی دوسری طرف اکبر چارپائی پر گہری نیند سو رہا تھا۔ قادر حسین نے دایاں ہاتھ آگے کر کے ہاتھ کو دیکھا۔ ہاتھ کی انگلیوں نے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دستے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور چار پانچ انچ لمبا فولاد کا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔ چاقو کھلا ہوا تھا۔ اس نے نوک کو انگلی سے محسوس کیا، پھر پیچھے، دائیں اور بائیں دیکھا۔

گندم کے ڈھیر کی دوسری طرف اسے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے چھپ کر آنکھ ذرا سی آگے کر کے دیکھا۔ کوئی آ رہا تھا۔ قادر حسین کو آنے والے کے قد بت اور چال وغیرہ سے شک ہوا، پھر یقین کہ انوری اکبر کی چارپائی کی طرف آ رہی تھی۔ انوری نے چارپائی کے قریب پہنچ کر ادھر اُدھر دیکھا اور چارپائی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر زمین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اکبر گہری نیند سو رہا تھا۔ قادر حسین دیکھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیا مبادا دل کی آواز انوری سن لے۔ انوری چند لمحے اکبر کو دیکھتی رہی۔ اکبر کی چادر ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ انوری نے اٹھ کر نہایت آہستگی سے چادر اکبر پر ڈال دی اور دبے پاؤں سرہانے کی طرف آ کر اکبر پر جھکی۔ اس نے اکبر کی پیشانی پر ہلکا سا بوسہ دیا اور اس کی طرف پیٹھ کئے بغیر الٹے پاؤں ڈھیروں کی طرف چلنے لگی۔ قادر حسین کا پسینہ چھوٹ گیا۔ خوف سے وہ کانپ اٹھا۔ انوری ڈھیر کے اس طرف اور قادر حسین اس طرف۔ انوری رک گئی۔ اس نے دوپٹے کا دامن دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور بلند سرگوشی

کی۔

''یا خدا! یا پیر استاد! یا پنج تن پاک! گیارھویں والے زندہ پیر، پیروں کے پیر! یا امام حسنؓ! یا علیؓ مشکل کشا! میری جان صدقے، میری سانس قربان، اکبر کو شر شرار، بھوت چڑیل ہر بلا سے بچانا یہ اکیلا ہے۔ اس کی رکھوالی کرنا، یا غوثِ اعظیم پیران پیر، یا دستگیر! جمپر شریف والے! مجھ کنواری جوگن کا سوال ہے۔ میرے گبھرو شیر پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ دشمن زیر سجنوں کی خیر۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! صدقے تیرے سوہنے نام پر!''

''آمین!'' ___ قادر حسین چونک اٹھا۔ آواز انوری کی نہیں تھی، قادر حسین کے ہونٹوں سے پھسلی تھی۔ اس نے اپنی آواز پہچان لی۔ جانے کون انوری کی دعا سن کر قادر حسین کے سینے سے ''آمین'' کہہ اٹھا تھا۔

قادر حسین نے دیکھا۔ انوری جا رہی تھی۔ اس نے دوسری طرف سے دیکھا۔ وہ جوہڑ کی ڈھلان کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے لمحے وہ اکبر پر جھکا ہوا تھا۔ دایاں ہاتھ ہوا میں بلند ہو چکا تھا۔ چاقو کا پھل چاندنی میں چمک رہا تھا۔ دل پر چاقو کا ایک ہی وار کافی تھا۔ دائیں ہاتھ کو حرکت ہوئی تھی کہ قادر حسین کے سر کے اوپر سے کرخت آواز آئی ___ ''آٹٹ ٹٹ ٹیوں۔ ٹیں ٹی۔ ٹٹ ٹیوں۔ ٹیوں اوں ٹیوں اوں'' ___ قادر حسین کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا۔ خوف سے اس کا دایاں بازو ہوا میں معلق رہا جیسے کسی کنواری جوگن نے یا علی مشکل کشا اور یا غوث پاک کا نام لے کر اس کی کلائی پکڑ لی ہو۔ قادر حسین کو پھر اکبر نظر نہ آسکا نہ اسے گندم کے ڈھیر نظر آئے۔ اسے صرف حجرے کا دروازہ نظر آیا۔ پھر اپنے آپ کو حجرے کے وسط میں کھڑے ہوئے پایا۔ سانسیں پھولی ہوئیں، دل پسلیاں توڑ کر باہر آنا چاہتا تھا۔ جیسے اکبر کا جلوس اس کے تعاقب میں آ رہا ہو۔ خوف و ہراس محسوس پیکر کی طرح اس کے گرد بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ یکبارگی دو تین کتے بھونک اٹھے۔ قادر حسین کو یوں لگا جیسے کتے بھی اس کی شکست پر طنز کر رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا، چاقو ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ ریت کے بت کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے دن انوری حسبِ معمولی اسے چھاچھ اور گھی میں تر بتر تندور کی روٹی دینے آئی۔ قادر حسین نے اسے دیکھا تو سن ہو گیا۔ چہرے پر ندامت اور ڈر کے تاثرات جھلک

رہے تھے۔اس کا رنگ روپ میں بدل گیا۔ جیسے اس کے سامنے انوری نہ ہو پولیس کا سپاہی ہو۔ایک ہاتھ میں ہتھکڑی اور دوسرے میں گرفتاری کا وارنٹ لیکن انوری کی جاں فزا اور بے لوث مسکراہٹ نے اسے کھویا ہوا حوصلہ لوٹا دیا۔

''مولوی جی! آج ذرا دیر ہوگئی ہے۔آپ کو بھوک تو بہت لگی ہوگی''۔

قادر حسین بصد مشکل صرف ہنس سکا۔پھیکی سی ہنسی۔

''مولوی جی!''___ انوری نے قادر حسین کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنے مخصوص بچپنے کے لہجے میں کہا___ ''آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔ اکبر نے دی ہے ابھی ابھی۔ کہتا تھا یہ میری نشانی ہے...... بڑا شیطان ہے۔دیکھئے نشانی کیا دی ہے یہ چاقو......''___ انوری نے قمیض کی پہلو والی جیب سے چاقو نکال کر قادر حسین کو دکھایا۔قادر حسین کا جسم یوں لرز کر سن ہو گیا جیسے چاقو اس کے دل میں پیوست ہو گیا ہو___ ''کھول کر دیکھئے مولوی جی! بڑا خوبصورت چاقو ہے......''___ قادر حسین نے ڈرتے ڈرتے چاقو کو ہاتھ میں لیا۔ وہ انوری کے سامنے دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔انگلیاں اسے چھونے سے ڈر رہی تھیں۔ رعشہ بھی ایسا کہ جو دیکھا جا سکتا تھا۔ انوری کہہ رہی تھی___ ''پتہ ہے مولوی جی! اکبر کو یہ چاقو کہاں سے ملا؟''___ قادر حسین نے سوالیہ اور بے بس نگاہوں سے انوری کی طرف دیکھا___ ''اکبر رات کو کھلیان میں سویا کرتا ہے۔آج صبح اٹھا تو یہ چاقو کھلا ہوا اس کی چارپائی سے تین چار قدم دور پڑا ہوا تھا''___ انوری نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا___ ''میں نے سنا تو سچی مولوی جی! میں تو ڈر گئی۔ میں نے سوچا کہ کوئی دشمن کلموا اکبر کو مارنے کے لیے آیا ہوگا۔ اکبر تو بڑا زور دار ہے نا جی! اس سے سبھی ڈرتے ہیں۔ جو اس کے دشمن ہیں وہ اس کے سامنے تھوڑا ہی آ کر لڑتے ہیں بس رات کو چاقو یا چھری لے کر پھرتے رہتے ہیں اور مولوی جی! اکبر کو دیکھتے ہی تو ان کا پیشاب نکل جاتا ہے۔ اللہ جانے مولوی جی! یہ چاقو کس کا ہے۔ پر ہے بڑا خوبصورت۔ دیکھئے سفید ہڈی کا دستہ اور پھل دیکھئے جیسے چاندی کا ہے۔ ہے نا مولوی جی! اکبر کہتا تھا یہ اپنے پاس رکھنا...... اور مولوی جی! آج اکبر کہتا تھا کہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ بات نہ کیا کرو اور نہ ہی کسی مرد کو دیکھ کر ہنسا کرو۔ میں نے کہا مولوی جی کے ساتھ بھی بات نہ کیا کروں؟ تو وہ چپ ہو کر پتہ نہیں کیا سوچنے لگ گیا۔ میں نے کہا کہ مولوی جی! تو ہمارے مولوی صاحب ہیں وہ مرد

تھوڑے ہی ہیں تو اکبر اتا ہنسا کہ بس کھاہ کھاہ کر کے ہنستا ہی رہا۔ بڑا شیطان ہے......''

قادر حسین کے سامنے معصوم اور نوخیز لڑکی بیٹھی بچوں کی سی باتیں کر رہی تھی لیکن اس کے دماغ میں بظاہر بے ضرر باتوں کی ترجمانی کوئی یوں کر رہا تھا___ ''اکبر کے مقابلے میں تم کیا ہو قادر حسین! وہ بڑا زوردار آدمی ہے تم اس کے دشمن بنے پھرتے ہو؟ اسے دیکھا اور پیشاب نکل گیا؟ تم مولوی صاحب ہو مرد تو نہیں ہو......''

''مولوی جی! یہ چاقو آپ رکھ لیں، دیکھئے میں کہاں چھپائے پھروں گی۔ ماں نے دیکھ لیا تو چھین لے گی اور پوچھے گی کہاں سے لائی ہو۔ میں کیسے بتاؤں گی کہ اکبر نے دیا ہے۔شرم لگتی ہے نا جی! آپ کی بات دوسری ہے مولوی جی! آپ اندر کی باتیں جانتے ہیں۔آپ چاقو یہیں رکھ لیں۔کبھی کبھی آ کر دیکھ لیا کروں گی''۔

قادر حسین نے بغیر بات کئے چاقو اٹھا کر سرہانے کے نیچے رکھ لیا اور سرہانے پر کہنی رکھ کر نیم دراز ہو گیا۔مبادا یہ چاقو خود ہی باہر آ کر دل میں اتر جائے۔انوری باتیں کر کے چلی گئی۔ قادر حسین پر بے رحم سا سکوت طاری رہا۔ زبان گنگ، جسم بے حس لیکن اس کی ڈھکی چھپی دنیا میں آگ لگی ہوئی تھی۔آندھی کے تیز و تند جھونکے آگ کے شعلوں کو دور دور تک پھیلا رہے تھے۔ وہ دن گزرا رات بھی گزر گئی۔ قادر حسین چپ چاپ اور گم صم رہا۔ سوائے اذان اور نماز کے کوئی بات نہ کی۔ظہر کی نماز کے بعد چند ایک لڑکیاں اس کے پاس قرآن پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ چھوٹی بھی، بڑی بھی، نوجوان بھی۔ قادر حسین ان کے وجود میں کھوئی کھوئی نظروں سے نہ جانے کیا تلاش کرتا رہتا تھا۔ وہ دو چار روز تو چپ رہا اور سینے میں جلتی ہوئی آگ کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن تپش نے آنسو بھی خشک کر ڈالے۔ اس پر غصہ اور چڑچڑا پن سوار رہنے لگا۔ پہلے وہ نمازیوں کو ہر طرح کے مسئلے سنایا کرتا تھا اور اب قیامت کی علامت اور روزِ محشر کے بیان کے بغیر کوئی بات ہی نہ کرتا تھا۔ وہ بھی دانت پیس کر۔

''لوگو! خدا کے حضور میں سجدے کرو، توبہ کرو۔ قیامت کی پہلی نشانی یہ ہوگی کہ تمہارے اس بڑ کے درخت کے پتے کہ جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں تمہاری بہو بیٹیاں چرخے رکھ کر گیت گاتی ہیں۔انگاروں کی طرح جلیں گے۔ جوہڑ کا پانی ابلنے لگے گا۔کبڈی کھیلنے والے گبھرو خشک لکڑیوں کی طرح جلیں گے۔کھلیانوں سے شعلے نکلیں گے۔ چناب آگ

اگلے گا۔ سورج سوا نیزے پر آجائے گا......''

اور اس نے شعوری اور لاشعوری طور پر ہر اس چیز کو کہ جس کے ساتھ انوری اور اکبر کا تعلق تھا، قیامت کی آگ میں جھونک دیا۔ اس کی ہستی تندور کی طرح جل رہی تھی اور وہ گاؤں کی ہر چیز اور ہر انسان کو اس میں ایندھن بنا کر جھونکتا جا رہا تھا۔

پھر دن گزرتے گئے۔

گندم کے دانے لوگوں کے گھروں میں آگئے۔ قادر حسین کو گاؤں والوں نے تین جوڑے کپڑے، ایک مشہدی لنگی، دو صافے، دو نئے جوڑے جوتیوں کے اور ایک زری کا کلاہ دیا۔ ہر شام اس کی کسی نہ کسی گھر میں دعوت ہوتی تھی ___ ''یا پیش امام! پیرا استاد! یہ سب آپ کی دعا و برکت ہے ورنہ ایسی فصل ہم نے ساری عمر نہیں دیکھی تھی'' ___ ہر گھر میں اسے یہ فقرہ سننا پڑتا تھا لیکن قادر حسین کے لیے یہ الفاظ اب بے معنی تھے۔ خالی خالی الفاظ، بے جان۔ وہ ہر پھر کے بات کو قیامت کی نشانیوں پر لے آتا تھا۔ جہاں ترنجن کے گیت انگارے بن کر پتوں کو جلاتے تھے اور جوہڑ کا پانی کھولتا تھا۔

ساؤنی بیجی گئی۔

ساؤنی نے سر نکالا۔

ساؤنی کی ہریالی نے چناب سے لے کر حدِ نگاہ تک سبزے کی چادر بچھا دی۔

پھر بادل، بادل چھائے اور بادل برسے۔

پھر وہ شام آئی۔ گاؤں میں کبڈی کے ڈھولوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ قادر حسین عصر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر اکھاڑے کی طرف چلا گیا۔ پار والوں کی ٹیم سارے گاؤں سمیت پہنچ چکی تھی۔ اپنا گاؤں گھر بار چھوڑ کر اپنے کھلاڑیوں اور اکبر کو ''ہلا شیری'' اور ''تھاپڑے'' دے رہا تھا ___ ''پڑ'' جم گیا تھا۔ قادر حسین نمبردار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ اس مخلوق کی تعداد کا اندازہ کر ہی رہا تھا کہ اکبر لنگوٹ کسے بھاگتا ہوا آیا اور قادر حسین کے پاؤں چھوئے پھر گھٹنے چھوئے اور اس کے ہاتھ تھام کر چومے اور کہا ___ ''یا پیرا استاد! بسم اللہ پڑھ کر پیٹھ پر ہاتھ پھیر دو''۔

قادر حسین نے یوں ہی کیا لیکن غیر ارادی طور پر جیسے مریض نے ڈاکٹر کے کہنے پر زبان نکال دی ہو اور زبان خود ہی اندر چلی گئی ہو۔ اس نے اکبر کا یا علی مشکل کشا! مدد کا نعرہ

سنا اور اسے اکھاڑے میں کودتے ہوئے دیکھا۔ قادر حسین خاموش رہا۔ نفرت کا طوفان اس کے سینے میں اٹھ آیا۔ اس نے اکبر کے لیے بددعا نہ کی۔ دعا بھی نہ کی۔ اس نے کچھ نہ دیکھا۔ اس نے اکبر کو ہر بار حریف کی گرفت سے ربڑ کے گڈے کی طرح پھدک کر نکلتے ہوئے دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ بڑ کے درخت کی ڈال پر دس بارہ لڑکیاں بیٹھی ہوئیں چیخ چیخ کر اپنے گاؤں کے کھلاڑیوں کو حوصلہ دے رہی تھیں، جن میں انوری کی آواز سب سے اونچی تھی۔

قادر حسین کبڈی ختم ہونے سے پہلے ہی مسجد میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈھول یکبارگی گونج اٹھے۔ تماشائیوں کا وہ شور کہ جیسے چناب کی غراتی ہوئی لہریں گاؤں کے اوپر سے گزر رہی ہوں۔ وہ وضو کر رہا تھا کہ اکبر ننگ دھڑنگ مٹی میں لت پت، لنگوٹ زیب کمر، پسینے میں شرابور، بکری کی رسی پکڑے ہوئے مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے بکری کو چھوڑ کر قادر حسین کے پاؤں چھوئے اور جوشِ مسرت سے کہا ___ ''سب تیری برکت ہے میرے استاد! یہ بکری اور چھبی کا صافہ تیرے حضور لایا ہوں۔ پار والے مار کھا گئے ہیں''۔

قادر حسین کو کچھ ہوش نہ رہا کہ اکبر کب چھلانگتا ہوا چلا گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ بکری مٹی کے لوٹے کو سونگھ رہی تھی۔ پھر نمازیوں کا ریلا آگیا۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ ہر کوئی بول رہا تھا۔

''شیر ہے تو ایک اکبر ہے''۔

''گبھرو ہے''۔

''گاؤں کی لاج رکھ لی''۔

''کیا جان کمائی ہے پٹھے نے''

''ربڑ کا بنا ہوا ہے''۔

''اللہ آباد کرے منگیتر بھی وہ ملے ہے پٹھے کو کہ......''

''اللہ کا انعام ہے جی!''

''ہاں جی! خدا منہ دیکھ کر حلوہ دیتا ہے''۔

قادر حسین بغیر وقت دیکھے اذان پر کھڑا ہو گیا۔ نمازی خاموش ہو گئے۔ قادر حسین کا مقصد غالباً یہی تھا۔

دوسرے دن انوری آئی۔ اس کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی جو اس نے قادر حسین کے حضور پیش کی اور کہا ۔۔۔ ''مولوی جی! آپ کا منہ میٹھا کرانے آئی ہوں'' ۔۔۔ قادر حسین نے پوٹلی کھولی۔ اس میں پاؤ بھر گڑ کی ریوڑیاں تھیں۔

قادر حسین اب چند مہینے پہلے والا قادر حسین نہ رہا۔ گاؤں والوں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ پیش امام صاحب اب بات بات پر غصے میں آ جاتے ہیں۔ کھاتے بھی کم ہیں اور زیادہ دیر مراقبے میں رہتے ہیں۔

''اللہ کی دین ہے۔ دیکھئے نا اسی نوجوانی کی عمر میں ہی مولوی صاحب نے پیری حاصل کر لی''۔

''مولوی قادر حسین پہنچ والا فقیر بن گیا ہے''۔

''اللہ جنت نصیب کرے سائیں عمرو کو'' ۔۔۔ بوڑھے کمہار نے کہا ۔۔۔ ''عورتوں تک کو غصے میں آ کر ننگی گالیاں دیا کرتا تھا لیکن جو بات منہ سے نکالی پوری ہوئی''۔

''اجی سائیں عمرو نے تو برستی بارش روک دی تھی''۔

''مولوی قادر حسین کیا کم ہے جی؟''

قادر حسین کا غصہ بھی تصوف اور پیری کی علامت سمجھا گیا۔ اس کی قدر و منزلت اور خاطر داری پہلے سے زیادہ ہونے لگی لیکن قادر حسین کے سینے میں حقارت اور غصے کی چنگاریاں سلگتی رہتی تھیں۔ اس حقارت اور غصے کا مرکز اکبر تھا۔ اس کا دماغ اب کیچڑ میں پھنسی ہوئی موٹر کے پچھلے پہیئوں کی طرح ایک ہی جگہ گھومتا رہتا تھا ۔۔۔ ''ساوَنی کٹتے ہی اکبر اور انوری کا بیاہ ہو جائے گا'' ۔۔۔ اس نے اس بیاہ کو رکوانے کے لیے عقل کو ہر پہلو سے آزمایا۔ جب بات ڈھنگ پر آتی نہ دیکھی تو اپنے آپ کو اس خیال سے آزاد کرانے کو دن رات ہاتھ پاؤں مارے۔ اپنے آپ کو کوسا۔ برا بھلا کہا۔ اپنے آپ سے بھاگا بھی، لیکن پناہ لی تو اپنے آپ میں ہی لی۔ اس کی ہستی میں بیٹھا ہوا ایک انسان کسی سمجھوتے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

اب اس کا یہ حال ہو گیا کہ صبح سویرے کھیتوں میں نکل جاتا اور باجرے، جوار اور مکئی کے شبنم سے ڈھلے پودوں کو بڑی ہی دیر تک دیکھتا رہتا۔ اسے یوں لگتا جیسے یہ پودے کل چھ

انچ اونچے تھے، آج ایک فٹ ہو گئے ہیں، شام کو ڈیڑھ فٹ ہو جائیں گے اور چند ہی دنوں تک کٹنے کے لیے تیار ہو جائیں گے ۔۔۔ ''پھر ساوَنی کٹ جائے گی اور ساوَنی کٹتے ہی......''

ایک روز انوری اس کے پاس آئی۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا ۔۔۔ ''مولوی جی! باڑی اتی جلدی پک گئی تھی اور ساوَنی دیکھی ہے آپ نے؟ پودے اٹھتے ہی نہیں۔ اتنے زور کا بادل برسا پھر بھی ساوَنی ذرا سی ہے'' ۔۔۔ قادر حسین نے آہ بھری اور جانے خون کے کتنے قطرے پی کر چپ رہا۔

اس کی ذہنی حالت دگرگوں ہوتی گئی۔ ایک صبح اس نے یوں کیا کہ باجرے کے ایک پودے کو بالشت سے ناپا اور اسی شام تیزی سے اس پودے کے پاس گیا اور بیٹھ کر پھر بالشت سے ناپنے لگ گیا۔

ایک شام جبکہ ساوَنی کے پودے ابھی دو دو فٹ تھے کہ قادر حسین بڑ سے ذرا دور اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ دور دور تک کسانوں کی محنت کی ہریالی عجیب شانِ بے نیازی اور بے پروائی سے جھوم رہی تھی۔ قادر حسین کی حسرت بھری نگاہیں سبزے کی لہروں پر تیر رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے دھندسی چھا گئی۔ قادر حسین نے آنکھیں بند کر کے کھولیں، دھند چھٹ گئی پھر چھا جانے کو۔ دو آنسو بہہ گئے۔ دو اور چلے آ رہے تھے۔ اس کے سینے سے دل کو ہلا دینے والی آہ نکلی اور قادر حسین نے اپنی سرگوشی بھی سنی۔

''خدا کرے یہ ساوَنی اس سے اوپر نہ اٹھ سکے''۔

وہ ہارے ہوئے ملاح کی طرح بیٹھ گیا۔ سر ہاتھوں پر اور کہنیاں گھٹنوں پر رکھ لیں۔ دور اوپر کی رف ساون کی سیاہ گھٹائیں دامن میں سینکڑوں طوفان اور بجلیاں لیے آہستہ آہستہ بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ اس سے کہیں زیادہ گہری سیاہ گھٹائیں قادر حسین کے سینے میں اٹھی ہوئی تھیں۔ بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اسے ایک بار پھر مرحوم استاد یاد آیا اور مرحوم کا بتایا ہوا وظیفہ بھی یاد آیا جس کا ایک چلہ وہ کر چکا تھا۔ وقت کڑی مشکل کا تھا۔ وظیفے کے خیال ہی نے اس کی ڈھارس بندھائی اور وہ کسی حد تک مطمئن سا ہو کر مسجد میں آ بیٹھا۔ شام کی نماز ختم کی پھر عشا کا وقت آیا اور گزر گیا اور قادر حسین تسبیح لے کر بیٹھ گیا۔

''یا قہار! یا جبار! یا علی، یا حسن یا بوتراب! یا قہار! یا جبار!''

آج کی رات وظیفے میں نیا ہی تاثر اور نیا ہی سوز تھا۔ مقدس الفاظ جل جل کر نکل رہے تھے اور ساؤنی کی بھیگی ہوئی رات میں بکھر بکھر کر بجھ رہے تھے۔ حجرے کی چھت پر دیئے کی لو یوں تھرک رہی تھی جیسے کوئی دیوانہ دیپک کے راگ پر آگ میں ناچ رہا ہو۔ رات گزر رہی تھی ہر سُو گھپ اندھیرا تھا۔ چاند ابھی دور گھٹاؤں کی اوٹ میں سو رہا تھا۔ نصف شب کا عمل ہوگا کہ گیدڑی کی بھیانک آواز بلند ہوئی پھر ٹیٹڑی اس طرح بولی جیسے پیاس سے مری جارہی ہو۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ قادر حسین کو پچھلے چلے کی رات یاد آئی اور وہ سہم گیا۔ آج پھر اس کی یکسوئی میں یہ آوازیں خلل ڈالنے لگیں۔ وہ وظیفے میں ڈوب جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مسجد کے پچھواڑے میں تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی کسی کو بلند آواز سے کہہ رہا تھا۔

''کرم دین! جلدی نکلو کشتیوں کے رسے ڈھیلے کر آئیں، اوپر بڑے زور کا پانی برس رہا ہے''___ قادر حسین یوں کانپ اٹھا جیسے کسی نے قیامت کی آمد کا اعلان کر دیا ہو۔

اس نے ''یا قہار! یا جبار!'' کے الفاظ کو اور بلند اور تیز کر دیا۔ گاؤں کی بڑی گلی میں اسے کسی نہ کسی سرگرمی کا شک ہو رہا تھا۔ قدموں کی آواز پھر سنائی دی اور چوکیداروں کے سے لہجے میں یہ اعلان ___ ''ہوشیار بھائیو! ہوشیار ہو کے۔ پانی کناروں تک پہنچ گیا ہے''۔

وظیفے کی تان ٹوٹنے لگی۔ گلی میں سرگرمی تیز ہوگئی تھی اور اونچی اونچی باتیں بھی سنائی دینے لگ گئی تھیں۔

''ہڑ چڑھ رہا ہے''...... ''اوپر بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے''...... ''مولا خیر کرے''...... ''سب کو جگا دو، اپنا آپ سنبھال لیں''...... ''ہڑ تیزی سے چڑھ رہا ہے......''

نصف شب کے تھوڑی دیر بعد تک سارا گاؤں جاگ چکا تھا۔ قادر حسین کی زبان وظیفے کے مؤکل دہرانے میں مصروف تھی اور کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ جاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں، بولنے کی آوازیں اور ان آوازوں میں خوفناک سا ضروری پن اور جلدی تھی۔

''مولوی صاحب! آپ بھی جاگ اٹھے ہیں؟''___ ایک گھبرائی ہوئی آواز حجرے کے دروازے پر گونجی۔ قادر حسین نے دیکھا۔ نمبردار کھڑا تھا، وہ کہہ رہا تھا___ ''جلدی

اٹھئے اور اذان دیجئے، ہڑ کا زور بڑھ رہا ہے''۔

''اذان!''___ قادر حسین نے حیرت سے پوچھا اور کہا___ ''ابھی تو رات آدھی گزری ہے''۔

''مولوی صاحب جی! مصیبت کے وقت کی اذان۔ ذرا باہر تو دیکھئے''۔

قادر حسین باہر نکلا۔ چناب کا عتاب غرا رہا تھا۔ وہ ہیبت ناک شاں شاں جیسے سات سمندر چناب میں آگرے ہوں۔ شب کی تیرگی، آندھی میں ایستادہ گھاس پھونس کی جھونپڑی کی طرح لرز رہی تھی۔ قادر حسین جب تین سیڑھیوں پر چڑھا تو اسے گاؤں کے دوسرے کونے سے اذان کی آواز سنائی دی۔ مسجد کے قریب ہی کوئی چھت پر کھڑا اذان دے رہا تھا۔ منظر پرہول طاری تھا۔ اذان کا تقدس بھی کانپ رہا تھا۔ اذان کی لہریں چناب کے شور میں بہی جارہی تھیں۔ قادر حسین نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ نمبردار جا چکا تھا۔ ایک خیال تیز جھونکے کی طرح قادر حسین کے ذہن میں آگھسا۔ اس نے ایک بار اپنے آپ سے کہا تھا___ ''سیلاب آتے ہیں، لوگ بہہ جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اکبر سیلاب میں ڈوب جائے، بھاگ ہی جائے اور انوری یہیں رہ جائے۔ اس میں میرا کیا قصور ہوگا؟ یہ نہ تو قتل ہے نہ اغوا''___ قادر حسین کو اس خیال نے ایسا سرور دیا جیسے مریض کا بخار اچانک اتر گیا ہو اور وہ پُرلطف سی غنودگی محسوس کر رہا ہو۔ وہ شاید مسکرایا بھی تھا اور دوسرے لمحے سیلاب کے خوف سے ہراساں فضا اور تیرہ و تار ماحول قادر حسین کی انتہائی سریلی آواز پر جھوم اٹھا۔ مقدس موسیقی شب کی تیرگی کو مخملیں پردوں کی طرح آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ ایک سوز تھا، ایک تپش تھی کہ اندھیرے چھٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اکبر بھینس کھول رہا تھا، جھکا ہوا وہ جہاں تھا وہیں رہا۔ اکو موچی ضروری سامان الگ کر رہا تھا کہ وہ صحن میں نکل آیا۔ اس نے قادر حسین کی اذان سنی تو اس کے آنسو نکل آئے اور دل سے فریاد نکلی___ ''اگر اب بھی جھناں کا زور نہ رکے تو یہ خدا کا قہر ہے۔ سات آسمانوں کا عذاب ہے''۔

لیکن جھناں کو آج رات کسی کا خیال نہ تھا۔ آسمان پر گھٹائیں چھا رہی تھیں اور رعد کی کڑک سیلاب کے شور میں اضافہ کر رہی تھی۔ قادر حسین نے اذان ختم کی اور خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہوگیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن زبان اور دل کا رشتہ نوٹ رہا تھا۔ وہ کوئی دعا نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ مسرور بھی تھا، خوفزدہ بھی تھا۔ خوش بھی تھا، بے چین بھی تھا۔ اس

کے آنسو جاری ہو گئے۔ رات سیلاب میں بہتی جا رہی تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں قیامت کا منظر بن رہا تھا۔ ڈھور ڈنگر بھی بھاگ رہے تھے اور قادر حسین اس بھیانک افراتفری سے بے نیاز سجدے پہ سجدہ کر رہا تھا۔

پھر وہ سو گیا تھا۔ سجدے میں ہی یا شاید وہ محسوس دنیا سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اس کا دل مسرت کے ملے جلے جذبات سے اچھل رہا تھا۔ ڈوب بھی رہا تھا۔ ایک کیفیت تھی کہ جسے قادر حسین محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ نہ سکتا تھا اور جب وہ اپنے آپ میں آیا تو صبح صادق کی لرزتی ہوئی دودھیا کرنیں مسجد میں پناہ گزیں تھیں۔ اذان تو اذان نماز کا وقت بھی گزر چکا تھا۔ آج کی صبح نہ کوئی نمازی آیا نہ کوئی مسجد کے پچھواڑے سے گزرا، نہ کوئی کھنکارا نہ کسی نے آکر ''مولوی جی! سامالیکم'' کہی۔ سیلاب کا شور آسمانوں کو پھاڑ رہا تھا۔ وہ سہمے ہوئے دل کو تھام کر اٹھا اور مسجد کے دروازے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ رات بھر بارش برستی رہی تھی۔ گلی میں ٹخنوں ٹخنوں تک پانی جمع تھا۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادل کے ٹکڑے اکٹھے ہو جانے کو بھاگ رہے تھے۔ گاؤں میں سوائے سیلاب کے شور کے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لوگ شاید رات کو ہی نکل بھاگے تھے۔ سیلاب کا پانی کھیتوں میں پھیل کر گاؤں میں پہنچ چکا تھا۔

قادر حسین کی حرکات میں نہ جلدی تھی نہ کوئی ضروری پن۔ وہ گلی میں بہتے ہوئے پانی اور کیچڑ میں شڑاپ شڑاپ کرتا آہستہ آہستہ چل پڑا۔ وہ سر جھکائے ہوئے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی سر کو دائیں اور بائیں گھما کر کسی بند دروازے کو دیکھ لیتا جس کے عقب میں زندگی کا نام تھا نہ نشان تھا۔ گلی میں گہرا گدلا پانی چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چلتا چلتا جوہڑ کے کنارے تک پہنچ گیا جہاں بڑ کا گھنا درخت گاؤں کی پاسبانی پر کھڑا تھا۔ وہ درخت کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے وحشت ناک چیخیں ٹکرائیں۔

''مولوی جی! مولوی قادر حسین جی!''___ اسے یہ نسوانی آوازیں سیلاب میں بہتی ہوئی کسی لاش کی روح کی آواز معلوم ہوئیں___ ''مولوی صاحب جی! میرے مولوی صاحب جی!''___ آوازیں تیزی سے اس کے قریب آ رہی تھیں۔

اسے نے گھوم کر دیکھا۔ انوری دوپٹہ گلے میں، بال پریشان، کپڑے کیچڑ میں لت پت، اس کی طرف پاگلوں کی طرح بھاگی آ رہی تھی۔ اس کی ٹھوکروں سے اڑتا ہوا پانی اس

کے اپنے سر پر پڑ رہا تھا۔ قادر حسین کا سینہ مسرت سے یکبارگی بھر گیا اور اس نے اپنے آپ کو گیس بھرے غبارے کی طرح اُڑتا ہوا محسوس کیا لیکن انوری نے اس کے سامنے گر کر اور اس کے گھٹنوں کو پکڑ کر اسے پرواز سے کھینچ کر زمین پر پٹخ دیا۔

''مولوی جی! خدا کے لیے جلدی سے چلیے''___ انوری اس کے سامنے گھٹنوں کے بل گری ہوئی اور اس کے گھٹنوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے رو رو کر کہہ رہی تھی___ ''اکبر پر چھت کا شہتیر گر گیا ہے۔ ساری چھت اوپر آ رہی ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ اسے چوٹ زیادہ نہیں آئی لیکن شہتیر نے اسے دبا لیا ہے۔ چھت شہتیر پر رکی ہوئی ہے۔ ابھی گر پڑے گی۔ خدا کے لیے مولوی جی!''

انوری کے گھٹنے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قادر حسین گم صم کھڑا سن رہا تھا۔ وہ خیالوں میں انوری کو کہہ رہا تھا___ ''انوری اٹھو بھاگ چلیں۔ سیلاب گاؤں میں داخل ہو چکا ہے۔ اکبر شہتیر کے نیچے آکر مر گیا ہے۔ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ وہ اب کبڈی کھیلنے کے لیے نہیں اٹھے گا۔ اب اس کا جسم محبت کے قابل نہیں رہا۔ آؤ انوری جلدی چلو۔ اکبر مر چکا ہے''۔

''خدا کے لیے سوچنے مت مولوی جی! ڈریئے مت! اکبر کسی سے نہیں ڈرتا۔ گاؤں میں ابھی تھوڑا تھوڑا پانی پہنچا ہے''___ انوری اسے خاموش دیکھ کر زار زار رو رہی تھی___ ''سارا گاؤں رات کو ہی نکل گیا تھا۔ میں اپنے جہیز کا صندوق اٹھا کر چھپ گئی تھی۔ اکبر کے لیے۔ وہ اپنے شادی کے کپڑوں کا ٹرنک نکالنے گیا تھا کہ...... مولوی جی! وہ بھی زور لگائے گا۔ میں نے بہت زور لگایا ہے لیکن شہتیر بہت وزنی ہے''___ قادر حسین سیلاب کے اوپر پھیلے ہوئے خلاؤں میں کھویا ہوا تھا کہ بجلی کا ایسا دھما کہ ہوا جیسے بیسیوں توپیں یکبارگی داغ دی گئی ہوں___ ''مولوی جی''___ انوری قادر حسین کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور چیخ مار کر بولی___ ''وہ چھت گری...... اللہ مولوی!''___ لیکن قادر حسین مر گیا تھا۔

انوری کی سخت تیکھی اور بلند تر آواز نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''پیش امام کے بچے!''___ انوری اٹھ کھڑی ہوئی اور چلا کر کہا___ ''میں نے تجھے ایک بار اپنا منہ چومنے دیا تھا۔ اگر اکبر کو پتہ چل جاتا تو......''___ بادل پھر گرجا اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ انوری چیخ مار کر گاؤں کی طرف بھاگ اٹھی۔

پانی تیزی سے چڑھ رہا تھا اور اب انوری کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔

''انوری!''___ قادر حسین نے بلند آواز میں کہا___ ''انوری ٹھہر جاؤ''___ وہ رک گئی___ ''تم یہاں ٹھہرو، بڑ کے نیچے۔ میں اکبر کو نکال کر لاتا ہوں''۔

''نہیں! میں بھی ساتھ چلوں گی''۔

''نہیں!'' ۔اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا___ ''میں شہتیر اٹھالوں گا۔ یہیں ٹھہرو اور ہمارا انتظار کرو''___ اور وہ گاؤں کی طرف تیز قدموں سے چل پڑا۔ دیکھا کہ انوری بھی سہمی ہوئی چال سے پیچھے چلی آ رہی تھی___ ''تم یہیں ٹھہرو، سنا نہیں تم نے؟..... ورنہ .....''___ قادر حسین نے مولویانہ رعب سے کہا اور چپ ہو گیا۔ انوری وہیں رکی رہی۔

بارش بہت تیز تھی۔ گھٹاؤں نے رات کا سا اندھیرا پھیلا دیا تھا۔ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ قدم جما کر چلنا مشکل تھا۔ قادر حسین چھلانگیں لگاتا ہوا اکبر کے دروازے میں جا داخل ہوا۔ صحن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ایلومونیم کی دیگچی اور دو گھڑے تیر رہے تھے۔ پانی سامنے والے کمرے کی دہلیز پھاند کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ قادر حسین کو گری ہوئی چھت نظر آئی اور وہ ایک ہی جست میں کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کی ایک ایک حرکت میں فیصلہ، عزم اور ارادہ تھا۔

اس نے دیکھا کہ شہتیر کا ایک سرا سامنے والی دیوار میں پھنسا ہوا تھا۔ دوسرا فرش پر اور گری ہوئی چھت درختوں کے ٹیڑھے ٹیڑھے ڈالوں اور شہتیر کے سہارے کمرے کے وسط تک پہنچی ہوئی تھی۔ اکبر فرش پر شہتیر کے نیچے والے سرے تلے اس طرح دبا ہوا تھا کہ اس کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ وہ پہلو کے بل پڑا تھا۔ اس کا بایاں بازو اوپر والے پہلو اور شہتیر کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ جھکی گری ہوئی چھت سے کیچڑ گر رہا تھا۔ صحن سے بھی اور اوپر سے بھی پانی بھرتا جا رہا تھا۔

قادر حسین نے اکبر کو دیکھا تو بجلی کی طرح اس کے سینے میں حقارت اور فتح کے جذبات اور احساسات بیدار ہو گئے۔ اس نے چند لمحے اکبر کو دیکھا اس کے سینے میں بجلی پھر کوندی اور دوسرے لمحے قادر حسین کا کندھا شہتیر کے نیچے تھا۔ اکبر نے آنکھوں کو گھما کر دیکھا اور چیخ اٹھا۔

''مولوی صاحب جی! آپ بھاگ جائیے۔ چھت گر رہی ہے۔ شہتیر بہت وزنی ہے''۔

''میں شہتیر ہلا لوں گا۔ تم ذرا سا زور لگاؤ...... چوٹ کتنی آئی ہے؟''

''چوٹ زیادہ نہیں آئی...... کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ چلے جائیے۔ آپ سے شہتیر نہیں اٹھے گا۔ میرے ساتھ مت مرو مولوی جی!''___ وہ دبی ہوئی آواز میں چیخ رہا تھا۔

قادر حسین شہتیر کو کندھا دے چکا تھا۔ اس نے جسم کی تمام قوتیں یکجا کیں اور پانی سے بھرا ہوا کمرہ ''یا علی مشکل کشا!'' کے نعرے سے گونج اٹھا۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ کمرے میں پانی زیادہ ہونے لگا۔ اکبر کا جسم پانی میں تقریباً ڈوب چکا تھا اور وہ سر کو اٹھا اٹھا کر پانی سے بچ رہا تھا۔

''مولوی صاحب، بھاگ جاؤ چھت آ رہی ہے''۔

قادر حسین کا جسم پسینے اور پانی میں نہا رہا تھا۔ اس نے ''یا علی مدد'' کا ایک اور نعرہ لگایا اور اس قدر زور لگایا جیسے وہ دو تین مہینے ورزش اور مالش یہ شہتیر اور چھت اٹھانے کے لیے کرتا رہا تھا۔ جیسے وہ گاؤں والوں کا دودھ اور مکھن اکبر کو شہتیر کے نیچے سے نکالنے کے لیے کھاتا پیتا رہا تھا۔ اس نے جیسے یہ جسم آج کے لیے ہی کمایا تھا۔

اکبر نے بوجھ میں کمی محسوس کی۔

''یا دستگیر!''___ ایک اور نعرہ لیکن بوجھ تلے دبا ہوا، گھٹا ہوا۔

ہیبت ناک کڑکڑ اور چڑچڑاہٹ بلند ہوئی۔ شہتیر ہل گیا تھا۔ چھت اٹھ گئی تھی۔ اکبر کا دایاں بازو آزاد ہو گیا۔ اس نے کروٹ بدل لی اور پیٹھ کے بل ہو گیا۔ دیکھا کہ شہتیر کا نیچے والا سرا فرش سے اٹھا ہوا تھا اور سارا وزن جھکے ہوئے قادر حسین کی پیٹھ پر تھا۔ بارش کا پانی پھٹی ہوئی چھت کے رستے قادر حسین پر بہہ رہا تھا۔ جسم کا سارا خون اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر جمع ہو گیا تھا۔ چہرہ سوج رہا تھا۔ اکبر پیٹھ کے بل سرک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے کوئی شدید چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ کبڈی کے داؤ کی طرح اچھلا اور دوسرے لمحے وہ قادر حسین کے ساتھ شہتیر کے نیچے تھا۔

''نکلو مولوی جی!''

''بھاگ جاؤ اکبر! چھت آ رہی ہے۔ انوری بڑ کے نیچے کھڑی ہے۔ جلدی جاؤ پانی گاؤں میں داخل ہو گیا ہے''۔

''نکلو نیچے سے!''___ اکبر نے دانت پیس کر کہا۔ وہ زور لگا رہا تھا۔

دو چار لمحوں بعد چھت گڑگڑ کرتی فرش پر آ گری تھی۔ دوسری دیوار پھٹ گئی تھی اور شہتیر کا اوپر والا سرا پرے نکل گیا تھا۔ اکبر اور قادر حسین ایک دوسرے کے اوپر دروازے سے باہر پانی میں جا گرے۔ صحن میں پانی گھٹنوں تک چڑھ گیا۔ دیگچی اور گھڑے ڈوب گئے تھے۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ سیلاب کا زور بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

''بھاگو مولوی جی! انوری کہاں ہے؟''

دونوں گھٹنوں سے اوپر اوپر پانی میں بھاگتے ہوئے بڑ کے نیچے بے چینی سے ٹہلتی ہوئی انوری کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وہ جگہ بلندی پر تھی وہاں ابھی ٹخنوں تک پانی آیا تھا۔

''چلیے جلدی''۔۔۔ اکبر نے کہا۔

''نہیں، تم جاؤ۔ تم دونوں''۔۔۔ قادر حسین نے مسکرا کر کہا۔

''مولوی جی! وہ دیکھیے۔۔۔۔''۔۔۔ انوری نے گھبرا کر کہا۔۔۔ ''بڑی لہر۔ بھاگو''۔

''تم چلو میں آتا ہوں''۔۔۔ قادر حسین نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہاں سیلاب تھا نہ طوفانِ باد و باراں۔ جیسے حالات روزمرہ کے تھے اور وہ تینوں میلہ دیکھنے چلے تھے۔ وہ عام سے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔۔۔ ''مسجد میں میری تسبیح رہ گئی ہے۔ تم اونچی جگہ پہنچ جاؤ۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ پانی زیادہ نہیں چڑھا سڑک تک خیریت سے پہنچ جاؤ گے۔۔۔۔ میں اکیلا آجاؤں گا''۔

''رہنے دو تسبیح کو مولوی جی!''۔۔۔ انوری نے التجا کی۔

''میں نے جس تسبیح پر دو چلے کاٹے ہیں۔ اسے گندے پانی میں بہنے نہ دوں گا انوری!''

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ تسبیح اس کی پہلو والی جیب میں تھی۔

گاؤں میں اب گھٹنوں سے اوپر پانی چڑھ گیا تھا۔ ساونی کی فصل گہرے مٹیالے پانی میں ڈوب چکی تھی۔ قادر حسین کے سامنے اکبر اور انوری کھڑے تھے۔ اس نے دونوں کو یوں دیکھا جیسے دونوں اس کے بچے تھے۔ ایک بیٹا، ایک بہو۔ وہ دونوں کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ آہستہ سے انوری کے دوپٹے کا کونہ ہاتھ میں لیا اور کونے کو بوسہ دے کر عجیب انوکھے سے لہجے میں بولا۔

''میں منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ تم ابھی راہ گزر میں ہو، جیو انوری! جیو اکبر!''۔۔۔ اس پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے دوپٹے کے کونے کو ایک اور بوسہ دے کر کونے پر گانٹھ دی اور کہا۔

''انوری! آنچل سے ایک پردیسی کا پیار باندھ لو۔ کبھی یاد آؤں گا''۔

دونوں نے قادر حسین کا لب و لہجہ اور یہ حرکت دیکھی تو سن ہو کر رہ گئے۔

بارش برس رہی تھی۔ سیلاب چڑھ رہا تھا۔ ایک مکان گرنے کا دھماکہ سنائی دیا۔

''جاؤ''۔۔۔ اس نے اٹھ کر دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔ ''خدا کے لیے چلے جاؤ۔۔۔۔ اکبر!''۔۔۔ اس نے اکبر کی آنکھوں میں پیار بھری نظریں ڈال دیں اور بولا۔۔۔ ''مجھے بخش دینا''۔

اکبر نے گھوم کر گاؤں کی طرف دیکھا اور چیخ اٹھا۔۔۔ ''وہ دیکھو! بھاگو!''

گاؤں سے کچھ دور سیلابی لہریں پہاڑوں کی طرح چلی آرہی تھیں۔ شاید دور اوپر چناب کا کوئی بند ٹوٹ گیا تھا۔

اکبر نے انوری کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے قادر حسین کا بازو تھاما اور بھاگ اٹھا۔ انوری اس کے ساتھ بھاگتی جارہی تھی لیکن قادر حسین وہیں کھڑا رہا۔ اس نے اپنا بازو چھڑا لیا تھا۔ وہ دونوں پانی میں چھلانگیں لگاتے بلند جگہ پر پہنچ گئے۔ اس سے آگے سڑک تک کا علاقہ محفوظ تھا۔ وہاں ابھی گھٹنوں سے نیچے نیچے پانی تھا۔ دور سڑک پر سیلاب سے بھاگ ہوئے انسانوں اور ڈھور ڈنگروں کا قافلہ جارہا تھا۔

انوری نے بلندی پر کھڑے ہو کر پیچھے دیکھا اور قادر حسین کو وہیں کھڑے پایا۔ اکبر اور انوری نے مل کر اسے آوازیں دیں، لیکن سیلاب اور بارش کے مہیب شور نے ان کی آوازوں کو قادر حسین تک پہنچنے نہ دیا۔ اگر آوازیں پہنچ بھی جاتیں تو کیا تھا۔ قادر حسین اب آوازوں کے دیس سے دور نکل گیا تھا۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ جیسے وہ بیس برس اسی مسرت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اس نے آج سب کچھ پا لیا تھا۔ کھویا ہوا پیار، ماں کی محبت، تسکین اور روحانی اطمینان۔ وہ بچپن کی محرومیاں، محرومی محبت، تلخیاں اور تلخ کامیاں اکبر کے گھر میں گری ہوئی چھت کے نیچے دفن کر آیا تھا۔

قادر حسین نے گاؤں کی طرف دیکھا۔ سیلاب کی پہاڑ نما لہریں گاؤں کی چھتوں کے عقب میں بڑھی چلی آرہی تھیں۔ اس نے مسجد کے دونوں میناروں کو جھومتے ہوئے

پھر گرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے سینے سے ایک آہ نکلی اور اس کے دل اور روح کو مسرور کر گئی۔ قادر حسین کھل کر مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ کہ جس میں مسرت ہی مسرت موجزن تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایسی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس نے بڑ کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھا۔ بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ بوندیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے ماں کی گود میں اونگھتا ہوا بچہ سو گیا ہو۔ بارش اس کے تمام دکھ اور درد دھو رہی تھی، دھو چکی تھی۔ قادر حسین نے آنکھیں کھولیں اور پھر اوپر دیکھا۔ سیلاب کے بھیانک شور میں اسے ترنجن کا گیت سنائی دیا جیسے ترنجن سے ٹوٹی ہوئی سہیلی اکیلی دکیلی گا رہی تھی۔

''اکھیاں میٹ کے سپنا تکیا''

بڑ کے ڈال پر اسے رنگ برنگ پنچھی نظر آیا۔ رنگ رنگیلا واہمہ۔

''قادر حسین! پہچانا نہیں؟...... میں انوری ہوں، آؤ پکڑ لو'' ___ بچپنے کی ہنسی کی آواز۔

پھر اس واہمہ کو قیامت نما سیلاب کے شور نے ہڑپ کر لیا۔ لہریں گاؤں کے اوپر سے گزر آئی تھیں۔ قادر حسین نے نہایت سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں کو یوں جوڑ لیا جیسے ان لہروں کو چومنا چاہتا ہو۔ بازو پھیلا دیئے جیسے لہروں کے پہاڑوں سے بغل گیر ہونا چاہتا ہو۔

''آؤ اور مجھے گود میں لے لو'' ___ اس نے مطمئن سی مسکراہٹ سے کہا ___ ''مجھے سکون بخش دو''۔

اکبر اور انوری دور سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ وہاں گاؤں تھا نہ جوہڑ، مسجد تھی نہ مینار۔ سیلاب کا گہرا مٹیالا پانی بڑ کے پتوں تک پہنچا ہوا تھا۔ تنا ڈوب چکا تھا اور پتے لرز رہے تھے۔

اکبر اور انوری نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

⌘ ⌘ ⌘

کھیم کرن کی پگلی

میری اس کہانی کا ایک مرکزی کردار ''سپاہی ابرار علی'' افواج پاکستان کے مجاہدوں کا علامتی کردار ہے اور دوسرا مرکزی کردار جو افسانے کے عروج میں منظر میں داخل ہوتا ہے ''کھیم کرن کی پگلی'' ہے۔ ''پگلی'' پاکستان کی آبرو کی علامت ہے جو سن سینتالیس میں بچپنے میں کھیم کرن رہ گئی تھی۔ اس وقت ابرار علی نو دس برس کی عمر کا ''ابو'' تھا اور ''پگلی'' نو دس برس کی ''زینو''۔ دونوں کے ماں باپ، بہن بھائی اور ان دہشت زدہ بچوں کے سروں پر ہاتھ رکھنے والے سن سینتالیس کے قتلِ عام میں کھیم کرن میں شہید ہو گئے تھے۔ ابو بڑا ہو کر پاکستان کا سپاہی ابرار علی بنا اور زینو کھیم کرن کی گلیوں میں پاگل ہو کے اٹھارہ برس بھٹکتی چیختی اور بین کرتی رہی۔

ابرار علی جوڑیاں سے کھیم کرن تک کے محاذوں پر لڑتا ہے اور دیوانہ ہو کے لڑتا ہے۔ اس کے سینے میں ذاتی جذبات بھی ہیں اور ملّی بھی۔ یہ جذبات صرف ابرار علی کے نہیں، پاکستان کا ہر جیالا جانباز انہی جذبات کی چنگاریوں سے آگ بگولہ ہو کے لڑا تھا اور انشاء اللہ اسی طرح لڑے گا۔

چونڈے کا معرکہ باقاعدہ جنگی معرکہ نہیں بلکہ ایک بالائے انسانی معرکہ تھا۔ میں نے اس معرکے سے متعلق زیادہ سے زیادہ حقیقی واقعات اور اپنے جانباز مجاہدوں کے کارناموں کو فراہم کر کے افسانے میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح دوسرے محاذوں کے واقعات کو بھی افسانوی رنگ آمیزیوں سے پاک رکھا ہے۔ میں خود فوجی رہا ہوں اور سپاہیوں کی بارکوں اور مورچوں کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے لہٰذا میں نے اس افسانے کی فضا مکمل طور پر فوجی رکھی ہے۔

حمیدی

اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی گلیوں میں کتنی ہی پگلیاں ابھی تک بین نہیں کر رہیں اور کتنے ہی ابرار علی پاکستان کی آبرو پر مر مٹنے کو پاگل نہیں ہو رہے۔

✦ ✦ ✦

ریوالی کا بگل بج رہا تھا۔

سپاہی ابرار علی اتنی سویرے کبھی نہ جاگا تھا۔ اس کی بارک کے کئی سپاہی ریوالی بجتے ہی جاگ اٹھتے تھے اور مسجد میں جا کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ سپاہی اللہ داد اور لانس نائک نور خان ہر صبح ابرار علی کو جھنجھوڑ کر مسجد میں جایا کرتے تھے اور ابرار کروٹ بدل کر پھر سو جایا کرتا تھا۔ وہ پریڈ کے وقت سے تھوڑی ہی دیر پہلے بستر سے نکلنے کا عادی تھا۔ لانس نائک نور خان اسے اکثر کہا کرتا تھا —— ''ابوگرائیں! تمہارے نمبری لانس نائیکی کا کیڈر کر رہے ہیں۔ اب تمہارا نمبر ہے لیکن فوج میں عہدہ خدا کو راضی کیے بغیر نہیں ملا کرتا۔ کبھی کبھار مسجد میں جا کے سجدہ دے آیا کرو۔ تم پر تو نہ خدا راضی نہ پلاٹون کمانڈر۔ کیڈر کی سفارش کون کرے گا؟'' —— اور ابرار بگلے کے سگریٹ کا کش لگا کر ہنس دیا کرتا تھا۔

آج صبح ریوالی بجی تو ابرار نے بالکل ہی پرواہ نہ کی۔ آج تو اٹھنے کی کوئی جلدی ہی نہیں تھی۔ کل کمپنی نے بڑی لمبی روٹ مارچ کی تھی اور آج پریڈ سے چھٹی تھی لیکن کوتوں میں رائفلوں اور مشین گنوں کی صفائی کا پروگرام تھا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ کوت کے سامنے بیٹھے رائفلیں صاف کرتے نور خان نے ابرار کو پھر وہی بات کہی جو وہ اکثر کہا کرتا تھا اللہ داد بھی بول پڑا —— ''ابوگرائیں! نور خان ٹھیک کہتا ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر ایک بار خدا اور رسولؐ کا نام لو تو سو مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک سجدہ سو گناہ بخشوا دیتا ہے''۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ابرار کو ہنسی نہ آئی۔ سنجیدگی سے بولا —— ''سجدہ مولوی کا، گولی سپاہی ابو کی...... گولی جو کافر کے سینے سے پار ہو جائے سو سجدوں جتنا ثواب دیتی ہے''۔

اس نے بگلے کا سگریٹ سلگا کر نور کی طرف بڑھا دیا اور جھنجھلا کر بولا —— ''ان سالی رائفلوں کو کب تک صاف کرتے رہیں گے......'' اس نے سگریٹ نور خان سے لیا اور کش لگا کر اللہ داد کو دیتے ہوئے کہا —— ''بٹ پر چاند ماری کرتے اب تو شرم آتی ہے......'' وہ چپ ہو گیا اور اللہ داد کے منہ سے نکلتے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھنے لگا۔ یکا یک سٹپٹا کر بولا

—— ''ہمیں کشمیر کب بھیجیں گے؟ رات ریڈیو والا ابھی سنا رہا تھا کہ ہندوستانیوں نے ہماری چوکیوں پر پکٹیں بنالی ہیں......'' اس کے چہرے کا تاثر ایک لخت بدل گیا...... آنکھوں کی پُر شباب چمک میں سرخی آ گئی اور اس نے رائفل میں پل تھرو ڈال کر اس قدر زور سے کھینچا جیسے ہندوستانی سپاہیوں کی لاشیں اپنی چوکیوں سے گھسیٹ کر پرے پھینک دی ہوں۔

اُسی دن کا پچھلا پہر تھا کہ بارکوں میں یہ خبر گھوم گئی کہ ہندوستانیوں نے گجرات کے ایک گاؤں، اعوان شریف، پر مارٹر اور مشین گن فائرنگ کر کے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو شہید اور زخمی کر دیا ہے اور ایک مسجد میں شہید ہو گئی ہے۔

اس بھارتی گولہ باری کا سیاسی پس منظر اور پاکستان کی سرکاری پالیسی خواہ کچھ ہی تھی مگر سپاہی ابرار کی پلٹن میں ایک ہی قہر آلود للکار گونج رہی تھی —— ''ہم گولے کا جواب گولے سے دیں گے'' —— عہدیدار اور جوان دانت پیس پیس کر باتیں کر رہے تھے۔ شام تک غم و غصہ اس قدر بڑھ گیا کہ جوانوں نے ہندوستانیوں کو ننگی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ انہیں توقع تھی کہ شام تک انہیں گجرات کی سرحد پر جوابی کارروائی کا حکم مل جائے گا لیکن سورج غروب ہو گیا اور انہیں کوئی حکم نہ ملا۔ جوانوں نے اپنی حکومت کو کوسنا شروع کر دیا۔ لانس نائک نور خان نے بارک سے اپنی چارپائی گھسیٹی اور برآمدے میں لے جا کر زور سے پٹخ دی اور بولا —— ''ہم کبڈی کھیلنے کے لیے تو دس سال سے سرکاری راشن نہیں کھا رہے''۔

پلٹن کی اس جذباتی کیفیت کی رپورٹ صوبیدار میجر تک پہنچ گئی اس نے تمام کمپنی حوالدار میجروں کو بلایا اور انہیں جوانوں کو قابو میں رکھنے کی سخت ہدایت دی۔ رات گنتی میں کمپنی حوالدار میجروں نے اپنی اپنی کمپنی کو خبردار کیا کہ جوان ڈسپلن کے پابند رہیں اور اور کوئی فالتو بات منہ سے نہ نکالیں۔

پاک فوج کے اعلیٰ ڈسپلن نے ساری پلٹن کے ہونٹ سی دیئے لیکن رات کے وقت بارکوں کے برآمدوں اور میدان میں جب سپاہی مچھر دانیوں میں گھس گئے تو ان پر یوں ہول طاری ہو گیا جیسے انہیں لوہے کے پنجروں میں بند کر دیا گیا ہو۔

سات دن گذر گئے۔ یہ لمبے لمبے سات دن، جوانوں نے ٹرانسسٹروں اور ریڈیو کے گرد ہجوم در ہجوم بیٹھے گذار دیئے۔ آٹھویں صبح پلٹن کی پریڈ اور مارچ پاسٹ تھی۔ جب

کمپنیاں کوتوں کے سامنے آ کر ڈسمس ہوئیں تو سپاہی ابرار نے رائفل کا بٹ زمین پر مار کر کہا۔۔۔ ''وہاں کافروں نے مسجد شہید کر دی ہے اور یہاں سلوپ اُم، آرڈر اُم، ہو رہا ہے''۔۔۔ سپاہی اللہ داد اور لانس نائک نور خان بھی پاس ہی تھے۔ انہوں نے ابرار کی طنز آلود آواز سنی نے قہر وغضب پر خاموشی طار ہوگئی۔ اس خاموشی میں انہوں نے قہر وغضب اور جوش جہاد کر یوں دبانے کی کوشش کی جیسے کسی نے چنگاری کو بارود میں چھپانے کی کوشش کی ہو۔

اللہ داد اور نور خان پر ایسی خاموشی طاری ہوگئی جو صرف ان سپاہیوں پر طاری ہوا کرتی ہے جو محسوس کر رہے ہوں کہ دشمن وطن کی سرحدوں پر آ بیٹھا ہے اور انہیں بارکوں سے نکلنے کی اجازت نہیں۔ قبل از طوفان کی یہ خاموشی گہری ہوتی چلی گئی اور اس خاموشی سے جانے کیا ابھرا کہ کوتوں کے سامنے رائفلیں صاف کرتے سپاہیوں میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ عہدیداروں اور سرداروں کی بھاگم بھاگ میں انوکھا سا ضروری پن نظر آ رہا تھا۔ کمپنی کمانڈر بھی آ گیا۔ ادھر پلٹن کی گاڑیاں سٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لانس نائک نور خان حوالدار میجر کی وسل سن کر اٹھ بھاگا اور اس نے حوالدار میجر سے ہدایات لے کر اپنی سیکشن کو اکٹھا کر لیا۔ کمپنی کمانڈر کے چہرے پر بے چینی سی چمک تھی۔

ابرار علی نے دیکھا کہ یہ ہڑبونگ اس کی کمپنی تک ہی محدود نہیں پلٹن کی تمام لائنوں میں مچی ہوئی ہے۔ کوتوں سے پرے میگزین کھلی ہوئی تھیں اور ایمونیشن کی پیٹیاں باہر نکل رہی تھیں۔ کمپنیاں فال اِن ہو رہی تھیں۔ سپاہی ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جانے کہاں سے ایک سرگوشی ابھری۔۔۔ ''کشمیر''۔۔۔ اور یہ سرگوشی ساری پلٹن میں گھوم گئی۔ چہرے چمک اٹھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر کنوائے ساری پلٹن کو اٹھائے طوفان کی طرح بارکوں سے نکلا، چھاؤنی کے موڑ کاٹے اور تیز بہت تیز، شہر سے نکل گیا۔ میدان پیچھے ہٹنے لگے اور تھوڑی دیر بعد بہت دور پیچھے رہ گئے، کنوائے ایک پہاڑی سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹرکوں کے گیئر بدلنے اور گیس دینے کی آوازیں اٹھیں اور جب ٹرک طوفانی رفتار پر تین چار موڑ کاٹ چکے تو توپوں کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ اوپر سے دو طیارے زناٹے سے گذر گئے۔ ذرا دیر بعد توپوں کے دور کے دھماکے قریب کی گرج بن گئے پھر توپوں کے پھٹتے

گولوں کا دھواں بھی نظر آنے لگا۔ ٹرکوں میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں ایک بار پھر سرگوشی گھوم گئی۔۔۔ ''کشمیر''۔۔۔ چہرے اور زیادہ چمک اٹھے۔ رائفلوں، مشین گنوں اور سٹین گنوں پر سب کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ گردنیں تن گئیں۔ ٹرکوں سے ترپال اتار دیئے گئے تھے اور سپاہی ایک حسین خطے کو دیکھ رہے تھے۔ ہر سو سبزہ زار۔ ساون کی ہریالی بھادوں کے آخر تک جوبن پر تھی لیکن یہ ہریالی کسی قدر مظلوم اور بے بس نظر آتی تھی جیسے ماں کی گود سے نوچا ہوا بچہ تن تنہا بیٹھا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو...... حیراں نہ گریاں نہ خنداں۔

کنوائے ایک لخت رک گیا۔ ساری پلٹن کود کے اتر آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پلٹن کمپنیوں میں، کمپنیاں پلاٹونوں میں اور پلاٹونیں سیکشنوں میں منظم ہو کے پھیل گئیں۔ ایڈوانس اور رئیر گارڈوں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی اور سپاہی ابرار علی کی پلٹن جوڑیاں کی طرف بڑھتے ہوئے بریگیڈ کے ساتھ ڈیپلائے ہوگئی۔

سپاہیوں پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ بعض نے ہاتھوں میں لرزہ محسوس کیا۔ ان میں سے کسی نے کبھی میدانِ جنگ نہیں دیکھا تھا۔ صرف ٹریننگ کی تھی اور جنگوں کی مشقیں کی تھیں جہاں مرنے مارنے کا خطرہ ہی نہیں تھا۔ وہ چاند ماری کے بٹ پر گتے کے تارگیٹوں پر گولیاں چلاتے رہے تھے اور بھوسے سے بھری ہوئی، کھڑی اور پڑی ڈمیوں پر سنگین مارتے رہتے تھے یا انسٹرکٹر کی پینری سٹک، پر بیونٹ فائٹنگ کی مشق کرتے رہے تھے لیکن آج وہ پہلی بار جیتے جاگتے، بھاگتے دوڑتے...... دھائیں دھائیں گولیاں اور توپوں کے گولے برساتے دشمن کے سامنے آئے تھے۔ وہ بھوسے کی ڈمیاں نہیں وہ ڈوگرے، ہندو، سکھ، مرہٹے اور گورکھے تھے۔ ان کی مدد کے لیے آگ اگلتے ٹینک اور فضا میں طیارے تھے۔

ابرار علی کی پلٹن کے ہر سپاہی کے جسم نے جھرجھری لی۔ سب نے پیش قدمی کرتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بعض کے چہرے بے تاثر تھے۔ بعض مسکرا دیئے اور بعض نے مسکرا دینے کی کوشش کی۔ ادھر یکبارگی تین چار توپیں چلیں ادھر تینوں چاروں گولے ہیبت ناک دھماکوں سے پھٹے۔ معاً جانے کس پاکستانی سپاہی کے سینے سے دھماکے کی طرح نعرہ نکلا۔۔۔ ''بولو نعرہ حیدری''۔

ساری ساری پلٹن آسمانی بجلی کی طرح کڑکی۔۔۔ ''یا علیؓ''۔۔۔ اور اس کڑک کے

ساتھ ہی ہیجانی کیفیت نہ رہی، ہاتھوں کا رعشہ نہ رہا، دلوں کا لرزہ اور مرنے مارنے کا خوف نہ رہا۔ چہروں پر ایک جیسا تاثر چھا گیا اور کوئی کالا نہ رہا، سانولا نہ رہا۔ گندمی نہ رہا۔ سب ایک ہی رنگِ حیدری، میں رنگے گئے۔ پھر کوئی کمپنی کمانڈر نہ رہا۔ کوئی صوبیدار، حوالدار، نائک اور لانس نائک نہ رہا اور نہ کوئی سپاہی رہا۔ سب مجاہدین بن گئے، اللہ کے شیر، سبھی مل کے ''اللہ اکبر'' کے نعروں کی مسلسل اور وادیوں کو ہلا دینے والی گرج بن گئے۔ آگ کا دریا بن گئے جس کے اندر کشمیر کے حسن کے لیٹرے خس و خاشاک کی طرح جلنے بھننے لگے۔ سورج ڈوبا، رات آئی، رات گئی۔ سورج شاید پھر بھی ابھرا ہوگا تو ڈوبا بھی ہوگا۔ کس کو اتنا ہوش تھا!

جب ہوش آیا تو دیکھا کہ دشمن جوڑیاں سے پسپا ہو گیا تھا اور ہندوستانی حکمران جنہوں نے اپنے لشکر کی مدد کے لیے لڑا کا بمبار طیاروں کے غول بھیجے تھے اب اپنے لشکر کی لاشوں سے گدھوں کو بھی اڑانے سے معذور تھے۔

چھمب سے پسپا ہو کر بھارتی سینا جوڑیاں میں قدم جما کے لڑنا چاہتی تھی لیکن پاکستانی سپاہ کے مسلسل دباؤ کے سامنے اس کے قدم ایسے اکھڑے کہ جوڑیاں سے پھسلتے بڑی مشکل سے اکھنور میں جا جمے۔ جوڑیاں ہندوستان کی جنگی قوت کی اہم کڑی تھی جو مجاہدوں نے تڑاخ سے توڑ دی۔ ہندوؤں کی تو کمر ہی ٹوٹ چلی تھی لیکن اُدھر سے تازہ دم کمک آ گئی تو اکھنور میں قدم جم گئے۔ ہندوستانیوں کو اس تلخ احساس نے باؤلا کر دیا کہ اکھنور گیا تو جموں بھی گیا۔ چنانچہ انہوں نے جوڑیاں کو واپس لینے یا کم از کم اکھنور کو بچائے رکھنے کے لیے جان کی بازی لگا دی لیکن پاکستانیوں کے تابڑ توڑ حملوں سے اکھنور کی زمین ہندوؤں کے پاؤں تلے سے سرک رہی تھی۔

پاکستانی دستے تو آگے نکل گئے لیکن سپاہی ابرار علی کی کمپنی کو پلٹن سے الگ کر کے پچھلا مورچہ مستحکم کرنے کے لیے جوڑیاں میں روک لیا گیا۔ رات گذر رہی تھی۔ سپاہی ابرار علی آؤٹ لائننگ پکٹ پر پہرہ دے رہا تھا۔ شب کی تیرگی میں اسے اکھنور کے مورچوں سے اٹھتے ہوئے اپنی توپوں کے شعلے دکھائی دے رہے تھے اور وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ گولے دشمن کے مورچوں پر نہیں اس کے اپنے ذہن میں پھٹ رہے ہوں۔ اس کی پلٹن کے جوانوں نے شام کھانا کھا کر جوڑیاں کی فتح کی خوشی میں ''سمی'' بھی

ناچی تھی بھنگڑا بھی اور راشن ٹینوں کی تھاپ پر جو منہ میں آیا گایا تھا۔ نعرے بھی لگائے تھے اور بعض نے دو دو نفل شکرانے کے بھی پڑھے تھے لیکن سپاہی ابرار علی مغموم تھا۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح بے جگری اور شوقِ شہادت سے دیوانہ ہو کے لڑا تھا۔ دست بدست جھڑپ کا بھی ایک موقع مل گیا تھا اور جب اس خونریز معرکے کے بعد دشمن کی لاشیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں تو اس نے دیکھا کہ اس کی سنگین پر خون جم گیا تھا اور خون سنگین سے بہہ کر رائفل کی نالی میں بھی چلا گیا تھا۔ جما ہوا خون دیکھ کر اسے روحانی سا قرار آ گیا تھا اور اس جان لیوا جھڑپ اور دو دن اور دو راتوں کی مسلسل جنگ کی تھکن دور ہو گئی تھی۔ اس نے سنگین صاف کئے بغیر نیام چڑھا لی تھی۔

اس کی کمپنی کا ہر سپاہی مسرور تھا اور فرصت ملی تو سپاہی فاتحانہ لب و لہجے میں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے —— ''اور میں نے جمپ لے کر دائیں کو لپے پر وار کیا۔ دشمن دہرا ہو گیا۔ میں نے بیونٹ کھینچا اور ایڈوانس کیا، دوسرا سامنے آیا۔ میں نے بٹ کہنی تلے رکھ کر اس کا جبڑا توڑ دیا...... اور میں نے ...... اور میں نے ...... قسم سے پانچ ...... سات پورے ...... اور میں نے ...... بائیں کندھے سے بیونٹ کھینچا تو ......'' صرف ابرار علی تھا جو سنتا رہا اور اپنی ایک بھی نہ سنائی۔

ابرار علی بے چین تھا۔ اس کی کمپنی کو جوڑیاں کے قابض دستوں کے ساتھ پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ لڑنا چاہتا تھا۔ آج رات وہ اپنے ساتھی سپاہی اللہ داد کے ساتھ آؤٹ لائنگ پکٹ پر رائفل کندھے سے لٹکائے پہرہ دے رہا تھا تو بھی وہ بے چین اور چپ چپ تھا۔ اس نے بگلے کا سگریٹ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور کش لگاتا تھا تو سگریٹ ہونٹوں میں رکھ کر اس کی چمک کو دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیتا تھا۔ دونوں سپاہی نصف گھنٹہ سے گھوم پھر کر پہرہ دے رہے تھے دونوں چپ تھے۔

''ابو گرائیں! ......'' اللہ داد بوجھل سے لہجے میں بولا —— ''دوسرے ضلعوں کے جوان طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں ......'' ابرار علی نے رک کر اللہ داد کی طرف دیکھا۔ اللہ داد کہہ رہا تھا —— ''بعض کہتے ہیں کہ بیونٹ فائٹنگ کے وقت ابو ایک ٹوٹے ہوئے ٹینک میں چھپ گیا تھا۔ راولپنڈ یئے اور جہلمئے کہتے ہیں کہ سن سینتالیس میں کھیم کرن سے بھاگے ہوئے پناہ گزین کیا لڑیں گے''۔

''محاذ پر آ کر بھی وہ اپنے آپ کو راولپنڈیا جہلمیا اور پناہ گزین سمجھتے ہیں؟'' ابرار علی نے دبی دبی آواز میں کہا — ''یہاں بھی انہوں نے اپنے آپ کو ضلعوں اور تحصیلوں میں تقسیم کر رکھا ہے؟''

''نہیں'' — اللہ داد بولا — ''یہاں سب پاکستانی ہیں۔ پاکستان ہی ہمارا ضلع، ہماری تحصیل بھی پاکستان اور موضع بھی پاکستان ہی ہے، لیکن جو سپاہی پیٹھ دکھا جائے پلٹن والے اسے ہندوستانی کہا کرتے ہیں...... تم اس وقت کہاں تھے ابو؟'' — اللہ داد نے اپنائیت اور رازداری سے پوچھا — ''تم بیونٹ فائٹنگ کے بعد سے چپ چپ کیوں ہو؟ جوان گاتے رہے، ناچتے رہے اور تم رونی سی صورت بنائے الگ بیٹھے رہے۔ تم نے شاید نعرہ بھی نہیں لگایا......'' اللہ داد نے آہ لے کر کہا — ''تم شاید دوست محمد، اشرف اور عابد خان کی شہادت کا غم کر رہے ہو۔ شاید تمہیں خان محمد کی ٹانگ، کٹ جانے کا بھی دکھ ہے۔ وہ ساری عمر کے لیے بیکار ہو گیا ہے لیکن ابو دوست! ہم سب شہید ہونے کے لیے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ابھی گولہ آ پڑے اور ہم دونوں کے ٹکڑے اڑ جائیں۔ جنگ شہیدوں کا ماتم کر کے تو نہیں لڑی جاتی......'' اللہ داد کی آواز میں یک لخت جوش آ گیا اور وہ ابرار علی کے کندھے پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں بولا — ''ابو گرائیں! گاؤ، ناچو، لڑو، نعرے لگاؤ۔ ہم پاکستان کے سپاہی ہیں۔ ہم ہندوستانی نہیں۔ اس کھیم کرن کو دل سے اتار دو جہاں تم پیدا ہوئے تھے۔ ورنہ لوگ تمہیں بزدل کہیں گے''۔

''کیا فتح خان دھنی وال بھی کہتا ہے کہ ابو ٹینک میں چھپ گیا تھا؟'' — ابرار نے طنز سے بھرپور لہجے میں اللہ داد سے پوچھا اور گھونٹ سا نگل کے بولا — ''جب دشمن کے مورچے پر ہم نے چارج کیا اور بیونٹ فائٹ شروع ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ فتح خان گر پڑا تھا۔ صبح اس سے پوچھنا۔ دو ڈوگرے اکٹھے بیونٹ تانے اس پر چڑھ آئے تھے۔ میں ذرا دور تھا لیکن داد گرائیں! مولا علی کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ میں کس طرح اُڑ کر پہنچا۔ ایک ڈوگرے کے پہلو میں بیونٹ مارا۔ اسی چارج میں دوسرا ڈوگرہ بھی گر پڑا۔ میں نے اس کے پہلو سے بیونٹ نکالا اور دوسرا جو گر کر اٹھ رہا تھا اسے جبڑے پر کک ماری اور جبڑا توڑ دیا۔ اوپر سے فتح خان کے بیونٹ نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ پھر معلوم نہیں فتح خان کہاں گیا اور میں کدھر چلا گیا......'' ابرار علی چپ ہو گیا اور آہ بھر کے بولا — ''داد گرائیں! جہاں

بیونٹ فائٹ ہوئی تھی وہاں کوئی ٹوٹا ہوا ٹینک نہیں تھا۔ ہندوستانیوں کی چار ٹوٹی ہوئی توپیں اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ اب بھی وہاں جا کے دیکھو تو تمہیں سب سے اِدھر والی توپ کے پاس دو ہندوستانیوں کی لاشیں پڑی نظر آئیں گی۔ ایک کے بائیں کولھے میں بیونٹ لگا ہوا ہے اور دوسرے کے دونو جبڑے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ وہ میں نے بٹ سے توڑے تھے......'' ابرار علی نے تیرہ دشمنوں کی موت کی تفصیلات سنا دیں جو اس نے اپنی سنگین سے مارے تھے۔

''اندھیرے میں تمہیں میرا بیونٹ نظر نہیں آئے گا داد!'' — ابرار علی نے کہا — ''اس پر ابھی تک خون جما ہوا ہے۔ میں نے مزل بھی صاف نہیں کی۔ اس کے اندر بھی خون چلا گیا ہے ...... تم پوچھتے ہو میں چپ کیوں ہوں؟'' — ابرار علی نے للکار کے لہجے میں کہا — ''ساری کمپنی کو فال اِن کر کے پوچھو کہ ہے کوئی مائی کا لال جس نے پورے تیرہ دشمن بیونٹ سے گرائے ہوں؟ آٹھ سے زیادہ کسی نے نہیں گرائے......''

''لیکن تم چپ کیوں ہو؟'' — اللہ داد نے سٹپٹا کر کہا — ''دوسروں کی طرح تم بھی اپنے کارنامے کیوں نہیں سناتے''۔

''نہیں'' — ابرار علی نے کربناک آواز میں کہا — ''میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ میں بھی کہانیاں سناؤں گا لیکن ابھی نہیں...... داد گرائیں! میں نو دس برس کا بچہ تھا جب سن سینتالیس میں کھیم کرن کے ایک گاؤں سے تن تنہا بھاگا تھا۔ کافروں نے میرے باپ، میری ماں اور میری بہن کو صحن میں آ کر برچھیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ سارا گاؤں کاٹ دیا تھا کافروں نے داد!......'' ابرار علی نے لمبی آہ لی اور بولا — ''آہ اٹھارہ برس گذر گئے ہیں۔ اٹھارہ برس سے ماں کا خون میرے سینے میں جل رہا ہے۔ اٹھارہ سال سے ماں کی یادیں مجھے طعنے دے رہی ہیں......'' اس نے اللہ داد کو کندھے سے جھنجھوڑ کر عتاب آلود لہجے میں کہا — ''آج وہ خون شعلے بن کر مجھے اندر ہی اندر جلا رہا ہے۔ بہن کے زخم آج میرے سینے میں ہرے ہو گئے ہیں...... ابھی نہیں، ابھی میں کسی کو نہیں سناؤں گا کہ میں نے کس طرح تیرہ کافروں کو مارا ہے۔ میں ناچوں گا بھی نہیں۔ نعرہ بھی نہیں لگاؤں گا، میں اپنی سنگین سے خون بھی صاف نہیں کروں گا۔ ایک روز کھیم کرن جاؤں گا اور اپنے گاؤں جا کر کافروں کے خون سے لتھڑا ہوا یہ......'' اس نے اپنی سنگین پر بھرپور ہاتھ مار کر کہا — ''یہ بیونٹ

اپنے اس گھر کے صحن میں گاڑھ دوں گا جہاں میرا باپ میری ماں اور بہن دشمنوں کے ہاتھوں کٹ گئی تھیں۔ میں اُس روز ناچوں گا اور اس روز میرے سینے سے اللہ اکبر کا جو نعرہ اٹھے گا اسے سارا ہندوستان سنے گا...... کہتے ہیں بچپن کی یادیں لڑکپن میں بھول جاتی ہیں دادگرائیں! لیکن میں نہیں بھول سکا۔ میں اتنا بڑا ہو کر آٹھ برس کا بچہ ہی رہا۔ میں تو پرسوں جوان ہوا ہوں جب میرا بیونٹ پہلے کافر کے سینے میں لگا تھا اور میں اب سمجھنے لگا ہوں کہ وہ باپ میرا نہیں تھا جو بچپن میں کٹ مرا تھا۔ نہ وہ ماں میری تھی نہ وہ بہن میری تھی جو کافروں کی برچھیوں سے چھلنی ہو گئی تھیں۔ وہ باپ پاکستان کا تھا۔ وہ ماں پاکستان کی تھی، وہ بہن پاکستان کی تھی اور وہ آبرو پاکستان کی تھی...... اس وقت میں نو دس برس کا بچہ تھا نا، آج میں ستائیس برس کا جوان ہوں...... لیکن...... لیکن دادگرائیں......''

ابرار چپ ہو گیا۔ وہ کھیم کرن پہنچنے کی راہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر بولا ——
''داد! پاکستان واہگہ کی طرف سے ہندوستان پر کیوں نہیں حملہ کر دیتا؟''

دور اُفق پر بجلی سی چمکی اور تین چار گولے داد اور ابرار سے چار پانچ سو گز دور پھٹے۔ پھر اندھیری فضا میں رہ رہ کے توپیں چمکنے اور دھاڑنے لگیں۔ ہندوستانی توپ خانہ ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا...... دور، جوڑیاں سے بہت آگے...... پاکستانی توپوں نے اس کے سامنے شعلوں کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ اللہ داد کی ہنسی نکل گئی۔ ابرار نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی ہنس دیا۔ جیسے سمجھ گیا ہو کہ اللہ داد کو کیوں ہنسی آئی ہے۔

ابرار علی نے بلند آواز سے ننگی گالی دے کر کے کہا —— ''ایشیا پور کا سارا ایمونیشن لا کے پھونک دو، ...ریو! جوڑیاں اب تمہیں واپس نہ ملا''۔

''جموں'' —— اللہ داد نے گلا پھاڑ کر کہا —— ''جموں توی کے مورچے سنبھالو۔ ڈوگرو! اب جموں میں ملاقات ہو گی''۔

دور پرے اِن لائنگ پکٹ کے سنتری نے مسرت اور فتح سے مخمور اور ترنم لے میں بیت الاپا......

اسیں نسل محمود جیہے غازیاں دی دودھ پیتے نیں مانواں پٹھانیاں دے
اسیں سندھی، بنگالی، بلوچ چھٹے اسیں پُت پنجاب دے پانیاں دے

تھوڑی دور پرے توپ خانے کے توپچی نے گولہ داغ کر بلند آواز سے نعرہ لگایا ——

''علی!'' —— اور رات کے اندھیرے میں جانے کہاں کہاں سے کتنی ہی آوازیں دور مار توپ کی طرح گرجیں —— ''حیدر'' —— ساتھ ہی توپوں میں گولے ری لوڈ، کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

سنتری بدل گئے۔

سپاہی ابرار علی کو ریوالی کے وقت کسی نے نہ جھنجھوڑا۔ نائک سلامت خان کبھی کا اذان دے چکا تھا اور بہت سے جوان، سپاہی اللہ داد کے پیچھے نماز پڑھ چکے تھے۔ ابرار کی آنکھ کھلی تو سورج بہت چڑھ آیا تھا۔ اسے جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ رات ڈیوٹی دے چکا تھا۔ اب بارہ بجے اسے ایک بار پھر سنتری کھڑا ہونا تھا۔ پانی کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے میس ٹن اٹھایا اور ٹیکری کے دامن میں چشمے کی طرف چل پڑا۔

چشمے میں منہ ہاتھ دھو کر اس نے رائفل کندھے سے لٹکائی اور ٹیکری پر جا چڑھا۔ جگہ جگہ ہندوستانی سپاہیوں کی لاشیں گِدھوں کے سیاہ پروں تلے چھپی ہوئی تھیں اور گِدھوں کی چڑ چڑ اور چی چی سے جوڑیاں کے ہریالے حسن پر کراہیت سی طاری ہو گئی تھی۔ لاشیں تھوڑی نہیں تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گِدھوں اور کتوں میں سمجھوتہ سا ہو گیا تھا اور وہ ایک دوسرے پر جھپٹے مارے اور بھونکے بغیر نہایت اطمینان سے لاشوں کو کھائے جا رہے تھے۔ بدبو بہت تھی لیکن سپاہی ابرار علی پر خمار سا طاری ہو گیا جیسے وہ پنجاب کی سرسوں کی پیلی پیلی رومان انگیز مہک میں گھوم پھر رہا ہو۔ یہیں کہیں وہ تیرہ لاشیں بھی تھیں جو اس نے گرائی تھیں۔

قریب ہی پڑی ہوئی ایک لاش کے ہاتھ پر الٹی طرف ''اوم'' لکھا ہوا تھا۔ ابرار علی کو گِدھوں اور کتوں کے پچوڑے ہوئے اس بازو کو دیکھ کر لذت سی محسوس ہونے لگی اور وہ ٹیکری کے اس طرف چلا گیا جہاں ہندوستانیوں کی وہ ٹوٹی ہوئی توپ پڑی تھی جس کے قریب ابرار نے تین ڈوگرے سپاہیوں کو سنگین سے ہلاک کیا تھا۔ گِدھوں کے غول تلے توپ بھی نظر نہ آتی تھی۔ جو گِدھ سیر ہو چکے تھے وہ توپ کی بیرل پر چونچیں رگڑ رہے تھے۔ انہیں گدھوں تلے وہ تین لاشیں بھی تھیں۔ ابرار علی کا سینہ زور سے تھرکا۔ ''یا علی'' کے نعروں کے بگوے اٹھے جنہیں ابرار نے بڑی مشکل سے سینے میں ہی روک لیا۔

وہ چند قدم دور ہی رک گیا۔ جوڑیاں کا ماحول پاکستانی توپوں سے لرز رہا تھا

اور ہندوستانی توپوں کے گولے اب اور زیادہ پیچھے پھٹ رہے تھے۔ وہ شاید اکھنور پر پاؤں جمانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ابرار کی نگاہیں ان تین ہندوستانی سپاہیوں کی لاشوں پر جم گئیں جو گدھوں تلے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ابرار علی کا سینہ ایک بار پھر تھرکا لیکن اب کے سینے میں کوئی نعرہ نہ تڑپا۔ ایک ہچکی ابھری جو ہونٹوں سے پھسل گئی۔ ابرار نے ہلکا سا دھچکا محسوس کیا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ گالوں پر آنسوؤں کی ہلکی ہلکی تپش نے اسے نو برس کا بچہ بنا دیا اور وہ سسکیاں لے لے کے رونے لگا۔

اس کا ذہن اٹھارہ برس کی طویل مسافت پھلانگ کر کھیم کرن کے ایک مضافاتی گاؤں میں جا پہنچا جہاں وہ سن سینتالیس میں کھرلی کے پیچھے چھپ نہ جاتا تو اپنے باپ، ماں اور بہن کے ساتھ کٹ جاتا۔ لاشوں کی انتڑیاں کھینچتے اور گوشت نوچتے گدھوں اور کتوں کو دیکھ کر آج اسے وہ ہندو اور سکھ یاد آ گئے جو اگست 1947ء کی ایک شام انہی گدھوں اور کتوں کی طرح اس کے گھر پر ٹوٹ پڑے تھے اور جے کارے مارتے اس کے باپ، ماں اور بہن کو برچھیوں اور کرپانوں سے کاٹ گئے تھے۔ کافر دو چار نہیں پندرہ بیس تھے۔ کھیم کرن کے مسلمانوں نے گاؤں میں آ کے سب کو کہا تھا کہ سبھی کھیم کرن چلے چلو، وہاں سے پاکستان جانے کے لیے ٹرکوں کا انتظام ہو رہا ہے لیکن ابرار کے باپ نے سینہ تان کر کہا تھا —— "میرا گاؤں کٹ مرے گا لیکن بھاگ کے نہیں جائے گا۔ جانا تو ہمیں پاکستان ہی ہے لیکن دشمن سے دو دو ہاتھ کر کے جائیں گے"۔

گاؤں والوں نے چھویاں اور کلہاڑیاں تیز کر لی تھیں۔ گاؤں میں دو شکاری بندوقیں بھی تھیں۔ عورتوں نے بھی ٹوکے رگڑ لئے تھے لیکن انہیں دشمن کی تعداد کا اندازہ نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ ہندوستان کی فوج کو بھی مسلمانوں کے قتل عام کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایک شام اچانک ہزاروں بلوائی ابرار علی کے گاؤں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے ساتھ فوجی بھی تھے۔ رائفلیں بھی چلیں اور مشین گنیں بھی۔ گاؤں والوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ ابرار علی کا باپ کلہاڑی لئے صحن میں نکلا ہی تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا ایک ہجوم اندر آ گیا اور......

ابرار علی نو برس کا بچہ تھا۔ اسے باپ کی شکل وصورت ابھی تک یاد تھی، اس کی مونچھیں بھی یاد تھیں اور یہ بھی یاد تھا کہ کافروں کے نرغے میں آ کر اس نے اللہ اکبر کا نعرہ

لگایا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کی ماں اور بہن ٹوکے اٹھائے دشمن پر ٹوٹ پڑی تھیں، لیکن جانے کتنی برچھیاں، کتنے بھالے اور کتنی کرپانیں ان کے جسموں کا قیمہ کر گئی تھیں۔ ابرار علی کھرلی کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس نے خوفزدہ ہچکیوں کو بڑی مشکل سے سینے میں روکے رکھا تھا۔

یہ ہچکیاں اٹھارہ برس سے اس کے سینے میں رکی ہوئی تھیں۔ کسے سناتا؟ کس کے سینے سے لگ کے روتا؟ رہا ہی کون تھا دنیا میں؟ اور آج جوڑیاں کے جیتے ہوئے میدان میں اپنی سنگین سے مارے ہوئے دشمن کی لاشوں پر چڑ چڑ پھڑ پھڑ کرتے گدھوں کے غول کو اور ہندوستانی توپ خانے کی ٹوٹی ہوئی پچیس پونڈ کی توپ کو دیکھا تو ابرار کے سینے کے بند ٹوٹ گئے اور اٹھارہ برسوں کی رکی ہوئی ہچکیاں آنسوؤں کی راہ بہہ نکلیں، لیکن اٹھارہ برس پہلے کھیم کرن کے آنسوؤں میں نوحہ تھا، فریادیں اور درد کی ٹیسیں تھیں اور آج جوڑیاں کے آنسوؤں میں نوحہ تھا نہ درد نہ فریاد۔ ایک لذت تھی، مسرت بھری لذت، ابرار علی نے چاہا کہ یہ آنسو بہہ ہی جائیں اور اٹھارہ برس کی رکی ہوئی ہچکیاں آج نکل ہی جائیں۔

ابرار ٹوٹی ہوئی توپ سے ذرا دور ایک پیڑ تلے بیٹھ گیا اور پیٹھ پیڑ سے لگا لی۔ اس کی روح بھی مسرور ہوئی جا رہی تھی اور وہ رگ رگ اور انگ انگ میں ایسا پُر لطف سکون محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اٹھارہ برس اس کے سینے پر وزنی سل رکھی رہی تھی جسے اس نے اب اس عمر میں مسلسل تین دن اور تین راتیں رائفل کی گولیوں، گرینیڈوں اور سنگین کی ضربوں سے توڑ پھینکا ہے۔

اس نے ذہن پر زور دیا اور اپنے گاؤں اور گھر کو یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یادیں دھندلی دھندلی سی تھیں۔ اسے رہ رہ کے وہی منظر یاد آتا تھا کہ کھرلی کی اوٹ سے اس نے اپنے ماں باپ اور بہن کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ پھر وہ شام گہری ہونے کے بعد اٹھ بھاگا تھا۔ گاؤں میں کئی مکان جل رہے تھے۔ وہ بھاگتا ہی چلا گیا تھا۔ نو برس کا خوفزدہ، تن تنہا بچہ۔ بھاگتے بھاگتے جانے کہاں گر پڑا اور اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر اسے اسی قدر یاد آیا کہ کوئی اس کے پاس بیٹھا کسی کو کہہ رہا تھا —— "چوہدری سردار علی کا بچہ ہے" —— اور وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اس کی برادری کے دوسرے گاؤں کے لوگ تھے۔ انہوں نے اسے باری باری کندھے پر اٹھایا اور پاکستان لے آئے تھے اور انہوں نے ہی ابرار کو پال پوس

کر چھ برس گذرے پنجاب رجمنٹ میں بھرتی کرا دیا تھا۔

اس نے ذہن پر اور زور دیا تو یادوں کی دھند میں اسے ایک ہجولی لڑکی نظر آنے لگی — ''شاید اس کا نام زینو تھا......'' اس نے سوچا — ''ہاں زینو۔ اس کی برادری کی لڑکی تھی......'' اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ زینو اس کے سوا کسی اور بچے کے ساتھ کھیلا ہی نہیں کرتی تھی۔ گاؤں سے باہر کے کنارے آم کا ایک پرانا پیڑ تھا جس کا ایک ٹہن جھک کر زمین سے گز بھر اونچا رہ گیا تھا۔ زینو اور ابرار اس پر بیٹھ کر گھوڑا سواری کیا کرتے تھے۔ ایک روز ٹہن زور سے ہل گیا اور ابرار سر کے بل گرا اور ایک پتھر سے اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ زینو نے اپنی قمیض اتار کر اس کے ماتھے پہ لپیٹ دی تھی۔ بچے نے اپنا خون دیکھ لیا اور رو رو کر اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ مرہم پٹی تو ہو گئی لیکن وہ تین دن بخار میں پڑا رہا تھا اور زینو کھیل کود بھول کر سارا سارا دن اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔

ایک روز ننھی زینو نے اسے کہا — ''ابو! میں نہ ہوتی تو تم وہیں بے ہوش ہو جاتے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلتا اور تم مر جاتے'' — ابرار کو آج بھی یاد تھا کہ اسے غصے آ گیا تھا اور اس کی ننھی سی مردانگی کو دھچکا سا لگا تھا۔ آج اٹھارہ برس بعد اسے زینو اچانک یاد آ گئی تھی ورنہ اس سے پہلے ایک لمحے کے لیے اسے کبھی زینو یاد نہ آئی تھی۔

وہ تڑپ کے اٹھا اور اسے تلخ سا خیال آیا کہ آج زینو بھی مجھ جتنی ہو گئی ہو گی، لیکن کہاں ہو گی؟ وہ شاید پاکستان نہیں آئی تھی برادری تو ساری لائل پور (فیصل آباد) میں آباد ہو گئی تھی لیکن نہ زینو نظر آئی نہ اس کے ماں باپ نہ چچے نہ تائے۔ آہ بے چارہ سارا خاندان کٹ گیا ہو گا، لیکن ابرار کو یہ خیال بھی آیا کہ زینو بڑی پیاری سی بچی تھی۔ اسے کوئی ہندو نہ اٹھا لے گیا ہو۔ ابرار کا سینہ تھرکنے لگا اور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ زینو بھی عزت و آبرو کی مقدس علامت بن گئی۔ اس کا خون کھولنے لگا جیسے زینو ہندوستانیوں کے قبضے میں ہے...... زینو، گاؤں کی بیٹی، پاکستان کی عزت۔

جانے وہ کتنی دیر وہیں بیٹھا ان گدھوں کے غول کو دیکھتا بچپن کی باتیں یاد کرتا رہتا لیکن فضا میں گھن گرج سی گونجی تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ دو پاکستانی سیبر جیٹ طیارے خاصے نیچے نیچے، اکھنور کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ابرار نے طیاروں کے پروں تلے راکٹ لگے دیکھے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ بلند آواز سے بولا

— ''او جیو......او جیو...... اللہ راکھا'' — اور وہ چھبیس ستائیس برس کا جیالا ابرار علی بن گیا۔

وہ دوپہر کا کھانا کھانے ایک درخت تلے بیٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ کمپنی کے جوانوں کے چہروں کے تاثرات بدلے بدلے سے ہیں اور وہ دو دو چار چار الگ الگ کھڑے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ کوئی بات ضرور تھی۔ ابرار نے میس ٹن اٹھایا اور روٹیاں دوسرے ہاتھ میں لے کے اٹھا۔ وہ کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا بات ہے کہ اتنے میں اللہ داد آ گیا۔

''ابو! ابو!'' — اللہ داد نے بے قابو سے لہجے میں کہا — ''ہندوستانیوں نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے''۔

''قسم سے؟...... کب؟''

''قسم سے۔ دو روز ہوئے'' — اللہ داد نے کہا — ''ہم جنگلوں میں پچھلے مورچوں میں پڑے ہیں، آگے پیچھے کی کچھ خبر ہی نہیں''۔

''ہمیں بتایا کیوں نہیں گیا؟''

''بتانے کا آرڈر نہیں تھا'' — اللہ داد نے کہا — ''کمپنی کمانڈر کے اردلی نے ابھی ابھی رازداری سے بتایا ہے اور سرور سگنیلر بھی کہتا ہے کہ اس نے اپنے وائرلیس سیٹ پر خبر سنی تھی......''

''پھر کیا ہوا داد؟ ساری بات بتاؤ نا!'' — ابرار نے میس ٹن زمین پر رکھ کر بے چین ہو کر پوچھا — ''داد گرائیں! دشمن لاہور کے اندر...... کہیں لاہور کے اندر تو......'' اور اس کی زبان ہکلانے لگی۔ وہ اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ دشمن لاہور کے اندر تو نہیں آ گیا۔ اس کے ہونٹ تھرکے اور جذبات ابھر کر چہرے پر آ گئے۔ اَن پڑھ سپاہی کو بیان کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس نے لمحہ بھر خلاؤں میں گھورا، آنکھیں لال سرخ ہو گئیں۔ اس نے روٹیاں پھینک کر اللہ داد کے کندھے تھام لئے اور کندھوں کو جھنجھوڑ کر لرزتی مگر گرجتی آواز میں پوچھا — ''داد! چپ کیوں ہو گئے؟ دشمن شہر کے اندر تو نہیں آ گیا؟...... لاہور کے بچے کہاں گئے؟ بچوں کی مائیں کہاں گئیں؟...... نہیں...... نہیں......'' اس کی آواز اور زیادہ بلند ہو گئی — ''ہمارے جوان زندہ ہیں...... داتا کی نگری میں......؟''

اوراس کی آواز جذبات کے بھنور میں ڈوب گئی۔

اللہ داد نے زمین سے روٹیاں اٹھا کرانہیں چوما پھر سینے پر رکھ کرہنس پڑااور بولا ——

''رزق کی بے ادبی نہ کرو، ابو!...... دشمن واہگے سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہماری ایک ایک پلاٹون نے ایک ایک بریگیڈ کو مار مار کر پیچھے ہٹا دیا ہے، لیکن لڑائی بڑے زور کی ہو رہی ہے''۔

ابرارعلی نے کھانا نہ کھایا۔ اس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ بگلے کا سگریٹ سلگا کر اس نے پیڑ سے پیٹھ لگالی۔ جب ڈیوٹی دینے لگا تو رائفلوں کے کندلوں پر پہرہ دیتے کھویا کھویا اور بے چین رہا۔ اس وقت کے بعد کمپنی کے جوانوں کی بے تابی کا یہ عالم ہوگیا کہ سگنیلروں کو گھیرے میں لئے رکھتے تھے۔ کمپنی کمانڈر اپنے جوانوں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ جوان اسے بھی گھیر لیتے تھے اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے —— ''صاحب! ہم لاہور کب مووہوں گے؟...... جوڑیاں کے مورچے پکے ہیں...... صاحب! ہم وطن کی خاطر لڑنے کے لیے بھرتی ہوئے ہیں، پہرہ دینے کے لیے نہیں...... صاحب! لاہور کی کیا خبر ہے؟......''

بارکوں کی بات اور تھی یہ محاذ تھا، جوان بارکوں میں سپاہی تھے۔ محاذ پر وہ اتنے ہی مجاہد تھے جتنا کمپنی کمانڈر۔ 'سلوپ آرمز' اور 'پریزینٹ آرمز' کے کاشن بارکوں میں رہ گئے تھے۔ محاذ پر پاکستانی جیالے مووا ور ایڈوانس کے سوا کوئی اور حکم سننے پر تیار نہ تھے۔ وہ کھانا کم اور ایمونیشن زیادہ مانگتے تھے۔

تیسرے دن کمپنی کمانڈر نے وسل بجائی۔ حوالدار میجر بھاگا گیا۔ کمپنی کمانڈر نے اسے کچھ کہا اور حوالدار بھاگا آیا اور ساری کمپنی میں بھاگم بھاگ بپا ہوگئی۔ ٹرک آ گئے۔ سپاہی کود کر ٹرکوں میں سوار ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کنوائے جوڑیاں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ جوڑیاں پر قبضہ اور مورچہ مضبوط ہو چکا تھا۔ اس کمپنی کی جگہ کسی اور پلٹن کی کمپنی وہاں بھیج دی گئی تھی۔ ادھر سے ابرارعلی کی ساری بٹالین جو آگے چلی گئی تھی واپس آ رہی تھی۔ کنوائے اُڑا جا رہا تھا اور سپاہی سیکشن اور پلاٹون کمانڈروں سے ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے —— ''کس طرف؟ لاہور؟ واہگہ......'' اور انہیں کوئی تفصیلی جواب نہیں مل رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ دشمن نے اس طرف سے بڑے زور کا حملہ کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کنوائے کے اوپر سے ایک پھر دوسرا اور اس کے بعد تین چار سیبر جیٹ غراتے گذر گئے۔ سپاہیوں نے اوپر دیکھا اور تمام ٹرکوں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ سپاہیوں کا خیال تھا کہ وہ لاہور سیکٹر میں لڑنے جا رہے ہیں اور انہیں اندازہ تھا کہ لاہور ابھی بہت دور ہے لیکن توپوں کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ جوں جوں کنوائے آگے بڑھ رہا تھا گولہ باری قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر یہ شور قیامت کا شور بن گیا۔ سپاہیوں نے ٹرکوں سے اٹھ کے دیکھا۔ انہیں زمین کا ایک وسیع خطہ نظر آیا جس سے سیاہ دھوئیں اور مٹیالی گرد کے گھنے بادل اٹھ اٹھ کر آسمان پر چھا رہے تھے۔ کوئی پتہ نہ چلتا تھا کہ اس میلوں گرد و غبار آلود وسعت میں توپیں ہیں یا ٹینک یا بارودی سرنگیں پھٹ رہی ہیں یا اوپر سے بم گر رہے ہیں۔ کچھ نظر نہ آتا تھا، نہ کوئی انسان دکھائی دے رہا تھا۔ زمین دھواں، گرد اور دھماکے اگل رہی تھی۔

سپاہیوں کو صرف ریل کی پٹڑی دکھائی دے رہی تھی جو آگے جا کر دھوئیں اور گرد میں چھپ گئی تھی۔ ایک ٹرک میں کسی نے کہا —— ''یہ لاہور تو نہیں'' —— ایک اور بولا —— ''سیالکوٹ ہے......'' کسی اور نے کہا۔ ''چونڈہ ہے بھائی، مجھے معلوم ہے......'' کوئی اور بولا —— ''سیالکوٹ ہے، سیالکوٹ ہے'' —— آخر نائک سلامت خان نے حرفِ آخر کہا —— ''نہیں۔ یہ چونڈہ ہے۔ سیالکوٹ ہی سمجھو لیکن یہ میدان چونڈے کا ہے''۔

اور سپاہیوں کو ابھی تک علم نہ تھا کہ ہندوستان تین پیادہ اور ایک بکتر بند ڈویژن سیالکوٹ پر لے آیا ہے اور اس کی توپوں کے گولے سیالکوٹ چھاؤنی میں پھٹ رہے ہیں۔ پاکستانی جوانوں کو ابھی یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ اس میدان میں کودنے والے ہیں جو جنگوں کی تاریخ میں سب سے بڑا اور خونریز معرکہ ہوگا۔ چھ سو ٹینک ایک ہی معرکے میں کبھی نہیں لائے گئے تھے لیکن ہندوستان کا جنرل چودھری لاہور کی دہلیز پر منہ کی کھا کر ٹینکوں کے زور پر سیالکوٹ کے راستے پاکستان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چناب تک کے علاقے پر قابض ہو کر لاہور کے دفاعی مورچوں کو گھیرے میں لے کر پاک فوج سے ہتھیار ڈلوائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ساری بکتر بند قوت اکٹھی کر کے چونڈے کے میدان میں پھینک دی۔

پاکستان تاریخ کے بھیانک موڑ پر کھڑا تھا۔

کنوائے رک گیا۔ جوان کود کر اتر آئے۔ اب ٹینکوں اور توپوں کے گولے ان کے قریب آ آ کے پھٹ رہے تھے۔ گرینیڈوں کے بکس کھل گئے اور جوان حکم کا انتظار کئے بغیر بکسوں پر ٹوٹ پڑے۔ پتلونوں کی جیبوں، میں لمبے ایمونیشن پوچوں میں اور بنڈولیئرز میں ایک ایک سپاہی جس قدر گرینیڈ اٹھا سکتا تھا اٹھا لئے۔ کمپنی کمانڈر نے سب کو بلا کر لرزتی آواز میں کہا۔

''میرے پاکستانی جوانو! آج ڈیپلائے کا کوئی آرڈر نہیں ہے۔ آج ہر جوان خود کمپنی کمانڈر اور خود پلاٹون کمانڈر ہے۔ آج تم میرے حکم سے نہیں، خدا کے حکم سے لڑو گے......'' کمپنی کمانڈر کی آواز میں انوکھی سی گرج پیدا ہوگئی اور وہ گردن تان کر بولا ــــ ''آج تم لڑو گے جوانو! تم آج خدا کو لڑ کے دکھاؤ گے۔ اس گرد اور دھوئیں میں ٹینک اور توپیں ہیں۔ تم آرمرڈ ڈویژن کے مقابلے میں جا رہے ہو۔ یاد رکھو، تھری ناٹ تھری کی گولی تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ یہ گرینیڈ اور بیونٹ کی لڑائی ہے، ٹینک پر کود کر ٹینک کے اندر گرینیڈ پھینکنے کا جو سبق تمہیں پڑھایا گیا تھا آج اس کا عملی امتحان ہے، جوانو! اور یاد رکھو...... اگر دشمن کا ایک بھی ٹینک اس ریلوے لائن سے اس طرف آ گیا تو رائفلیں تمہارے پاس ہیں، ایک ایک گولی اپنے اپنے سینے میں مار لینا یا ہندوستان کی سرحد میں چلے جانا۔ پاکستانی قوم سمجھ جائے گی کہ تم پاکستانی نہیں ہندوستانی تھے۔ یہ ریلوے لائن پاکستان کی آبرو ہے۔ دشمن کا قدم اس لائن پر نہ پڑے...... اور ڈرائیو جوان! ٹرک دور پیچھے لے جاؤ، ٹرک اکٹھے کھڑے نہ کرنا''۔

''صاحب بہادر!'' ــــ ایک ڈرائیور بول پڑا ــــ ''ٹرک پاکستان سے زیادہ قیمتی نہیں۔ ہم ٹرکوں کی چوکیداری نہیں کریں گے۔ ہم لڑیں گے، ہم بارکوں میں ڈرائیور ہیں، یہاں سپاہی ہیں''۔

یہ صریحاً حکم عدولی تھی لیکن کمپنی کمانڈر پر رقت طاری ہوگئی۔ آہستہ سے بولا ــــ ''یہ تمہاری جنگ ہے۔ میرا کوئی حکم نہیں''۔

''اور کوشش کرنا میرے جوانو!'' ــــ کمپنی کمانڈر نے کہا ــــ ''کہ اپنے ساتھی سے ملاپ نہ ٹوٹے۔ دو دو ہو کے لڑو گے تو ایک دوسرے کا ایمونیشن کام آئے گا۔ اوپر بھی دھیان رکھنا، ہماری ایئر فورس ہماری مدد کر رہی ہے۔ اپنے ہوائی جہازوں کے راکٹوں

سے بچنا''۔

اور بٹالین کے پانچوں کمپنی کمانڈروں کی ہدایت یہی اور جذباتی کیفیت بھی یہی تھی۔ یونٹ کمانڈر تک نے ڈیپلائے کی کوئی سکیم نہ سوچی وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ لڑائی باقاعدہ ڈیپلائے کی نہیں بلکہ آہنی چٹانوں سے ٹکرا جانے والا معرکہ ہے۔ اسے اپنے جوانوں پر بھروسہ تھا اور جوانوں کو قادرِ مطلق پر بھروسہ تھا۔ آسمان لرز رہا تھا۔ پہیوں پر رینگتے، آگ اگلتے، لوہے کے قلعے، لوہے کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ ابرار علی کے کمپنی کمانڈر نے آخری بار کہا ــــ ''پاکستانیو! پاکستان کے نام پر...... بولو نعرہ تکبیر......'' اور ''اللہ اکبر'' کی گرج یوں بلند ہوئی جیسے کئی توپوں نے مل کر فائر کر دیا ہو۔

جوان بڑھ گئے اور بکھر کر آگ، دھوئیں اور گرد میں گم ہو گئے اور ان تین سو تیرہ جانبازوں کی روحیں مسکرا اٹھیں جو تیرہ صدیاں گذریں ایک ہزار کے لشکر میں کود گئے تھے۔

یہ سیالکوٹ کے معرکے کا جذباتی پہلو تھا۔ گو کمپنی کمانڈر نے جذبات کی رَو میں بہہ کر کہہ دیا تھا کہ آج ڈیپلائے کا کوئی آرڈر نہیں لیکن ایک ایک دو دو کمپنیوں کو جب اپنے ٹینک سکواڈرنوں کے ساتھ اٹیچ کیا گیا تو ٹینکوں اور پیادہ جوانوں کا ڈیپلائے کلاسیکی صورت اختیار کر گیا۔ دشمن کے توپ خانے اور ٹینکوں کی گولہ باری اور اس قدر شدید اور تیز تھی کہ نظری ملاپ محال ہو گیا تھا اور قدم قدم پر موت دندنا رہی تھی۔ اوپر سے دشمن کے طیاروں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔ اس قیامت میں پاؤں جمانا ممکن نہ تھا لیکن پاک فوج کی ٹینک رجمنٹ کے کمانڈروں نے پاک انفنٹری کی ایک ایک کمپنی کو ساتھ لے کر جنگی اہلیت کا قابلِ داد مظاہرہ کیا۔ یہ ٹینکوں کی جنگ تھی جس میں ٹینک آگے اور انفنٹری پیچھے ہونے چاہئے تھی لیکن انفنٹری کی جاں نثاری کا یہ عالم کہ آر، آر اور راکٹ لانچروں والے ٹینکوں سے آگے نکل گئے تھے۔

چونڈے کا معرکہ انسان اور انسان کا نہیں، انسان اور ٹینک کا تھا۔ ٹینک اور رائفل کا تھا۔ سٹین گن اور توپ کا تھا۔ پاکستانی پیادہ بریگیڈ اور ہندوستانی بکتر بند ڈویژن کا تھا۔ پچاس ہزار آہن پوش بھارتیوں کے مقابلے میں نو ہزار پاکستانی لڑ رہے تھے، چھ سو ہندوستانی ٹینکوں کے مقابلے میں سو ڈیڑھ سو پاکستانی ٹینکوں نے پاکستان کی آن کو بچائے رکھنے کی قسم کھا کر دیوار کھڑی کر دی تھی اور خدا کے سوا کون کہہ سکتا تھا کہ چھوٹی جماعت بڑی

جماعت پر غالب آ سکتی ہے۔

ابرار علی اور اللہ داد اکٹھے رہے۔ میدان میں انہیں ''اللہ اکبر'' اور ''علی حیدر'' کے بکھرے بکھرے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ دونوں نے رائفلوں کے سلنگ کندھے سے چڑھا کر گلے میں ڈال لئے۔ یہ رائفلوں کی جنگ نہیں تھی۔ انہوں نے ایک گرینیڈ کی پلیٹیں الگ کر کے سیفٹی پن نکال لیے اور گرینیڈوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ ٹینک بھیانک گڑگڑاہٹ سے ان کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

دشمن کی پوری ٹینک رجمنٹ پوری پیادہ پلٹن کے دوش بدوش سپاہی ابرار اور اللہ داد کی کمپنی کے مقابلے کے لیے آ رہی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ بھارتی توپ خانہ اپنے حملہ آور بکتر بند اور پیادہ دستوں کو گولہ باری کی بارش سے ''کور'' کر رہا تھا۔

اپنی ٹینک رجمنٹ کے لفٹیننٹ کرنل نے ٹینکوں کو اور زیادہ پھیلا دیا۔ انفنٹری کی آر۔ آر اور راکٹ لانچروں کی پوزیشنیں بھی تبدیل کر دیں۔ اپنے ٹینکوں اور انفنٹری کے لیے آڑ خاصی اچھی تھی۔ دائیں طرف کوئی دو سو گز دور کماد کا گھنا کھیت تھا۔ آر کے لیے کماد نہایت مفید آڑ تھی لیکن دو سو گز کا بے آڑ فاصلہ طے کرنا موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ دشمن نے یک لخت گولہ باری اور شدید کر دی۔ زمین اور آسمان سیاہ دھوئیں میں چھپ گئے اور اس گھٹا ٹوپ میں پھٹتے گولوں کے شعلے چمک چمک کر لوہے کے لال انگارہ ٹکڑوں اور پتھروں کی بارش برسانے لگے۔ دشمن کے ٹینک اور پیادہ دستے اس گرد و غبار میں روپوش ہو گئے لیکن اپنے کمانڈر جانتے تھے کہ دشمن اس سیاہ دھوئیں میں بڑھتا آ رہا ہے۔

سپاہی ابرار علی نے جوڑیاں کا معرکہ لڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جنگ اسی طرح لڑی جاتی ہے مگر سیالکوٹ میں جب اس نے اس قدر گولہ باری اور دشمن کے اتنے ٹینک دیکھے تو وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا وطن اس سے بہت بڑی قربانی مانگ رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی کا آخری معرکہ لڑنے کے لیے تیار کر لیا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ذات میں ایک اور انسان چھپا بیٹھا ہے جو مرنے سے گھبرا رہا ہے۔ اس سے ذرا ہی دور تین چار گولے پھٹے تو اس نے سرزمین سے لگا کر دونوں بازوؤں سے چہرہ چھپا لیا۔ اسے اپنا کوئی ساتھی نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ وہ اس سے دور نہیں تھے۔ سب مورچوں میں یا کسی

کھیت کی مینڈھ کے پیچھے آڑ میں تھے لیکن دھواں دھار میں سبھی چھپ گئے تھے۔

تیس چالیس گز دور، دائیں طرف اسے اپنے ایک ٹینک کی گن نظر آئی۔ ٹینک آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی گن نے یکے بعد دیگرے دو گولے فائر کئے لیکن وہ تیسرا گولہ فائر نہ کر سکا کیونکہ دشمن کے ٹینکوں کے جانے کتنے گولے اس اکیلے ٹینک کو آ لگے تھے۔ ٹینک گھوما اور دوسرے لمحے اس سے شعلے اٹھنے لگے۔ ابرار نے اس سے ایک آدمی کو کود کر باہر آتے دیکھا۔ اس کی ڈانگری کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ابرار کا جسم لرزا اور وہ اٹھ کر اس کی طرف بھاگا۔ وہ آدمی زمین پر لیٹ کر لڑھکنیاں کھانے لگا۔ ابرار رائفل پھینک کر اس پر ہاتھوں سے مٹی پھینکنے لگا۔ ڈانگری اتار پھینکی۔ ابرار دیکھ رہا تھا کہ اس جوان کا چہرہ بھی جھلس گیا تھا اور ہاتھ بھی لیکن اس نے ابرار سے کہا — ''گرائیں لیٹ جاؤ'' — ابرار نے اپنے جھولے سے فیلڈ پٹی نکالی اور اسے کہنے لگا — ''لو میں تمہارے زخموں پر پٹی لپیٹ دیتا ہوں۔ تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے''۔

''بہنے دو گرائیں! ہم زندہ رہنے کے لیے نہیں آئے''۔

دونوں لیٹ گئے۔ ٹینک کا زخمی جوان اپنے جلتے ہوئے ٹینک کو دیکھنے لگا اور اس کے آنسو بہہ نکلے۔ اس کا کوئی بھی ساتھی ٹینک سے نہیں نکل سکا تھا۔

ابرار کا سینہ تھرک تھرک کر بے قابو ہونے لگا۔ ٹینک کے اس جوان کے بہتے خون کو دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے اپنی رائفل کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن یہ ٹینکوں کی جنگ تھی۔ جہاں رائفل کی حیثیت لاٹھی سے زیادہ نہیں تھیں۔ میدانِ جنگ میں ٹینک، آر۔ آر گنیں اور راکٹ لانچر دھاڑ رہے تھے۔ مسلسل دھماکوں سے دماغ ماؤف ہوئے جا رہے تھے۔ قیامت کے ان دھماکوں میں ابرار کو اپنی کمپنی کے ''اللہ اکبر'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے لیکن نعرے بکھرے ہوئے تھے۔

دشمن کا توپ خانہ یک لخت خاموش ہو گیا لیکن اس کے ٹینکوں کی گولہ باری اور شدید اور قریب ہو گئی بائیں طرف تھوڑی دور تک کا علاقہ دھوئیں سے صاف ہونے لگا۔ ٹینک کے زخمی جوان نے ابرار سے پوچھا — ''گرائیں راکٹ لانچر چلا سکتے ہو؟'' — ابرار نے کہا — ''ہاں'' — تو زخمی نوجوان نے کہا — ''اٹھو، بھاگ کر آؤ''۔

دونوں اٹھ بھاگے۔ ان کے اردگرد گولے پھٹ رہے تھے اور ان کے سروں کے

اوپر سے اپنے توپ خانے اور ٹینکوں کے گولے گذر رہے تھے۔ ٹینک کے زخمی جوان نے دیکھ لیا تھا کہ ابرار کی کمپنی کے ایک راکٹ لانچر کے جوان شدید زخمی ہو گئے تھے۔ جب ابرار اور وہ ان کے مورچے میں پہنچے تو ابرار کے دل کی دھڑکن رک گئی۔ اس کے سامنے اپنے عزیز دوست لانس نائک نور خان کی لاش پڑی تھی اور دوسری لاش اس کی پلاٹون کے سپاہی جہانداد کی تھی۔ راکٹ لانچر محفوظ تھا اور گولے بھی پاس ہی پڑے ہوئے تھے۔ دونوں مشین گن کے فائر سے شہید ہوئے تھے۔ ابرار کو یوں لگا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس نے لپک کر راکٹ لانچر اٹھا لیا اور ٹینک کے زخمی جوان نے گولے اٹھا لیے۔ اس کا خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ اس نے ابرار کو پوزیشن لینے کے لیے کہا لیکن ابرار بولا—— ''یہاں نہیں۔ اس کماد میں چلتے ہیں''۔

ٹینک کا جوان ابرار کا منہ دیکھنے لگا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کماد کا کھیت وہ اڑھائی سو گز دور ہے اور یہ سارا فاصلہ دشمن کے فائر کی زد میں ہے۔ دو اڑھائی سو گز کے فیلڈ آف فائر سے زندہ گذر جانا ممکن نہ تھا۔ راستے میں کوئی آڑ نہیں تھی لیکن ابرار کھیت کی طرف بھاگ اٹھا۔ اسے صرف گرد و غبار کی آڑ میسر تھی۔ ٹینک کا زخمی جوان گولوں کے بوجھ تلے اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ دشمن کی مشین گنوں کی بوچھاڑیں ان کے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں پڑتی رہیں۔ گولے ان کے گرد پھٹتے رہے۔ ان کے سروں پر موت چیختی چنگھاڑتی رہی لیکن ابرار کو دو عزیز ساتھیوں کی لاشوں نے پاگل بنا ڈالا تھا اور ٹینک کا زخمی جوان اپنے ٹینک اور ساتھیوں کے خون بدلہ لینے کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

دونوں کماد کے کھیت میں جا گھسے۔ دشمن پہلے ہی کھیت کے اندر مشین گن فائر کر رہا تھا تا کہ پاک فوج کا کوئی جوان کماد میں نہ آ سکے۔ ابرار اور اس کا زخمی ساتھی اندھا دھند کھیت میں جا گھسے اور اگلی مینڈھ تک جا پہنچے۔ وہاں سے انہیں دشمن کے بکھرے ہوئے ٹینک اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ فاصلہ تھا تو زیادہ لیکن موزوں تھا۔ انہوں نے ایک راکٹ لوڈ کیا۔ ابرار نے نہایت تحمل سے فائر کیا۔ دشمن کا ایک ٹینک ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ دوسرا راکٹ لوڈ کیا اور دوسرے لمحے دشمن کا ایک اور ٹینک جلنے لگا۔

اُن کے سامنے گرد اڑی اور انہیں اپنے سروں کے اوپر سے گذرتی گولیوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ابرار نے چلا کر کہا—— ''لرائیں! راکٹ دو''—— لیکن اس کا اجنبی ساتھی

اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کا دایاں کندھا اور سینہ کھل گیا تھا۔ اس نے دشمن کی مشین گن کا پورا برسٹ کندھے اور سینے پر لیا تھا۔ ابرار اکیلا رہ گیا۔ خدا کے سوا اب اس کا ساتھی راکٹ لانچر اور تین راکٹ تھے۔ اس دیکھنے والا کوئی نہ تھا اسے حکم دینے والا کوئی نہ تھا اور اسے فائر سے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ساری کمپنی، ساری پلٹن اور ساری کی ساری پاک فوج شہید ہو گئی ہو اور پاکستان کی آبرو کو دشمن سے بچانے کے لیے وہ اکیلا رہ گیا ہو۔

اُسنے پوزیشن بدل لی اور باقی تین راکٹ بھی فائر کر دیئے پھر شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔

پاکستانی مجاہد اپنی اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ چونڈہ کا میدان تیس چالیس میلوں پر پھیل گیا ہے اور ہندوستانی ٹینکوں کے پیچھے پیادہ ڈویژن چلے آ رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کرۂ ارض کے تمام آتش فشاں پہاڑ چونڈے میں سرک آئے ہیں۔ پھٹ رہے ہیں اور ان کا لاوا، جلتے ہوئے پتھر اور ان کے شعلے سیالکوٹ کو خاکستر کرنے بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

پاکستانی جانباز سینوں سے بارودی سرنگیں باندھ کر، گرینیڈ ٹینکوں پر کود کر ٹینکوں کے اندر پھینک کر، بزوکا رائفلیں کولہوں سے لگا لگا کر دشمن کی آہنی صفیں توڑ رہے تھے، زخمی ہو رہے تھے اور شہید ہو رہے تھے۔ پاکستانی ہوا باز ایک دوسرے کے پیچھے چونڈہ کے تاریخی میدانِ کارزار میں آسمانی بجلیوں کی طرح کڑک، گرج اور چمک رہے تھے۔

اور پاکستانی جیالے آہنی دیواریں توڑ کر پیادہ ہندوستانی ڈویژنوں میں گھس گئے تھے اور دست بدست معرکہ شروع ہو چکا تھا لیکن آوازیں اٹھ رہی تھیں—— ''پاکستانی جوان پیچھے ہٹ آؤ...... پاکستانی جوانو آگے نہ بڑھو''—— لیکن پاکستانی جوان پیچھے ہٹنے کے صرف ایک معنی جانتے تھے...... پسپائی...... اور وہ پسپا ہونے کے لیے میدان میں نہیں کودے تھے۔ وہ سرتاپا شعلے بن چکے تھے۔ وہ سمجھنا ہی نہ چاہتے تھے کہ زیادہ آگے نہ جانا جنگی لحاظ سے سودمند ہے حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی ٹینک چونڈہ کا میدان ہار کر اپنے پیادہ سپاہیوں کو کچلتے پیچھے کو بھاگ رہے تھے اور اوپر سے پاکستانی طیارے ان پر آگ برسا رہے تھے۔

نو ہزار سے کم پاکستانیوں نے پچاس ہزار ہندوستانیوں کو آنکھیں کھول کر بھاگنے بھی نہ دیا۔ ہندوستانی ٹینکوں نے ہندوستان کے ان ہاتھیوں کی روایت کو زندہ کر دکھایا جو اپنے لشکر کو کچلتے بھاگ گئے تھے۔ ہندوستانی اپنی ''بلیک ایلیفنٹ'' (سیاہ ہاتھی) نامی ٹینک کو اور ''فخر ہند'' کو بھی چونڈے کے میدان میں لائے تھے۔ انہوں نے جھانسی سے اپنی مایۂ ناز سولہویں کیولری کو بھی بلا کے چونڈے کے تنور میں جھونک دیا تھا۔ ہندوستان والے سولہویں کیولری کا نام اکثر یوں لیا کرتے تھے۔ جیسے وہ اس کے بل بوتے پر ساری دنیا کو فتح کر لیں گے۔

ابرار علی اور اس کے دوش بدوش لڑتے مجاہدوں کو وقت کا کچھ احساس نہ تھا۔ سورج کب نکلا؟ کب ڈوب گیا؟ سورج نکلا بھی تھا یا نہیں؟ کسی نے نہ دیکھا۔ گولوں کے سیاہ دھواں دھار میں جانے کتنے سورج ڈوب گئے تھے۔ پاکستانی مجاہد اپنے سینوں اور روحوں کی روشنی میں لڑ رہے تھے، گر رہے تھے، اٹھ رہے تھے اور یا علی کے نعروں پر قربان ہو رہے تھے۔

سپاہی ابرار علی نے محسوس کیا جیسے ہر سو خاموشی طاری ہو گئی ہو۔ اسے وقت کا، سمت کا کچھ احساس نہ تھا اور نہ یہ احساس کہ وہ چل رہا ہے۔ کھڑا ہے لیٹا یا بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔ سانس اس قدر تیز کہ حلق اور ناک میں آتی جاتی سانسوں کے تصادم سے اس کا دم گھٹنے لگا اور اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ بے حس ہو گیا ہے لیکن اب ایک آواز سنائی دے رہی ہے ـــــ ''ابرار علی! تم مر گئے ہو، تم اب جسم نہیں، روح ہو'' ـــــ اس آواز پر وہ چونک اٹھا اور اس کی رگ رگ میں مسرت و شادمانی کی پُر لذت رو دوڑ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی ـــــ ''میں شہید ہو گیا ہوں۔ اللہ کے نام پر۔ پاکستان کی آن پر۔ آسمانوں کے فرشتو! مجھے سینے سے لگا لو''۔

''گرائیں!......'' اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی ـــــ ''ہانڈی وال!......''

پھر کسی نے اسے جھنجھوڑا اور ذرا بلند آواز سے پکارا ـــــ ''گرائیں جی!''

وہ چونکا۔ جانے کس پلٹن کا ایک لانس نائیک اسے بازو سے تھامے ہلا رہا تھا۔ ابرار اپنے آپ میں آ گیا اور دیکھا کہ وہ میدانِ کارزار میں ایک درخت کے تنے کے سہارے کھڑا ہے۔ اس نے ایک ہاتھ میں ایک گرینیڈ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جس کا سیفٹی پن نکلا

ہوا تھا۔ اگر اس خود فراموشی یا تکان کی غشی میں اس کی گرفت ذرا سی بھی ڈھیلی ہو جاتی تو گرینیڈ اس کے ہاتھ میں ہی پھٹ جاتا۔ جونہی اس نے گرینیڈ کو دیکھا وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ سامنے دیکھا، ایک ہندوستانی ٹینک کھڑا تھا...... ابرار علی نے یا علی کا نعرہ لگایا اور ٹینک کی طرف بھاگ اٹھا لیکن لانس نائیک نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا اور کہا ـــــ ''رکے رہو، دوست! وہ ٹینک ٹوٹا ہوا ہے۔ دشمن بھاگ گیا ہے''۔

ابرار نے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر وہ آئینہ دیکھتا تو اپنے آپ سے ڈر جاتا۔ بارود اور گرد سے اس کا چہرہ سیاہ کالا ہو گیا تھا اس کے سر پر فولادی ٹوپی نہیں تھی، جانے کہاں گر پڑی تھی۔ قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ پتلون ایک طرف سے پھٹ گئی اور چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی پشت سے خون بہہ رہا تھا اور اسی ہاتھ میں اس نے ''لائیو'' گرینیڈ پکڑ رکھا تھا۔ اس کی سانسوں سے بارود کی تیز بو آ رہی تھی۔

''پن کہاں ہے؟'' ـــــ لانس نائیک نے گرینیڈ کی طرف دیکھ کر گھبراہٹ سے پوچھا ـــــ ''تم ہوش میں نہیں ہو، گرائیں! مٹھی دبائے رکھنا''۔

ابرار اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا۔

لانس نائیک اِدھر اُدھر پن تلاش کرنے لگا۔ وہاں پنوں کی کیا کمی تھی۔ ہزارہا گرینیڈ چلے تھے۔ اسے مٹی میں پڑی ہوئی ایک پن مل گئی جو اس نے اٹھا کر ابرار کے گرینیڈ میں ڈال دی اور گرینیڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''جنگ ختم ہو گئی ہے گرائیں!'' ـــــ لانس نائیک نے کہا ـــــ ''دشمن لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے''۔

''سیالکوٹ ٹھیک ہے؟'' ـــــ ابرار نے مری مری سسکی کے لہجے میں پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے، گرائیں!'' ـــــ لانس نائیک نے کہا۔

ابرار کی ٹانگیں لرزیں اور اسے یکبارگی یوں محسوس ہوا جیسے جسم کا جوڑ جوڑ عضو عضو الگ الگ ہو گیا ہے اور وہ جیسے یہی خبر سننے کے لیے کھڑا تھا کہ سیالکوٹ ٹھیک ہے۔ اس کا جسم کانپا اور وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ لانس نائیک نے اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر اسے بازو سے تھاما، اٹھایا اور اپنے ساتھ لے چلا۔ لانس نائیک نے کہا ـــــ ''میرے ساتھ آؤ ہم اپنے جوانوں کو اکٹھا کر رہے ہیں۔ سیالکوٹ میں سب اچھا ہے۔ دوست!......'' لانس نائیک نے

آہ لی اور بولا ـــــ ''میرے گرائیں! میں جانتا ہوں تمہیں کیا ہو گیا ہے اور تم کیا محسوس کر رہے ہو۔ ہمارے تمام جوانوں کا یہی حال ہے ہم تو دو دن اور دو راتیں مسلسل لڑے ہیں...... یہ جنگ نہیں تھی گرائیں جی! ہم نے آگ اگلنے والے کالے پہاڑوں کو سر کی ٹکروں سے توڑ پھوڑ دیا ہے...... یہ جنگ نہیں تھی۔ تم اکیلے ہی نہیں، ہم سب پاکستانی جوان پاگل ہیں۔ ہم پاگل ہو گئے تھے ورنہ پاکستان کا اللہ بیلی تھا جس طرح تم ابھی ابھی ٹوٹے ہوئے ٹینک کی طرف اٹھ بھاگے تھے، ہمارے تمام جوان اسی طرح پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ واپس نہیں آ رہے۔ ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے ٹینکوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ رکتے نہیں کسی کا حکم نہیں مانتے۔ کہتے ہیں، نہیں، ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی...... ہم انسان نہیں رہے گرائیں جی! اگر ہم انسان ہوتے تو پاکستان کی آن کچلی گئی تھی''۔

ابرار چپ چاپ اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ لانس نائک نے دیکھا۔ ابرار کی آنکھوں میں آنسو تھے ـــ ''کیوں دوست! آنسو؟ سپاہی رویا تو نہیں کرتے، گرائیں!...... ابرار کے آنسو بہہ نکلے اور اس کے گالوں پر بارود اور گرد کی جمی ہوئی تہہ میں سے ٹیڑھی سی لکیر بناتے ٹھوڑی تلے غائب ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا ـــ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''چونڈہ''۔

ابرار نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور مٹی کو چوم کر زمین پر رکھ دیا۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا ـــ ''میرا اللہ سوہنا اس مٹی کو سدا پاک رکھے گا......'' اور وہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔

''پانی پیو گرائیں!'' ـــ لانس نائک نے اسے اپنی بوتل دیتے ہوئے کہا ـــ ''کھانے کا انتظام بھی ہے۔ حوصلہ کرو۔ دماغ ٹھکانے آتے آتے آئے گا''۔

پانی کی بوتل دیکھ کر ابرار کو شدید پیاس کا احساس ہونے لگا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور اسے یاد آیا کہ اس نے جوڑیاں سے چلتے وقت پانی پیا تھا۔ اس نے بوتل کا کارک کھولا اور بے صبری سے ایک سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی۔ اسے چکر آ گیا۔ لانس نائک نے بوتل تھام کر پیچھے کر لی۔ بولا ـــ ''آہستہ گرائیں، پیٹ خالی ہے نا!''

''تم ہی نے یاد دلایا ہے کہ میں پیاسا ہوں'' ـــ ابرار نے کہا ـــ ''ورنہ میں شاید

دو روز اور پانی نہ پیتا'' ـــ اور ابرار کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی۔

لانس نائک نے اسے کھانا کھلایا۔ وہاں بے شمار سپاہی اور عہدیدار کھانا کھا رہے تھے۔ تقریباً سب نے ابرار سے ہاتھ ملایا اور پُر جوش مبارک باد دی۔ سب کے چلنے سے ابرار اپنے چلنے کا اندازہ کر رہا تھا۔ ان میں کوئی بھی مغموم نہ تھا۔ وہ ہنس رہے تھے، اپنے کارنامے سنا رہے تھے، دوسرے کے سن رہے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، چہرے سیاہ کالے، تھکن سے مرجھائے ہوئے، آنکھیں مٹی اور دھوئیں سے لال سرخ، دانت کالے سیاہ، بعض کی آنکھیں سوج گئی تھیں، ہاتھ تقریباً سب کے زخمی تھے، جسموں سے بارود کی بو اٹھ رہی تھی لیکن سب کی مسکراہٹیں جاں فزا اور قہقہے جاندار تھے...... وہ فاتح سپاہی تھے...... وہ کسی تمغے کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ تمغوں کے لیے نہیں لڑے تھے، خدائے ذوالجلال نے انہیں سب سے بڑا تمغہ، ایک عظیم اعزاز عطا کر دیا تھا ـــ فتح اور وہ خدا کے مشکور تھے کہ پاکستان محفوظ تھا۔ پاکستان کی آن محفوظ تھی۔

ابرار علی کو اپنی پلٹن کے جوان مل گئے۔ اس کی اپنی کمپنی کے کئی جوان شہید یا شدید زخمی ہو گئے۔ زخمی ہسپتالوں میں چلے گئے تھے۔ اس کا دوست اللہ دادا ایک ٹینک میں گرینیڈ پھینک کر اپنے گرینیڈ کی زد میں آ کر شہید ہو گیا تھا۔ لانس نائک نور خان نے دو گز کے فاصلے سے ایک ٹینک بزوکا سے فائر کیا اور ٹینک کو تباہ کر کے خود بھی شہید ہو گیا تھا۔ حوالدار امانت علی گجراتیا چار ٹینک توڑ کر شہید ہو گیا تھا۔ جمعدار عابد حسین ہندوستان کے اس ٹینک پر چڑھ کر گرینیڈ پھینکنے لگا تھا جس پر ایک پاکستانی طیارے کے چھوڑے ہوئے دو راکٹ چلے آ رہے تھے۔ ادھر گرینیڈ پھٹا اِدھر راکٹ آ لگے اور جمعدار عابد حسین شہید ہو گیا۔

شہادت کی مسرت اپنی جگہ تھی لیکن وہ ابرار کے دوست تھے جو ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گئے تھے۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ دل پر بوجھ لیے، آہستہ آہستہ چلتا ذرا بلند جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے چونڈہ کا میدانِ کارزار دکھائی دے رہا تھا۔ دور دور تک ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے ٹینک اور ہندوستانیوں کی لاشوں کے انبار بکھرے ہوئے تھے۔ بعض ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے ابھی تک ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا سے گدھ، پر تول کر، میدانِ جنگ کی پُر ہول خاموشی میں اتر رہے تھے۔ آس پاس کے کتے بھی آ پہنچے تھے۔ پاکستانی جوان ان لاشوں میں پاکستانی شہیدوں کی لاشیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہے تھے۔ دور پرے

بدیانہ کی سمت سے توپوں اور ٹینکوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ چونڈہ سے شکست کھا کر اب دشمن بدیانہ میں قسمت آزمائی کر رہا تھا اس نے تازہ دم کمک منگوالی تھی۔

ابرار نے بلند جگہ سے میدانِ جنگ کا ہولناک منظر دیکھا تو اسے یاد آنے لگا کہ اس نے کماد کے کھیت سے راکٹ لانچر فائر کیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت اس قدر دگرگوں تھی کہ وہ معرکے کی ساری باتیں بھول گیا تھا۔ اب اسے ہر بات آہستہ آہستہ یاد آنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنی کمپنی کے بچے کھچے ساتھیوں سے آملا تھا اور رات کو اسے ٹینک شکار پارٹی کے ساتھ آگے بھیجا گیا تھا۔ اس نے ساٹھ ستر گز کے فاصلے سے راکٹ لانچر فائر کیا گیا اور دشمن کا ایک ٹینک برباد کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک اور راکٹ فائر کر کے ایک ٹرک کو آگ لگا دی تھی وہ تیسرا راکٹ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ اس کی گشتی پارٹی (فائٹنگ پٹرول) گھیرے میں آگئی۔ اس کے آٹھ ساتھی رات بھر لڑتے رہے تھے اور صبح کے دھندلکے میں سے پانچ ساتھی زندہ واپس آئے تھے۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اگلا سارا دن ٹینکوں، توپوں اور مشین گنوں کی فائرنگ میں لڑتا رہا تھا۔ اسے جوں جوں باتیں یاد آتی گئیں اس کا دماغ ماؤف ہوتا چلا گیا

ابرار کے اعصاب پہلے ہی چکنا چور تھے۔ دوستوں کی شہادت نے مزید بوجھ ڈالا تو اعصابی نظام بالکل ہی ختم ہوگیا اور اعصاب زدگی کا ردِعمل ظاہر ہونے لگا۔ انسان انسان سے کیوں لڑتا ہے؟ اس قدر انسانوں کا خون کس لئے؟ اللہ داد، نورخان اور سلامت علی، جیسے گبھرو مر کے خاک ہوگئے۔ آخر کیوں؟ کس کی خاطر؟ کیا میری زندگی خون خرابے میں ہی گذر جائے گی؟ بچپن میں ماں باپ کا خون ہوگیا اور بڑے ہو کر میں خود قتل و غارت کرتا پھر رہا ہوں اور لوگ مجھ پر آگ کے گولے برسا رہے ہیں۔

وہ اَن پڑھ سپاہی تھا، فلسفی اور سیاستدان نہیں تھا۔ اس کی علمیت سیف الملوک اور یوسف زلیخا کے قصوں تک محدود تھی۔ وہ بھی اس نے گاؤں کے حافظ سے سنے تھے۔ اب تو اس کا دماغ ہی شل ہو رہا تھا۔ سوچ وفکر مفلوج ہوگئی تھی۔ اس نے جنگ کے دیوتاؤں پر دانت پیس لیے اور سوچا کہ پاکستان والوں کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ جوانوں کو مروا رہے ہیں۔ اسے فوج میں بھرتی ہونے پر رنج ہوا اور سوچا کہ گاؤں میں ہی کھیتی باڑی کرتے رہتے تو اچھا تھا۔ چونڈے کی میلوں وسعت میں بکھری ہوئی لاشوں اور

اپنے بہت سے دوستوں کی موت نے اس کے خیالوں کا رخ ہی موڑ دیا اور اس پر قہر آلود سی خاموشی طاری ہوگئی۔

باپ کی یاد بھی ذہن سے نکل گئی۔ نہ ماں یاد رہی نہ بہن نہ زینو۔ اس پر مسلسل چھ روز خاموشی طاری رہی۔ ایک روز اس نے اپنی سنگین سے نیام اتاری تو دیکھا کہ اس پر جوڑیاں کے میدان کا خون اتر کر چونڈے کے معرکے کا خون جم گیا تھا۔ وہ بہت دیر خون آلود سنگین کو دیکھتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ کل ہی رات وہ پھر فائٹنگ پٹرول کے ساتھ گیا تھا اور دشمن کی فائٹنگ پٹرول کے ساتھ دست بدست ٹکر ہوگئی تھی لیکن اسے ذرہ بھر فخر محسوس نہ ہوا کہ اس نے انڈین آرمی کے تین سپاہیوں کو اپنے بیونٹ سے ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے اپنے ساتھی بکھر گئے تھے اور وہ ساری رات اکیلا لڑتا، گرینیڈ پھینکتا پیچھے ہٹنے کا راستہ بنا رہا تھا۔ پھر وہ کماد اور دھان کے کھیتوں میں بھٹک گیا تھا۔ صبح ہوتی تو فرنٹیئر فورس کے ساس لانس نائک نے اسے گرینیڈ ہاتھ میں سے لیے درخت کے ساتھ کھڑے دیکھا اور اسے ساتھ لے آیا تھا۔

اب ابرار اس بلند جگہ پر کھڑا اپنی خون اور آلود سنگین کو دیکھتا رہا اور وہ تلخ اور ٹیڑھے ٹیڑھے خیالوں میں بھٹک گیا۔

اس کی پلٹن کو ایک بار پھر موو کا آرڈر ملا۔ جوان کودتے پھلانگتے ٹرکوں میں بیٹھے گئے، لیکن ابرار علی میں تو جیسے پہلے والا دم خم ہی نہیں تھا۔ مرنے سے تو وہ ابھی بھی نہیں ڈر رہا تھا لیکن چونڈے کے خونریز معرکے سے اس کے اعصاب تباہ ہوئے اور اس کی سوچ وفکر کا رخ ہی بدل گیا حالانکہ وہ جان کی بازی لگا کر لڑا تھا۔ مگر اب وہ جنگ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اسے سمجھانے والا کوئی نہ تھا—— ''پاکستان کیوں جوانوں کو مروا رہا ہے''۔

اس نے ٹرک میں بیٹھ کر جوانوں سے سنا کہ پلٹن قصور سیکٹر میں جا رہی ہے۔ پھر بھی اسے یاد نہ آیا کہ جوڑیاں میں ایک رات آؤٹ لائنگ پکٹ پر ڈیوٹی دیتے۔ اس نے اللہ داد شہید سے کہا تھا کہ پاکستان ادھر سے ہندوستان پر حملہ کیوں نہیں کر دیتا۔ وہ تو کھیم کرن کے ایک گاؤں میں جا کے اپنے صحن میں اپنی خون آلود سنگین گاڑنے کے لیے بے تاب تھا، لیکن وہ ٹرک میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ان کا کنوائے جانے کیوں سیالکوٹ شہر میں چلا گیا اور شہری لوگ سڑک کے دونوں

طرف ہجوم کر کے نعرے لگانے لگے — ''چونڈہ کے جانباز..... زندہ باد'' — ''پاک فوج..... زندہ باد'' — سپاہیوں نے جواب میں ''پاکستان زندہ باد'' اور ''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند کئے۔ سارا سیالکوٹ جیسے سڑکوں کے کنارے جمع ہوا تھا۔ ابرار علی نے کوئی نعرہ نہ لگایا۔ وہ نعرے سن رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور غیر ارادی طور پر ٹرک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلی چیز جو اسے نظر آئی وہ چند مکانوں کے کھنڈر تھے۔ کسی سپاہی نے کہہ دیا — ''یہ مکان ہندوستان کی بمباری سے تباہ ہوئے ہیں'' — کسی اور نے کہہ دیا — ''ہسپتال پر بھی بم گرے تھے۔ عورتیں اور بچے بہت مرے ہیں''۔

ابرار علی کا رواں رواں بیدار ہو گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے لوگوں کے ہجوم کو دیکھا جن میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے اور جوانوں کے ساتھ ضعیف بوڑھے بھی تھے۔ سب ہاتھ اٹھائے سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے، زور زور سے نعرے لگا رہے تھے اور ہنس ہنس کے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ سب کے چہروں پر پیار اور شفقت تھی۔

ذرا آگے جا کر کنوائے رک گیا۔ شہریوں کا ایک ہجوم کنوائے روک کر ہاتھوں میں کوکا کولا، سیون اَپ اور طرح طرح کی بوتلیں اور چائے کی پیالیاں اور بسکٹوں کی پلیٹیں اٹھائے ٹرکوں میں بیٹھے جانباز سپاہیوں کو پیش کر رہا تھا۔ شہری لپک لپک کر سپاہیوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ عورتیں دور کھڑی بلائیں لے رہی تھیں اور بچے پاکستان کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اٹھائے نعرے لگا رہے تھے۔ تمام بچوں نے سول ڈیفنس کی وردیاں اور سبز بیرٹ ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ ابرار علی کے ٹرک کے پاس ایک جوان سال آدمی نے ٹرانسسٹر آن کر رکھا تھا۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے نور جہاں گا رہی تھی......

میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیا رکھاں
اَج تکدیاں تینوں سارے جگ دیاں اکھاں

سپاہی ابرار علی کے جسم نے جھرجھری لی اور تھکے ٹوٹے ہوئے اعصاب ٹھکانے آنے لگے۔ خیالوں کا دھارا جو جانے کدھر مڑ گیا تھا آپ ہی آپ رک گیا پھر لوٹ کے وہیں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔ کسی نے آ کے ابرار علی کا ہاتھ تھاما اور بڑے زور سے مصافحہ کیا۔ وہ چونکا اور مصافحہ کرنے والے کو دیکھ کر ہنس دیا۔ ذرا سی ہنسی اور مصافحے کی گرم جوشی نے اسے جیسے جگا دیا ہو۔ اس نے دیکھا، سامنے فٹ پاتھ پر کمسن سی ایک بچی ہاتھ میں سبز جھنڈی

لہرا رہی تھی اور ابرار علی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ابرار علی کے جذبات اُمڈ آئے۔ اس کی آنکھوں پر دھند چھا گئی اور اس کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی — ''زینو، تم ہنسو کھیلو، میں زندہ ہوں'' — پھر اس کے سینے میں دھماکہ ہوا اور اس نے بے بس ہو کر چلا کر نعرہ لگایا — ''بولو نعرۂ تکبیر'' — اور اس کی پلٹن نے توپ کی گرج کی طرح جواب دیا — ''اللہ اکبر''۔

ابرار علی بے چین ہو کر اپنے ساتھی سے بولا — ''کنوائے چلتا کیوں نہیں؟ قصور سیکٹر میں سنا ہے آگ لگ رہی ہے اور ہم یہاں چائے پی رہے ہیں۔ رکنے کا وقت ہی کہاں ہے'' — اور اس نے سخت گرم چائے کی پیالی حلق میں انڈیل لی پھر نہ وہ بیٹھا نہ اس کا سر جھکا اور جن ٹیڑھے ٹیڑھے خیالوں اس پر سکوت طاری کر دیا تھا وہ آپ ہی آپ سیدھے ہو گئے۔ کسی شہری نے ابرار علی کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے رازداری سے پوچھا — ''سنگی! اب تم لوگ کس طرف جا رہے ہو؟''

''جس طرف سے پاکستان کی آبرو کو خطرہ ہوگا'' — ابرار علی نے مسکرا کر کہا اور بولا — ''اور سنو، دوست! سیالکوٹ کے بچوں کو کہنا کہ تمہیں یتیم کرنے کوئی ویری نہیں آئے گا ہم زندہ ہیں''۔

قصور سیکٹر پہنچتے کنوائے کو شہریوں نے جگہ جگہ روکا، سپاہیوں کو چائے اور سگریٹ پیش کئے۔ نعرے لگائے۔ ہاتھ ملائے اور جب کنوائے قصور سے آگے نکل کر ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تو سپاہیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ٹرکوں پر نہیں آئے بلکہ باپ، مائیں، بہنیں اور بچے انہیں سر آنکھوں پر بٹھا کر یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ چونڈہ کے تھکے ماندے سپاہیوں کے جسموں میں بجلیاں کوندنے لگیں۔

ابرار علی جو اپنے دوستوں کی موت پر افسوس کرتا رہا تھا۔ اب ان کی موت پر رشک کرنے لگا — ''وہ شہید ہیں'' — لیکن اسے معاً خیال آیا — ''اور میں مجاہد ہوں، پاکستان کا محافظ۔ اللہ کا سپاہی!''

جوانوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ قصور سیکٹر کے کس مقام پر آ گئے ہیں، آدھی رات کے بعد جب چاند نکلا تو انہیں ارد گرد کا علاقہ نظر آنے لگا۔ ورنہ وہ توپوں کی اندھا دھند فائرنگ کے شعلے اور دھماکے دیکھ اور سن رہے تھے۔ دور دور تک بڑے زور کی جنگ ہو رہی تھی۔ نصف شب کے بعد ابرار علی کی پلٹن بھی بریگیڈ میں شامل ہو گئی۔ اسے بریگیڈ کے دائیں

پہلو میں رکھا گیا۔ بریگیڈ پیش قدمی کر رہا تھا۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ پاکستانی ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور انفنٹری کا ڈیپلائے خوب ملاپ سے چل رہا تھا۔ پیچھے سے توپوں کی کورنگ بڑی کامیابی سے آ رہی تھی۔

ابرار علی کی پلٹن والے فلینک پر دشمن کا دباؤ تھا لیکن کمانڈ اس قدر جچی تلی تھی جیسے پریڈ قدم ملا کے چل رہی ہو۔ پچھلے سے اگلے مورچے تک جوان یوں بھاگ کر پوزیشن لیتے تھے جیسے ٹریننگ سنٹر میں ایڈوانس کی مشق کر رہے ہوں۔ ہراول دستے بڑی خوبی سے دشمن کو دباتے چلے جا رہے تھے اور دشمن لاشوں اور زخمیوں کو پھینکتا چلا جا رہا تھا۔

رات گذر گئی اور دن بھی طلوع ہو کر ڈھلنے لگا۔ دشمن نے کھیم کرن پر قدم جما لئے، اسے تازہ دم کمک پہنچ گئی تھی۔ مورچے جم گئے۔ ٹینک آگے بڑھ گئے۔ پیچھے سے پاکستانی توپ خانہ رئیر گارد کے قریب آ لگا۔ فلینک اور کھل گئے۔ فضا میں طیاروں کی بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ پاکستان کے بری توپچیوں نے ایک طیارہ گرا لیا اور دشمن کے باقی طیارے بھاگ گئے۔ دن بھر کھیم کرن کے مورچے جمے رہے۔ شام کے وقت پاکستانی کمانڈر کی چابکدستی نے ہندوستانیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور شب بھر کی دوطرفہ گولہ باری کے بعد کھیم کرن کے مورچے ٹوٹ گئے۔ ہندوستانیوں نے دور پیچھے ہٹ کر کھیم کرن پر اس قدر گولہ باری کی کہ شہر کو کھنڈروں کا ہُو، حق ویرانہ بنا دیا، جیسے ان کی شکست میں کھیم کرن کے درو دیوار کا بھی ہاتھ تھا۔

ابرار علی کی بٹالین کو یہ مورچہ مضبوط کرنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ کمانڈر کو معلوم تھا کہ یہ چونڈہ کے میدان کی تھکی ہوئی بٹالین ہے، ذرا ستا لے اور بریگیڈ آگے ولٹوہا کی سمت پیش قدمی کرنے لگا۔

ابرار علی نے ایک روز پٹرول ڈیوٹی کے دوران اس علاقے کو پہلی بار غور سے دیکھا اور یادوں سے اٹھارہ برسوں کی سپاٹ مدت پلک جھپکتے طے کر لی۔ کھیتوں کی ہریالی کو تو گولوں اور ٹینکوں نے جلا اور روند ڈالا تھا۔ بعض درخت بھی ٹوٹ گئے تھے لیکن ماحول ویسا ہی تھا جیسے اٹھارہ برس پہلے تھا۔ ذرا پرے پیپل کا ایک پیڑ اور اس کے ذرا آگے نیم کے پیڑوں کا جھنڈ ہو گا۔ ان کے ساتھ ہی پرے چوڑی پگڈنڈی گزرتی ہو گی جس پر بیل گاڑیوں کے پہیوں سے گہری نالیاں بنی ہوئی تھیں۔

اس نے ذرا بلند پر جا کر دیکھا تو اس کے بچپن کے پیڑ ابھی کھڑے تھے۔ پیپل بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اسے بچپن کی یاد دلانے کو ابھی وہیں کھڑا تھا اور بچپن کی سب سے بڑی یادگار کھیم کرن کا قصبہ تھا جو ابرار کو سامنے نظر آ رہا تھا۔ اسے دھندلی دھندلی یادیں آنے لگیں کہ باپ اسے شاید کبھی کبھی کھیم کرن اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا اور جلیبیاں لے دیا کرتا تھا۔ کھیم کرن کے ساتھ ہی اسے اپنا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی ایسا دور نہیں تھا۔ اسے دور سے اپنا گاؤں کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا۔ کئی مکان پکے بن گئے تھے اور بعض توپوں کے گولوں نے گرا دیئے تھے۔ وہ دور کھڑا اپنے گاؤں کو دیکھتا رہا اور تصورات اسے دور اٹھارہ برس پیچھے لے گئے۔

''وہ تھا میرا گاؤں......'' اس نے دکھیاری سی آواز میں اپنے ساتھ سے کہا—— ''مغلاں والی''——اور اس پر رقت طاری ہو گئی۔

''یہ گاؤں اب پھر تمہارا ہو گیا ہے ابو!''——اس کے ساتھی نے کہا۔

اور ابرار نے اپنے ساتھی کو بچپن کی جتنی باتیں یاد تھیں سنا ڈالیں۔ اس رات ابرار اچھی طرح سو نہ سکا۔ آنکھ لگی تو خواب میں اپنا گاؤں دیکھا اور آنکھ کھل گئی پھر رہ رہ کے جی چاہنے لگا کہ اپنے گاؤں کے اندر جا کر گھوم آئے اور اپنے گھر کو ایک نظر دیکھ لے۔ اپنی کھیتیاں تو اس نے دور سے دیکھ لی تھیں۔ صبح اٹھ کر اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا—— ''میرا گاؤں تو خالی ہو چکا ہو گا۔ اجازت ملے تو کھیم کرن گھوم آئیں۔ وہاں کے بازاروں میں ابھی وہی رونق ہو گی جو اٹھارہ برس پہلے تھی''۔

''پاگل......''——اس کے ساتھی نے کہا—— ''وہاں بھونکنے کے لیے کتے بھی نہیں رہے ہوں گے شہر پر گولے بارش کی طرح برستے رہے ہیں''۔

اس کے ساتھی نے ٹھیک کہا تھا کھیم کرن میں اب کوئی انسان نہیں رہا تھا۔ بازار اجڑ گئے تھے اور گلیوں میں چند ایک لاشیں پڑی تھیں۔ منڈیروں پر گدھ اور چیلیں بیٹھی چونچیں صاف کر رہی تھیں۔ وہاں گشت لگانے والے چند پاکستانی فوجیوں کے سوا کوئی نہ جاتا تھا۔

گشت کرنے والے بعض سپاہیوں نے بتایا تھا کہ کسی کسی رات کھیم کرن کے کھنڈروں میں کسی عورت کی آواز آتی ہے—— ''ہوشاں کولوں مستی چنگی جیہڑی رکھدی سدا ٹھکانے''—— وہ کہتے تھے کہ یہ آواز بعض اوقات یوں سنائی دیتی ہے جیسے کوئی دکھیاری کسی

کھنڈر میں اکیلی بیٹھی بین کر رہی ہو اور کبھی یوں جیسے کوئی چڑیل چیخ رہی ہو۔ جن سپاہیوں نے ہندوستان کے آگ اگلتے بکتر بند ڈویژن کو چکنا چور کر دیا تھا وہ بھی ان آوازوں سے ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ کلمہ شہادت پڑھنے لگتے تھے اور سنگینیں ننگی کر لیا کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ننگے لوہے کو دیکھ کر چڑیل بھاگ جاتی ہے۔

کبھی کبھی دن کے وقت بھی یہ آواز سنائی دیتی تھی لیکن کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ آگے جا کے دیکھے کہ یہ کون ہے۔ سب جانتے تھے کہ کھیم کرن میں ہندوستانی بے گناہ شہریوں پر گولہ باری کرتے رہے ہیں اور جانے کتنے لوگ مارے گئے ہوں اور جانے ان کے اپنے ہی فوجیوں کی کتنی لاشیں انہی کھنڈروں میں پڑی گل سڑ رہی ہوں۔ جہاں موت کی حکمرانی ہو وہاں ہو سکتا ہے کہ کسی پیر فقیر یا کسی دکھیاری ماں کی روح بھٹک رہی ہو جس کے بچے اس کے سامنے پھٹتے گولوں سے مر گئے ہوں۔

لیکن پاکستانی سپاہیوں کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ چڑیل یا بدروح نہیں ایک جواں سال لڑکی ہے جو شہر میں ''کھیم کرن کی پگلی'' کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا حال حلیہ ڈراؤنا ضرور تھا لیکن گرد آلود بال شانوں پر بکھرے ہوئے، چہرہ گول اور دلکش مگر مٹی سے اٹا ہوا، کپڑے تار تار اور جسم نیم عریاں، سر سے ننگی، پاؤں سے ننگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ نوحہ جب کھیم کرن آباد تھا تو ''کھیم کرن کی پگلی'' بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومتی رہتی تھی اور ایک ہی مصرعہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد الاپتی تھی ـــــ ''ہوشاں کولوں مستی چنگی جھیڑی رکھدی سدا ٹھکانے'' ـــــ اس کے علاوہ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہتی تھی لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کہتی ہے۔ شہر کے بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں، ہندو، سکھ اور عیسائی اسے کھانا کھلاتے تھے اور وہ رات قبرستان میں یا سردیوں میں کسی مندر یا گردوارے میں یا چھوٹے سے گرجے میں گزارتی تھی۔ اس کا انداز کچھ ایسا مقدس سا تھا کہ ہر عمر اور ہر مذہب کے لوگ اسے پاک عورت سمجھا کرتے تھے۔ کسی بچے کو بھی کبھی اسے پتھر مارنے یا تنگ کرنے کا خیال نہ آیا۔ وہ بارہ برسوں سے کھیم کرن کے گلی بازاروں میں بھٹک رہی تھی۔ بارہ برس پیشتر ایک روز وہ اچانک کھیم کرن میں آ گئی تھی۔ کسی نے نہ پوچھا تھا وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ وہ تھوڑے ہی دنوں میں کھیم کرن کی رونق اور روزمرہ زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔

اور اب کھیم کرن تو اُجڑ گیا لیکن کھیم کرن کی پگلی کھنڈروں میں رہ گئی تھی اور اس کا الاپ جو اکثر پُرسوز اور مستانہ ہوا کرتا تھا اب بین کی اداس لے یا بدروح کی چیخ بن گئی تھی اور فوجیوں کے لیے ڈراؤنا معمہ۔

تین چار روز ہندوستانی توپیں اکا دکا گولہ کھیم کرن کے مضافات میں پھینکتی رہیں جو کھسیانے دھماکے کی زبان میں جیسے کہہ رہا ہو ـــــ ''پاکستانیو! ہم تم سے کھیم کرن چھین لیں گے'' ـــــ یوں لگتا تھا جیسے گولوں کے دھماکوں میں وہ جان ہی نہیں رہی۔

پاکستانی فوجیں کھیم کرن کے دائیں بائیں اور آگے اس اطمینان سے مورچے سنبھالے ہوئے تھیں جیسے اب ہندوستانی جوابی حملہ نہیں کر سکیں گے لیکن ہندوستانی کمانڈر کھیم کرن کو واپس لینے کے لیے بچے کھچے بکتر بند اور انفنٹری دستوں کو آخری حملے کے لیے یکجا کر رہے تھے۔ انہوں نے چونڈہ کے میدان سے بھاگے ہوئے چند ٹینک بھی اس حملے کے لیے بلا لیے تھے۔

ایک رات ابرار علی کی آؤٹ لائنگ ڈیوٹی آ گئی۔ اس کی بیٹ تو محدود تھی لیکن بیٹ سے تجاوز کر جانے کی صورت میں اسے پکڑنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ ڈیوٹی پر گشت کر رہا تھا کہ پرے نکل گیا۔ ساتھی نے اسے روکا تو ابرار بولا ـــــ ''دشمن کا تو خطرہ نہیں اور چیک کرنے شاید کوئی نہ آئے...... تم یہیں ٹھہرو میں آتا ہوں'' ـــــ اور اس نے اپنے ساتھی سے اپنے گاؤں کو دیکھ آنے کی خواہش دُکھے ہوئے لہجے میں کی کہ اس کا ساتھی مان گیا۔ بولا ـــــ ''دیکھو، ابو! کوئی آ گیا تو میں کہوں گا ہالٹ ہکم در، تو تم بھاگ کے آ جانا اور کہنا کہ میں پیشاب کرنے گیا تھا''۔

ساتھی سے ہٹ کر ابرار علی کھیتیاں پھلانگتا یوں اپنے گاؤں جا پہنچا جس طرح وہ بچپن میں بیلوں کے پیچھے بھاگا کرتا تھا۔ گاؤں دور نہیں تھا۔ شفاف چاندنی رات میں اسے گھر کی راہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ اپنے بچپن کے گھر کے دروازے پر جا پہنچا کواڑ کھلے تھے۔ اس کا دل یکبارگی اچھلا پھر ڈوبنے لگا اور جب اس نے دہلیز پر قدم رکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ نو برس کا بچہ بن گیا ایسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی ماں، باپ اور بہن اندر گہری نیند سوئے ہوئے ہوں اور وہ اندر جائے گا تو تینوں اٹھ کر گلے لگا لیں گے اور رو رو کر منہ چومیں گے اور وہ انہیں کہے گا ـــــ ''تم روتے

کیوں ہو، میں پاکستان بنا آیا ہوں، چلو، تمہیں لینے آیا ہوں''۔

ذرا آگے ولٹوہا کے مضافات میں خونریز معرکہ جاری تھا۔ رات کی جنگ زدہ خاموشی مسلسل دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ انڈین آرمی کا چوتھا مونٹین ڈویژن اور نمبر 2 آرمڈ بریگیڈ گروپ پاک فوج کے بریگیڈ کو پیچھے دھکیلنے کے لیے امریکہ اور برطانیہ سے حاصل کیا ہوا ایمونیشن بے دردی سے پھونک رہے تھے۔

ابرار آہستہ سے اندر چلا گیا۔ صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کھرلی بھی وہیں تھی جس کے پیچھے اٹھارہ برس پہلے وہ چھپا تھا۔ کھرلی پر سایہ کیے ہوئے بیری کا درخت بھی وہیں تھا۔ صحن میں مونجھ کی دو چار پائیاں پڑی تھیں۔ کھرلی کے قریب ایک گائے مری پڑی تھی جس کے جسم کا کچھ حصہ گدھ کھا گئے تھے۔ ابرار تیزی سے گھوما اور ڈر گیا۔ قریب ہی شاید گاؤں کے اندر توپ کا گولہ گر کر پھٹا تھا۔ اندھیرے کمرے سے چمگادڑوں کا غول نکل کر چاندنی رات میں بکھر گیا۔ اس نے ماچس جلائی زرد لرزتی لو میں اسے کمرہ اسی طرح دکھائی دیا جس طرح اس کے بچپن میں تھا لیکن ہُوحق ویران تھا۔ سامنے دیوار پر ہندوؤں کی کسی دیوی کی تصویر لٹک رہی تھی اور دیوار پر ایک جگہ سرخ رنگ سے ہندی لکھی تھی۔ کمرے میں کھلا ہوا ایک خالی ٹرنک اور تین چار چارپائیاں پڑی تھیں۔

ابرار نے دیوار سے دیوی کی تصویر اتار کر بڑے زور سے فرش پر پٹخ دی اور اسے بوٹوں تلے چکنا چور کر دیا۔ اس چھناکے سے اسے جانے کیا ہوا کہ اس کے آنسو بہہ نکلے اور وہ صحن میں آ گیا۔ ٹہلتا ٹہلتا کھرلی کے پیچھے وہیں جا کھڑا ہوا جہاں وہ نو برس کی عمر میں چھپا تھا۔ وہاں سے اس نے صحن میں اس جگہ کو دیکھا جہاں اس کے باپ کو، ماں اور بہن کو پندرہ بیس ہندوؤں اور سکھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ابرار کو وہ بھیانک منظر یوں یاد آیا جیسے وہ کل کا حادثہ تھا۔ اس نے عتاب آلود انداز سے اپنی رائفل سے سنگین اتاری، اس کے اوپر سے نیام اتار کر پرے پھینک دی اور سنگین کو ایک نظر دیکھا۔ اس پر جوڑیاں اور چونڈہ کے معرکوں کا ہندوؤں، سکھوں اور ڈوگروں کا خون جما ہوا تھا۔ وہ کھرلی پھلانگ کر تیز قدم صحن کے وسط میں آیا اور گھٹنا زمین پر ٹیک کر پوری طاقت سے سنگین صحن میں گاڑ دی۔ سنگین صحن میں آدھی اتر گئی۔

ابرار کے آنسو خشک ہو گئے۔ اداسیاں ڈھل گئیں اور اس نے دونوں گھٹنے زمین پر

ٹیک کر ہاتھ اٹھائے اور فاتحہ پڑھنے لگا، فاتحہ پڑھ کر وہ سرگوشی میں بولا—— ''ماں جی! اگر تمہاری روح اس گھر میں ہے تو آج مجھے دودھ کی دھاریں بخش دو۔ ہم نے تمہارے دیس میں پاکستان کا جھنڈا گاڑ دیا ہے''۔

اس نے سنگین صحن میں رہنے دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ یکبارگی توپوں کے کئی گولے گاؤں میں آ پھٹے اور ایک گولہ کھرلی پر آ پڑا اور پھٹا۔ اس کے لال انگارہ ٹکڑے ابرار علی کی ایک ٹانگ میں لگے اور ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی۔ دھماکے کے ساتھ ہی گاؤں میں قریب ہی کہیں نسوانی چیخ بلند ہوئی جو کسی انسان کی نہیں، بدروح یا شرشرار کی معلوم ہوتی تھی۔ ابرار گر پڑا تھا وہ اٹھا اور دروازے کی طرف چلنے لگا لیکن اسے محسوس ہوا جیسے ٹانگ کی ہڈی کہیں سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس نے دیکھا گھٹنے سے ذرا نیچے پتلون اُڑ گئی تھی اور ہڈی ٹوٹ کے سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ باقی زخموں سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ ٹانگ گھسیٹتا دروازے تک آ گیا اور دہلیز سے باہر گلی میں رک گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن چلنا ممکن نہ تھا۔ اس نے رائفل کے سہارے چلنے کی کوشش کی لیکن بات بن نہ سکی۔ اس نے ہار کر دیوار کا سہارا لے لیا۔

توپوں کی ایک اور باڑ چلی اور کئی گولے گاؤں میں پھٹے۔ کسی مکان کے گرنے کی ہولناک آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی نسوانی چیخ پھر سنائی دی اور ساتھ ہی چیخ نما آواز آئی—— ''ہوشاں کولوں مستی چنگی جیہڑی رکھ دی سدا ٹھکانے''—— ابرار نے بھی اس پُراسرار آواز کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے گلے میں لٹکتے تعویذ کو ہاتھ میں لے کر الحمد شریف کا ورد شروع کر دیا اور چلنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔ توپوں کی باڑیں تیز اور شدید ہو گئی تھیں اور اب گولے گاؤں کے اوپر سے گذر کر پھٹ رہے تھے...... ہندوستانی فیصلہ کن حملے کے لیے کھیم کرن کی طرف ایک خالی سمت سے توپوں کے فائر کور، میں پیش قدمی کی کوشش کر رہے تھے۔

''کون ہو تم؟''—— عقب میں اسے نسوانی آواز سنائی دی۔ ابرار کا دل دہل گیا اور پیچھے دیکھنے سے گریز کرنے لگا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ چڑیل کے بلانے پر پیچھے دیکھو تو وہ کلیجہ نکال لیتی ہے۔ اس کے پاس سنگین بھی نہیں تھی جسے چاندنی میں دکھا کر چڑیل کو بھگا سکتا لیکن آواز پھر سنائی دی اور اس نے محسوس کیا کہ یہ جو کچھ بھی ہے میرے سر پر کھڑا ہے۔

اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا...... وہ ایک عورت تھی، بال بکھرے ہوئے اور جسم نیم عریاں وہ کھیم کرن کی پگلی تھی۔ ابرار کے سینے میں سپاہی بیدار ہو گیا۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کر لیا اور جب رائفل اس پر سیدھی کرنے لگا تو پگلی نے لپک کر رائفل پر ہاتھ رکھ لیا۔ بولی ''خدا کے لیے ......تم ہندوستانی ہو یا پاکستانی؟...... میں جانتی ہوں تم زخمی ہو۔ میں چڑیل نہیں انسان ہوں......تمہاری صورت پاکستانیوں جیسی ہے''۔

''ہاں''—— ابرار نے خالی خالی سے لہجے میں کہا—— ''میں پاکستانی ہوں اور تم چڑیل نہیں تو ہندوستان کی جاسوس ہو''۔

''تم اٹھو، پاگل!''—— پگلی نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے جھنجھلا کر کہا—— ''میں کھیم کرن کی پگلی ہوں لیکن ہوش میں آ گئی ہوں۔ اگر میں جاسوس ہوں تو پاکستان کی ہوں۔ تم اٹھو......اوہ! تم اٹھ نہیں سکتے''۔

ابرار کا دماغ ساتھ چھوڑ گیا۔ ایسے بھیانک ماحول میں ایک پاگل عورت، جاسوس یا چڑیل ہی ہو سکتی تھی۔ اس کا خون بہہ رہا تھا۔ اتنے میں ایک گولہ منڈیر پر آ لگا اور پھٹا تو......اینٹیں ابرار کے کندھے پر لگیں اور ایک پگلی کے بازو پر لگی۔ ابرار پرے جا پڑا اور پگلی نے لپک کر اس کی رائفل اٹھا لی۔ موت ابرار کے سر پر منڈلانے لگی۔

''ہندوستانی بڑھے آ رہے ہیں''—— پگلی نے کہا—— ''تم ہندوستانی ہوتے تو تمہیں اپنے ہاتھوں مار جاتی لیکن تم پاکستانی ہو۔ اٹھو۔ ان کے پہنچنے تک تمہیں گاؤں سے دور چھوڑ آؤں گی''—— اور اس نے ابرار کی بغل تلے کندھا رکھا کر اسے ایسا سہارا دیا کہ وہ زخمی ٹانگ گھسیٹنے اور دوسری پر چلنے کے قابل ہو گیا۔ پگلی کے اپنے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ اسے گاؤں سے باہر لے گئی۔ ہندوستانی توپیں اب تیزی سے گولے اگل رہی تھیں اور ان کے جواب میں پاکستانی توپ خانہ دھاڑ رہا تھا۔ دونوں توپ خانوں کے گولے ابرار اور پگلی کے سروں کے اوپر سے چیختے گزر رہے تھے۔ پگلی ابرار کے جسم کا بہت سارا بوجھ اپنے اوپر لیے پاکستانی مورچوں کی طرف لیے جا رہی تھی۔

''تمہیں گولوں سے ڈر نہیں لگتا؟''—— پگلی نے پوچھا۔

''اوں ہوں''—— ابرار نے کہا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے''—— پگلی بولی۔

ابرار چپ رہا۔ اس کی ذہنی حالت ٹھکانے نہیں تھی۔ زخموں کی اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ ڈیوٹی سے غیر حاضر تھا اور وہ بھی محاذ پر اور اس انوکھی لڑکی سے وہ ابھی تک ڈر رہا تھا۔

''تم گاؤں میں کیا کر رہے تھے؟''—— پگلی نے پوچھا—— ''لوٹنے آئے تھے؟ پاکستانی سپاہیوں کو میں نے لوٹ مار کرتے تو نہیں دیکھا کبھی۔ کھیم کرن میں بھی کوئی پاکستانی سپاہی......''

''یہ میرا اپنا گاؤں ہے''—— ابرار نے کہا—— ''وہ میرا گھر ہوا کرتا تھا جس کے دروازے پر میں زخمی ہو کے کھڑا تھا۔ میں اٹھارہ سال بعد اپنے گھر کو دیکھنے آیا تھا''۔

''وہ تو چوہدری سردار علی کا گھر ہوا کرتا تھا''—— پگلی نے کہا—— ''اگر تمہارا ابھی وہی گھر تھا تو تمہارا نام ابو یا ابرار ہونا چاہئے''۔

''ہاں تو......''ابرار نے حیرت زدہ ہو کے کہا—— ''میں ابو ہوں۔ چوہدری سردار علی کا ابرار۔ اب سپاہی ابرار علی ہوں''۔

پگلی نے اسے سہارا دے کر بٹھا لیا اور دیوانہ وار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کے اس کے دونوں گالوں کو چوم کر ہچکی لے کے بولی—— ''ابو! تم ابرار علی ہو تو میں کھیم کرن کی پگلی ہوں۔ جب تم چھوٹے سے تھے تو میں زینو ہوا کرتی تھی اوہ! میرے ابو! میرے بچپن کے ساتھی۔ تُو تو اکیلا بھاگ گیا تھا اور مجھے کافر اٹھا لے گئے تھے......اٹھو، رکنے کا وقت نہیں۔ میں بڑی دور سے آئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستانی کھیم کرن پر حملہ کر رہے ہیں''۔

ابرار کو یوں لگا جیسے وہ بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ اسے بچپن کی ہجمولی، بھولی بھالی سی زینو یاد تو آ گئی لیکن اس کا دل خوفزدہ سا تھا اور ذہنی کیفیت بے ٹھکانہ۔

وہ کٹھے پر پہنچ گئے۔ پگلی نے اسے بٹھا کر چلو بھر پانی پلایا اور اسے سہارا دے کر کٹھے کے پانی میں سے گزار لے گئی۔ آگے جا کر کہنے لگی—— ''ابو تمہارا خون دیکھ کر بچپن کی ایک یاد آ گئی ہے۔ شاید تم بھول گئے ہو گے تم آم کے پیڑ سے گر پڑے تھے تو تمہارے ماتھے سے خون بہنے لگا تھا۔ میں تمہیں گھر لے گئی تھی اور شاید میں نے کہا تھا کہ میں نہ ہوتی تو تم مر جاتے''۔

''یاد ہے زینو!''—— ابرار نے درد کی ٹیسیں سہتے ہوئے کربناک آواز میں کہا——

’’مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مجھے غصہ آ گیا تھا‘‘۔

’’اور آج؟‘‘ — پگلی ہنس دی۔

’’آج تو میں تمہیں گولی مارنے لگا تھا‘‘ — وہ چونک اٹھا۔ گھبرا کر بولا — ’’میری رائفل؟‘‘

’’میرے پاس ہے، فکر نہ کرو‘‘۔

ٹینکوں اور گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ بائیں طرف سے فلینک آگے بڑھ گیا۔ ابرار بیٹھ گیا اور چھپ کر اپنے ٹینکوں اور سپاہیوں کو قریب سے گزرتے دیکھنے لگا۔ اگلی لائن کے لیے کمک جا رہی تھی۔ ابرار کی بٹالین بھی آگے چلی گئی تھی۔ ابرار کی حالت غول سے زخمی ہو کر گرے ہوئے پرندے کی سی تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ایڈوانس اور اپنی بے بسی کو دیکھ کر اس کے آنسو نکل آئے پگلی نے اسے اٹھانا چاہا تو بولا — ’’میرے ساتھی آگے نکل گئے ہیں، مجھے یہیں مرنے دو‘‘۔

پگلی نے قمیض اتار کر اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لپیٹ دی اور خود برہنہ ہو گئی۔ بولی — ’’میں تو پگلی ہوں ننگی ہو گئی تو کیا‘‘۔

کھیم کرن سے میلوں آگے دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ یہ کھیم کرن کا آخری معرکہ تھا۔ آخری معرکے کے ساتھ ہندوستانیوں کی آخری امید کا خون کھیم کرن کی مٹی میں مل گیا اور وہ پسپا ہو گئے۔ چونڈہ سے بلائے ہوئے ٹینک بھی ان کے انفنٹری ڈویژن کی دستگیری نہ کر سکے۔

رات بھر ابرار اور پگلی ایک خالی مورچے میں بیٹھے رہے۔ اکے دکے گولے ان کے اردگرد دور دور پھٹتے رہے اور ان دھماکوں میں پگلی ابرار کو سناتی رہی کہ — ’’سن سینتالیس میں جب سارا گاؤں کٹ گیا تو میں گاؤں سے باہر بھاگ گئی۔ بوڑھے سے ایک سکھ نے مجھے پکڑ لیا۔ میں بہت روئی چیخی لیکن وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے ہاتھ میں کرپان تھی نہ برچھی، وہ خالی ہاتھ تھا۔ تمہاری طرح میں بھی دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کس کے بھروسے چیختی چلاتی جو مجھے اس سکھ سے چھڑا لیتا......

’’اس بوڑھے سکھ نے مجھے اپنے گھر رکھ لیا۔ کھیم کرن سے اس طرف دو کوس دور ایک گاؤں ہے۔ جرموکی، وہ اس گاؤں میں رہتا تھا۔ سکھ میرے ساتھ باپ کی طرح پیار

کرنے لگا۔ اس کی بوڑھی سی ایک بیوی بھی تھی۔ میں تو ہر لمحہ ان سے ڈرتی رہتی تھی لیکن بڈھے بڈھی نے مجھے گود لے لیا اور مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ مجھے پالنا پوسنا چاہتے ہیں۔ ان کا ایک ہی جوان بیٹا تھا۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہیں تھی۔ بڈھا بڈھی مجھے اپنے مذہب کے رنگ میں رنگنے لگے لیکن میں اس چھوٹی عمر میں بھی نہ بھول سکی کہ میں مسلمان کی بیٹی ہوں۔ وہ مجھے جو پڑھاتے تھے میں پڑھ لیتی تھی لیکن اکیلے جا کر بسم اللہ شریف اور کلمۂ شہادت پڑھ لیا کرتی۔ گاؤں میں ایک بھی مسلمان نہ رہا تھا جس کے پاس بھاگ جاتی لیکن جہاں تک پیار و محبت کا تعلق تھا بڈھا بڈھی مجھ سے اس قدر پیار کرتے تھے کہ میں ایک ہی سال میں اپنے ماں باپ کا دکھ بھول گئی۔ بڈھی مجھے اپنے پاس سلایا کرتی تھی......

’’یہ دونوں مذہب کے پابند تھے۔ ان کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے میں مذہب ہی مذہب تھا اور حقیقت یہ ہے کہ بڑے خدا ترس لوگ تھے، لیکن ان کا بیٹا کوئی ایسا اچھا آدمی نہیں تھا......

’’میں چودہ پندرہ برس کی ہوئی تو بڈھا بڈھی مر گئے۔ مرے بھی اتنی جلدی کہ ایک دن بڈھا مرا اور تین روز بعد بڈھی مر گئی اور میں ان کے جوان بیٹے کے پاس اکیلی رہ گئی۔ چند روز اس نے مجھے بہن بہن کہا مگر پھر اس کی نظریں بدلنے لگیں۔ پھر وہ گھر میں شراب لا کر پینے لگا شراب تو لوگ گاؤں میں پانی کی طرح پیا کرتے تھے لیکن اس گھر میں کبھی شراب کی بو بھی نہیں آئی تھی......

’’ایک رات اس جواں سکھ نے مجھے شراب پینے کو کہا لیکن میں نہ مانی، اس نے شراب کی بہت تعریفیں کیں لیکن میں نہ مانی۔ آخر اس نے مجھے نیچے گرا لیا اور شراب میرے منہ میں انڈیل دی۔ مجھے ابکائیاں آئیں، میں بہت تڑپی لیکن اس نے جانے کتنی شراب میرے حلق میں اتار دی اور قہقہے لگاتا پلنگ پر جا لیٹا۔ میں ابکائیاں لیتی صحن میں چلی گئی پھر باہر نکل گئی۔ وہ خود شراب میں بدمست تھا شاید سو گیا ہو گا......

’’مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور میں جانے کس طرف چلی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے۔ اپنے بال نوچ نوچ کر بکھیر لئے تھے اور میں نے شاید نشے اور غصے کے اثر سے اپنے منہ اور سر پر مٹی مل لی تھی۔ میں مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئی تھی جن کے مذہب میں شراب حرام تھی پھر جن سکھوں

نے مجھے پالا اور جوان کیا وہ سراپا مذہب تھے اور شراب کی بو سے بھی بھاگتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے جو شراب پی لیتا ہے بابا نانک اور خدا اس سے روٹھ جاتے ہیں۔ میں خدا سے بہت ڈرا کرتی تھی......

''میں شاید رات بھر چلتی رہی تھی اور جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہی تھی اور منہ سر پر مٹی پھینک پھینک کر اپنے آپ کو سزا دے رہی تھی۔ اس کے بعد یاد آتا ہے کہ کچھ لوگ میرے اردگرد کھڑے کہہ رہے تھے — ''پاگل ہے'' — میں نے انہیں دیکھا تو میں نے زور سے چیخ ماری اور ابو!'' — پگلی نے ہچکی سی لی اور بولی — ''اور ابو! میں بارہ برس کھیم کرن کی گلیوں میں چیخیں مارتی رہی ہوں...... خدا لوگوں کا بھلا کرے جو مجھے کھانا دیتے رہے اور اپنی عبادت گاہوں میں رات سونے کی اجازت دیتے رہے...... لیکن ابو! یہ باتیں مجھے یاد نہیں تھیں۔ چند ہی روز ہوئے اپنے آپ دماغ میں آگئی ہیں۔ میں تو سچ مچ کی پگلی تھی......''

ابرار کے منہ سے کرب آلود سسکی نکل گئی۔ زخم درد کر رہے تھے۔ باہر گولے پھٹ رہے تھے۔ رات لرزتی کانپتی گزر رہی تھی۔ کھیم کرن سے آگے ولٹوہا کے میدان میں ہندوستانی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے اور پیچھے بھی ہٹ رہے تھے۔ پگلی نے مورچے سے سر نکالا۔ اس نے اپنا خون آلود بازو پھٹی ہوئی شلوار پر مل لیا۔ وہ اٹھی اور بولی —
''تمہارے لیے پانی لے آؤں'' — لیکن ابرار نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔ بولا —
''سر باہر نہ نکالنا'' — وہ بیٹھی ہی تھی کہ ایک گولہ ان کے مورچے سے ذرا ہی پرے پھٹا اور مٹی ان کے اوپر یوں گری جیسے بیلچے بھر بھر کے انہیں کوئی دفن کر رہا ہو۔ مورچے کے قریب سے ایک ٹینک اور اس کے پیچھے ایک ٹرک گزر گیا۔ ابرار پر تکلیف دہ سی خاموشی طاری تھی اور پگلی بھی چپ ہوگئی۔ انہوں نے اپنے سروں سے مٹی بھی نہ جھاڑی۔
''باتیں کرتی رہو زینو!'' — ابرار نے دردناک سی آواز میں کہا — ''ورنہ مجھ پر غشی طاری ہو جائے گی...... پھر تم بارہ برس کھیم کرن کی گلیوں میں......''
''لیکن میں سب کچھ بھول چکی تھی......'' زینو پگلی نے کہا — ''یہ بچپن یاد رہا تھا نہ بڑھاپا نہ اس کی بڈھی نہ ان کا نامراد جوان بیٹا اور مجھے تو ابو! اپنا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ میں تو لگتا ہے جیسے بڑی لمبی نیند سے جاگی ہوں...... تھوڑے ہی دن ہوئے کھیم کرن میں

بڑے زور زور سے دھماکے ہوئے اور کئی مکان گر پڑے۔ لوگ جدھر منہ آیا اٹھ بھاگے۔ ہر سُو ایک ہی واویلا سنائی دیتا تھا...... پاکستانی آگئے، پاکستانی فوجیں آگئیں...... بچے چیخ رہے تھے، عورتیں ہائے ہائے کرتی بھاگ رہی تھیں۔ توپوں کی گھن گرج قریب آرہی تھی اور پاکستان، پاکستان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں......''
''لیکن گولے جو شہر پر گرے تھے وہ پاکستانی توپوں کے نہیں ہو سکتے'' — ابرار بول پڑا — ''ہم تمام پاکستانی فوجیوں کو حکم ملا تھا کہ کوئی فوجی کسی سویلین پر یا کسی گاؤں پر یا کسی شہر میں گولی یا توپ نہیں چلا سکتا۔ اس حکم کے علاوہ پاکستانیوں کا مذہب بھی سویلین لوگوں پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ گولہ باری ہندوستانی توپ خانے کی ہوگی۔ کھیم کرن کی فتح میں میری پلٹن بھی تھی۔ میں تمہیں بتاؤں کہ......''
''کچھ بھی تھا'' — زینو بولی — ''شہر پر گولے گرے تو لوگ بھاگے اور میں نے ایک گری ہوئی دیوار کے ملبے میں دو آدمی تڑپتے دیکھے وہ لہولہان تھے لیکن کوئی انہیں اٹھانے والا نہ تھا...... اِدھر اس خون کو دیکھا، اُدھر پاکستان، پاکستان کا شور سنا، لوگوں کی بھگدڑ دیکھی اوپر سے گولے پھٹے تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں گہری نیند یا غشی سے جاگ رہی ہوں۔ خون اور پاکستان نے میرے ذہن سے پردے اٹھا دیئے اور میں کچھ کچھ سمجھنے لگی اور کچھ کچھ سوچنے بھی لگی...... پاکستان خون...... پاکستان خون دے کر بنا تھا نا! میرے بھی سارے کٹ گئے، تیرے بھی سارے کٹ گئے ے خاندانوں کا خون بہہ گیا۔ لیکن تجھے پاکستان مل گیا، مجھے نہ ملا......
''...... پاگل پن کی دبیز تہیں ڈھل گئیں اور میں ایک ہی اُڑان میں نو دس برس کی بچی بن گئی پھر جوں جوں توپ کا ایک گولہ چلتا اور پھٹتا رہا میں عمر کی منزلیں طے کرتی چلی گئی اور شام تک جب سارا کھیم کرن خالی ہوگیا اور پیچھے کھنڈر رہ گئے تو میں کھیم کرن کی پگلی سے زینو بن گئی اور مجھے اپنا نام یاد آگیا۔ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ یاد آگیا۔ توپوں کے گولوں اور ماحول کے ڈراؤنے واویلے اور پاکستان کے نام نے میری حسیں بیدار کر دیں۔ یادوں کی کڑیاں ایسی ملیں کہ میں پگلی سے سیانی ہوگئی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلی ہوں، عورت ذات ہوں اور میرا کوئی نہیں، نہ گھر نہ دیس، اردگرد لڑائی لگی ہوئی ہے اور جانے مجھے کون اٹھا لے جائے۔ پتہ نہ چلتا تھا کدھر بھاگ کے جاؤں، پاکستان کی راہ

میں پاکستانی فوجیں کھڑی تھیں، میں انہیں پہچانتی بھی نہیں تھی اور ہندوستان کی طرف میں جانا نہ چاہتی تھی......

''معلوم نہیں میں نے بارہ برس کس طرح پاگل پن میں گزار دیئے تھے لیکن ہوش آیا تو میں ڈرنے لگی۔ سوچا کہ میں اس ہوش سے تو مست ملنگ اچھی تھی نہ کوئی فکر نہ ڈر۔ میرے ذہن سے ایک بات ابھری اور زبان سے نکل گئی —— ''ہوشاں کولوں مستی چنگی جیڑی رکھدی سدا ٹھکانے''—— اور میں زور زور سے یہ ایک ہی بول گانے لگی۔ کبھی کبھی میں چیخیں مارا کرتی تھی میں دراصل خوفزدہ دل کو سنبھالا دینے کے لیے رات کو چیخیں مارا کرتی تھی اور بَین بھی کیا کرتی تھی۔ ایک رات میں ایک کھنڈر میں بیٹھی تھی کہ تین چار سپاہی آتے نظر آئے۔ میں نے چیخنا شروع کر دیا پھر میں نے بَین کیا —— ''ہوشاں کولو مستی چنگی......'' میں نے دیکھا کہ سپاہی رک گئے اور ایک بولا —— ''نہیں، عورت نہیں، شر شرار ہے......'' دوسروں نے جانے کیا کہا اور وہ چاروں وہیں سے لوٹ گئے۔ اس روز کے بعد جب بھی مجھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دیتی میں چھپ کر بَین کرنے لگتی یا چیخیں مارتی تھی اور سننے والے بھاگ جاتے تھے......

''آج رات میں کھیم کرن سے نکلی تو اس طرف دور نکل گئی۔ آگے ہندوستانی فوجیں نظر آئیں تو میں نے سرکنڈوں میں چھپ کے دیکھا۔ ان کا لشکر جمع ہو رہا تھا۔ پھر یہ لشکر توپیں اور جانے کیسی کیسی خوفناک چیزیں آہستہ آہستہ آگے چلے پڑیں اور پھر ان سے دھماکے اور شعلے نکلنے لگے اور میرا دماغ اور زیادہ بیدار ہو گیا۔ مجھے جانے کیوں محسوس ہونے لگا کہ ہندوستانی پاکستان پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ میں اٹھ بھاگی۔ ہر طرف فوجی تھے لیکن میں چھپتی چھپاتی کھیم کرن جانے کی بجائے اس گاؤں میں آن پہنچی......

''صرف تم ہی نہیں زینو!''—— ابرار نے بازو اس کے کندھے پر رکھ کر کہا ——
''پاکستان کے سارے پاگل توپوں کے دھماکوں سے اور پاکستان کے نام پر سیانے ہو گئے ہیں۔ کسی کو دولت نے پاگل بنا رکھا تھا، کوئی رتبے اور عہدے سے پاگل ہو گیا تھا۔ بعض عیاشی اور گناہوں میں پاگل ہو گئے تھے۔ بہتوں کو غربت نے پاگل بنا ڈالا تھا لیکن دشمن کا پہلا گولہ پاکستان کی سرحد کے اندر پھٹا تو سب پگلے سیانے ہو گئے۔ کوئی امیر نہ رہا کوئی غریب نہ رہا...... میں دیکھ آیا ہوں زینو! سارا پاکستان ایک ہو گیا ہے، سارے پاکستانی

ایک ہو گئے ہیں۔ میری ہڈی ٹوٹ گئی ہے لیکن مجھے پرواہ نہیں، میرا خون بہہ گیا ہے، مجھے فکر نہیں، پاکستانی قوم میری ہڈیاں بھی جوڑ دے گی اور میری رگوں میں اپنا خون ڈال دے گی۔ میں اگر مر گیا تو میرے ساتھی میری لاش کو ہندوستانیوں کی طرح مورچے میں نہیں پھینک جائیں گے اٹھا کے قوم کے حوالے کر دیں گے اور میری قوم مجھے دفن کر کے میری قبر پر فاتحہ پڑھے گی اور میں مر کے بھی ان کے دلوں میں زندہ رہوں گا......''

مورچے کے منہ پر آ کر ایک گولہ پھٹا اور زینو کی چیخ نکل گئی۔ ابرار تو بچ گیا لیکن ایک ٹکڑا زینو کے سر پر لگا اور خون تیزی سے بہنے لگا۔ ابرار نے اسے تھاما لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی......

جب زینو ہوش میں آئی تو وہ پاکستان کے ایک ہسپتال میں پڑی تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور یکا یک چلا کر بولی —— ''میرا ابو کہاں ہے؟ میرا پاکستان کہاں ہے؟ مجھے پاکستان جانے دو، یہاں نہیں رہوں گی......'' وہ اٹھ بیٹھی لیکن ایک نرس نے اسے پکڑ کر لٹا دیا۔

اور دس روز بعد جب اس کا زخم مل گیا تو اسے ابو بھی مل گیا اور پاکستان بھی۔

⌘ ⌘ ⌘

ماں

حمیدی

میں ماں ہوں...... ننھے منے شہید کی ماں۔

آج پھر اسی گھر میں آ بیٹھی ہوں جس کے آنگن میں میرا منا کھیلا کرتا تھا۔ آج اکیلی ہوں۔ منا بھی نہیں، منے کا ابو بھی نہیں، میرا سہاگ خون کی لالی بن کر پاک سرحد کی مٹی میں جذب ہو گیا ہے۔ کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں جس کے انتظار میں دہلیز پر جا بیٹھوں۔

پھر بھی دل میں ایک اضطراب سا ہے۔ ایسی بے چینی سی جیسے کوئی آ گے گا۔ میرے اجڑے ہوئے جنگ زدہ گھر میں کوئی آئے گا ضرور! کبھی کبھی دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے لیکن لمحے دو لمحے بعد دل سنبھل جاتا ہے۔ جیسے کوئی آ رہا ہے۔ آدھی رات کے بعد آنکھ کھل جاتی ہے۔ میرے منے کا ابو ملیشیا کی شلوار اور قمیص پہنے، چمڑے کی پیٹی باندھے رات کی گشت سے اسی وقت لوٹا کرتا تھا۔ آج بھی یوں گمان ہوتا ہے۔ جیسے اجڑی رات کے ویران اندھیرے میں کوئی چلا آ رہا ہے۔ کبھی یوں سنائی دیتا ہے جیسے میرے بے چھت مکان کے پچھواڑے کوئی کسی سے پوچھ رہا ہے۔۔۔ ''رینجرز کے سپاہی اللہ داد شہید کا گھر کون سا ہے؟''

جی میں آتی ہے کہ اٹھوں اور اس اجنبی مسافر کو ساتھ لے آؤں۔ اس سے پوچھوں۔۔۔ ''تم میرے منے کے شہید ابو کے دوست ہو؟ اس کی لاش کہیں دیکھی تھی؟ اس کی رائفل بھی دیکھی ہو گی؟ اس کی رائفل میں کوئی گولی بچی تو نہیں ہو گی؟ اس کی سنگین پر دشمن کا خون تو لگا ہو گا''۔۔۔ پھر یاد آتا ہے کہ کسی نے بتایا تھا کہ میرے منے کے شہید ابو کی لاش کے گرد چھ سات بھارتی سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ سب سنگین سے مرے تھے۔ وہ سات بھارتی اسی نے مارے ہوں گے۔ میں جانتی ہوں اسی نے مارے ہوں

گے۔ اس کے متعلق پہلے ہی مشہور تھا کہ سرحد پر گشت کرتے وہ بھارت کے پنکھ پکھیرو کو بھی اس طرف نہیں آنے دیا کرتا تھا۔ بڑا زہری تھا۔ پانچ برس گزرے ایک روز مجھے بھرے گاؤں سے دن دیہاڑے گھوڑی پہ بٹھا لایا تھا۔ اس وقت میں اس کی بیوی نہیں تھی۔

لوگ اب بھی کہتے ہوں گے کہ عائشہ اللہ داد کے پیچھے نکل گئی تھی لیکن کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس نے مجھے اغوا کیا تھا۔ وہ ستلج رینجرز کا سپاہی تھا۔ رینجرز کی چوکی میرے گاؤں ہی میں تھی۔ سرحد سے فرلانگ، ڈیڑھ فرلانگ دور جہاں بارہ چودہ سپاہی رہتے تھے، ان میں اللہ داد بھی تھا۔ یہ ہماری شادی سے پہلے کی بات ہے۔ وردی تو سب کی ایک جیسی تھی، باتیں اور چال ڈھال بھی ایک جیسی، دھوپ میں سرحد پر گشت کرتے کرتے سب کے چہروں کی رنگت بھی ایک جیسی ہو گئی تھی لیکن اللہ داد سب سے جدا ہی لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس جیسی بنسری کوئی نہ بجا سکتا تھا۔

سرحد کی راتیں بڑی خاموش اور پُر اسرار ہوا کرتی ہیں۔ ان راتوں کی خاموشی میں اللہ داد کی بنسری کی لے فضا میں تیرتی میرے خوابوں اور خیالوں میں نئے رنگ بھر دیا کرتی تھی۔ میں تو جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی تھی۔ پھر ایک روز بنسری کی لے نے مجھے مسحور کر کے اللہ داد کی راہ میں کھڑا کر دیا اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں بنسری تھی۔

''بنسری تم بجایا کرتے ہو؟''

وہ مسکرا دیا۔ بڑی ہی پیاری اور مردانہ مسکراہٹ۔ !

''تم سنا کرتی ہو؟''

میں نے آہ بھری۔ بیساختہ اور شرم سے بوجھل آہ۔

اور اُس رات میں چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ میری ایک سہیلی میرے پاس بیٹھی جانے کیا بات سنا رہی تھی کہ سرحد کی چپ چاپ رات میں بنسری کا نغمہ سنائی دیا۔ میری سہیلی بولی___ ''سنتی ہو عائشہ! کتنی دکھیاری سُر بجا رہا ہے''___ اور میں نے محسوس کیا کہ اس رات اللہ داد کی بنسری کے انگ کوئی اور ہی نغمہ الاپ رہے تھے۔ اس قدر سوز کہ میرا انگ انگ تھر کنے لگا۔

''کہتے ہیں کہ ہیر کو رانجھے کی بنسری نے اجاڑ دیا تھا''___ میری سہیلی نے آہ بھر کر کہا۔

اور آج میں بنسری کی اجاڑی ہوئی، سرحد کے ایک جنگ زدہ گاؤں میں بیٹھی ہوں، نہ اللہ داد ہے نہ اس کی بنسری۔ سرحد کی رات پھر اسی طرح چپ چاپ ہے جس طرح ہوا کرتی تھی...... پُر اسرار!

ستلج رینجرز کے سپاہی ہم سرحدی گاؤں والوں کے لیے اجنبی اور بیگانے نہیں ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمارے گاؤں ہی کے نہیں، ہمارے گھر کے فرد بن گئے تھے۔ جس گھر میں آ بیٹھیں یوں لگتا تھا۔ جیسے اپنے بھائی آ بیٹھے ہوں۔ دودھ، دہی، مکھن، انڈے جتنے چاہیں لے جائیں۔ وہ پیسے دیا کرتے تھے لیکن ہم پیسے نہیں لیا کرتے تھے۔ وہ سب پردیسی تھے۔ ان میں پٹھان بھی تھے، بلوچ بھی اور سندھی بھی لیکن ہمیں سب اپنے ہی گاؤں کے جنے پلے اور اور ہنسے کھیلے لگتے تھے۔

کبھی کبھی اکی دکی گائے یا بکری، چرتی چگتی کھالی پھلانگ کر سرحد پار کر جاتی تو بھارت کے رینجر نظر بچا کر پکڑ لے جاتے تھے۔ ایک بار ایک بچھڑا پرے چلا گیا تو بھارتی رینجروں نے پکڑ لیا۔ ہمارے رینجر کے حوالدار نے واپس مانگا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بات بڑھ گئی۔ حوالدار نے اپنے سپاہیوں کو فائر کھول دینے کے لیے تیاری کا حکم دے دیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے بیچ میں آ گئے۔ بولے___ ''اللہ کے شیرو! کوئی بات نہیں۔ ذرا جتنے بچھڑے پر لہولہان ہو جاؤ گے۔ دفع کرو، جانے دو''___ لیکن حوالدار نے آگ بگولا ہو کے کہا___ ''یہ بچھڑا نہیں گاؤں کی عزت ہے۔ پاکستانی گاؤں کی عزت''___ اور حوالدار نے سرحد پر کھڑے ہو کر للکار کر کہا___ ''ہندوؤ! پانچ منٹ کے اندر بچھڑا لوٹا دو ورنہ پوزیشن لے لو، پھر نہ کہنا ستلج رینجرز نے بے خبری میں فائر کھول دیا تھا''___ اچھا ہوا کہ کافروں نے بچھڑا چھوڑ دیا اور خون خرابہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

سرحدوں کے پاسبان ہماری اپنی برادری بن گئے تھے۔ ہمارے دکھ، درد اور ہماری عزت سانجھی ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے لیے غیر نہیں تھے لیکن اللہ داد کو میں زیادہ ہی اپنا بنا بیٹھی۔ ہم سکھی سہیلیاں رینجروں کی گاؤں والی چوکی میں جا اودھم مچایا کرتی تھیں مگر اب یہ حال کہ میں ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح کماد کی اوٹ سے اللہ داد کو دیکھنے لگی اور دل میں خواہش ابھرنے لگی کہ اللہ داد اسی مینڈھ سے گزرے جس پر میں کھڑی ہوں۔

ایک روز وہ اس طرف آ ہی نکلا۔ میں مینڈھ پر کھڑی تھی، وہ گشت سے لوٹ رہا تھا۔

پسینے میں نہایا ہوا۔ رائفل کندھے سے لٹکائے، پیاس سے ہونٹ سوکھے ہوئے، اسے دیکھ کر میں مینڈھ سے ہٹ کر کماد میں ہوگئی۔ وہ قریب آ کر رک گیا اور پیاسی سی ہنسی ہنس کر بولا ـــــ ''یا تو چھپ جاؤ کہ میں تمہیں دیکھ نہ سکوں یا سامنے آ جاؤ کہ میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں''۔

آہ، آج پانچ برس بعد دل فریادیں کر رہا ہے ـــــ ''اللہ داد دم بھر کو سامنے آ جاؤ۔ پھر گم ہو جانا۔ تمہیں سرحد کی مٹی ہی میں چھپے رہنا ہے تو چھپے رہنا'' ـــــ پر مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اللہ داد گشت کرتے کرتے زندگی کی سرحد سے بہت پرے نکل گیا ہے۔

جانتی ہوں کہ جلے ہوئے تنکوں سے آشیاں نہیں بنا کرتے لیکن جلی ہوئی یادوں اور تصوروں کے آشیاں بنائے جا رہی ہوں۔ لگتا ہے۔ جیسے وہ لوٹ آئے گا۔ وہ اس رات بھی گشت پہ نکلا تھا۔ دو برس گزر گئے ہیں، وہ نہیں آئے گا۔ اس کی باتیں یاد آتی ہیں۔

جس روز پاک فوج نے چھمب جوڑیاں فتح کر لیا تھا۔ اس روز سے اللہ داد کی چال ڈھال بدل گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا تھا اور کبھی منے کو بڑے غور سے دیکھ کر انوکھی سی ہنسی ہنس دیا کرتا تھا اور کبھی گھر میں بیٹھے یوں چونک کے باہر نکل جاتا تھا جیسے کوئی کام یاد آ گیا ہو۔ پانچ ستمبر کے دن کے پچھلے پہر وہ کچھ زیادہ ہی بے چین تھا۔ میں نے پوچھا تو ایک شگفتہ سی آہ لے کے بولا ـــــ ''عائشہ! جس دیس کی مٹی میں شہیدوں کا خون مل جائے۔ اس دیس کو روزِ قیامت تک کوئی فتح نہیں کر سکتا...... ہماری سرحد قوم سے خون مانگ رہی ہے''۔

میں نے دیکھا تھا کہ چار چار پانچ پانچ رینجر اکٹھے کھڑے سرحد کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ رات ذرا سا بھی کھٹکا ہو یا کتا بھونکے تو وہ رائفلیں اٹھائے بھاگ کر شیشم کے پیڑوں کی اوٹ سے سرحد کو دیکھنے لگتے تھے۔ کئی بار اللہ داد رات کو بدک کے اٹھا اور باہر بھاگ گیا۔

لیکن یہ تو بڑی بعد کی بات ہے۔ میں تو آج اُس روز کو یاد کر رہی ہوں جس روز میں کماد کی اوٹ میں ہو گئی تھی اور اللہ داد میرے قریب آ کر رک گیا تھا۔ میں اس سے چھپی نہیں تھی میں تو اسے بھی اپنے ساتھ چھپا لینا چاہتی تھی۔ وہ رکا اور میں کماد کے اندر ہو گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور وہ بھی کماد کے اندر آ گیا۔

پھر تین مہینے اللہ داد کی بنسری کی تان پر جھومتے گزر گئے۔ سکھی سہیلیوں نے مجھے

چھیڑا، ماں نے گھورا، باپ نے دھتکارا۔ گاؤں کی دیواروں سے چپکے ہوئے گوبر کے اپلوں نے بھی مجھ پر انگلیاں اٹھائیں لیکن ہم دونوں نے پہلے ہی روز قسم کھالی تھی کہ چھ کلمے پڑھ کر رجسٹر پر انگوٹھا لگائے بغیر ایک دوسرے کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ میری زندگی کے ان تین مہینوں کی راتوں کے چاند تارے روزِ قیامت گواہی دیں گے کہ ہم نے شادی تک قسم ٹوٹنے نہ دی۔ یہ تو دلوں کا سودا تھا۔ جسموں کی کچی مٹی سے کون دل لگاتا ہے۔

تین ماہ بعد اللہ داد کی چوکی کی بدلی آ گئی۔ ان کی جگہ رینجر کے نئے سپاہی آ گئے۔ یہ بدلی تو پہلے بھی ہوا کرتی تھی لیکن ہم گاؤں والوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ پرانوں کی جگہ نئے سپاہی آ گئے ہیں۔ ملیشیا کی وردی میں کوئی آدمی آ جائے وہ ہمیں اپنے ہی گاؤں کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہم الہڑ لڑکیوں اور کھلنڈرے لڑکوں کو بدلی اچھی لگا کرتی تھی۔ نئے نئے چہرے اور نئی طبیعتیں گاؤں میں آ جاتی تھیں۔ نئے سپاہی دو ایک روز ہی جھجکتے تھے پھر گاؤں میں گھل مل جاتے تھے، لیکن اب چوکی کی بدلی ہوئی تو میری دنیا ہی اجڑ گئی۔ سرحد کی راتیں ویران ہو گئیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کسی سے دل لگا لینا کھیل نہیں۔ میں دور کھڑی دیکھتی رہی اور اللہ داد دور ہوتے ہوئے پیڑوں کے جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔ سرحد کی راتوں سے بنسری کی لَے نکل گئی تو اندھیرے ہولناک ہو گئے۔

چند ہی روز بعد رات کے پہلے پہر مجھے بنسری کا محبوب نغمہ پھر سنائی دیا۔ سوچا شاید کوئی اور ہو گا لیکن میں رات بھر سو نہ سکی۔ لَے اللہ داد ہی کی تھی اور سوز اسی کی بنسری کا تھا۔ دوسری صبح میں ڈھور ڈنگر لے کر جوہڑ پر گئی تو سامنے اللہ داد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سب بندھن اور سب خوف جھٹک ڈالے اور اس تک جا پہنچی۔ وہ چار روز کی چھٹی پر آیا تھا۔ دو روز وہ ہمارے گاؤں والی چوکی میں رہا۔ دوسری شام میں اللہ داد سے ملی ـــــ ''مرد ہو تو حوصلہ کرو، مجھے ساتھ لے چلو'' ـــــ اس کے سانولے سلونے چہرے پر رونق آ گئی۔ بولا ـــــ ''کل تیار رہنا''۔

اگلے روز کی دوپہر تھی کہ میں گھر سے نکلی پھر لوٹ کے نہ گئی۔ اللہ داد کہیں سے گھوڑی لے آیا تھا۔ مجھے گھوڑی پر بٹھایا اور خود باگیں تھام کر پیدل چل پڑا۔ میں نے کہا ـــــ ''تم بھی گھوڑی پر بیٹھ جاؤ'' ـــــ اس نے مجھے سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا اور بولا ـــــ ''چھ کلمے پڑھ کر۔ ابھی نہیں'' ـــــ ہم نے دس کوس دور ایک گاؤں میں نکاح پڑھوا لیا اور بارہ چودہ

روز بعد اللہ داد نے میرے گاؤں سے پچاس ساٹھ کوس دور تبدیل کرالی۔ وہ گاؤں بھی میرے گاؤں کی طرح سرحد کے ساتھ تھا۔ وہاں ہم نے اپنا مکان بنالیا۔ مکان کیا تھا، گاؤں والوں نے تین چار مرلے جگہ دے دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں پتھروں کی دیواریں کھڑی کر کے اوپر مٹی کا لیپ کر دیا تھا۔ رینجرز کے سپاہیوں نے درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر ان کی چھت ڈال دی تھی۔ چھت تلے ٹیڑھے میڑھے ٹہنوں کے دو شہتیر اور ایسے ہی ایک ٹہن کا ستون رکھ دیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے ٹہنیوں کی چھت پر سرکنڈوں کی تہیں بچھا کر اوپر مٹی ڈال دی تھی اور یوں ستلج رینجرز کے سپاہیوں اور گاؤں کے لوگوں نے میرا اور اللہ داد کا گھونسلہ بنا ڈالا تھا۔ کس قدر پیار اور کتنی شفقت تھی اس گاؤں میں۔ میں تو رینجروں کی بھابی اور گاؤں کی بہو بیٹی تھی۔

پھر میرا منا پیدا ہوا۔ پانچ برس گزر گئے ہیں۔ میں بہت ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ جوں جوں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا تھا، دل پر ہول طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میں تو کبھی کسی چیز سے نہ ڈری تھی۔ لوگ چڑیلوں کی باتیں سنایا کرتے تھے تو میں اکثر رات کو جب اللہ داد رات کی گشت پر چلا جاتا تھا۔ باہر نکل جایا کرتی تھی۔ شاید کہیں چڑیل نظر آ جائے اور دیکھوں تو کہ اس کے پاؤں الٹے کس طرح ہوتے ہیں۔ پھر وہ رات مجھے یاد ہے کہ شادی کے بیس پچیس روز بعد اللہ داد ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا اور میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ صحن میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھٹکا۔ سردیوں کی راتیں تھیں۔ میں سمجھی اللہ داد آیا ہے۔ میں نے دیا جلایا اور دروازہ کھول دیا۔ ایک اجنبی صورت آدمی لڑکھڑاتا لنگڑاتا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی سی تھی......

اس نے ستون کا سہارا لیا اور بولا ___ "ایک ہزار روپیہ نقد دوں گا۔ مجھے تھوڑی سی دیر یہیں چھپا رہنے دو" ___ اس نے نیفے سے پستول نکالا اور میری طرف نالی کر کے بولا ___ "ورنہ ایک ہزار روپیہ بھی کھو بیٹھو گی اور اپنی جان بھی...... کہو سودا منظور ہے؟"

کم بخت کو معلوم نہ تھا کہ میں رینجرز کے سپاہی کی بیوی ہوں اور سرحد کے پاسبان ملک کی آبرو کو ایک ہزار روپے پر نہیں بیچا کرتے اور نہ ہی پستول سے ڈرا کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور اس کی ایک ٹانگ سے اس قدر خون بہہ رہا ہے کہ اس کی شلوار لال سرخ ہو گئی تھی اور خون مٹی کے فرش پر بہنے لگا تھا۔ باہر رات کے

سناٹے میں دو گولیاں چلیں اور اس کے جواب میں تین چار رائفلیں دھاڑیں اور سرحد کی پُراسرار رات پھر خاموش ہو گئی۔

"سنتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟" ___ میرے زخمی مہمان نے کہا ___ "اپنا دوپٹہ میرے زخم پر باندھ دو...... کہو ایک ہزار منظور ہے؟ میں تھوڑی دیر یہاں چھپوں گا"۔

"منظور ہے" ___ میں نے کہا ___ "تم بیٹھو میں زخم کے لیے پٹی دیتی ہوں"۔

وہ چارپائی کی طرف گھوما تو میں نے جھپٹ کر اس کے پستول والے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا اور کلائی پر دانت گاڑ دیئے۔ وہ بہت تڑپا۔ میرے منہ پر گھونسہ بھی مارا لیکن میرے دانت اس کی کھال میں دور اندر تک اتر گئے تھے۔ اس کی زخمی ٹانگ نے اس کا دم خم پہلے ہی ختم کر ڈالا تھا۔ وہ ہمارے کسی رینجر کی گولی سے زخمی ہوا تھا۔

میرے دانتوں کے شکنجے میں آ کر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے پستول چھین لیا اور پستول کا بٹ پوری طاقت سے اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ چکرایا تو میں نے اس کے سر پر پستول کے بٹ کے دو اور وار کر کے اسے گرا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر باہر نکل گئی۔ باہر اکا دکا گولی چل رہی تھی۔ رینجروں نے ایک اور سمگلر کو گرا لیا تھا اور باقی رات کی تاریکی میں بھاگتے فائر کرتے جا رہے تھے۔ میں دو سپاہیوں کو ساتھ لائی ان سے اللہ داد کی خیریت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے سمگلروں سے مقابلہ اسی نے شروع کیا تھا کیونکہ وہ اس وقت گشت پر تھا۔

سپاہی آئے اور میرے زخمی مہمان کو اٹھا لے گئے جب اللہ داد ڈیوٹی سے واپس آیا تو اس نے بتایا کہ یہ سمگلروں کے منظم گروہ کا آدمی ہے۔ اس کی گٹھڑی سے دس سیر چھوٹی الائچی اور ہزاروں روپے برآمد ہوئے ہیں۔

میں نے کسی کو نہ بتایا کہ میں نے ایک ہزار روپے کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ یہ کوئی ایسی معرکے کی بات نہیں تھی کہ میں سب کو بتاتی پھرتی۔ سرحد پر ایسی وارداتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ گولیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں اور کبھی کبھار رات کی تیرگی کو چیرتی ہوئی ایک گولی آتی ہے اور ایک رینجر کے جسم سے زندگی کا رس چوس کر تیرگی ہی میں غائب ہو جاتی ہے۔ رینجروں نے کبھی تمغے نہیں مانگے۔ کسی سمگلر کو پکڑ لینا، زخمی کر لینا یا مار دینا یا دشمن کو سرحد سے اس طرف ایک قدم نہ آنے دینا رینجروں کے لیے سب سے بڑا انعام ہوتا ہے۔ قوم ان

رنجروں کے بھروسے گہری نیند سو جاتی ہے۔ قوم جانتی ہے کہ رینجر کا سپاہی جاگ رہا ہے۔ اس کا انگ انگ اور ایمان کا ذرہ ذرہ جاگ رہا ہے۔

لیکن اللہ داد گہری نیند سو گیا ہے۔

میرے منے کو بھی سوئے ہوئے آج دو برس ہونے کو آئے ہیں۔ وہ نہیں جاگیں گے۔ باپ بیٹا اب نہیں اٹھیں گے۔

ان کی لاشیں مل جاتیں تو میں اپنے آنگن میں مٹی کے دو ڈھیر بنا لیتی۔ جب تنہائی سے جی گھبرا اٹھتا تو ان ڈھیروں ہی سے باتیں کر لیا کرتی لیکن باپ بیٹے کا خون اور ہڈیاں پاک سرحد کی پاک مٹی میں رچ بس گئی ہیں۔ اللہ داد سچ کہا کرتا تھا۔ جس دیس کی سرحد کی مٹی میں شہیدوں کا خون مل جائے اس دیس کو قیامت تک کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ ہماری سرحد قوم سے خون مانگ رہی ہے۔ خدا کا شکر بجا لاتی ہوں کہ میرے دیس کی سرحد نے میرے منے اور منے کے ابو کا خون قبول کر لیا ہے اور دشمن جو میرے دیس پر سیلاب کی طرح چڑھ آیا تھا۔ اپنے ہی خون میں بہتا لوٹ گیا ہے۔

میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔ اب تو یاد بھی نہیں رہتا کہ کیا بات شروع کی تھی اور کدھر بہک گئی ہوں..... ہاں میں منے کی پیدائش کی بات کر رہی تھی۔ میں کہہ رہی تھی کہ میں کسی چیز سے کبھی ڈری نہیں تھی لیکن منے کی پیدائش کا وقت جوں جوں قریب آ رہا تھا، میرے دل پر ہول طاری ہوتا جا رہا تھا۔ وہ وقت اچانک آن پہنچا۔ اللہ داد ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ میں سمجھی شاید میری زندگی کا آخری دن آ پہنچا ہے لیکن درد کی ٹیسیں جیسے گاؤں کی عورتوں نے بانٹ لیں اور قیامت کا یہ وقت یوں گزر گیا تھا جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ عورتوں کا ہجوم میرے گرد کھڑا ہنس بھی رہا تھا مسکرا بھی رہا تھا۔ اسی ہنسی مسکراہٹ میں مجھے اپنے پہلو میں رونے کی آواز آئی تو میں نے عورتوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، جانے کون بولی___ ''سرحدوں کا رکھوالا پیدا ہوا ہے۔ عائشہ مبارک ہو''___ اور میں نے کروٹ بدل کر لال گلابی روئی کے گالے کو سینے سے لگا لیا۔ سکون سا۔ سرخوشی سی اور خمار سا دل و دماغ پر چھاتا چلا گیا اور روح میں اتر گیا۔ ایسا قرار سا آ گیا جیسے میں نے منے کا بوجھ کوکھ میں اٹھایا ہی نہیں تھا۔ جیسے فرشتے آسمانوں سے اتر کر پھول جیسا منا میرے پہلو میں رکھ گئے ہوں جیسے میں کل کنواری تھی۔ آج ماں بن گئی ہوں.....

میں آج بھی ماں ہوں لیکن آسمان کے فرشتے اپنی امانت واپس لے گئے ہیں۔

منا تین برس میرے آنگن میں کھیلا۔ تین برس میرے منے کی ریل گاڑی اس آنگن میں چلتی رہی۔ اس کا گھوڑا آنگن میں دوڑتا رہا۔ اس کا ہوائی جہاز چلتا رہا۔ اس کا بھوسے کا گڈا اور اس کی بندوق چلتی رہی۔ اس کی ریل گاڑی، اس کا گھوڑا، ہوائی جہاز، گڈا اور بندوق ایک ہی چیز تھی۔ ابو کی چھڑی۔

بید کی چھڑی کو ننھے منے ہاتھوں میں تھام کر جب وہ چھڑی کو دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھ کر بھاگتا تھا تو وہ انجن ڈرائیور بھی ہوتا تھا۔ شاہسوار بھی، ہوا باز بھی اور توپچی بھی لیکن منڈیر پر کوا آ بیٹھتے تو منا رک کر ٹکٹکی باندھے کائیں کائیں کرتے کوے کو دیکھنے لگتا تھا اور بید کی چھڑی لکڑی کا بے جان ٹکڑا بن جاتی تھی۔ منا تجسس سے بھرپور نگاہوں سے کوے کو دیکھنے لگتا تھا جیسے کوے کی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ میری طرف دیکھنے لگتا جیسے پوچھنا چاہتا ہو___ ''امی! کوا کیا کہہ رہا ہے؟ وہ منڈیر پر کیوں بیٹھ گیا ہے؟ میرے ساتھ کھیلتا کیوں نہیں؟''

وہ خاموش نگاہوں سے اور کبھی بے تکی توتلی زبان سے بہت کچھ پوچھا کرتا تھا اور میں اسے بہت کچھ بتایا کرتی تھی لیکن چھ ستمبر 1965ء کی صبح میں اسے کچھ بھی نہ بتا سکی نہ اس کے قریب جا سکی۔ اس صبح بھی اس کی نگاہوں میں سوال رینگ رہے تھے اور وہ حیران و ششدر گاؤں کے پندرہ بیس بچوں کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح اس کے ہاتھ بھی پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اور چھ بھارتی سپاہی سٹین گنیں تانے انہیں ساتھ لیے جا رہے تھے۔ منے کو میں کیا بتاتی؟ میں خود کسی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ بچوں کے ہاتھ کیوں باندھ لیے ہیں ان بھارتی سورماؤں نے؟ بچوں سے کون سا خطرہ ہے کہ چھ بھارتی سپاہی ان پر سٹین گنیں تانے ہوئے ہیں؟ میں پوچھ نہ سکی اور نہ مجھے کوئی بتا سکا۔

ہم چند ایک عورتوں کو ہندو سپاہی الگ ہانکے لیے جا رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ بھی رسیوں سے پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ بچوں کا جلوس ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں اپنے وطن کی سرحد کی طرف بھارت کی سمت لے جایا جا رہا تھا..... زندگی کی آخری سرحد کی طرف..... مجھے اپنا منا اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہر ماں کو اپنا منا اچھی طرح نظر آیا کرتا ہے۔

میرا منا سہما سہما ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح رو نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا۔۔۔۔ ''امی! میرے ہاتھ باندھ کیوں دیئے گئے ہیں؟ مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں؟ امی! ابو کہاں ہیں؟ امی! ہر سُو دھماکے کیسے ہیں؟ دھواں کیسا ہے؟ میرے دیس کی زمین لرز کیوں رہی ہے امی؟ یہ اتنے سارے اجنبی لوگ پٹاخے چلاتے کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟''

لیکن میں اس سے بہت دور تھی۔ قریب ہوتی تو اسے بتاتی۔۔۔۔ ''منے تو وہ غنچہ ہے جو دیس کی مٹی میں جذب ہو کے کھلے گا۔ تیرا خون ضائع نہیں ہوگا میرے جگر کے ٹکڑے، اپنے ابو کو نہ ڈھونڈ۔ وہ تجھ سے پہلے دیس کی آن پر کٹ گیا ہے۔ میرے منے! تیرے دیس کی سرحد تیرا خون مانگ رہی ہے۔ رونا مت منے! چپ چاپ شہید ہو جا، اپنی مقدس سرحد کو خون کا نذرانہ دے دے۔۔۔۔''

ہند میرا جگر کاٹ کے لیے جا رہے تھے۔ عورتوں میں بہت سی مائیں تھیں جن کے بچے میرے منے کے ساتھ پرے جا رہے تھے۔ وہ پہلے روتی رہی تھیں اور بھارتی سپاہی ننگ دھڑنگ باتیں کرتے ہنستے جا رہے تھے۔ پھر عورتوں کی آہ و زاری یوں تھم گئی جیسے وہ بے حس ہو گئی ہوں۔ جیسے وہ بچے ان کے تھے ہی نہیں جن کے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ کر بھارتی درندے ہانکے لیے جا رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے دل کو تسکین دینی چاہی کہ ان ننھے منے قیدیوں میں میرا بچہ نہیں ہے لیکن میں ماتا کو کیسے فریب دیتی۔ میں تو سوکوس سے سو بچوں میں سے اپنے منے کو پہچان لیا کرتی تھی۔ وہ میرا ہی بچہ تھا جو سونے سے پہلے رات کو چاند تاروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا کہ یہ دن کے وقت کہاں چلے جاتے ہیں اور یہ سب چمکتی گیندیں اس وقت کیوں آتی ہیں جب مجھے نیند آ جاتی ہے۔

ہاتھ بندھے ننھوں کا جلوس ہم سے دور ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں جانے کیا سوچ رہی تھی کہ نورے کمہار کی بیوی نے چلا کر بھارتی سپاہیوں سے کہا۔۔۔۔ ''کافرو! تم تو ہمارے ملک پر حملہ کرنے آئے تھے۔ ذرا رکو نا! ہمارے مردوں کے سامنے ذرا جم کے تو لڑو، بھاگے کیوں جا رہے ہو؟ سوتے میں عورتوں اور معصوم بچوں کو باندھ لیا اور سمجھ بیٹھے کہ پاکستان فتح کر لیا ہے؟''

ایک بھارتی سپاہی نے اسے رائفل کے بٹ کا ٹہوکا دے کر ننگی گالی دی اور باقی

سپاہیوں نے قہقہہ لگایا جیسے انہوں نے پاکستان فتح کر لیا ہو۔

میں نے ایک بار پھر بچوں کے جلوس کو دیکھا۔ کاش میں اُدھر نہ دیکھتی اور جو ہونا تھا میرے دیکھے بغیر ہو جاتا۔۔۔۔ بچوں کے قریب توپوں کے تین چار گولے پھٹے، شعلے چمکے، زمین نے سیاہ دھواں اور گرد اُگلی اور یہ بادل آہستہ آہستہ سرحد کی طرف چل پڑا۔ میں نے آنکھیں سکیڑیں۔ نگاہوں نے دھوئیں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بچے کو تلاش کیا لیکن بھولے بھالے قیدیوں کو گولوں کے دھوئیں نے نگل لیا تھا۔ مجھے صرف دو بھارتی سپاہی نظر آئے جو بری طرح تڑپ رہے تھے۔ ہمارے بچے بغیر تڑپے مر گئے تھے۔ ان کی لاشیں اور لاشوں کے ٹکڑے جانے کہاں بکھر گئے تھے۔ میرا منا وطن کی سرحد پر ننھی سی جان کا نذرانہ دے کر انہی تاروں کے دیس میں پہنچ گیا تھا جنہیں وہ ہر رات سونے سے پہلے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کرتا تھا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ چھ ستمبر کے سوج کی کرنیں بجھی بجھی سی تھیں، توپوں کے دھاکوں سے لرز لرز جاتی تھیں۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سرحد کی وہی سرزمین تھی۔ جس سے مجھے پیار تھا۔ میں سرحدی علاقے میں جنی پلی تھی اور اسی ماحول میں میری اور اللہ داد کی محبت بھی جنی پلی تھی۔ مجھے سرحد کی راتوں کی خاموشی اور اسرار سے بڑا ہی پیار تھا۔ مگر آج میرے دیس کی ہریالی خون سے لال سرخ ہو گئی تھی۔ کھڑے کماد کی مٹھاس میں بارود کا زہر مل گیا تھا۔ گھنے پیڑ لمبے لمبے بالوں والے ڈراؤنے بھوت بن گئے تھے۔ فضا میں توپوں کے گولے چیختے چنگھاڑتے گزر رہے تھے۔ ان میں بھارتی گولے بھی تھے پاکستانی بھی لیکن دور دور حد نگاہ تک بھارت کی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سرحد کا ذرہ ذرہ دشمن لگ رہا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے اللہ داد سے نہیں اس سرزمین سے پیار ہے اور میری سرزمین بڑی ہی پیاری ہے لیکن یہ سرزمین پیچھے رہ گئی تھی۔

ہمیں بھارتی سپاہی ہانکے لیے جا رہے تھے۔ سینہ تنور کی طرح جل رہا تھا۔ ہمیں رات کو سوتے میں دبوچ لیا گیا تھا۔ لڑنے کی مہلت ہی نہ دی تھی کافروں نے، ورنہ ہمارے ہاتھ یوں پیٹھ پیچھے نہ بندھے ہوتے۔ اللہ داد گشت پر تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ جب گاؤں زلزلے کے مہیب جھٹکوں سے بنیادوں تک ہلنے لگا۔ رات کی تاریکی میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ گاؤں میں قیامت کا شور اٹھا۔ اس شور میں اللہ اکبر کے نعرے اور جے کارے سنائی دے رہے تھے۔

پھر یہ نعرے اور شور مشین گنوں اور رائفلوں کے دھماکوں میں دم توڑنے لگے۔ ستلج رینجرز رائفلوں سے ٹینکوں اور مشین گنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور ایک ایک کر کے شہید ہو رہے تھے۔ گاؤں میں بعض مرد تو جاگ بھی نہ پائے تھے کہ کٹ گئے اور جو وقت پر جاگ اٹھے تھے وہ تین تین چار چار بھارتیوں کو ختم کر کے شہید ہو گئے۔ گاؤں میں تین شکاری بندوقیں تھیں۔ ان تین بندوقوں نے سٹین گنوں کی بوچھاڑوں کا خوب مقابلہ کیا۔

میں جلدی جلدی میں لالٹین جلانے لگی مگر کسی نے لپک کر مجھے دبوچ لیا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک بھارتی کی ناک پر سر کی ٹکر ماری۔ دوسرے کی ناف پر لات جمائی اور دونوں سے آزاد ہو گئی لیکن ایک اور نے پیچھے سے آ کر ایسا جکڑا کہ میں بے بس ہو گئی۔ ذرا سی دیر بعد مجھے گاؤں کی عورتوں کے مقید ہجوم میں پھینک دیا گیا تھا۔ میرے سوئے ہوئے منے کو ایک بھارتی نے بازو سے پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔ پھر کچھ ہوا وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا جو میں نے ہی نہیں، سرحد نے ہر گاؤں کی ہر عورت اور ہر بچے نے دیکھا۔ مجھ پر جو بیتی وہ انوکھی نہیں، جگ سے نرالی نہیں، خوش نصیب تھیں وہ جو گاؤں ہی میں کٹ مریں اور ان کا خون پاک سرحد کی مٹی میں مل گیا ہے۔

میں دیکھ رہی ہوں کہ شہیدوں کے خون سے رچی ہوئی مٹی سے جو گھاس پات سر نکال رہے ہیں ان کی ہریالی کی شان کچھ اور ہی ہے۔ ہریالی تو یہاں پہلے بھی ہوا کرتی تھی لیکن ایسی نہیں جو میں اب دیکھ رہی ہوں۔ جن پیڑوں کی گھنیری ڈالیوں سے توپوں کے آتشیں گولے گزرے تھے ان پر پھر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ شیشم کے تین پیڑ جو سرحد سے ایک دو قدم اس طرف ہیں، فاتحانہ انداز سے جھوم رہے ہیں۔ گاؤں اجڑا ہوا ہے۔ بھارتیوں نے کسی بھی مکان کی چھت نہیں رہنے دی کواڑ بھی اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ گاؤں میں ڈھور ڈنگروں کی گھنٹیوں کا جلترنگ بھی سنائی نہیں دیتا۔ ڈھور ڈنگر تو وہ بھارتی پکڑ کر لے گئے ہیں جو پاکستان فتح کرنے آئے تھے لیکن گاؤں کے وسط میں صدیوں پرانا پیپل تالیاں بجا رہا ہے۔

میرے سینے میں گولے پھٹ رہے ہیں، یہ تو اب پھٹتے ہی رہیں گے۔ ایسے ہی گولے میرے منے کے قریب پھٹے تھے اور ان کا دھواں میرے منے کو اٹھا کر آسمانوں پر لے گیا تھا۔ اس وقت میں نے دعا کی تھی۔۔۔ ''یا خدا! ایسا ایک گولہ میرے قریب بھی

پھینک دے جو مجھے میرے منے کے پاس پہنچا دے''۔۔۔ میں نے ہر عورت کے چہرے پر ایسے ہی تاثرات دیکھے تھے وہ سب میری ہی طرح دعائیں مانگ رہی تھیں۔

خدا نے ہماری دعا جلد ہی سن لی۔ ہم سرحد سے ابھی چند ہی گز دور تھیں کہ ہمارے اردگرد، دو دو چار چار سو گز دور کئی گولے پھٹے۔ پھر گولوں کی بارش ہونے لگی۔ ہمارے محافظ بھارتیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ ہمیں گھسیٹنے لگے۔ کئی عورتوں کو انہوں نے رائفل کے بٹوں سے مارا اور چلانے لگے۔۔۔ ''بھاگو، تیز بھاگو''۔۔۔ لیکن ہم اڑیل مویشیوں کی طرح اڑ گئیں۔ ہم سب عورتوں نے مار کھائی، گالیاں کھائیں پھر ایک حوالدار نے آگے والی عورت کو گولی مار دی اور بولا۔۔۔ ''جو تیز نہیں چلے گی اسے گولی مار دی جائے گی''۔۔۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام عورتیں بیٹھ گئیں اور وہ ہمیں ٹھڈ اور بٹ مار مار کر اٹھانے لگے۔ بعض عورتوں نے کلائیوں سے بندھی رسیاں توڑنے کی کوشش میں اپنی کلائیاں لہولہان کر ڈالیں۔ دو عورتوں نے اٹھ کر ایک سپاہی کو ٹکریں مارنی شروع کر دیں اور اس کی ناک سے خون نکال دیا۔ پیچھے سے دھڑا دھڑ گولے آ رہے تھے۔ ایک عورت نے لپک کر اس حوالدار کی ران میں دانت گاڑ دیئے جس نے ایک عورت کو گولی ماری تھی لیکن ایک سپاہی نے دور سے چھلانگ لگا کر عورت کے پہلو میں سنگین اتار دی اور بڑے فاتحانہ انداز سے خون اور آلود سنگین بلند کر کے اپنے حوالدار کی طرف دیکھنے لگا۔

لیکن حوالدار کو داد دینے کی ہوش نہیں تھی، کیونکہ پیچھے سے مشین گن کی بوچھاڑ اس کے قریب سے گزر کر چند گز سامنے کھیت کی مینڈھ پر جا لگی تھی اور گولیاں سنسناتی ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ بھارتی سینا میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پاک فوج میدان میں اتر آئی تھی۔ ادھر ہمارے ایک محافظ بھارتی فوجی کی پیٹھ میں گولی لگی۔ وہ فٹ بھر اچھلا اور اوندھے منہ گر پڑا۔ ذرا ہی پرے تین چار گولے پھٹے اور پاکستانی گولوں کے دھوئیں کا بادل بھارت کی طرف اڑنے لگا۔ فضا اور ماحول مسلسل دھاکہ بن گئے تھے۔ سورج ابھر آیا تھا۔

اب گولیاں ہمارے قریب گر رہی تھیں۔ میں خوب سمجھ رہی تھی کہ پاک فوج کی کسی بٹالین یا کمپنی یا پلاٹون نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ اس لیے بچ بچ کر گولیاں چلا رہے ہیں ورنہ ان چند ایک بھارتیوں کو نشانہ بنانا کوئی مشکل نہ تھا۔ وہ ہمیں کافروں کے پنجے سے چھڑانے

کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے بھارتی محافظ بوکھلا گئے اور ہم سب عورتیں، ہاتھ پیٹھوں
پیچھے بندھے، ان پر ٹوٹ پڑیں اور ٹکروں سے انہیں بے حال کرنے لگیں۔ وہ دس بارہ تھے
اور ہم بیس پچیس تھیں۔ انہوں نے رائفلوں کے بٹوں اور سنگینوں سے ہمارا مقابلہ کیا۔
جانے کتنی عورتیں شہید اور زخمی ہوگئیں۔

دور سے پاک فوج کی کسی پلاٹون نے سنبھل کے فائرنگ جو کی تو ان کی مشین گنوں
کی بوچھاڑیں ہمارے اردگرد پڑنے لگیں۔ بھارتی سپاہی بھاگ اٹھے۔ کسی نے مینڈھ کے
پیچھے آڑ لی اور کوئی پیڑ کے تنے کی اوٹ میں ہوگیا۔ دو تین گولیوں سے اوندھے ہوگئے۔
ہمارے مجاہدوں کا مقصد یہی تھا کہ بھارتی ہم سے دور ہٹ جائیں۔ ان کا دور ہٹنا تھا کہ
ہمارے مجاہدوں کی گولیاں انہیں چن چن کر ختم کرنے لگیں اور ہم پیچھے کو بھاگ کر کھالی کے
اونچے کنارے کی اوٹ میں ہوگئیں۔ میں نے دانتوں سے ایک عورت کی رسیاں کھول
دیں۔ اس نے میری رسیاں کھولیں پھر ہم دونوں نے تمام عورتوں کے ہاتھ کھول دیئے۔
پاک فوج نے رن میں ایڑیاں جما لی تھیں اور جو کافر رات کی تاریکی میں حملہ آور ہوئے تھے
ان کی ایڑیاں اکھڑ گئی تھیں۔

دھوئیں کے سیاہ بادلوں سے ماحول تاریک ہوگیا تھا۔ عورتیں تھوڑی دور تک دو دو
چار چار ہو کے چلیں۔ ہم اپنی سرحد میں آ گئیں۔ پھر اکیلی اکیلی دھوئیں کے بادلوں میں گم
ہوگئیں۔ مجھے قریب ہی جھونپڑا سا دکھائی دیا۔ میں بھاگ کے وہاں چلی گئی۔ اندر دو
پاکستانی رینجروں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے قریب خالی کارتوس بکھرے تھے۔ وہ آخری
گولی تک لڑتے رہے تھے۔ میں دونوں کو جانتی تھی۔ ایک سپاہی علی افسر تھا۔ اس نے میری
شادی پر مرزا صاحباں کی بولیاں سنائی تھیں اور دوسرا احمد خان تھا۔ کبھی کبھی صبح کی اذان
دیا کرتا تھا۔ آواز میں ایسا مقدس سوز کہ سرحد کی سحر پر وجد طاری ہو جایا کرتا تھا۔ دونوں کے
جسم لہولہان تھے۔ ان کے قریب چھوٹا سا گڑھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان پر گرینیڈ
پھینکا گیا تھا۔ دونوں ہی اوندھے منہ پڑے تھے۔ میں نے لاشوں کو سیدھا کیا۔ آہ کس قدر
نور تھا ان کے چہروں پر۔ آنکھیں نیم وا۔ مونچھیں تنی ہوئی اور ہونٹوں پر تبسم۔

میرے آنسو خشک ہوگئے۔ ان کا خون میرے ہاتھوں کو لگا تو میں نے اپنے ہاتھ چوم
لیے۔ سینے میں لرزہ نہ رہا، خوف نہ رہا اور میں نے لپک کر ایک رائفل اٹھائی لیکن وہ خالی

تھی۔ دوسری اٹھائی، وہ بھی خالی، ادھر اُدھر دیکھا خالی کھوکھے بکھرے ہوئے تھے۔ گولی
ایک بھی نہیں تھی۔ میں لڑنا چاہتی تھی، لڑ نہ سکی۔

میں نے علی افسر اور احمد خان کی لاشوں کے چہروں کو ایک بار پھر دیکھا تو وہم سا ہوا
جیسے یہ اللہ داد اور میرے منے کی لاشیں ہوں۔ ممتا نے دیوانہ بنا ڈالا اور میں نے پہلے علی
افسر پھر احمد خان کے چہروں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے ان کے ہاتھ چومے، ان
سے باتیں کیں۔ میں دونوں لاشوں کے درمیان یوں بیٹھ گئی جیسے ماں اپنے سوئے ہوئے
بچوں کو بڑے فخر اور والہانہ پیار سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہہ رہی ہو —— ''یہ بچے میری
تخلیق ہیں، ان پھولوں کو میرے جگر کے خون نے تازگی دی ہے''۔

زناٹے سے ایک ہوائی جہاز اوپر سے گزر گیا۔ فضا میں مشین گنیں چلنے کی آواز سنائی
دی —— ''اللہ داد!..... اللہ داد!'' —— دل بے اختیار پکار اٹھا۔ میں اللہ داد کی لاش کی تلاش
میں اٹھ بھاگی۔ میرا پاگل پن۔ باہر کی دنیا میں اب اور ہی سماں تھا۔ بھارتی پیچھے ہٹ کے
گولیاں برسا رہے تھے۔ پاک فوج کا آتشیں جوابی حملہ عروج پر تھا۔ سوائے دھماکوں کے
کچھ سنائی نہ دیتا تھا اور سیاہ دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ زمین کا کوئی چپہ محفوظ نہ تھا۔
میں مینڈھوں، جھاڑیوں اور کھڑی فصلوں کی اوٹ میں رینگتی سرکتی اِدھر اُدھر جا رہی تھی۔
کماد کے کھیت کی مینڈھ پر ایک اور رینجر کی لاش دیکھی۔ اس کی سنگین خون آلود تھی اور اس
کے قریب چار بھارتی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے اس کی بھی رائفل دیکھی خالی
تھی۔ میں اس کی لاش کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے مہرے پر بھی میں نے اپنے منے
جیسا تبسم دیکھا۔ میں نے اس کے گالوں اور ہاتھوں کو پاگلوں کی طرح چوما۔ وہ طوطی خاں
تھا۔ وزیرستان کا رہنے والا پٹھان، نسوار اور چرس کا رسیا تھا۔ مجھے اس سے گھن آیا کرتی تھی
لیکن اس کی لاش دیکھی تو دل سے اک ہوک اٹھی جیسے طوطی خان میرا اکلوتا ماں جایا تھا۔ اس
کی مونچھوں پر خون جم گیا تھا۔ میں نے دوپٹے سے اس کی مونچھیں صاف کر ڈالیں۔

پھر میں آگے چل پڑی۔ جانے میں کتنی ہی دیر پھٹتے گولوں، گرینیڈوں اور مشین
گنوں کی بوچھاڑوں، مہیب دھماکوں، بارود اور گرد کی دھواں دھار اور ہوائی جہاز کے
زناٹوں میں رینگتی رہی۔ میں نے رینجر کے کئی سپاہیوں کی لاشیں دیکھیں اور ہر لاش کے
چہرے پر مجھے اپنے منے کی معصومیت اور تبسم نظر آیا۔ ممتا سے دل پھٹنے لگا۔ میں اپنے منے کو

بھول گئی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے رینجر کا ہر شہید میرا منا ہو۔ جیسے ہر رینجر نے میری چھاتیوں کا دودھ پیا ہو۔ مجھے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ میں قیامت کے رن میں لاشوں کے دیس میں رینگ رہی ہوں ہر چند قدم پر مجھے بھارتیوں کی لاشیں نظر آتی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اللہ داد میرا خاوند تھا۔ اس کا خیال آیا تو دل یوں تڑپا جیسے وہ بھی میرا بچہ تھا۔ میرا منا...... ممتا اندھی ہو گئی تھی۔

سرحد کے پیڑ پودے بھی اپنے بچوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

قریب ہی سے جانے کتنی مشین گنیں اور رائفلیں یکبارگی چلیں۔ سینہ دہل گیا۔ زمین کانپ گئی۔ میں نے سرحد کی طرف دیکھا۔ دھوئیں کی اوٹ میں بھارتی تیزی سے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ان کے دو ٹینک بھی واپس مڑے جا رہے تھے اوپر سے ہمارا ایک ہوائی جہاز غوطے میں آیا۔ جب وہ غوطے سے اٹھا تو زمین پر بھیانک دھماکہ ہوا اور دشمن کا ایک ٹینک سیاہ دھوئیں کا بادل بن گیا۔ پیچھے پیچھے دوسرا ہوائی جہاز آیا اور پسپا ہوتے دشمن پر مشین گنوں کی بارش برساتا گزر گیا۔

میں ذرا اور آگے بڑھی تو ایک گاؤں نظر آیا اور خاکی وردی والے سینکڑوں جوان، کوئی لیٹے ہوئے، کوئی کسی آڑ کے پیچھے کھڑے اور کوئی بیٹھے دشمن پر آگ برسا رہے تھے۔ میرے وطن کے رکھوالے پہنچ گئے تھے۔ یکایک وہ سب کے سب آگے کو بھاگے اور سو ڈیڑھ سو گز آگے جہاں آڑ ملی لیٹ گئے یا بیٹھ گئے اور فائر کرنے لگے۔ ان کے عقب سے پاکستانی توپیں وہ گولے پھینک رہی تھیں کہ دشمن کی بکھری ہوئی نفری دھوئیں میں نظر نہ آتی تھی۔

میں جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی اوٹ میں بھاگتی ہوئی گاؤں میں داخل ہوئی۔ معلوم نہیں یہ کون سا گاؤں تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں کہیں کہیں گاؤں والوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ عورتوں کی بھی اور بچوں کی بھی۔ مردوں کی لاشوں نے ابھی تک کلہاڑیاں چھویاں اور گنڈاسے تھامے ہوئے تھے۔

انہی لاشوں کے درمیان بھارتیوں کی لاشیں بھی تھیں۔ گاؤں میں زندگی کا نشان تک نہ تھا۔ پیڑوں کی شاخوں میں سے گولے گزر رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلنے لگی جیسے خواب میں چلی جا رہی ہوں۔

میں چونک اٹھی۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ میں نے رک کے دیکھا۔ پاک فوج کا ایک

جوان بری طرح زخمی پڑا تھا۔ میں بھاگ کر اس تک پہنچی اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ پانی مانگ رہا تھا۔ اس کے منہ سے پانی پانی کی سسکی سنی تو میرے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر جا پڑے یوں لگا جیسے میرے منے نے دودھ مانگا ہو لیکن مجھے یاد آ گیا کہ منے کو دودھ چھڑائے کئی مہینے گزر گئے ہیں اور اب میرے جسم میں دودھ کی نہریں خشک ہو گئی ہیں۔

میں اس کی پانی کی بوتل تلاش کرنے لگی لیکن وہ شاید اتنی جلدی میدان میں کود آیا تھا کہ پانی کی بوتل ساتھ لانے کی بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دو بھارتی سپاہیوں کی لاشیں قریب ہی پڑی تھیں۔ دونوں کے ساتھ پانی کی بوتلیں تھیں۔ میں نے ایک بوتل دیکھی۔ پانی سے بھری ہوئی تھی لیکن میرے دل میں نفرت کا طوفان اٹھ آیا۔ یوں کراہت محسوس ہوئی جیسے میں ایک غازی کو زہر پلانے لگی ہوں۔ میں نے بوتل پھینک دی۔

پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتنے میں پاک فوج کے کئی سپاہی سٹریچر اٹھائے بھاگتے نظر آئے۔ کس قدر ضروری پن تھا ان کی بھاگ دوڑ میں۔ کس قدر پیار، کتنی شفقت، وہ برستے گولوں میں زخمیوں کو اٹھا اٹھا کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ایک نے مجھے بلایا۔ میں ان کی طرف چیختی چلاتی بھاگی ـــــ ''بھاگ کے آؤ ایک زخمی پانی مانگ رہا ہے۔ پانی، پانی۔ اسے اٹھا لو'' ...... اور میں زخمی مجاہد کی طرف بھاگی۔

تھوڑی دیر بعد دو سپاہی زخمی کو سٹریچر پر ڈالے اور مجھے ساتھ لیے گاؤں کی اوٹ میں کھڑے ٹرک میں جا بیٹھے۔ ادھر سے دو اور سٹریچر زخمیوں کو اٹھائے آ گئے۔ جب ٹرک چلا تو میں نے دور پرے ایک ایمبولینس گھومتے دیکھی۔ ٹرک میں اب تین زخمی تھے اور دو لاشیں۔ آٹھ نو سپاہی اور میں، ایک سپاہی نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے؟

اس وقت تک میرے دل نے سب خوف جھٹک ڈالے تھے لیکن پاک فوج کے ایک سپاہی نے مجھ سے پوچھا ـــــ ''بہن جی تم کیسے زندہ بچیں؟'' ـــــ تو میں کمزور اور بے بس عورت بن گئی جسے بھائی جنوں اور بھوتوں سے چھڑا لائے ہوں۔ میری ہچکی بندھ گئی اور میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھل نہ سکی۔ میں نے سر گھٹنوں میں دے لیا اور روتی رہی۔ ایک سپاہی نے میرے کندھے تھام کر میرا سر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا ـــــ ''بہن جی! حوصلہ کرو...... ہم پہنچ گئے ہیں۔ اب غم نہ

کرو'' ___ میرا سینہ پھٹنے لگا۔ میں انہیں سنا ہی نہ سکی کہ مجھ پر اور سرحد کی عورتوں اور بچوں پر کیا بیتی ہے۔ میری ہچکیاں اور سسکیاں ساری داستان سنا رہی تھیں۔

اتنے میں ٹرک میں میرے پاس بیٹھے سپاہی نے بم کے دھماکے کی طرح نعرہ لگایا ___ ''اللہ اکبر'' ___ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چونک کے دیکھا۔ وہ چلتے ٹرک سے کود گیا۔ اس نے زمین پر گر کر لڑھکنی کھائی اور سرحد کی سمت اٹھ دوڑا باقی سپاہی چلانے گئے ___ ''اکبر...... فضل اکبر...... فضلے'' ___ لیکن فضل اکبر کو میری ہچکیوں نے پاگل بنا ڈالا تھا۔ وہ ایک بہن کی بپتا برداشت نہ کر سکا تھا۔ کسی نے ڈرائیور کو ٹرک روکنے کے لیے آواز دی لیکن دوسرا بولا ___ ''نہیں زخمیوں کو پہلے پیچھے پہنچاؤ'' ___ ہمارے اردگرد بھارتی توپ خانے کے گولے پھٹ رہے تھے اور فضل اکبر محاذ کے گرد و غبار اور دھوئیں میں گم ہو گیا۔

کاش میں یوں نہ روتی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ بھارتی تو اسلحہ بارود اور لشکر لے کے میدان میں آئے ہیں لیکن ہمارے جیالے جانباز، غیرت، خودداری اور وطن کی آبرو پر کٹ مرنے کی دیوانگی سے میدانِ جنگ میں کودے ہیں۔ ورنہ میں کہہ دیتی ___ ''کچھ نہیں بھائیو! میں تو بڑے اطمینان سے بھاگ آئی ہوں'' ___ لیکن میں رو جو پڑی تھی۔ اتنے سارے بھائی اکیلی بہن کو روتا کہاں دیکھ سکتے ہیں! فضل اکبر لڑاکا سپاہی نہیں تھا۔ وہ نرسنگ سپاہی تھا۔ فیلڈ ایمبولینس کا جوان جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا کیونکہ اس کا کام لڑنا نہیں، زخمیوں کو اٹھانا اور ہسپتال پہنچانا تھا لیکن میرے آنسوؤں اور ہچکیوں نے اسے پاگل بنا ڈالا تھا۔

میں آج بھی فضل اکبر کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ جنگ ہوتی رہی، جنگ ختم بھی ہو گئی۔ فوجیں واپس بھی آ گئیں۔ میں راہوں میں کھڑی گزرتے فوجیوں کو بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ میں نے پاک فوج کے شاید سارے ہی چہرے دیکھ ڈالے ہیں۔ ہر چہرہ فضل اکبر کا چہرہ لگتا ہے۔ ہر سینہ فضل اکبر کا سینہ لگتا ہے۔ میں نے اسے ٹرک سے کودتے دیکھا۔ اس کا چہرہ مہرہ نہ دیکھ سکی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیسا تھا لیکن میں اسے ہر روز دیکھتی ہوں۔ پاک فوج کے ہر جوان کا چہرہ فضل اکبر کا چہرہ ہے۔ وہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ وہ میرے تصوروں میں پاگلوں کی طرح بھاگتا رہتا ہے۔ جب تھک جاتا ہے تو میرے سینے میں آ کر سو جاتا ہے۔ کبھی تو وہ میرے اجڑے آنگن میں آ جاتا ہے اور بید کی چھڑی پر سوار

ہو کر انجن ڈرائیور بھی بن جاتا ہے۔ شاہسوار بھی اور ہواباز بھی اور جب کوا منڈیر پر آ بیٹھتا ہے تو بید کی چھڑی لکڑی کا بے جان ٹکڑا بن جاتی ہے اور میرا ننھا منا فضل اکبر کوے کو یوں ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا ہے جیسے اس کی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اور رات جب میں تن تنہا یادوں کے دیئے جلاتی ہوں تو دور سے بنسری کی پرسوز لے سرحد کی پراسرار خاموشی میں تیرتی آتی ہے تو میں اونگھنے لگ جاتی ہوں۔

میرے منے کا نام شاید اشرف تھا۔ اس کا ابو اسے اچھو کہا کرتا تھا شاید؟ کچھ یاد نہیں رہا۔ یوں جان پڑتا ہے جیسے میرے منے کا نام فضل اکبر تھا۔ فضل اکبر ہی تھا۔ پاک فوج کے ہر جانباز کا نام شاید فضل اکبر ہی ہے۔ میں نے سب کے چہروں پر اپنے منے جیسی معصومیت اور ہونٹوں پر اسی جیسا تبسم دیکھا ہے۔ میں نے ان کی لاشیں بھی دیکھی ہیں۔ ان کے چہروں پر بھی معصومیت اور تبسم تھا جو شہادت کے بعد اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ میرے منے کتنی جلدی بڑے ہو گئے ہیں۔

آج سرحد کے قریب اسی جھونپڑے میں پھر آ بیٹھی ہوں جہاں سب کچھ جل جانے کے باوجود سہاگ کی پہلی رات کی بو باس ابھی تک تر و تازہ ہے۔ میں نے ملبہ صاف کر دیا ہے۔ آنگن میں ہر روز جھاڑو دیتی ہوں۔ دروازے کے سامنے ہر صبح اور ہر شام پانی چھڑک دیتی ہوں۔ دل کہتا ہے میری کٹیا میں کوئی آئے گا ضرور۔ گاؤں میں پھر سے زندگی لوٹ آئی ہے۔ سنا ہے عورتیں کہتی ہیں ___ ''عائشہ کا خاوند شہید ہو گیا ہے۔ چلو وہ تو شہید ہو گیا لیکن یہ ماں ہے کہ ڈائن، اکلوتا، بچہ مر گیا ہے لیکن جب دیکھو جھاڑو دیتی ہے۔ چھڑکاؤ کرتی رہتی ہے اور آپ ہی آپ مسکراتی رہتی ہے۔ نہ غم نہ فکر''۔

میں کیوں غم کروں؟ کیوں فکر کروں؟ کون کہتا ہے میرا منا مر گیا ہے؟ جا کے دیکھو تو وہ ملیشیا کی وردی پہنے سرحد پر پہرہ دے رہا ہے۔ بی آر بی کے کنارے جا کے دیکھو نا! کسی چھاؤنی کی بارکوں میں جا کے دیکھو نا! وہ خاکی وردی پہنے ہر جگہ موجود ہے۔ میں ماں ہوں، ڈائن نہیں کہ اپنے جیتے جاگتے بچوں کو رونے بیٹھ جاؤں۔

⌘ ⌘ ⌘

پنجرے کا پنچھی

حمیدی

انجم ہارے ہوئے جواری کی طرح اٹھی اور کھڑکی کی طرف یوں چلی جیسے ناگوار سا بوجھ گھسیٹ رہی ہو۔ اس نے پردے ہٹائے اور جھک کے کہنیاں کھڑکی پر ٹیک دیں۔ اس کے سامنے دور دور تک پھیلی ہوئی کوٹھیوں کی فیشن زدہ بستی تھی۔ عشق پیچاں کی بیلیں، رنگ برنگے پھول، باڑوں اور لانوں کی سنواری ہوئی ہریالی تھی۔ بھاگتے کودتے بچے، کاروں کے زناٹے اور ان زناٹوں سے اٹھتے ہوئے نقرئی قہقہے جن میں ہنسی کم اور قہقہہ پن زیادہ تھا اور جو زندگی کے رچاؤ سے محروم اور دولت کے نشے سے چور تھے۔

انجم اس ہماہمی کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی قیدی سلاخوں میں سے آزاد دنیا کو دیکھ رہا ہو اور اس احساس سے اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہو کہ آزادی اور اس کے درمیان یہ چند سلاخیں نہیں اس کی ایک لغزش اور لمبے لمبے کئی سال حائل ہو گئے ہیں اور یہ دنیا جو اسے بظاہر ایک قدم دور دکھائی دیتی ہے، کوسوں دور، برسوں دور ہو گئی ہے۔

انجم کا ضمیر کسی ناگوار سے بوجھ تلے جھکتا چلا جا رہا تھا جیسے کسی جرم یا کسی لغزش نے اس پر سارا وزن ڈال دیا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے کسی ایسے جرم کی پاداش میں اس سے زندگی کی مسرتیں چھین لی گئی ہیں جو اس سے ابھی سرزد نہیں ہوا۔

انجم کا ذہن آج پھر برسوں پیچھے لوٹ گیا۔ جانتے ہوئے کہ اس کا ماضی مرگھٹ ہے جس پر گھناؤنے سائے رینگتے رہتے ہیں۔ نفرت و حقارت کے سائے، محرومیوں اور لعن طعن کے سائے اور یہ سائے جیسے سرگوشیاں کرتے گزرتے جاتے ہیں ــــ ''تو منحوس ہے نامراد جب سے پیدا ہوئی ہے گھر سے رونا نہیں نکلا'' ــــ نفرت سے بھرپور ایک گونج اس کی بستی کے ویرانے میں منڈلاتی ہی رہتی تھی ــــ ''تیری کسی کو ضرورت نہیں تھی، جانے تو

پیدا ہی کیوں ہوئی تھی‘‘۔

انجم اپنے متعلق اس رومان انگیز حقیقت سے تو جیسے بے خبر ہی تھی کہ وہ سترہ برس کی نوخیز دوشیزہ ہے اور اس کے نقش و نگار تینوں بڑی بہنوں سے زیادہ جاذب ہیں۔ اس کی گردن ان تینوں سے زیادہ لمبوتری اور زیادہ دلفریب ہے اور شکوک سے لبریز آنکھوں میں وہ سحر ہے جو اس کی تینوں بہنوں کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ انجم کو تو یادوں کی آخری حد تک ماں کا عتاب اور باپ کی بے رخی ہی نظر آتی تھی۔

اسے اسی قدر یاد تھا کہ اس کے یہ دہکتے ہوئے گال نہ کسی نے آج تک چومے ہیں نہ سترہ برس پہلے چومے تھے اور انہیں چومنے کے لیے کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ سترہ برسوں سے ایک دقیانوسی سے ساگراموفون اس کا ساتھ دے رہا تھا جس پر وہ زیادہ تر ایک ہی ریکارڈ سنا کرتی تھی۔

پنجرے کے پنچھی رے تیرا درد نہ جانے کو،

اس گانے سے وہ کبھی نہیں اکتاتی تھی۔ اس گیت کے اداس اداس اور یاس انگیز بول اسے ہلارے دیتے، کہکشاں کی راہ ستاروں کے دیس سے بھی آگے لے جایا کرتے تھے لیکن گھر میں کسی کی گھرکی یا نفرت آلود نگاہ اسے گھسیٹ کے وہیں لے آتی تھی جہاں سے وہ تصوروں کے دریچے کی راہ کود کے بھاگ گئی تھی۔ ایسے میں اس کا دل یوں دھڑکنے پھڑکنے لگتا جیسے اڑتے پنچھی کو کسی نے مٹھی میں دبوچ کر پنجرے میں پھینک دیا ہے۔

آج جب اس نے سامنے والی کوٹھی کے لان میں بچوں کو کھیلتے دیکھا تو اس کا ذہن ایک ہی جست میں برسوں پیچھے جا پہنچا۔

وہ ذرا جتنی بچی تھی تو اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے حصے میں ماں کا صرف عتاب آیا ہے۔ انجم کا تصور صرف اتنا تھا کہ وہ اس وقت پیدا ہوئی تھی جب اس کے ماں باپ کو کسی اور بچے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ غریب تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اب امیر ہو گئے تھے۔ چھوٹے سے گھروندے کی سادگی اور ٹھہری سلجھی ہوئی تہذیب چھوٹے سے مکان کے ملبے میں دب گئی تھی اور اس پر نئی طرز کی کوٹھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اس میں پرانے ماڈل کی سیکنڈ ہینڈ کار بھی آ گئی تھی۔

اس دولت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ماں باپ اب کوئی اور بچہ

پیدا کرنے کے جھنجھٹ سے فارغ ہو جانا چاہتے تھے۔ ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ بڑے دونوں بچے چھوٹے بچوں کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے تھے۔ گھر میں ملازمہ بھی تھی اور ماں باپ اب آزادی سے سینما اور پارٹیوں میں جانے لگے تھے لیکن انجم کے لوتھڑے نے ماں کی کوکھ میں انگڑائی لے کر اس کی آزادی اور زندگی کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔ اس نے خاوند کو کوسا اور نظر بچا کر صانع قدرت کو بھی گھورا جس نے اس کے پیٹ میں رحم کی تھیلی بھی دھر دی تھی۔

ماں نے انجم کو پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دینے کی سر توڑ کوشش کر ڈالی تھی لیکن دولت بھی آڑے نہ آئی۔ آپریشن کا خیال آیا تو ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آپریشن خطرے سے خالی نہیں۔ چوتھا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ماں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ باہر نکلتے یوں جھجکتی تھی جیسے اس کی کوکھ میں پھیلتا ہوا یہ بوجھ اس کے اپنے خاوند کا نہیں تھا۔

انجم کا جسم جوں جوں ماں کے پیٹ میں پھیلتا جا رہا تھا ماں کے دل میں اس کے خلاف نفرت اور غصہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ جونہی انجم پیدا ہوئی تو ماں نے ملازمہ کو کہہ دیا۔۔۔۔

’’بوتل سے دودھ پلاؤ، میں اپنا دودھ نہیں پلاؤں گی‘‘۔۔۔۔ ماں نے چھٹے روز بچی کی صورت دیکھی تھی۔

ساتویں روز انجم کا باپ دفتر گیا اور لوٹ کے نہ آیا۔ دوسرے روز اطلاع آئی کہ وہ غبن کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ الزام ایک مدت سے اس کے گرد گھوم رہا تھا لیکن انجم کی ماں کو علم نہ تھا۔ ماں نے باپ کا گناہ سات دن کی بچی کے سر تھوپ دیا کہ یہ اسی منحوس کی نحوست ہے ورنہ ایسے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

انجم کا باپ جس طرح ہاتھ پاؤں ہلا کر غبن کرتا رہا تھا اسی طرح ہاتھ پاؤں مار کر جیل سے صاف بچ آیا لیکن غبن کیے ہوئے چالیس ہزار روپے میں سے دس ہزار بچ نکلنے میں صرف ہو گئے جو انجم کے حساب میں لکھ دیئے گئے لیکن باپ محکمانہ کارروائی سے نہ بچ سکا۔ اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ انجم کو بدشگون سمجھ کر ملازمہ کے رحم و کرم پہ ڈال دیا گیا۔

بچی کی عمر ایک ماہ کی ہوئی تو اس کا ایک چچا حرکت قلب بند ہونے سے مر گیا۔ چند ہی روز بعد ننھیال والوں کی بھینس مر گئی۔ انجم کیا پیدا ہوئی کہ پورے خاندان میں ماتم

ہونے لگے۔

انجم کی عمر چھ ماہ ہوئی تو آسمان کا دولت برسانے والا سوراخ اور کھل گیا۔ کوٹھی تو بن ہی چکی تھی اب اس پر ایک اور منزل تعمیر ہو گئی مگر انجم کی روح پھر بھی منحوس ہی رہی کیونکہ چند ماہ بعد اس کا باپ سمگلنگ کے جرم میں دھر لیا گیا۔ پولیس نے آ کے کوٹھی کے کونے کھدرے کی تلاشی لی اور باپ کو ہتھکڑیاں لگا کے لے گئی۔ انجم کی ماں نے سر پیٹ لیا، اپنا کم اور انجم کا زیادہ۔ ماں بدروحوں کی طرح چیخی ''منحوس! یہ سب تیری بدروح کی کرتوت ہے نامراد! جب سے پیدا ہوئی ہے گھر میں ماتم شروع ہوا ہے..... ایک بدروح ہوتی ہی ایسی ہے۔ چڑیل! تجھے پیدا ہونے کو کوئی اور گھر نہ ملا''۔

سمگلنگ کے کمائے ہوئے نوے ہزار میں سے بیس ہزار خرچ کر کے باپ قانون کو جُل دے آیا۔

انجم سے ایک اور جرم یہ سرزد ہوا کہ وہ ایک سال کی تھی تو اس کی ماں کی ایک آنکھ میں پھولا ہو گیا۔ علاج معالجہ سے پھولا تو ٹھیک ہو گیا لیکن آنکھ کی پتلی میں ایک سفید بدنما داغ یادگار چھوڑ گیا۔ ماں کی آنکھ کیا داغدار ہوئی اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ وہ کوٹھی میں رہنے والی تھی اور کوٹھیوں والیوں سے اٹھنا بیٹھنا تھا جن میں سے کسی کی آنکھ میں سفید داغ نہیں تھا۔ ان میں سے دو بھینگی تھیں لیکن ان پر انگلی اٹھا کے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں سفید دانہ ہے۔ ان کے جسموں میں کچھ ایسی لچک تھی اور سوسائٹی میں ان کا مقام اس قدر بلند تھا کہ ان کے چاہنے والے ان کے بھینگے پن کو ''محبوب کی ترچھی نگاہیں'' سمجھ کے گھائل ہوتے رہتے تھے۔

انجم کی ماں میں اور کوئی کشش تھی ہی نہیں۔ اوپر تلے پانچ بچے جننے سے پیٹ پھول آیا تھا۔ جن چھاتیوں سے چار بچوں نے دودھ پیا تھا وہ اب انگیہ کے فریب میں بھی نہیں آتی تھیں۔ انگیہ کس کے باندھتی تھی تو لوٹا سی چھاتیاں چوڑی ہو کے ناپید ہو جاتی تھیں اور ڈھیلی کرتی تھی تو پیٹ کے نصف تک پہنچنے لگتی تھیں۔ آخر وہ ربڑ کے پیڈوں والی انگیہ استعمال کرنے لگی تھی۔ شکل وصورت پہلے ہی واجبی سی تھی، اس پر مصنوعی مسکراہٹیں۔ فیشن زدہ ظاہرداری اور فرمائشی قہقہے۔ چہرے کا رہا سہا قدرتی پن بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے مؤنث ہونے کا ثبوت صرف دو چیزوں سے ملتا تھا۔ ایک اس کا میک اپ جو عورتوں کی سی

طرح ہوتا تھا، دوسرا اس کا خاوند جو اکثر کہا کرتا تھا ''یہ میری بیگم ہیں''۔

دو اڑھائی گھنٹے بناؤ سنگھار پر صرف کر کے وہ چہرے کی جھریوں اور جہالت کو چھپا لیا کرتی تھی لیکن پتلی کا داغ کسی طور آنکھ سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ ایسے میں ماں کا غصہ عروج پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ اگر اس وقت انجم رو رہی ہوتی تو ماں تمام تر غصہ تھپڑوں اور گھونسوں کی راہ اس پر ٹھنڈا کر لیتی تھی۔

انجم آج کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ گزرے ہوئے لمحات کا تھکا تھکا سا قافلہ جیسے شام ڈھلے تھکے ہارے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کو لوٹ کے جا رہے تھے۔ اسے پندرہ برس پہلے کا ایک دن یاد آ گیا۔ وہ دو برس کی تھی کہ ننھے ننھے قدم اٹھاتی پہلی بار ریڈیو تک پہنچی اور ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ماں نے ایسی جھڑکی دی کہ وہ سہم کے الگ ہو گئی۔ جونہی ماں کمرے سے نکلی انجم پھر ریڈیو کی طرف بڑھی۔ پھول جیسا ہاتھ ریڈیو تک پہنچا ہی تھا کہ ایک اور آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ اس کے بڑے بھائی کی آواز تھی۔ اس نے اسے چونکا ہی نہ دیا بلکہ ایسا دھکا دیا کہ وہ گھوم کے منہ کے بل گری اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ماں پھر کمرے میں آ دھمکی اور بچی کو بازو سے پکڑ کر چارپائی پر دے پٹخا اور نفرت سے بھرپور آواز میں بولی ''یہاں مر منحوس! جی بھر کے رو جننے والوں کو۔ نامراد جب سے پیدا ہوئی ہے گھر میں ماتم شروع ہوا ہے''۔ ماں واہی تباہی بکتی نکل گئی اور بچی روتے روتے سو گئی۔

انجم ان لمحات کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی مگر یہ تو اس کے ذہن میں ریل کی پٹڑی کی طرح ابھرے ہوئے نقش بن گئے تھے جن پر اس کی زندگی کا دھکیلا ہوا ڈبہ شنٹ کرتا رہتا تھا۔

اس کے بعد اسے اسی قدر یاد تھا کہ اس نے گھر میں کسی بھی چیز کو کبھی ہاتھ لگایا تو ایک ہاتھ نے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو جھٹک ڈالا اور ساتھ حقارت آمیز آواز گرجی ''مت چھیڑنا اسے مردود!'' پھر خود ہی اپنے آپ کو دھکا دے کر الگ تھلگ کمرے میں بند کر لیتی اور شکوے آنسوؤں کی راہ بہہ جاتے۔

وہ چودہ برس روتی رہی اور رو رو کر ماں باپ کے دلوں میں محبت کا ذرہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر ماں باپ اس کے رونے سے اکتا اکتا کر اسے پیٹتے رہے چیختے رہے ''نامراد! جب سے پیدا ہوئی ہے گھر میں ماتم شروع ہو گیا ہے''۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا وجود ماں باپ اور بھائی بہنوں کے لیے نفرت وحقارت کا مجسمہ بن گیا اور وہ گھر کے ہر فرد کے لیے ٹوکا ٹکائی اور طنز کا نشانہ بن گئی۔ اس کا اثر اور ردِعمل یہ ہوا کہ اس کی عادت میں زود پشیمانی، چڑچڑاپن اور پھوہڑپن پیدا ہوگیا۔ اس کا دل اس جان لیوا حقیقت کی گرفت میں آ گیا کہ وہ اس گھر میں ہی نہیں اس دنیا میں اور اس زندگی کی گہما گہمی میں بن بلائی مہمان ہے۔ ان رونقوں پر اس کا کوئی حق نہیں۔ اس کج خیالی نے اس میں خود اعتمادی اور ایک بات پہ ٹک کے رہنے جیسے اوصاف پیدا ہی نہ ہونے دیئے۔ پیار کی محرومی سے روح بنجر زمین کی طرح ہوگئی تھی جس میں خشک سالی نے گہری دراڑیں ڈال دی ہوں۔ دل وجگر پیاس سے سسک رہے تھے۔

اس کی زندگی نفرت آگیں حادثات سے بھرپور تھی۔ دُکھے ہوئے دل ماضی میں جا چھپتے ہیں مگر انجم ماضی سے بھاگ کے اپنے آپ میں پناہ لیتی تھی۔ اپنی ذات کے ہُوحق سے ویرانے میں بھی اسے پناہ نہ ملتی تھی۔ آج یہ حادثات یادیں بن کر اس کی کھڑکی کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس نے سر کو زور سے جھٹک کر ان یادوں سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہ ان خیالوں کو ذہن سے نہ جھٹک سکی۔ اس وقت وہ تیرہ برس کی تھی۔ گھر میں ڈنر تھا۔ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ ان سب نے اپنے اوپر بڑا پن ٹھونس رکھا تھا وہ اپنی اصلیت کو انگریزی جملوں اور مصنوعی قہقہوں سے ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کو خوب جانتے پہچانتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی بیویوں کے بھی ظاہر اور باطن سے واقف تھے۔ ان میں ٹھیکیدار بھی تھے اور ٹھیکے منظور کرنے والے افسر بھی، سمگلر بھی اور کسٹم کے عملے کے لوگ بھی۔ ان مہمانوں میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں، ادھیڑ عمر عوتیں بھی اور وہ بھی جنہوں نے بڑھاپے کو سرخی پوڈر اور لپ سٹک کی دبیز تہوں سے جُل دے رکھا تھا۔ خود فریبی کے شکار اس انبوہ میں کنوارے بھی تھے اور شادی شدہ بھی، شادی شدہ اپنی بیویوں سے کنواروں کی طرح جھینپ رہے تھے اور کنوار سے شادی شدہ لگتے تھے۔ مصنوعی قہقہے یوں کھڑک رہے تھے جیسے بچے خالی ڈبے بجا رہے ہوں۔ ان قہقہوں میں مسرت کم اور خالی ڈبوں کا کھڑاک زیادہ تھا۔ سرکاری افسر اور نوجوان لڑکیاں سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

انجم چپ چاپ سوپ پینے میں مگن تھی جیسے ان کھڑ کھڑ کرتے قہقہوں سے اس کا دور

پار کا بھی تعلق نہ ہو۔ وہ اس فیشن زدہ ہجوم میں تنہا تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بیشتر مردوں کی نظریں اور مسکراہٹیں اس کی بہنوں پر مرکوز تھیں۔ اگر کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا بھی تو اس مسکراہٹ میں بھی اسے طنز کی جھلک دکھائی دی۔ وہ جانتی تھی کہ ساری سوسائٹی میں مشہور ہو چکا ہے کہ انجم پھوہڑ لڑکی ہے اور ذرہ بھر سوشل نہیں۔

انجم کے سینے میں بگولا سا اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری محفل اس پر چیخ اٹھی ہو___ ''نامراد! جب سے پیدا ہوئی ہے گھر میں ماتم شروع ہوا ہے..... منحوس! بدروح!'' سوپ سے بھرا ہو چمچ جو اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھ رہا تھا ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں جا پڑا۔ سوپ اچھلا اور اس کے کپڑوں کے علاوہ دو مہمانوں کے سفید کوٹوں کو بھی داغدار کر گیا۔ ماں نے بھری محفل میں اسے ڈانٹ دیا اور باپ نے مہمانوں سے اس طرح لجا کر معافی مانگی جیسے انجم سے انتہائی مکروہ جرم سرزد ہو گیا ہو۔

وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی جیسے ماں کی پھٹکار اور مہمانوں کی نفرت آلود نگاہیں اس کے تعاقب میں چلی آ رہی ہوں۔ وہ روئی اور خوب روئی۔ دوسری ہی صبح سے سختی سے حکم دے دیا گیا کہ وہ آئندہ کسی فنکشن میں شریک نہیں ہو سکتی___ ''منحوس نے ساری پارٹی کا مزہ کرکرا کر دیا''۔

اس کے سینے میں ایک چنگاری سلگنے لگی جس نے انتقام اور بغاوت کے شعلوں کو جنم دیا۔ وہ اچانک منہ پھٹ ہوگئی۔ کہاں وہ چپ چاپ سی اداس اداس رہنے والی انجم اور کہاں یہ انجم کہ کسی نے ذرا سا ٹوک دیا اور وہ اس پر برس پڑی۔ جو منہ میں آتا کہہ گزرتی، نتیجتاً اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا گیا اور اس نے دل کو سینے میں اور اپنے آپ کو کمرے میں قید کر لیا۔

جب وہ پندرہ برس کی ہوئی تو اسے الگ کمرہ دے دیا گیا۔ لڑکپن جوانی کی دہلیز پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ سینے میں ایسے احساسات اور جذبات بیدار ہونے لگے تھے جن کی تفصیلات اس کے لیے انوکھی تھیں۔ ذہن میں سوال سے پیدا ہونے لگے جن کا کوئی جو نہ تھا نہ کوئی جواب دینے والا تھا۔ عمر آگے بڑھ رہی تھی اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے اجنبی سے خیالات اور کسی دور دیس کے تصورات اس کے ویرانے میں آنے لگے۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ یہ خیالات اور تصورات لذت آگیں بھی تھے اور ملول بھی۔ اب

ان اداسیوں میں ہی اسے قرار آنے لگا۔

زندگی کے سولہویں برس میں وہ شدت سے چاہنے لگی کہ وہ کسی کے ساتھ مل بیٹھے، باتیں کرے باتیں سنے، دل کی کہے، دل کی سنے اور کسی کو اپنے پاس الگ کمرے میں دروازہ بند کر کے بٹھائے اور کہے___ ''آؤ سکھی! ایک کہانی تم سناؤ ایک میں سناؤں گی، پھر مجھے بتانا میری کہانی مجھے کس نے سنائی تھی؟ اس کا خالق کون تھا، میں نے تو نہیں سوچی تھی یہ کہانی'' ___ لیکن اپنے گرد منڈلاتی ہوئی نفرت آلود آوازوں نے اسے پابجولاں کیے رکھا اور وہ کسی سے مل بیٹھنے سے ہچکچاتی رہی۔ اس نے کھڑکی میں سے اکثر دیکھا تھا کہ کوٹھی کے سامنے رنگ برنگی کاریں رکتی تھیں اور اس کی بہنوں کو لے جاتی تھیں۔ کس قدر شوخ تھیں اس کی بہنیں، کس قدر چنچل، انجم تو ان کی طرح ہنس بھی نہیں سکتی تھی۔

اپنے سے چار سال بڑی بہن کو، جو ابھی کنواری تھی، اس نے سب سے زیادہ پھدکتے دیکھا تھا۔ اس کی ہر ادا نرالی تھی اور مردوں کو دیکھ کر تو وہ سراپا ادا بن جایا کرتی تھی۔ انجم نے دو برس گزرے اس ہنستی پھدکتی بہن کو کمرے میں لیٹے اکثر روتے بھی دیکھا اور وہ کئی ماہ کمرے میں قید رہی تھیں۔ انجم نے بارہا چاہا کہ اس سے جا کے پوچھے___ ''آپا اب باہر کیوں نہیں جاتی تم؟ اب تمہارے دوست تمہیں لینے کیوں نہیں آتے؟''___ لیکن انجم ایسی جرأت نہ کر سکی۔

اور ایک رات نصف شب سے ذرا پہلے اس نے گھر میں غیر معمولی سرگرمی دیکھی جو پُراسراری تھی۔ اس نے آپا کے کمرے سے دلدوز چیخیں سنیں اور گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ اس نے عجیب سی بو سونگھی تھی۔ دوسری صبح اس نے جھانک کے دیکھا تو اس کی آپا کا رنگ زرد تھا حالت مریضوں کی سی تھی اور وہ پلنگ پر لیٹی شکست خوردہ نظروں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ کمرے میں ابھی تک رات والی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دو مہینے تک اس کی آپا مریضوں کی طرح پڑی رہی اور تیسرے ماہ اسے ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر سے بیاہ دیا گیا جسے چاروں بہنیں حاجی چچا کہا کرتی تھیں۔ انجم کو کسی نے پتہ نہ چلنے دیا کہ دولت نے اپنے گناہ پر بڑی خوبی سے سیاہ پردہ ڈال دیا ہے اور ایک کلی جو انجم کی بڑی بہن کی کوکھ میں کھلی تھی اسے رات کی تاریکی میں مسل کر مٹی میں چھپا دیا گیا ہے۔

انجم کو خیال آیا___ ''کیا مجھے بھی کوئی اپنے ساتھ باہر لے جائے گا؟ کار پر نہ سہی

پیدل ہی آ جائے۔ جوان نہ سہی کوئی حاجی چچا کی عمر کا ہی آ جائے'' ___ لیکن اس آنگن میں آئیں تو آوازیں ہی آئیں، نفرت سے بھرپور آوازیں، اور وہ سکڑ سمٹ کے اپنے آپ میں قید ہو گئی۔

اسے تنہائی سے پیار ہو چلا تھا مگر وہ تنہائی سے اکتانے لگی۔ ایک روز اس نے کوٹھی کا مقفل سٹور روم کھولا جس میں اس گھر کی پرانی تہذیب اور سادگی چند ایک ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی صورت میں بند تھی۔ فرسودہ سے ایک ٹرنک میں سے قدیم سا گراموفون برآمد ہوا جسے نکال کر انجم نے صاف کیا، کل پرزوں میں تیل دیا اور جیب خرچ میں سے دو تین ریکارڈ خرید لائی۔ رات کا وقت تھا کہ اس نے پہلا ریکارڈ لگایا۔ دکھے ہوئے گیت کی ملول لے کمرے میں گونجنے لگی۔

''پنجرے کے پنچھی رے تیرا درد نہ جانے کو''۔

اس گھسے پرانے گراموفون نے جیسے وہ بات کہہ دی ہو جو پہلے ہی انجم کے دل میں تھی لیکن جانتی نہ تھی کہ یہ کیا ہے۔ غبار تھا سینے میں جو گراموفون نے ہلکا کر دیا۔ اس کے بعد وہ بار بار یہی گیت سنتی اور آج وہ ڈیڑھ دو برس سے یہی گیت سن رہی تھی۔

آج وہ پورے سترہ برس کی ہو گئی تھی۔ صبح سے اسے خیال آ رہا تھا کہ آج اس کی سالگرہ کا دن ہے۔ اس کے بھائی اور بہنوں کی سالگرہیں بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھیں لیکن انجم کے سوا تو جیسے کسی کو یاد ہی نہیں تھا کہ وہ بھی کسی روز پیدا ہوئی تھی۔

اس کی مزاجی کیفیت کچھ اس طرح بگڑ گئی جیسے ڈراؤنے خواب سے جاگ اٹھی ہو اور ہر سُو گھپ اندھیرا ہو۔ ذہن کے کسی کونے سے آوازیں سی اٹھنے لگیں، اٹھ اٹھ کے کمرے میں جھنجھنانے لگیں اور اس کی روح کو ڈسنے لگیں۔ وہ ٹپٹا اٹھی، کھڑکی سے ہٹی۔ اٹیچی کیس سے پرس نکالا اور باہر نکل گئی۔ کسی نے بھی اسے جاتے ہوئے نہ دیکھا۔ کوئی دیکھ بھی لیتا تو کیا تھا۔ گھر والوں نے ہی اسے دھتکارا ہوا تھا۔ کوئی اسے روکتا تو وہ مرنے مارنے پر نہ تل جاتی؟ اب تک وہ مکمل طور پر باغی ہو چکی تھی۔

وہ سڑک پر آئی، تانگے میں بیٹھی اور راوی کے کنارے جا پہنچی۔ راوی کی خنک ریت پر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ بہت دور نکل گئی۔ آخر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ سینے میں انگارے سے سلگ رہے تھے۔ اس نے سینڈل اتار کر پاؤں پانی کی روانی میں ڈال دیے۔ کچھ پانی

کی ٹھنڈک، کچھ لہروں کا لطیف سا جلترنگ، ساحلی اور حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تنہا تنہا سی فضا، ماحول میں کچھ ایسا پیارا سا ٹھہراؤ تھا کہ انجم کے انگارے ٹھنڈے ہونے لگے۔ اسے سکون سا محسوس ہوا، ملول سا سکون، مقید سا، وہ پرانا سا کوئی گیت گنگنانے لگی۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ وہ کھل کے گانے لگی۔

اسے نیند سی آنے لگی جیسے لمبی اور کٹھن مسافت طے کر کے منزل پر آ گری ہو۔ کس قدر روح افزا تھی یہ نم ناک سی فضا، انسانوں سے دور تنہا سا یہ ماحول لیکن وہ تنہا نہیں تھی۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ نوجوان لڑکی جا رہی ہو اور راہ چلتے لوگوں کی آوارہ نظریں اسے روک لینے کی کوشش میں اس کے تعاقب میں نہ بھاگ اٹھیں۔ بھرے چوکوں اور بازاروں میں لوگ رک کے دیکھنے لگے جاتے ہیں۔ یہ تو ساحل کی تنہائی تھی۔ ایسی جگہ گھومتی پھرتی اکیلی دکیلی لڑکی آوارہ تصوروں کا عروج معلوم ہوتی ہے یا کوئی جل پری جو ذرا کی ذرا ساحل پہ آ بیٹھی ہو۔

انجم نے گھوم کے دیکھا تو اس کا دل یکبارگی اچھلا اچھل کے یوں ڈوب گیا جیسے پانی سے مچھلی نے سر نکال کر پھر ڈبکی لگالی ہو۔ ایک آدمی، ہونٹوں پہ خفیف سی مسکراہٹ، آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ انجم نے دیکھا تو مارے غصے کے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اپنی طرف دیکھنے والوں پر اسے اسی طرح غصہ آ جایا کرتا تھا۔ اسے ہر کسی کی نگاہ میں طنز اور طعنے دکھائی دیتے تھے۔

وہ اٹھی اور منہ پھر کر دریا کے کنارے کنارے چل پڑی۔ اجنبی نے قریب آ کر کہا—— ''اے، اے سنئے!......'' وہ رک گئی۔ وہ بولا—— ''آپ نے یقیناً برا منایا ہو گا۔ میں صرف داد دینے آیا ہوں۔ آپ بہت......''

''جی ہاں! میں بہت اچھا گاتی ہوں''—— انجم نے طنز آلود لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا—— ''اور بھی کچھ کہنا ہے آپ کو؟''

''اوہ! آپ ناراض ہو رہی ہیں''—— اس نے انکساری سے کہا—— ''شاید اس لیے کہ میں مرد ہوں......''

''جی نہیں!''—— انجم نے غصے سے کہا—— ''اس لیے نہیں کہ آپ مجھے چھیڑیں گے بلکہ اس لیے کہ آپ نے میری تنہائی کو تباہ کر دیا ہے۔ میں یہاں سکون کی تلاش میں آئی

تھی''۔

''اوہ! مجھے معاف کر دینا محترمہ!''—— اجنبی کا لہجہ اداس ہو گیا اور ذرا سا رک کر بولا—— ''میں آپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ میں خود یہاں سکون ہی کی تلاش میں آیا کرتا ہوں۔ میں بھی گوارا نہیں کیا کرتا کہ کوئی میری تنہائی میں قدم رکھے۔ خدارا، اتنی سی صفائی پیش کر لینے دیجئے کہ میرا مطلب اور کچھ نہ تھا۔ اس ماحول میں آپ کی آواز بڑی ہی اچھی لگی تھی''۔

انجم رک گئی جیسے اجنبی کے لہجے اور الفاظ نے اس کا مزاجی کھچاؤ کم کر دیا ہو۔

وہ کہہ رہا تھا—— ''میں وہاں سامنے ان درختوں کے جھنڈ میں جا کے گایا کرتا ہوں۔ وہاں میرے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ شام کو پرندے آتے ہیں اور میری سنگت میں گاتے ہیں''۔

''آپ گا سکتے ہیں؟''—— انجم نے یکسر بدلی ہوئی ذہنی حالت میں پوچھا۔

''میں اسے گانا ہی کہا کرتا ہوں''—— اجنبی بولا—— ''آپ جانے کیا سمجھیں''۔

دوسرے لمحے وہ اس کے پاس ریت پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے مسحور کر کے بٹھالی گئی ہو اور راوی کی ہلکی ہلکی لہروں کے جلترنگ سے ایک نغمہ ابھر رہا تھا۔

وہ گا رہا تھا اور انجم پر خود فراموشی طاری تھی، بے خودی سی۔ اس نے دو ایک بار گانے والے کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ان آنکھوں میں ایک دکھ بھرا پیغام تھا جو گانے والے نے اسی کو سنانے کے لیے چھپا رکھا تھا۔ پھر یوں جیسے اجنبی کے سینے میں شگاف ہو گیا ہو اور انجم اس میں سماتی جا رہی ہو۔ پھر وہ اس طلسم میں سما گئی۔ جذب ہو کے رہ گئی۔ گانے والا گا چکا تھا لیکن مترنم گونج ابھی تک انجم کے گرد منڈلا رہی تھی۔ اسے محسوس ہی نہ ہوا کہ اس نے اپنا ہاتھ اجنبی کے ہاتھ پر رکھا ہوا ہے جسے اجنبی سہلا رہا ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ انجم کے سینے میں ہلچل تھی۔ دونوں نے بہت سی باتیں کہہ سن لیں اور سورج غروب ہونے تک دو اجنبی ہم راز دوست بن چکے تھے۔ درد مشترک تھا۔ جذبات ایک جیسے تھے لیکن اس آدمی نے وہ بات پھر بھی نہ کہی جس کے انتظار میں انجم نے عمر کے سترہ برس گزار دیے تھے۔ اب اس کا انتظار اور امید ہی ترک کر دی تھی۔

آخر اس نے وہ بات کہہ ہی دی۔ وہ اس وقت جب وہ انجم کو موٹر سائیکل پر بٹھائے شہر کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اس کا موٹر سائیکل پل کے قریب کھڑا تھا۔ وہاں تک پہنچتے شام

کا دھندلکا رات کے اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے انجم کو پیچھے بٹھایا تو انجم نے ایک بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ مرد کے پہلے لمس نے اس کے جسم میں زندگی کی رمق اور دل کی دھڑکنوں میں بے پناہ سرگرمی پیدا کر دی۔

موٹر سائیکل بہت تیز چلا جا رہا تھا اور انجم جیسے بادل کے سفید ٹکڑے پر آسمان کی وسعتوں میں اُڑی جا رہی تھی۔ جانے وہ کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی کہ موٹر سائیکل کی بے ہنگم پھٹا پھٹ اور تیز ہوا کے چیخ نما زناٹوں میں سے آواز آئی ـــــ ''انجم! تم کتنی اچھی ہو''ـــــ انجم کو خوشگوار سا دھچکا لگا۔ وہ بازو کا گھیرا تنگ کر کے ہونٹ اس کے کان کے قریب لے گئی۔ اسی شور شرابے میں اس نے اپنی سرگوشی سنی ـــــ ''عرشی! تم کتنے پیارے ہو''ـــــ اور اس نے دوسرا ہاتھ عرشی کے کندھے پر رکھ دیا۔

وہ رات انجم کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ کمرے کی فضا بے ہنگم پھٹا پھٹ اور تیز و تند ہواؤں کے شور سے لرزتی رہی اور اس طوفانی شور میں دو سرگوشیاں ایک دوسری کے تعاقب میں اُڑتی رہیں ـــــ ''انجم! تم کتنی اچھی ہو...... عرشی! تم کتنے پیارے ہو''ـــــ وہ خیالوں کے اُڑن کھٹولے پہ اُڑی جا رہی تھی۔

اگلی شام وہ پھر عرشی سے راوی کنارے ملی۔ آس پاس کوئی نہ تھا پھر بھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک ہجوم اسے گھور گھور کے دیکھ رہا ہو اور وہ اپنے آپ میں سکڑ رہی ہو۔

وہ ساحل پر چلے جا رہے تھے کہ اس نے ہاتھ عرشی کے ہاتھ میں دے دیا جسے عرشی نے زور سے دبایا تو انجم کی ہنسی نکل گئی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی ہنسی تھی یا شاید ایسی ہنسی جسے اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ مسرت اور جذبات سے لبریز اس ہنسی نے اس کی سترہ سالہ زندگی کی تلخ کامیاں اور محرومیاں دھو ڈالیں۔

لیکن وہ بے قرار سی ہوئی جا رہی تھی جیسے کوئی اہم بات بھول رہی ہو یا جیسے کوئی قیمتی چیز کہیں بھول آئی ہو۔ اسے کچھ یاد آ رہا تھا جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی اور جسے وہ یاد کرنا چاہتی تھی وہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے رہ رہ کے عرشی کو دیکھا۔ اس کے ایک ایک نقش کو دیکھا۔ وہ اسے بہت ہی اچھا، بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ وہ کسی چیز کی کمی محسوس کر رہی تھی اس نے بے اختیار چاہا کہ عرشی سے کہے ـــــ ''آؤ عرشی! اسی طرح چلتے چلیں

اور لوٹ کے نہ آئیں''۔

وہ کہنے میں لگی تھی کہ عرشی نے بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔ انجم اس کے ساتھ لگ گئی بلکہ تھوڑی دور تک اس نے اپنا بوجھ عرشی پر گرا دیا۔ عرشی نے اس کے سر پر بوسہ دے کر کہا ـــــ ''انجم! تم کتنی اچھی ہو''۔

وہ چونک اٹھی جیسے بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو لیکن ان الفاظ میں آج وہ سحر نہ تھا جو اس نے ایک روز پہلے محسوس کیا تھا۔ انجم کا دل جو عشق کے خمار میں بے خود ہوا جا رہا تھا بے قرار سا ہونے لگا جیسے نشہ اُتر رہا ہو۔ وہ تڑپ اٹھی اور سامنے آ کر عرشی سے لپٹ گئی اور جذبات سے بھرپور لہجے میں بولی ـــــ ''عرشی! مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

عرشی نے اسے سینے سے لگا کے زور سے بھینچا اور زور سے لیکن انجم کی بے چینی بڑھتی گئی۔

''تم نے کل کی طرح کیوں نہیں کہا ـــــ ''انجم! تم کتنی اچھی ہو''۔

''آج تو میں نے پاگل ہو کے کہا'' ـــــ عرشی نے کہا۔

''نہیں!''ـــــ انجم نے بے چین ہو کے کہا ـــــ ''مجھے کل والا لطف نہیں آیا''۔

وہ اور بے چین ہو گئی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔

دونوں واپس آ کے موٹر سائیکل پہ بیٹھے تو عرشی نے شہر کا رخ کیا۔

''ادھر نہیں''ـــــ انجم نے کہا ـــــ ''شاہدرے کی طرف...... آگے...... اور آگے، کھلی ویران سڑک پہ چلو''۔

عرشی انجم کو پیچھے بٹھائے شاہدرے سے بہت آگے چلا جا رہا تھا کہ انجم نے کہا ـــــ ''عرشی! تیز!''۔

رفتار اور تیز ہو گئی۔

''عرشی! اور تیز!''ـــــ انجم پہ دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔

موٹر سائیکل زمین سے اٹھنے لگا۔

انجم نے چیخ کر کہا ـــــ ''اور تیز! عرشی! اور تیز!''۔

موٹر سائیکل کی رفتار انتہا تک جا پہنچی۔

تیز و تند ہواؤں نے انجم کی آنکھیں بند کر دیں۔ بال بکھر کے چہرے پر چپکنے لگے۔
قیامت خیز شور نے اس کے کان بند کر دیئے اور انجم جیسے ان چیختی ہواؤں اور رات کا سینہ چاک کرنے والے شور کا جزو بن گئی۔ اس نے دونوں بازو عرشی کے سینے پر لپیٹ کے اسے زور سے بھینچا اور گال اس کے گال کے ساتھ لگا کر کہا___ ''عرشی! اب کہو، انجم تم کتنی اچھی ہو''۔

اور آندھی کے زناٹوں میں سے عرشی کی آواز ابھری___ ''انجم تم کتنی پیاری ہو''۔

''عرشی! تم کتنے......''

موٹر سائیکل سڑک سے اتر کر زور سے اچھلا۔ عرشی نے چونک کر تھراٹل بند کر لیا اور موٹر سائیکل روک کر بولا___ ''تم تو پاگل ہو''۔

''میں پاگل ہی ہوں عرشی!''___ انجم اس سے لپٹی رہی۔ وہ رو رہی تھی۔ بولی___ ''میری زندگی ایک طوفان ہے عرشی ایک آندھی۔ چیختی ہوئی ہوائیں اور مسلسل دھماکے۔ میں انہی میں پیار ڈھونڈتی رہی ہوں عرشی! مجھے انہی بگولوں میں پیار دو''۔

''میں تو تم سے پیار مانگنے آیا ہوں پگلی!''___ عرشی نے کہا۔

''سچ کہو تم دھوکہ تو نہیں دے رہے ہو؟''___ انجم نے اس کا چہرہ تھام کے کہا___ ''قسم کھاؤ تم خواب تو نہیں ہو؟''___ اس کی آواز بھرا گئی، سسکی لے کے بولی___ ''تم میرا وہ تصور تو نہیں ہو جسے میں نے جنم دیا ہے؟''

عرشی نے اس کے گال سہلاتے ہوئے کہا___ ''تم پاگل ہو''۔

وہ ہر دوسری تیسری شام عرشی سے ملنے لگی۔ ان کا پیار اتنی دور پہنچ گیا جہاں سے لوٹ آنا ممکن نہ تھا لیکن انجم اندر ہی اندر دو حصوں میں کٹتی گئی۔ بچپن اور ماحول کے اثرات اس کی مسرت کو ڈس رہے تھے۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس پر ہنس رہا ہو اور منہ چڑا رہا ہے___ ''منحوس! تُو پیدا ہی کیوں ہوئی تھی...... تُو تو بدروح ہے نامراد!''___ وہ تڑپ کے رہ جاتی۔ گاہے یوں محسوس کرتی جیسے عرشی بھی اس پر طنز کر رہا ہو۔

اس نے اپنے آپ کو ایسی جنت میں پایا جس پر جہنم کے سائے رینگ رہے تھے۔

ایک بار نہیں کئی بار وہ عرشی کی گود میں سر رکھے چونک اٹھی اور خود فراموشی سے بیدار ہو کے بے تابی سے عرشی کے کندھے جھنجھوڑے___ ''سچ کہو عرشی! تم مجھے چاہتے ہو؟......

نہیں، نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم کھیل رہے ہو۔ تم میرے لیے ریت کا گھروندا بنا رہے ہو''۔

عرشی کو اس سے والہانہ پیار تھا جس کے بل بوتے پر وہ اسے سنبھال ہی لیتا تھا۔

انجم کے ماں باپ نے اللہ کا سو شکر ادا کیا کہ ان کی پھوہڑ سی بیٹی کا بھی کوئی امیدوار پیدا ہو گیا ہے۔ عرشی نے ان سے راہ و رسم پیدا کر کے بات چلائی ہی تھی کہ انہوں نے ہاں کر دی اور انجم کو عرشی سے بیاہ دیا گیا۔ باپ نے انجم کو تین ہزار کی مالیت کا ہار دیا اور انجم کو پہلی بار محسوس ہوا کہ باپ کے دل میں اس کی محبت کی ذرا سی رمق موجود ہے۔ اسے اس ہار سے بہت پیار ہو گیا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس ہار میں محبت کم اور نمائش زیادہ تھی۔

عرشی تن تنہا آدمی تھا۔ الگ تھلگ چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ اس نے انجم کو رانی بنا کر اس کوٹھی میں آباد کیا تو انجم کی ذہنی حالت میں یوں ہونے لگی جیسے اس کے اعصاب اس قدر عظیم اور غیر متوقع مسرت، آزادی اور اہمیت کے متحمل نہ ہو سکے ہوں۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ منحوس اور نامراد نہیں ہے۔ یہ تلخ احساسات تو اس کی فطرت کا حصہ بن چکے تھے۔ شادی کے بعد بھی عرشی کو کئی بار انجم کے اس پاگل پن کے دوروں سے نبٹنا پڑا۔ وہ رہ رہ کے عرشی سے پوچھتی___ ''سچ بتاؤ عرشی! تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟ اب بھی بتا دو، میں وہیں اپنے کمرے میں جا کے قید ہو جاتی ہوں''۔

انجم کے سینے میں ایک پنچھی قید تھا جسے وہ آزاد کر دیا کرتی تھی لیکن وہ ذرا سا اڑ کر کے پھر پنجرے میں آ قید ہوتا تھا۔

ایک روز عرشی نے اسے کہا کہ ایک دوست کی مالی مدد کے لیے تین ہزار روپے کی ضرورت ہے لیکن اس کے پاس صرف پانچ سو روپیہ ہے۔ اس نے انجم سے مشورہ لیا کہ اس کے باپ سے اڑھائی تین ہزار قرض لے لیا جائے لیکن انجم ماں باپ کا احسان قبول کرنے کو تیار نہ ہوئی۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور وہ ابھی ابھی کہیں سے گھوم پھر کے آئے تھے۔ انجم صوفے پہ بیٹھی تھی اور عرشی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ انجم نے باتوں باتوں میں ہار اتار کر صوفے پہ رکھ دیا۔

عرشی نے کہا___ ''اگر یہی ہار دے دو تو اسی کے اڑھائی تین ہزار مل جائیں گے''۔

انجم نے کہا۔۔۔ ''اونہہ! اتنا پیارا ہار ہے۔ یہ تو میں تین لاکھ پہ بھی نہ دوں''۔۔۔ اس نے ہار صوفے پہ ہی رکھ پہ دیا اور بولی۔۔۔ ''جانتے ہو عرشی! یہ ہار سونے کا نہیں۔ میرے ابا کے پیار کا ہے''۔

لیکن عرشی اپنے دوست کی مدد کرنے کے متعلق بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے زور دے کر کہا۔۔۔ ''انجم! یہ ہار دے دو، تمہیں اس سے خوبصورت ہار لا دوں گا''۔

انجم نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔۔۔ ''آپ تو یوں پریشان ہو رہے ہیں جیسے آپ دوست کے تین ہزار کے مقروض ہیں۔ ہٹائیے اس قصے کو''۔

عرشی انجم کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور صوفے پہ پڑی ایک گدی اٹھا کے گھٹنوں پر رکھ لی۔ ہار دونوں کے درمیان پڑا تھا۔ عرشی نے کہا۔۔۔ ''پریشانی یہ ہے کہ اس کی بیوی نے عجیب لجاحت سے کہا تھا کہ تین ہزار کا بندوبست کر دینا''۔

بیوی کا نام سنتے ہی انجم کے سینے میں طوفان اٹھ آیا۔ وہ بھک سے اُڑ جانے والے بارود کی طرح پھٹ پڑی۔

''پھر یوں کہئے نا کہ یہ بندوبست کسی اور کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ پریشانی اس کی بیوی کو خوش کرنے کے لیے ہے۔ اس کی خاطر آپ میرا ہار بھی بیچنے پہ تل گئے اور میری باتوں پہ دھیان ہی نہیں''۔

وہ رونے لگی اور غصے میں جو منہ میں آئی کہہ ڈالی۔ اسی غصے میں اٹھی، کانوں سے آویزے اتار کر سنگار میز کی دراز میں پھینک دیے، تینوں انگوٹھیاں اور گھڑی بھی اتار کر دراز میں پھینک دی۔ عرشی نے گھٹنوں سے گدی اٹھا کے صوفے پہ پھینکی اور لگا انجم کو سنبھالنے مگر وہ تو غصے اور شکوک سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں کہ عرشی کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔ انجم دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عرشی بھی اس کے پیچھے گیا لیکن لوٹ آیا اور باہر نکل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے انجم کو اس کیفیت میں تنہا چھوڑا تھا۔

ذرا سی دیر بعد انجم پھر اس کمرے میں آئی۔ مزاجی حالت اور زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ دیکھا کہ عرشی اس کمرے میں نہیں تھا وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تمام کمروں میں گھوم آئی، عرشی کہیں نہ ملا۔ واپس آ کر دھڑام صوفے پر بیٹھ گئی اور خلاؤں میں گھورنے لگی۔

اس نے اپنی گردن پہ ہاتھ رکھا تو چونک اٹھی۔ صوفے پہ نگاہ ڈالی۔ اس کا دل اچک کے حلق میں آ ٹکا۔ ہار غائب تھا وہ ایک ہی جست میں سنگار میز کی دراز تک پہنچی، وہاں بھی ہار نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ ہار تو اس نے صوفے پر ہی رکھا تھا۔ تین گدیاں صوفے پر رکھی تھیں، ہار نہیں تھا۔

''وہ ہار لے گیا ہے''۔۔۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔۔۔ ''کہہ رہا تھا یہ بیچ کر دوست کی بیوی کو تین ہزار روپیہ دوں گا۔۔۔ عرشی نے بھی دھوکا دے دیا''۔

لمحات کا غول پیچھے کو اُڑنے لگا۔ ایک ایک لمحہ اسے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔۔۔ ''تُو پیدا ہی کیوں ہوئی تھی منحوس! بدروح! تُو ہے ہی نامراد! جب سے پیدا ہوئی ہے گھر میں ماتم شروع ہوا ہے۔۔۔ کوئی نہیں آئے گا تیرے اُجڑے انگنا۔۔۔''

ماضی نے اسے ڈس لیا۔

''میں نے جسے چاہا وہ بھی فریب دے گیا، چور اچکا نکلا، محبت کو ہار پر قربان کر دیا''۔

عرشی کی محبت کے سہارے وہ اتنی دور نکل آئی تھی کہ اب اسی کمرے میں جا کے قید ہو جانا آسان نہ تھا۔ پنجرے کے پنچھی نے آزاد فضاؤں کی لذت چکھ لی تھی۔ انجم نے اسے پھر سے قید کر لینا چاہا لیکن اب وہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

انجم اندھیروں میں بھٹک گئی۔ ماضی کی گھٹائیں اور گہری ہو گئیں۔ اس گھٹا ٹوپ میں اسے اپنا نائیلون کا دوپٹہ نظر آیا۔ اس نے لپک کر دوپٹہ اٹھایا اور گردن کے گرد لپیٹ کر گانٹھ دے دی۔ دونوں طرف سے پکڑ کر دوپٹے کو اس قدر زور سے جھٹکے دیے کہ نائیلون کا مضبوط دوپٹہ پھانسی کے رسے کی طرح گردن میں کھب گیا اور انجم تڑپ کے سنگار میز کی کھلی ہوئی دراز پہ جا لگی۔ وہاں سے تڑپی تو تپائی کو گراتی اوندھے منہ فرش پر گری۔ گانٹھ مضبوط اور پھندا تنگ تر ہو چکا تھا۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر ملازمہ بھاگی ہوئی کمرے میں آئی، دیکھا کہ انجم فرش پر پڑی تھی۔ جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ ملازمہ اس قدر گھبرائی کہ گلے سے دوپٹہ کھولنے کی بجائے باورچی کو بلانے بھاگ اٹھی۔ جب باورچی کمرے میں آیا تو پنجرے کا پنچھی آزاد ہو چکا تھا۔

ملازمہ نے نبضیں دیکھیں، دل پہ ہاتھ رکھا، ہر طرف خاموشی تھی دونوں نے لاش کو

اٹھایا اور صوفے پر ڈالنے لگے باورچی نے صوفے کے درمیان رکھی ہوئی گدی کو سرکی طرف کیا تو فرش پر چھنا کا سا ہوا۔ لاش صوفے پر ڈال کر ملازمہ نے باورچی سے کہا——

''دیکھنا فرش پر کیا گرا تھا؟''

باورچی نے جھک کے کہا—— ''بیگم کا ہار ہے۔ شاید گدی کے نیچے رکھا تھا کھینچتے گر پڑا ہے''۔

چند منٹوں بعد عرشی لوٹ آیا۔ وہ تو ویسے ہی اُکتا کر باہر نکل گیا تھا۔ آ کے دیکھا تو اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ باورچی نے ہار تپائی پر رکھ دیا۔ عرشی نے ہار اٹھا کے انجم کی لاش کے گلے میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

⌘ ⌘ ⌘

اکھاڑہ

کہتے ہیں استاد کاموکے اکھاڑے کو پیر کی دعا تھی۔

جانے اس اکھاڑے کو کسی پیر کی دعا تھی یا نہیں لیکن اس نرم وملائم، تیل پسینے سے بھیگی مٹی میں اَن گنت کہانیاں، بے شمار وارداتیں ___ کچھ حزنیہ کچھ طربیہ ___ ضرور دفن تھیں۔ جنہیں وقت وزمانہ کے لمحات آئے دن دہرا رہے تھے۔ جامی اور سراج دین نے نوردین لوہار کی بیٹی کی شرط بدکر کشتی جولڑی تھی وہ اسی اکھاڑے میں لڑی تھی اور جامی کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چندروز بعد جب سراج دین کی بارات نوردین کے گھر جارہی تھی تو جامی شاہدرہ کے قریب مال گاڑی تلے آکر کٹ گیا تھا۔

کرن سنگھ نے اسی اکھاڑے میں جرنیلے کو للکارا تھا اور جرنیلا ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ لئے اکھاڑے میں اتر آیا تھا۔ جرنیلا کرن سنگھ سے تو کبھی نہیں گرا تھا لیکن اس روز دھوبی پٹڑے کی لپیٹ میں ایسا آیا کہ کرن سنگھ اسے سر سے اوپر تک اٹھالے گیا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ کرنا جرنیلے کو یوں پٹخے گا۔ دونوں اسی اکھاڑے اور ایک ہی استاد کے پٹھے تھے، دشمن نہیں تھے لیکن کرنے نے اسے دشمنوں کی طرح پھینکا اور پھینکا بھی اکھاڑے کے پختہ کنارے پر جہاں جرنیلا سر کے بل گرا پھر اٹھ ہی نہ سکا اور تیسرے روز ہسپتال میں دم توڑ گیا۔

ادھر جرنیلا مرا ادھر کرنے اپنی بہن کا گلا گھونٹ دیا اور تھانے جاکر اقبال جرم کرلیا کہ ___ ''میں بہن کو قتل کر آیا ہوں اور جرنیلے کو بھی میں نے قتل کیا تھا'' ___ محلے والے تو پہلے ہی سرگوشیاں کرتے تھے کہ جرنیلا گلی میں جو پھیرے لگاتا رہتا ہے اور ایشرو جو شام گہری ہوتے ہی کبھی کبھی چپکے سے باہر نکل جاتی ہے مردوں کے سرکھلوا کے رہے گی۔

استاد کامو کی جوانی عروج تھا۔ اس کا باپ بوڑھا ہو چکا تھا۔ باپ نے اپنی تمام ترقوت، داؤ پیچ اور فن کامو کے جسم میں سمو دیا تھا۔ دودھ، دہی، گھی اور بادام کامو کے جسم میں جا کر فولاد بن گئے تھے اور کامو اب پٹھا نہیں استاد کامو تھا جس کی شاگردی میں کوئی کوئی پٹھا ٹھہرتا تھا اور جو ٹھہر جاتا تھا اس کا جوڑ دور دور تک نہیں ملتا تھا۔ باپ نے استاد کامو کو چند آخری داؤ بتائے اور موت کے سامنے چاروں شانے چت لیٹ گیا۔

اکھاڑہ استاد کامو نے سنبھال لیا اور باپ کا نام باپ کے ساتھ مرنے نہ دیا۔ اس اکھاڑے کی فضا تیل، پسینے، باداموں اور تماشائیوں کے حقوں کے دھوئیں سے بوجھل رہتی تھی اور ہر شام یہاں ''یا علی مدد'' ''ست سری اکال'' ''جے بھگوان جی کی'' اور ''یا پیر و مرشد'' کے نعرے گونجا کرتے تھے۔ پٹھے کسرت کرتے تھے، استاد کامو انہیں داؤ سکھاتا تھا۔ ان کا پیر و مرشد اور واہگورو استاد کامو تھا۔ محبت اور خلوص ان کا مذہب اور کشتی اور کسرت ان کی عبادت تھی۔

استاد کامو کا اکھاڑہ دور دور تک مشہور تھا۔ یہاں جو بھی للکار کے آیا، ہار کے گیا اور اس اکھاڑے کے پروردہ جہاں بھی گئے، جیت کے آئے۔ بڑے بڑے استاد، کامو کو گرانے آئے جو گر کر چلے گئے، بعض ہزاروں روپے کی شرط بد کر آئے اور روپے کاموں کے کام آئے۔

وقت گزرتا چلا گیا اور استاد کامو کے سینے پر بڑھاپا دستک دینے لگا۔ باداموں اور تیل نے چند روز بڑھاپے کو فریب دیئے اور اسے ٹالتے رہے لیکن بڑھاپا لوٹ جانے کو نہیں آیا تھا۔ اس کی دستک بلند تر ہو رہی تھی اور جوانی کے پٹ ٹوٹنے لگے لیکن استاد کامو استاد ہی نکلا۔ اس نے اپنی جوانی، اپنے شاگردوں کی رگوں اور پٹھوں میں محفوظ کر دی اور اکھاڑے کے ہنگاموں، گہما گہمی اور شہرت کو بوڑھا نہ ہونے دیا۔ اس اکھاڑے کے پٹھے قلعے کی دیواروں کی طرح استاد کامو کے نام کی حفاظت کو کھڑے ہو گئے۔

استاد کامو کے شاگردوں اور منجھے ہوئے پہلوانوں کے پیار بھرے اور جوشیلے نعرے بدستور گونجتے رہے لیکن ملک کے کونے کونے سے کچھ ایسے نعرے ابھرنے لگے جو اکھاڑے کے نعروں کو ہڑپ کرنے لگے۔ استاد کامو اور اس کے شاگردوں نے بہت جتن کئے کہ اکھاڑے کی رونق اور ہماہمی کو مذہب اور سیاست سے بچائے رکھیں لیکن انہیں معلوم

نہ تھا کہ سارا ملک اکھاڑہ بن چکا ہے جس میں ''مشکل کشا'' ''بھگوان'' ''پیرو مرشد'' اور ''واہگورو'' اتر آئے ہیں اور مذہب اور سیاست دور بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

اکھاڑے پر مندر، مسجد اور گوردوارے کے سائے پڑنے لگے اور اکھاڑے کے بے ضرر اور پیار بھرے نعرے بجتے بجتے گلیوں اور محلوں میں بکھر گئے۔

پھر ان نعروں سے خون ٹپکا اور خون کا میل اکھاڑے کی سرگرمیوں اور رونق کو ہی بہا لے گیا۔

تقسیم تو ملک کی ہوئی تھی مگر انسان ہی بٹ گئے۔

انسان انسان کا بیری ہو گیا، آنگن اجڑ گئے۔

سہاگ لٹ گئے۔

ساؤنی کی کھڑی فصلوں کی ہریالی اجڑ گئی۔

استاد کامو کا اکھاڑہ اجڑ گیا۔

استاد کامو نے جن پٹھوں میں آہنی جوانی سمودی تھی وہ سرحد پار چلے گئے اور جو سرحد سے پار آئے ان میں اکھاڑے آباد کرنے کی سکت نہیں تھی۔ جینے کے ڈھنگ ہی بدل گئے، معاشرت کے خطوط ہی ٹیڑھے ٹیڑھے سے ہو گئے اور استاد کامو اجڑے اکھاڑے کے کنارے اسی چارپائی پر لیٹ گیا جس پر اس کے باپ نے لیٹ کر زندگی کے آخری دن گزارے تھے۔

استاد کامو کا پیٹ بڑھ چلا تھا، جسم بے ڈھب ہوتا جا رہا تھا، گردن کا گوشت لٹکتا آ رہا تھا اور گھٹنوں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اس کا گھر اکھاڑے کے قریب ہی تھا۔ وہ اکثر پچھواڑے کی کھڑکی کھول کر اکھاڑے کو دیکھنے بیٹھ جاتا اور بڑی ہی دیر تک اس کی ٹھہری ٹھہری سی نگاہیں اکھاڑے کی اکڑی ہوئی مٹی پر حیران و پریشان جمی رہتیں۔ گاہے وہ اکھاڑے کے پاس چارپائی پہ لیٹے لیٹے یوں چونک کے اٹھ بیٹھتا جیسے اس کے شاگرد لوٹ آئے ہوں اور اکھاڑہ کھود رہے ہوں اور رونقیں جو افق کے اس پار چلی گئی تھیں اُڑ کے لوٹ آئی ہوں۔ استاد کامو مسکرانے لگتا لیکن قریب سے گزرتی کار یا ٹرک کا ہارن یا تانگے کی ٹاپ ٹاپ یا کسی کی ''استاد کامو سا مالیکم'' کی رسمی سی آواز اسے یوں ماضی کے سبزہ زاروں سے اٹھا کے، اجڑے اکھاڑے کی سخت مٹی پہ لا پٹختی جیسے چیل مرغی کے بچے پنجوں میں

دبوچے گھونسلے میں لا پھینکتی ہے۔ استاد کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

ایک دو بار تو اس نے کدال تھام لی تھی اور اکھاڑے کے وسط میں کھڑے ہو کر دھرتی کا سینہ چاک کر دینا چاہا تھا لیکن اس نے دکھ زدہ آہ لے کر کدال پھینک دی اور سر جھکائے گھر چلا گیا۔ سوچا ـــ ''کھود بھی لوں گا تو کون آئے گا یہاں کشتی لڑنے''۔

گھر میں استاد کامو کے لیے سکون کا کچھ سامان تھا جس سے وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلا لیا کرتا تھا۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ دو بچے پیدا ہوئے اور دونوں ڈیڑھ ڈیڑھ برس کی عمر میں مر گئے تھے۔ اسے اپنی بیوی سے بے پناہ پیار تھا۔ یہ پیار شادی کے بعد کا نہیں بہت پہلے کا تھا۔ اس وقت کا جب اس کی بیوی مسلمان نہیں تھی۔ دوسری ہی ملاقات میں اس لڑکی نے کامو کو کہہ دیا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ آنے کو تیار ہے اور مسلمان بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ گامے دس نمبریئے نے، جو کامو کا گہرا دوست تھا، ایک رات لڑکی کو اغوا کر کے کامو کی گود میں لا پھینکا تھا اور اگلے ہی روز لڑکی نے کلمہ پڑھ کر نکاح کے رجسٹر میں انگوٹھا لگا دیا تھا۔ لڑکی والوں نے ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر گاما دس نمبریا اور کامو ایسی چٹانیں تھیں جنہیں سر نہ کیا جا سکا۔

جب ملک میں فسادات کا دور دورہ شروع ہوا تھا تو کاموں کی بیوی ادھیڑ عمر ہو چکی تھی۔ فسادات نے جہاں سینکڑوں ہزاروں امنگوں کا خون کیا تھا، استاد کامو کے گھر میں رونق آ گئی تھی۔ ایک پندرہ سالہ ہندو لڑکی نے استاد کامو کے گھر آ پناہ لی تھی جسے کامو کی بیوی نے سینے سے لگا لیا تھا۔ میاں بیوی نے اس کا نام بدل کر اسے زینت بنا دیا اور منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا۔ لڑکی کے لیے استاد کامو اور اس کی بیوی اجنبی نہیں تھے۔ وہ اسی محلے میں جنی پلی تھی اور کئی بار کامو کے آنگن میں کھیلی تھی۔ کامو نے اسے چند بار گودی بھی اٹھایا تھا اور دو تین بار اس کی گود میں سوئی بھی تھی۔ شاید استاد کامو کا یہ پیار ہی تھا جس کے اثر سے زینت بچپن ہی میں اکھاڑے میں آ جاتی تھی اور کرتے کرتے اسے اکھاڑے اور پہلوانوں کے ساتھ روحانی سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ تو اکھاڑے کا لازمی جزو بنتی جا رہی تھی۔ لڑکپن میں اس نے اکھاڑے کے گرد جھاڑو بھی دیا تھا۔ بعض اوقات تو وہ کتنی ہی دیر کسی پہلوان کے ننگے جسم پر نظریں جمائے گم صم کھڑی رہتی تھی۔

یہی وابستگی تھی کہ جب اس کی زندگی کے پندرھویں برس کی ایک رات اس کے ماں

باپ اور دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہڑبڑا کر بھاگ اٹھے تو وہ بھاگ کر استاد کامو کے گھر آ گئی تھی۔ اس کے ماں باپ اندھیرے میں جانے کدھر نکل گئے تھے۔ زینت نے استاد کامو کو سسکیوں اور سہمی ہوئی ہچکیوں کی زبان میں ساری بات سنائی تو کامو اور اس کی بیوی نے لپک کر اسے پناہ میں لے لیا تھا اور وہ میاں بیوی کے مشفقانہ پیار و محبت میں جذب ہو گئی۔

ایک دن پچھلے پہر استاد کامو اکھاڑے کے پاس چارپائی پہ لیٹا ماضی حال کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ زینت اس کی پائنتی آ بیٹھی۔ کامو کو تو زینت کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ زینت کی بھی نگاہیں اکھاڑے کی ویرانی میں بھٹکنے لگیں۔ اسے اپنا بچپن اکھاڑے میں ہنستا کھیلتا، لوٹ پوٹ ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے بچپنے کے معصوم سے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔

زینت آہستہ سے اٹھی اور جھکی جھکی سی اکھاڑے کے اردگرد چکر کاٹنے لگی جیسے وہ ناگوار سے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ وہ بے خیالی میں اکھاڑے کے کنارے بیٹھ گئی اور انگلیوں سے اکھاڑے کی پتھر جیسی مٹی کو کریدنے لگی۔ استاد کامو نے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ زینت نے اداس سی آہ لے کر سر اٹھایا تو اس کی نظریں استاد کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔

''چچا!'' ـــ زینت نے ملول سی مسکراہٹ سے کہا ـــ ''جی چاہتا ہے اکھاڑہ کھود ڈالوں''۔

''کاہے کو بیٹا!'' ـــ استاد کامو نے آہ کے انداز میں کہا۔

زینت کہنے ہی لگی تھی ـــ ''میں کھیلا کروں گی نا چچا!'' ـــ لیکن اسے یاد آ گیا کہ اب وہ اکھاڑے میں کھیلنے کی عمر سے بہت دور نکل آئی ہے اور وہ سولہویں سال میں داخل ہو چکی ہے۔

''کھود ہی ڈالیں چچا!'' ـــ زینت نے جھینپ کر کہا اور دوپٹہ سرکا کر ماتھے تک لے آئی۔ شرمیلی سی مسکراہٹ سے بولی ـــ ''شاید کوئی کسرت کرنے آ ہی نکلے''۔

استاد کامو خوب سمجھتا تھا کہ زینت کو کشتی لڑتے پہلوان کتنے اچھے لگتے تھے اور وہ اب انہی دنوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔ کامو یوں اٹھ بیٹھا جیسا اسی انتظار میں تھا کہ کوئی

اسے کہے گا۔

''شاید کوئی کسرت کرنے آ ہی نکلے''۔

وہ بھاگ کر کدال اٹھا لایا اور اکھاڑہ کھودنا شروع کر دیا۔ مٹی اکڑ کے پتھر ہو رہی تھی۔ کامو پاگلوں کی طرح کدال چلا رہا تھا۔ زینت نے ایک دو بار کہا بھی کہ چچا! ذرا دم لے لو لیکن وہ اس طرح کھدائی میں مگن رہا جیسے کدال رکتے ہی اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کا دم اکھڑ چلا تو زینت نے بڑھ کر کدال لے لی اور اکھاڑہ کھودنے لگی۔ چند ایک تماشائی آ کھڑے ہوئے اور ایک نے لپک کر زینت سے کدال لے لی۔

اور اکھاڑہ کھد گیا۔

اگلی صبح کامو گلی گلی گھوم پھر کر دس بارہ نوجوانوں کو ہانک لایا اور کسرت شروع کرا دی۔

تین چار روز بعد تین چار نوجوان بھاگ گئے لیکن ان کی جگہ تین چار اور آ گئے اور استاد کامو کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے اکھاڑے میں ریڈیو لا رکھا اور قریب ہی پان سگریٹ کی دکان کھلوا دی۔ تھوڑے ہی عرصے ہی اکھاڑے کی گم گشتہ رونق عود کر آئی۔ شاگردوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور استاد کامو نے چھ ماہ کی مشقت سے چار شاگرد تیار کر کے بھاٹی دروازے والے استاد شیرے کو چیلنج کر دیا۔ استاد کامو اسی روز کے انتظار میں بوڑھا ہو رہا تھا۔

اسے ''بھاٹی دروجے'' کے ساتھ تو جیسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیرا پہلا پہلوان تھا جس نے کامو کو گرایا تھا ورنہ وہ کبھی کسی سے نہیں گرا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی ایک کشتی تھی اور استاد کامو کو معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی آخری کشتی ہو گی۔ اس کے بعد بڑھاپا اسے لڑنے نہ دے گا۔ اس کشتی پہ سارا لاہور تماشائی تھا۔ ڈیڑھ ہزار کی شرط جو ہاری وہ الگ تھی۔ استاد شیرے نے ڈھول باجوں سے اپنا جلوس نکالا تھا اور جلوس استاد کامو کے اکھاڑے تک ہو آیا تھا۔ کامو تو جیسے رات کی نیندیں بھی ہار بیٹھا تھا۔ کسی پل چین نہ آتا تھا۔ شیرے نے جو داؤ کھیلا تھا وہ کامو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ایک ہی ماہ بعد استاد کامو نے استاد شیرے کو پھر للکارا تھا مگر شیرا ٹال مٹول کر گیا تھا۔ شیرا کامو کی جسامت اور داؤ پیچ سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ تو فلوک تھا جو کامو کو

گرا لیا تھا ورنہ اس دیوہیکل کو گرانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ وہ استاد کامو کے ہر چیلنج کو ٹالتا رہا حتیٰ کہ فسادات شروع ہو گئے پھر اکھاڑے ہی اجڑ گئے اور استاد کامو شیرے کو گرانے کی خواہش دل میں لئے بوڑھا ہونے لگا۔

اب اس نے ''بھاٹی دروجے'' کے خلاف نئے شاگرد تیار کرنے شروع کر دیئے۔ ''بھاٹی دروجے والے'' تو استاد کامو کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ ادھر استاد شیرے کو معلوم ہوا تو اس نے بھی از سرنو اکھاڑہ کھودا اور پٹھے تیار کر لئے۔

آخر استاد کامو نے چیلنج بھیج دیا۔ بھاٹی دروازے کے باہر دونوں طرف سے دو دو پٹھے اترے تو استاد کامو کے دونوں پٹھوں نے جوڑ جیت لیے لیکن تیسرے جوڑ میں استاد کامو کا پٹھا شیرے کے شاگرد ولیم سے مار کھا گیا تھا۔ پھر ولیم نے استاد کامو کے تین پٹھے اور گرا دیئے۔

اب تو استاد کامو کی یہ حالت تھی کہ دن بھر شاگردوں کو کسرت کرانے لگا۔ باداموں کی دو بوریاں گھر میں لا رکھیں اور پانچ سو کی ایک بھینس لا باندھی جس کا دودھ پٹھے خود دوہتے اور خود ہی پیتے۔

استاد کامو خود تو بوڑھا ہو گیا لیکن اس کی روح جوان ہو گئی۔ اس کے شاگرد یونان کے دیوتاؤں کی طرح اکھاڑے میں اترتے تھے تو اس کا رواں رواں جوان ہو جاتا تھا۔ زینت تو جیسے اکھاڑے کی دیکھ بھال کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔ بھینس کو نہلانا، اکھاڑے کے گرد جھاڑو دینا، پودوں کو پانی دینا اور پچھلے پہر جب پٹھے اکھاڑے میں اترتے تو اس کا گھر جا کے پچھواڑے کی کھڑکی کھول کر تماشا کرنا روزمرہ کا معمول بن گیا۔

ایک اور سال گزر گیا لیکن استاد شیرے کے پہلوان ولیم کو استاد کامو کا کوئی شاگرد گرا نہ سکا۔

استاد کامو کے دوستی کے حلقے میں صرف دو آدمی تھے جو اس کے ہمراز و ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ ایک گاما دس نمبریا اور دوسرا نیاز۔ گاما روپے پیسے اور اثر و رسوخ والا غنڈہ تھا جس کا نام ایک مدت سے پولیس کے رجسٹروں میں دس نمبر میں درج تھا اور دس نمبریا اس کا تخلص بن گیا تھا۔ شہر بھر کے غنڈے اس کے اشارے پر ناچتے تھے اور پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچ لیا کرتی تھی۔ گاما دس نمبریا استاد کامو کے اکھاڑے کا وزیر

دفاع تھا۔ جہاں ڈانگ سوٹے کی ضرورت پڑتی وہ دو چار بانکے لے کے پہنچ جاتا تھا۔

ایک بار استاد کامو دنگا فساد کے الزام میں حوالات چلا گیا۔ گاما اپنے تعلقات استعمال کر کے استاد کو بری کرالایا تھا۔ گامے کی عمر اب کوئی چالیس بیالیس ہوگی۔

نیاز واجبی سا لکھا پڑھا جوان سال آدمی تھا اور نیو سٹار سنیما میں آپریٹر تھا۔ اس سنیما کی گھسی پرانی دقیانوسی مشین کو چلانا نیاز کا ہی کمال تھا۔ اس سے پہلے وہ کسی دفتر میں ملازم تھا اور اسے کشتی کا شوق تھا۔ ایک سال استاد کامو کی شاگردی کی اور جسم کمالیا لیکن ایک شام کشتی کرتے اس کی دائیں ٹانگ کچھ اس طرح دوہری ہوگئی کہ ہزار علاج معالجے سے بھی ٹھیک نہ ہوسکی اور گھٹنے سے اکڑ گئی۔ اب وہ مستقل طور پر لنگڑا ہوگیا تھا۔ جسم اور چہرے مہرے میں وہی جاذبیت تھی لیکن ٹانگ نے اسے اکھاڑے میں اترنے سے معذور کر دیا۔

دفتر کی نوکری طویل غیر حاضری کی وجہ سے چھوٹ گئی تو اس نے نیو سٹار سنیما میں آپریٹر کی جگہ سنبھال لی۔ اب وہ فرصت کے وقت استاد کامو اور اس کے شاگردوں کے خط پتر لکھتا تھا اور اکھاڑے کا حساب کتاب رکھتا تھا اور کشتیوں کے جوڑوں کا بھی انتظام کرتا تھا۔ وہ اکھاڑے کا اچھا خاص منیجر تھا یا پہلوانی زبان میں ''کھڑپینچ'' تھا۔ آدمی خوش وضع اور خوش پوش تھا اور کامو کو اس کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔

زینت اب اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔ نیاز ان کے گھر، گھر کے فرد کی طرح آتا جاتا تھا اور زینت سے اس کی بے تکلفی تھی۔ کچھ عرصہ سے زینت نیاز میں زیادہ ہی دلچسپی لینے لگی تھی۔ اسے نیاز زیادہ ہی اچھا لگنے لگا تھا اور اب وہ نیاز کے ساتھ سب کے سامنے باتیں کرنے سے بھی جھجھکنے لگی تھی۔ پھر اسے نیاز کے بغیر اکھاڑہ سونا سونا لگنے لگا اور یہ خواہش بھی بیدار ہوگئی کہ وہ نیاز کے ساتھ تنہائی میں بات کرے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت نیاز کی تھی۔ دونوں سینوں میں ایک ہی چنگاری جو سلگی تو راتوں کی تیرگی نے ایک رات نیاز اور زینت کو اکھاڑے سے ذرا پرے صدیوں پرانے پیپل کے تنے کے ساتھ کھڑے دیکھا۔

پیپل کی اندھیری چھاؤں میں ہر دوسری تیسری رات دو سائے ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے اور پیپل کے ڈال پات حسن و عشق کا بھید یوں اپنے اندر جذب کر لیتے جس طرح وہ ہوا اور زمین سے نمی چوس لیتے ہیں۔ وہ اندھیرے ہی اندھیرے میں خیالوں

کی پگڈنڈی پر بہت دور نکل گئے۔

نیاز اس امید پہ بے خود تھا کہ استاد کامو اس کی ہر بات مان لیتا ہے اور وہ زینت کے رشتے پر بھی ہاں کر دے گا۔

ایک رات زینت پیپل تلے کھڑی بے چینی سے نیاز کا انتظار کر رہی تھی۔

نیاز آیا تو وہ گھبرائی گھبرائی بولی۔۔۔ ''تمہیں سو بار کہا کہ استاد چچا سے بات کر لو پر تم نہ مانے۔ خدا کے لیے کچھ کرو میں جیتے جی مر رہی ہوں۔ نیاز تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ آج گامے دس نمبریے نے استاد چچا کو کہہ دیا ہے کہ زینت کو مجھ سے بیاہ دو، لڑکی جوان ہوگئی ہے، اب دیر نہیں ہونی چاہئے''۔

''تم پاگل ہو زینت!''۔۔۔ نیاز نے ہنس کے کہا۔۔۔ ''استاد تمہیں اس بوڑھے بدمعاش کے ساتھ کبھی نہیں بیاہے گا''۔

''تم یہی کچھ سوچتے رہو اور وہاں چچا نے زبان بھی دے دی ہے''۔

''کیا کہا؟''۔۔۔ نیاز نے ہڑبڑا کر پوچھا۔۔۔ ''کس نے زبان دے دی ہے؟''

''استاد چچا نے اور کس نے؟''۔۔۔ زینت بولی۔۔۔ ''چچا نے گامے کو کہا ہے کہ چار چھ مہینے انتظار کر لو۔ زبان تو تمہیں دے ہی چکا ہوں۔ میں ذرا بھائی دروجے والوں سے نمٹ لوں''۔

نیاز کو پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ تاروں بھرا آسمان بڑی ہی تیزی سے گھومنے لگا۔ اس نے بدلتے موسم کی خنک رات کو قمیض کے اندر پسینے کے قطرے محسوس کئے۔ اس نے خشک حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔

''کیا سوچ رہے ہو نیاز؟''۔۔۔ زینت نے اسے جھنجھوڑ کے کہا۔۔۔ ''استاد چچا سے کہو نا، زینت کو دس نمبریے سے نہ باندھو۔ وہ بڈھا بھی ہو چلا ہے۔ نیاز! چلو کہیں بھاگ چلیں''۔

لیکن نیاز تو خیالوں میں جانے کہاں بھاگ گیا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ گامے کی رقابت میں کیا کیا خطرے ہیں۔ اگر اسے ان کی چوری چھپے ملاقاتوں کا علم ہو جاتا تو نیاز کی بو بھی نہ ملتی۔

''جو خدا کرے گا زینت!''۔۔۔ نیاز نے زینت کے ہاتھ تھام کر کہا۔۔۔ ''میں

تمہارا ساتھ دوں گا۔ یہ شادی نہیں ہو گی''۔

نیاز نے اس رات کے بعد استاد کا مو کے اور نزدیک ہونے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دیں اور زینت سے ملتا ملاتا رہا۔ اسے تسلیاں بھی دیتا رہا۔ زینت نے اسے ہر بار کہا کہ کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو وہ اس کے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہے لیکن نیاز خود اعتمادی سے اس کے دل پہ ہاتھ رکھتا رہا۔ زینت کو نیاز پر بھروسہ تھا۔ گو نیاز ایک ٹانگ سے لنگڑاتا تھا لیکن زینت کو معلوم تھا کہ نیاز اور گامے کا سامنا ہو گیا تو نیاز ایک ہی تھپڑ سے گامے کی جان نکال دے گا لیکن زینت کو معلوم نہ تھا کہ نیاز اسے جو تسلیاں دے رہا تھا وہ کس قدر خوفزدہ اور سہمی ہوئی تسلیاں تھیں۔

ایک شام اکھاڑے میں ہر شام والی ہما ہمی تھی۔ استاد کا مو ایک پٹھے کو داؤ پیچ کا آخری سبق دے رہا تھا۔ اکھاڑہ چھوٹے بڑے شاگردوں سے اٹا پڑا تھا۔ تماشائی ہر روز کی طرح اکھاڑے کے گرد جمگھٹا کیئے ہوئے تھے۔ ریڈیو پہ فلمی گانے چل رہے تھے اور زینت جو اس وقت کھڑکی کھولے محو تماشا ہوتی تھی آج اوندھے منہ چارپائی پہ پڑی غم کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

اکھاڑے کا شور بلند ہونے لگا تو زینت نے بے دلی سے کھڑکی کھولی اور نظریں اکھاڑے پہ جما دیں۔ وہاں نیاز نہیں تھا۔ وہ نیو سٹار سینما میں مشین چلا رہا تھا۔ نیاز تو کسی بھی شام اکھاڑے میں نہیں ہوتا تھا لیکن اب زینت بے تابی سے چاہنے لگی تھی کہ نیاز ہر لحہ اس کے سامنے رہے۔ گاما دس نمبریا اس کے اعصاب اور محبت پر دیو کی طرح چھا گیا تھا۔

استاد کا مو ایک شاگرد سے فارغ ہو کر مٹی میں لت پت اٹھا اور اکھاڑہ خالی کرایا۔

''چلو بھئی اوئے''۔۔۔ استاد کا مو نے کہا۔۔۔ ''جمال اور اچھا''۔

دوسرے لحہ دو تیار شاگرد جو اب ماہر پہلوان بن چکے تھے، اکھاڑے میں اتر آئے۔ یہ دونوں پٹھے استاد کا مو کی امیدوں کا سہارا تھا۔ انہیں اس نے ''بھائی دروجے'' والوں کے خلاف تیار کیا تھا۔ دونوں اکھاڑے میں اترے۔ دونوں اسی اکھاڑے کے پروردہ تھے۔ پون گھنٹہ تک لڑتے رہے لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں ہانپ گئے۔ استاد کا مو نے انہیں الگ کر دیا۔ دو چار گالیاں بھی دیں اور انہیں کچھ بتانے ہی لگا تھا کہ ایک اجنبی صورت انسان جو بہت دیر سے اکھاڑے کے کونے پہ خاموش کھڑا تھا، کپڑے اتار کر

اکھاڑے میں اتر آیا۔

''استاد!''۔۔۔ اجنبی نے استاد کا مو کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔۔۔ ''اپنا کوئی پٹھا اتار دو''۔

استاد کا مو نے اجنبی کو دیکھا اور چند ثانئے دیکھتا ہی رہا۔ اجنبی کا جسم ایسا جیسے کسی بت تراش نے دن رات محنت کر کے تراش کے اکھاڑے میں دھر دیا ہو۔ اس کا پیٹ پہلوانوں کی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا۔ کمر کے پتلے پن نے جسم کی ساخت میں جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ کندھوں کے پٹھے گٹھے ہوئے اور تمام اعضاء کا تناسب دلکش تھا۔ سر گول اور استرے سے منڈا ہوا، آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئیں۔ اگر اس کی آنکھیں موٹی ہوتیں تو شاید اس گلابی سے چہرے پہ کبھی اچھی نہ لگتیں۔ چہرہ گول مٹول اور بھرا بھرا تھا۔

کھردرے ملیشیا کا پاجامہ قمیض پہنے اور منڈے سر پر گز ڈیڑھ گز کا ململ کا میلا کچیلا صافہ لپیٹے، وہ نہ جانے کب سے تماشائیوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔

''چلو جمالے!''۔۔۔ استاد کا مو نے اجنبی کے خلاف جمال کو اتار دیا۔

جمال نے ذرا سا دم لیا۔ اکھاڑے کا چکر کاٹا اور اجنبی حریف کے سامنے آ گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا۔ استاد کا مو الگ کھڑا ہنس رہا تھا لیکن اس کی ہنسی فوراً ہی غائب ہو گئی۔ تماشائی دم بخود ہو گئے۔ کسی کو گمان تک نہ تھا کہ یوں بھی ہو گا۔ ہوا یوں کہ جمال نے اجنبی سے ہاتھ ملا کر اس کی گردن پہ ہاتھ رکھ ہی تھا کہ اجنبی نے جانے کیا داؤ کھیلا کہ جمال چاروں شانے چت گرا ہوا تھا۔ اجنبی جمال کو گرا کر نہایت ہی سنجیدگی سے الگ جا کھڑا ہوا۔

استاد دل ہی دل میں عش عش کر اٹھا لیکن زبان سے داد نہ دی۔ اس نے اچھے کو اکھاڑے میں اتار دیا۔ اجنبی وسط میں آیا۔ اچھے سے ہاتھ ملایا۔ اچھا جمال کے حشر کے پیش نظر بچ بچ کر ہاتھ بڑھ رہا تھا لیکن اجنبی نے اسے موقع نہ دیا اور ایک ہی داؤ میں اچھے کو پیٹھ کے بل لٹا دیا۔

استاد کا مو چھلانگیں لگاتا اکھاڑے میں آیا اور اجنبی کو سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کی پیشانی چوم کر پوچھا کہ اس نے کون سا داؤ کھیلا تھا۔

''طاقت اور دماغ!''۔۔۔ اجنبی نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے انداز میں فاتحانہ

جھلک نہیں تھی۔

استاد کامو نے اسے چارپائی پہ بٹھایا۔ سب سے بڑے پیالے میں اسے بادام پلائے اور کہا۔۔۔ ''اگر تم اس اکھاڑے میں ہر روز آیا کرو تو منہ مانگی اجرت دوں گا۔ روٹی کپڑا اور نصف سیر بادام ہر روز۔ دودھ جتنا پی سکو۔ کچھ اور چاہو تو وہ بھی ملے گا''۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے''۔۔۔ اجنبی نے متانت سے کہا۔ وہ بظاہر چپ چاپ اور اداس اداس سا تھا۔ بولا۔۔۔ ''روٹی کپڑا اور رہنے کی جگہ چاہئے''۔

استاد کامو نے اکھاڑے کے قریب اپنے مکان سے چند ہی قدم دور ایک چھوٹا سا مکان خالی کروا کے اجنبی کو وہاں آباد کر دیا۔

اجنبی کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ وہ کسی کے ساتھ بات تک نہ کرتا تھا۔ استاد کامو نے اس سے نام پوچھا تو وہ اسی قدر کہہ کے چپ ہو گیا۔۔۔ ''جو جی میں آئے کہہ لیا کرو''۔۔۔ اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اکھاڑے والوں نے اسے سہراب کا نام دے دیا جو چند روز بعد شہراب، پھر شہرابا اور آخر میں شرابا بن گیا۔ شرابا عجیب قسم کا خاموش طبع انسان تھا۔ اس کی خاموشی پُراسرار سی تھی جس کے پیش نظر اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہونے لگیں۔ کوئی کہتا یہ کانگڑہ کا ڈوگرا ہے بعض کہتے مشرقی پنجاب کا گوجر ہے اور اس نے اپنے آپ کو پاکستان سمگل کیا ہے۔ پھر اور ایک روایت نے جنم لیا کہ شرابا غیر ملکی جاسوس ہے اور یہ افواہ بھی پھیلی کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے لیکن شرابا اپنے متعلق کسی بھی کہانی کی تائید و تردید کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ وہ جاڑے کے چاند کی طرح بے آواز پا زندگی کا سفر طے کر رہا تھا۔ کشتی جیت گیا تو خوشی نہیں، ہار گیا تو غم نہیں۔ نصف سیر دودھ ملا تو پی لیا، دو سیر ملا تو پی لیا، نہ ملا تو نہ سہی، کامو کو تو ایک دنیا استاد مانتی تھی لیکن وہ شرابے کو دل ہی دل میں استاد مانتا تھا اور اس کا سینہ فخر سے پھیلتا جا رہا ہے کہ اب ''بھاٹی دروجے'' والوں کے ڈھول خاموش ہو جائیں گے۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ بھاٹی دروازے والے ڈھول بجاتے آئے اور سر جھکائے لوٹ گئے۔ اکیلے شرابے نے استاد شیرے کے تین شاگردوں کو پچھاڑ دیا اور استاد کامو کی سب بڑی کامیابی تو یہ تھی کہ شرابے نے ولیم کو بھی گرا دیا۔ اس رات استاد کامو اس قدر خوش تھا کہ سینما دیکھنے چلا گیا۔ پچپن سال کی عمر میں وہ تیسری بار سینما دیکھنے گیا تھا۔

بھاٹی دروازے والے کیوں کر چین سے بیٹھتے لیکن وہ جان گئے تھے کہ شرابے کے جوڑ کا ان کے پاس کوئی پہلوان نہیں۔ استاد شیرے نے بھاری قیمت دے کر مقبوضہ کشمیر سے ایک ''ہاتو'' سمگل کر لیا جو شرابے کا ہم پلہ تھا۔ اس نے ہاتو کو اپنے رنگ میں تیار کرنا شروع کر دیا اور استاد کامو کو میٹھی عید پر دو جوڑ کشتی کا چیلنج بھیج دیا۔ عید کو اڑھائی مہینے باقی تھے۔

استاد کامو نے بارہا چاہا کہ شرابا اس کے ساتھ کھل کر باتیں کرے جس طرح نیاز اور گاما دس نمبریا کرتے ہیں لیکن شرابا خاموش ہی رہتا تھا۔ گریاں نہ خنداں اور اس پر سنجیدگی سی طاری رہتی تھی۔ وہ صرف نیاز سے بے تکلف تھا جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ نیاز اسے کبھی کبھی سینما لے جاتا تھا۔ نیاز کہا کرتا تھا کہ شرابے کے ذہن اور دل پر کوئی بوجھ ہے جس نے اس کی زبان بند کر رکھی ہے۔ استاد کامو نے کہا۔

''کوئی شر شرار ہوگا۔ میں تو پہلے ہی روز سے کہہ رہا ہوں کہ شرابے پر سیّد جن عاشق ہے اور یہ اسی کی برکت ہے''۔

شرابا بعض اوقات خلاؤں میں کھو جاتا تھا۔ گم صم، کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ لاشعور میں کیا کچھ اٹھائے پھرتا تھا۔ وہ دو ہی موقعوں پہ بیدار نظر آتا تھا۔ ایک اکھاڑے میں اور دوسرے جب سر پہ استرا پھر رہا ہو۔

عید کو دو اڑھائی مہینے باقی تھے لیکن استاد کامو یوں گھبرایا اور مصروف رہنے لگا جیسے عید میں دو ہی روز باقی ہوں اور اس کا کوئی پٹھا تیار نہ ہو۔ اس نے باداموں کی ایک بوری اور منگوا لی اور ایک اور بھینس خرید لی جس کا نصف دودھ صرف شرابے کے لیے مختص تھا لیکن شرابا کسی اندرونی خلش سے بے چین رہنے لگا۔ بعض اوقات اکھاڑے میں بھی دیر سے جاتا۔ جاتا بھی تو بے دلی سے اور ایک شام بالکل نہ گیا۔ استاد کامو نے اس کے گھر جا کے ہزار منتیں کیں لیکن وہ خاموشی سے لیٹا رہا۔ جواب تک نہ دیا۔ استاد کامو جھنجھلا کر اٹھ آیا۔

اس نے گامے دس نمبریئے کو بتایا کہ شرابے نے اکھاڑے میں آنے سے انکار کر دیا ہے تو گاما چاقو ہاتھ میں لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔۔۔ ''سالے کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔ کمین ہماری روٹیاں کھاتا ہے اور یہ جرأت!''

شرابا کمرے میں لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ استاد کامو اور گاما داخل ہوئے۔ اس نے

توجہ ہی نہ دی۔

''شرابے!''۔۔۔ گامے دس نمبریئے نے چاقو آگے کر کے کہا۔۔۔ ''اگر تم دومنٹ کے اندر اٹھ کے اکھاڑے میں نہ آئے تو یہ چاقو تمہارے سینے میں ہوگا۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟''

اور دومنٹ بعد گاما دس نمبریا برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کا چاقو شرابے کے ہاتھ میں تھا۔ یہ تو گامے کی خوش قسمتی تھی کہ استاد کامو بیچ میں آ گیا تھا ورنہ شرابا اسے جان سے مار دیتا۔

استاد کامو گامے کو ساتھ لے کر چلا گیا اور شرابا پھر لیٹ گیا۔ نیاز کو پتہ چلا تو وہ رات کو تیسرا شو دکھا کر شرابے کے گھر آیا۔ اس کی بتی جل رہی تھی اور وہ آدھی رات گزر جانے کے بعد بھی جاگ رہا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر وہ لیٹا رہا اور اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ نیاز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ استاد اس کا اس قدر خیال رکھتا ہے اور اسے چاہئے کہ استاد کو اپنا باپ سمجھے اور اس کی خدمت میں کوتاہی نہ کرے اور یہ بھی کہ گاما اچھا آدمی ہے۔ یوں لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں ہوتا لیکن شرابا خاموش لیٹا رہا۔ اس نے نیاز کے منہ سے گامے کا نام سنا تو اس کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا۔

''تو کل سے اکھاڑے میں آؤ گے نا؟''۔۔۔ نیاز نے پوچھا۔

شراب چپ رہا۔

''مجھ سے بھی بات نہ کرو گے شرابے دوست؟''

شرابے نے پہلی بار نیاز کی طرف دیکھا اور نگاہیں پھیر لیں۔

''میری محبت کا یہی جواب ہے شرابے؟''۔۔۔ نیاز اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔۔۔ ''جانتے ہو مجھے تم سے کتنا پیار ہے؟''

شرابے کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے نیاز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ نیاز کو دھچکا سا لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ شرابا دھڑام سے پھر لیٹ گیا اور کروٹ بدل کر نیاز کی طرف پیٹھ پھیر لی۔ نیاز جذباتیت سے مغلوب ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا شرابے کے کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے دن نیاز استاد کامو کے گھر گیا۔ استاد گھر نہیں تھا اور اس کی بیوی بھی محلے

میں کسی کے گھر چلی گئی تھی۔ زینت گھر میں اکیلی تھی۔ نیاز کا دل مسرت اور جوشِ محبت سے بے قابو ہونے لگا اور اس نے لپک کر زینت کی کلائی پکڑ لی اور اسے کمرے میں لے گیا۔

''خدا کے لیے شرابے کا خیال رکھا کرو نیاز!''۔۔۔ زینت نے کہا۔۔۔ ''ورنہ وہ کسی کا خون کر کے پھانسی چڑھ جائے گا۔ اگر وہ گامے بدمعاش کو مار دیتا تو مجھے بہت ہی خوشی ہوتی لیکن شرابا......''

''اوہو ہٹاؤ گامے اور شرابے کو......''۔۔۔ نیاز نے زینت کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔۔۔ ''مریں چاہے پھانسی چڑھیں۔ ہم تنہائی کی گھڑیاں کیوں تباہ کریں''۔

''تمہیں تو اپنی پڑی رہتی ہے نیاز!''۔۔۔ زینت نے قدرے مسکرا کر کہا۔۔۔ ''چچا اور چچی ذرا دیر سے آئیں گے۔ گھبراتے کیوں ہو!......اور سنو نیاز!''۔۔۔ زینت نے ملتجی لہجے میں کہا۔۔۔ ''شرابا پردیسی ہے۔ جانے کیا دکھ لئے پھرتا ہے، تم اسے اپنے ساتھ رکھا کرو۔ اگر اس نے کسی کا خون کر دیا تو کیا ہوگا؟......اکھاڑے کی رونق مر جائے گی نیار!''

نیاز بہت ٹپٹایا اور زینت بار بار شرابے کا ہی ذکر کرتی رہی۔

وہاں سے اٹھ کے نیاز شرابے کے پاس آیا اور اسے باہر سیر کو لے گیا۔ گھومتے پھرتے وہ چڑیا گھر کے قریب سے گزرے تو شرابا رنگ برنگی بطخوں اور آبی پرندوں کو دیکھ کر رک گیا۔ نیاز نے دیکھا کہ شرابے کے چہرے پر شگفتگی آ گئی ہے تو وہ اسے چڑیا گھر کے اندر لے گیا۔

رنگ رنگیلے پنچھی اور طرح طرح کے جانور دیکھ کر شرابا یکسر بدلی ہوئی کیفیت میں آ گیا اور وہ کھل کر باتیں کرنے کے موڈ میں آ گیا۔ نیاز نے اسے پہلی بار مسکرا کر باتیں کرتے دیکھا۔ ایک جگہ کبوتروں کا جوڑا چونچ میں چونچ ڈالے عشق و محبت میں مصروف تھا۔ شرابا چلتے چلتے رک گیا اور نیاز کی موجودگی فراموش کرتے ہوئے اس حسین منظر میں کھو گیا۔

کسی بچے نے پنجرے کی جالی پہ ہاتھ مارا تو دھماکے سے یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرابا یوں چونکا جیسے کوئی حسین خواب دیکھ رہا تھا کہ کسی نے ٹھوکر مار کر اسے جگا دیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھا اور اسی طرح اسے گھور گھور کر دیکھتا نیاز کے ساتھ آگے چلا گیا۔

آخر میں نیاز نے اسے ہرن دکھائے۔ ایک ہرنی بیٹھی تھی اور اس کا ایک ماہ کا بچہ اس کا منہ چاٹ رہا تھا۔ ہرنی اس کے منہ کو رہ رہ کے چاٹتی جا رہی تھی۔

''دیکھا شرابے!''۔۔۔ نیاز نے کہا۔۔۔ ''ماں بچے کا پیار!''

لیکن شرابے نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ ماں بچے کے پیار میں اس طرح محو تھا جیسے اسی پیار کا ایک حصہ ہو۔ نیاز نے اسے واپس چلنے کو کہا لیکن شرابا جانے کس دیس میں جا پہنچا تھا۔ وہ محویت کے عالم میں کھڑا دیکھتا ہی رہا۔

اس شام شرابا اکھاڑے میں نہ گیا۔ گھر جا کے دیکھا تو غائب تھا۔ وہ رات کو بھی گھر نہ آیا۔ استاد کامو پاگل ہوا جا رہا تھا۔ شرابے کو وہ کسی قیمت پہ ضائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کھانا بھی کھایا نہ چین سے بیٹھا۔ تمام پٹھوں کو جمع کر کے انہیں شرابے کی تلاش میں بھگاتا رہا۔

''میں تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گا کہ بھاٹی دروازے والوں نے میرا شیر اغوا کر لیا ہے''۔۔۔ وہ بار بار کہتا۔۔۔ ''یہ انہی کی شرارت ہے''۔

بھاٹی دروازے بھی جاسوس بھیجے گئے اور دو شاگرد واہگہ تک گھوم آئے لیکن شرابے کا سراغ نہ ملا۔

اسی شام نیو سٹار سینما میں نیاز دوسرا شو دکھا رہا تھا۔ منیجر نے اسے ایک سلائیڈ دی اور کہا کہ انٹرول میں دوسری سلائیڈوں کے ساتھ دکھا دینا۔ نیاز نے سلائیڈ دیکھی۔ اس پر بھدے سے قلم سے لکھا تھا:

''چڑیا گھر سے ہرنی کا بچہ جس کی عمر تقریباً ایک ماہ ہے گم
ہو گیا ہے جس کسی کو یہ بچہ ملے یا جو کوئی اس کا سراغ لگا سکے اسے
تیس روپے انعام دیا جائے گا ورنہ جس کسی کے پاس یہ بچہ پکڑا
گیا اسے حوالہ پولیس کیا جائے گا''۔

نیاز نے سکرین پہ سلائیڈ دکھا دیا۔ دوسرا شو ختم ہوا تو پھر اس نے تیسرے شو کے لیے مشین چلا دی۔ خدا خدا کر کے تیسرا شو ختم ہوا تو نیاز بھاگم بھاگ پیپل تلے پہنچا۔ زینت اس کی راہ تک رہی تھی۔

''شرابے کا کچھ پتہ چلا؟''۔۔۔ زینت نے نیاز کے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''نہ ملے زینت''۔۔۔ نیاز نے بے خودی میں کہا۔۔۔ ''اکیلے میں کوئی اور بات کیا کرو۔ کہو! گامے نے پھر تو شادی کے لیے تو نہیں کہا؟''

''گولی مارو گامے کو نیاز!''۔۔۔ زینت نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ ''شرابے کو آ جانا چاہئے''۔

''آخر تم شرابے کے اس لیے اس قدر پریشان کیوں ہوئی جا رہی ہو؟''

زینت جھجک سی گئی۔ اکھڑے سے لہجے میں بولی۔۔۔ ''استاد چاچا بہت پریشان ہیں نیاز! وہ تو کچھ کھاتے پیتے ہی نہیں۔ کل بیٹھے بیٹھے رو پڑے تھے''۔

اور یہ ملاقات بھی شرابے کی باتوں کی نذر ہو گئی۔

زینت دبے پاؤں اپنے گھر کے پچھواڑے میں گم ہو گئی اور نیاز مایوسی کے عالم میں خراماں خراماں شرابے کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس نے دیکھا تو پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ شرابے کے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ اس نے سوچا کوئی اور ہوگا، شرابا کہاں۔ اس نے بے دلی سے کواڑ کو ذرا سا دھکیلا تو کھل گیا۔ دیکھا کہ سامنے کمرے میں شرابا لیٹا ہوا تھا۔

نیاز لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن عبور کر کے کمرے میں پہنچا۔ دیکھا کہ شرابا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے پہلو میں ہرنی کا بچہ سویا ہوا تھا۔ نیاز نے چاہا کہ وہ ہرنی کے بچے کو اٹھا لے اور چڑیا گھر میں پھینک آئے۔ وہ بہت دیر شرابے اور بچے کو محوِ خواب دیکھتا رہا۔ آخر اس نے آہ لی اور دبے پاؤں لالٹین کی طرف بڑھا۔ آہستہ سے لالٹین کا شیشہ اٹھایا۔ پھونک مار کر بتی بجھا دی اور باہر نکل گیا۔

دوسری صبح نیاز ادھر ادھر جا رہا تھا کہ استاد کامو اسے راستے ہی میں مل گیا۔ کامو تو خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھاگ کر نیاز سے لپٹ گیا۔۔۔ ''سنا تم نے پٹھے؟ میرا شیر لوٹ آیا ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ آیا ہوں۔ جا کے دیکھ......''۔۔۔ اس نے نیاز کو دھکیلتے ہوئے کہا۔۔۔ ''دیکھ جا کے، ہرنی کے بچے سے کھیل رہا ہے اور دیکھ، کس طرح ہنس رہا ہے...... میرا شیر ہنس بھی لیتا ہے...... جا تو بھی دیکھ''۔

استاد کامو کی باچھیں کانوں تک پہنچ رہی تھی، جوشِ مسرت سے وہ ہکلا رہا تھا۔ نیاز وہاں سے چل پڑا اور استاد کامو کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

''اب بھاٹی دروجے والوں کو......''

نیاز شرابے کے کمرے میں داخل ہوا۔ دیکھا شرابا ہرنی کے بچے کو سینے پہ بٹھائے اس کا منہ چوم رہا تھا اور بچہ اس کے گول مٹول گال چاٹ رہا تھا۔

''یہ بچہ کہاں سے لائے شرابے؟''

''چڑیا گھر سے چرایا ہے۔ مال روڈ کی طرف سے جنگلہ پھاند کر''۔

''کیوں چرالائے اسے؟''

''پیار کی خاطر''___ شرابے نے ہنستے ہوئے کہا___ ''دیکھو تو کیسے میرا منہ چاٹتا ہے''۔

شرابے کی ہنسی بھی چوری کی ہنسی معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ وہ تو کبھی مسکرایا بھی نہ تھا۔

''بچہ واپس کرآؤ ورنہ اس کی ماں مرجائے گی''۔

شرابا چپ سا ہو گیا۔

''اور ہوسکتا ہے پولیس تمہیں گرفتار کرلے''۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ یہ بچہ چوری کا ہے''۔

''پولیس کا تو نہیں یہ بچہ!''

''تمہارا بھی تو نہیں!''___ نیاز نے کہا اور شرابے کو طویل لیکچر دے کر سمجھانے کی کوشش کی کہ بچہ واپس کرنا کیوں ضروری ہے۔ شرابے نے اس کا لیکچر یوں انہماک سے سنا جیسے قائل ہو گیا ہو اور ساری بات سمجھ گیا ہو۔ نیاز نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

''اب یوں کروں کہ یہ بچہ چپکے سے وہیں پھینک آؤ، جہاں سے لائے ہو''۔

''کیوں؟''

نیاز نے جھنجھلا کر اپنا لیکچر پھر دہرادیا اور لیکچر کے دوران شرابا پوری توجہ سے ''ہاں، ہاں'' کرتا رہا اور بولا___ ''میں سمجھا''۔

''تو اب اسے چڑیا گھر چھوڑ آؤ''___ نیاز نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کیوں؟''___ شرابے نے پھر کیوں کہہ کر نیاز کو پریشان کر دیا اور بولا___ ''پھر مجھ سے پیار کون کرے گا؟ میں کھیلوں گا کس کے ساتھ؟''___ شرابے نے بچے کو سینے سے

لگا کر کہا___ ''شام استاد نے جو دودھ اور بادام بھیجے تھے وہ میں نے اسے پلا دیے ہیں''۔

''سنو شرابے!''___ نیاز نے تھکے سے لہجے میں کہا___ ''یہ بچہ سرکار کی ملکیت ہے اور اسے لوگوں کی تفریح......''

''کون سی سرکار؟''___ شرابے نے پوچھا۔

''پاکستان!''___ نیاز نے جواب دیا___ ''یہ بچہ اور چڑیا گھر کے تمام جانور پاکستان کی ملکیت ہیں''۔

''اچھا؟''___ شرابے کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

دوسری صبح معلوم ہوا کہ رات ہرنی کا بچہ پُراسرار طریقے سے چڑیا گھر میں واپس آ گیا ہے لیکن شرابے کی دنیا پر سکوت چھا گیا۔ گھناؤنی سی خاموشی جس میں اداسی کا رنگ نمایاں تھا۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ دیر کمرے میں بند رہنے لگا اور اکھاڑے کو تو اس نے فراموش ہی کر دیا۔

استاد کامو نے ایک دن اس کے گھٹنے چھو لیے اور التجا کی___ ''شرابے! بھاٹی دروجے والے جیت گئے تو کیا ہو گا؟ خدا کے لیے......''

''دیکھو استاد!''___ شرابے نے اس کی بات پوری نہ ہونی دی۔ اداس سے لہجے میں بولا___ ''اللہ نگہبان ہے۔ اس اکھاڑے میں کوئی جیت کے نہیں جائے گا۔ میں جانتا ہوں میرے مقابلے میں ہاتو آ رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو، پٹھوں کو تیار کرلو۔ کوئی پٹھا ڈھیلا نکلے تو مجھے بلا لینا۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو''۔

شرابا جسمانی لحاظ سے آسودہ و مطمئن تھا۔ اچھی خوراک اور اچھی رہائش وہ دن بہ دن گول مٹول ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کا دل جیسے بجھتا جا رہا تھا اور آنکھیں بے چین سی رہنے لگی تھیں۔ اس نے ہرنی کا بچہ پاکستان کے نام پر واپس تو کر دیا تھا لیکن جیسے یہ بچہ اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ گاہے اس کے ہونٹوں پہ لطیف سی مسکراہٹ آجاتی تھی جیسے اپنے آپ سے کوئی مذاق کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو یا کسی پُر لطف تصور سے دل بہلا رہا ہو لیکن یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کے اداس اداس سے تاثرات میں یوں لگتی جیسے قبرستان میں سے بارات گزر رہی ہو۔

ایک صبح شرابے کے گھر کی منڈیر اور دیواروں پر اور ہر طرف کوؤں نے کائیں

کائیں کا قیامت خیز شور بپا کر رکھا تھا۔ نیاز اسی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ شرابے کے گھر میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ کوؤں کے اس شور و غوغا سے بے نیاز شرابا کوے کے دو بچے ہاتھوں میں پکڑے انہیں منہ سے بادام چبا چبا کر کھلا رہا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر شرابا کھل کر مسکرایا۔ اس کے چہرے کی ا ُسیاں ڈھل گئی تھیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

لیکن اس کی مسکراہٹیں دوسری صبح بجھ کے رہ گئیں۔ شگفتگی جو کل صبح عود کر آئی تھی اداسیوں میں تحلیل ہو گئی۔ شرابا صحن میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر کوے کے دونوں بچوں کو دفن کر رہا تھا۔ بچے مر گئے تھے اور شرابا ایک بار پھر جیتے جی مر گیا۔

گرد و پیش کی گہما گہمی اور ہماہمی اسی طرح تھی جس طرح شرابے کے آنے سے پہلے تھی لیکن شرابا ان ہنگاموں سے منہ موڑ کر اپنے گھر کی چادیواری میں قید ہو گیا۔ نیاز اور زینت کی اندھیری راتوں کی ملاقاتیں اور دن کو ان کی خاموش نگاہوں کے رومان پرور تصادم بڑھتے گئے۔ گاما دس نمبریا جوا بازی اور غنڈہ گردی میں مصروف رہا۔ استاد کامو پٹھوں کی جان کھاتا رہا اور راتیں دن کو ہڑپ کرتیں میٹھی عید کو قریب تر لاتی گئیں۔

ایک دن پچھلے پہر شرابا خلاف معمول ٹہلتے ٹہلتے شہر کے شور و شر سے باہر نکل گیا۔ کھلے میدان میں ڈھول بج رہے تھے اور تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ شرابا بھی وہیں جا رکا۔ دیکھا، وہاں کتوں کی لڑائی شروع ہونے لگی تھی۔ دو کتے میدان میں لائے جا رہے تھے۔

شرابے کی نگاہیں ایک کتے پر جم گئیں۔ یہ ایک پنشنر صوبیدار کا کتا تھا۔ رنگ تو سفید تھا لیکن شکل و شباہت شیر کی سی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے زنجیروں سے باندھ کے تھام رکھا تھا۔ بوڑھا صوبیدار کتے کے پاس بیٹھا تھا اور کتا اس کے ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ شرابا کتے کے پیار کو مسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس قدر خونخوار کتا کس قدر پیار کر رہا تھا۔

"آ جاؤ صوبیدار صاحب!" ــــ کسی نے صوبیدار کو للکارا۔

دوسرا کتا میدان میں لایا جا چکا تھا۔ صوبیدار اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ اس نے اٹھ کر بید سے کتے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ کتا بلبلا اٹھا مگر دو آدمیوں نے اسے زنجیروں سے باندھ رکھا تھا۔ صوبیدار اسے بدستور پیٹ رہا تھا اور کتا ڈھولوں کی آواز سے کہیں بلند چیخ رہا تھا۔

آخر صوبیدار نے کتے کی زنجیریں کھلوا دیں اور اسے پٹے سے تھام کر میدان میں لے آیا اور دونوں کتے ایک دوسرے کا خون کرنے لگے۔

"اس نے کتے کو اس قدر مارا پیٹا کیوں تھا؟" ــــ شرابے نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"اس طرح کتا طیش میں آ جاتا ہے" ــــ آدمی نے جواب دیا ــــ "اور پورے غصے سے لڑتا ہے"۔

"لیکن کتا اس سے پیار کرتا ہے....." ــــ شرابے نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہا ــــ "اور وہ اسے ظالموں کی طرح مارتا ہے"۔

"ہر کوئی یوں نہیں کرتا" ــــ اس آدمی نے جواب دیا ــــ "یہ نرالا طریقہ صرف اسی صوبیدار نے اختیار کر رکھا ہے"۔

اس شام شرابا گھر نہ آیا۔ استاد کامو ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ وہ دوسرے دن بھی لاپتہ رہا۔ اکھاڑے کے ماحول میں پھر افراتفری مچ گئی۔ گامے دس نمبریے نے اپنے بالکے ہر طرف دوڑا دیئے۔

استاد کامو گھر میں سر تھامے بیٹھا تھا کہ کسی نے آ کر خوشخبری سنائی ــــ "استاد! شرابا آ گیا ہے۔ میں اس کے کمرے میں بتی جلتی دیکھ آیا ہوں"۔

استاد کامو بھاگ کر شرابے کے گھر پہنچا۔ وہ جونہی کمرے میں داخل ہو، ایک خونخوار قسم کا کتا ہیبت ناک طریقے سے بھونک کر استاد پر جھپٹنے کو اٹھا۔ استاد کامو گھبرا کر جو بھاگنے لگا تو دہلیز سے ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرا ــــ "خبردار ٹائیگر!" ــــ شرابے نے لپک کر کتے کی کمر دبوچ لی اور کتا شرابے کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

نیاز آخری شو دیکھ کر لوٹا تو شرابے کی بتی جلتی دیکھ کر اندر چلا گیا۔ کمرے میں جا کر دیکھا۔ شرابا کتے کو اپنے ساتھ پلنگ پہ لٹائے ہوئے تھا۔ نیاز کو دیکھ کر کتا غرایا لیکن شرابے نے کتے کو ڈانٹ دیا اور کتا پھر لیٹ گیا۔

"یہ کتا مالک سے پیار کرتا تھا" ــــ شرابا اٹھ بیٹھا، بولا ــــ "اور مالک اسے مارتا تھا۔ اب میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ دیکھو یہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے" ــــ اس نے اپنا منہ کتے کے منہ کے ساتھ لگا کر کہا ــــ "ٹائیگر!" ــــ تو کتے نے شرابے کے گالوں کو چاٹ

لیا اور شرابے کا چہرہ جو نیند سے مرجھایا مرجھایا تھا، چمک اٹھا۔

''کہاں سے لائے یہ کتا؟''___ نیاز نے پوچھا۔

''صوبیدار کے گھر سے!''___ شرابے نے تحمل سے جواب دیا___ ''رات دیوار پھلانگی تھی''۔

آخر کس طرح؟''___ نیاز نے حیرت زدہ ہو کے پوچھا___ ''اس قسم کا درندہ کتا چرالانا آسان تو نہیں''۔

''یا علی مشکل کشا کا نام لیا تھا''___ شرابے نے کہا اور بازو کتے کی گردن میں ڈال دیئے۔

ادھر صوبیدار کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔ یہ کتا اس نے سینکڑوں روپے خرچ کر کے چترال سے منگوایا تھا۔ اس وقت یہ ننھا سا پلا تھا۔ اس پر اس نے دن رات محنت کی تھی اور کتے نے جوان ہو کر بڑے بڑے لڑاکے کتوں کو میدان سے بھگایا تھا۔ اب جبکہ کتے کی شہرت ضلع میں دور دور تک پھیل گئی تھی اور صوبیدار کو ایک جاگیردار کتے کے آٹھ ہزار روپے پیش کر رہا تھا تو کتا چوری ہو گیا۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دیئے اور کتا ڈھونڈنے والے کو ایک سو روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا لیکن کتے کا سراغ نہ ملا۔

کتے کی گمشدگی اور انعام کا اشتہار استاد کامو کے اکھاڑے میں بھی پہنچا۔ استاد، نیاز اور گامے نے بھی شرابے کو کہا کہ کتا واپس کر دے لیکن وہ نہ مانا۔ جب انہوں نے زور دیا تو شرابے نے کہا___ ''جس کسی نے مجھ سے کتا لینے کی ہمت کی اسے جان سے مار دوں گا''۔

سب کو معلوم تھا کہ شرابے نے خالی دھمکی نہیں دی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے کر گزرتا ہے۔ انہوں نے سوچا شراب کتا دینے سے رہا، کہیں ایسا نہ ہو کر شرابا ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔ انہوں نے اسے کہا کہ کتے کو باہر نہ نکالے ورنہ کوئی ایک سو روپے کے لالچ میں صوبیدار کو بتا دے گا۔

شرابے کی زندگی میں ایک بار پھر بہار آ گئی۔ وہ اکھاڑے میں بھی جانے لگا۔ چہرے پر مسکراہٹ لئے ہوئے۔ اس نے استاد کامو کو الگ بٹھا دیا اور پٹھوں کو خود تیار کرنے لگا۔ رات کتے کو اپنے پاس سلاتا تھا اور آدھ سیر بادام اور دو سیر دودھ کتے کو پلا دیتا تھا۔ استاد نے کتے کے لیے اسے زیادہ دودھ دینا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ کتا ہے تو

شرابا بھی ہے۔ کتا گیا تو شرابا بھی گیا۔

استاد کے دو پٹھے جمال اور اچھا شرابے کے ہاتھوں اب اس قدر تیار ہو گئے کہ چٹانوں سے ٹکرانے کو اٹھتے تھے۔ استاد کامو کی تو جیسے جوانی لوٹ آئی تھی اور زینت جو شرابے کی غیر حاضری میں ملول سی ہو گئی تھی، کھل اٹھی۔

''زینت!''___ ایک رات نیاز نے زینت سے پوچھا___ ''شرابا کہیں چلا جاتا ہے تو تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں!''___ زینت چپ سی ہو گئی جیسے جھینپ گئی ہو، ذرا سنبھل کر بولی ___ ''شرابا اکھاڑے کی روح ہے اور اکھاڑے کی رونق اسی کے دم سے ہے۔ تم تو جانتے ہو نیاز! مجھے اس رونق سے کس قدر پیار ہے''۔

''کہیں پیار کا دھارا رخ ہی نہ بدل جائے زینت!''

''تم تو پاگل ہونا ہے!''___ زینت نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا___ ''ایسا بھی ہو سکتا ہے کبھی؟''___ اس نے شگفتہ سی آہ لی اور بولی___ ''وہ بے چارہ تن تنہا سا آدمی ہے۔ جانے کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا۔ سوچتی ہوں وہ پہلوان نہ ہوتا تو کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ سب اس کی استادی اور جسم سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی ذات سے تو کسی کو دلچسپی نہیں...... جانے میرا دل کیوں چاہنے لگا ہے کہ اس کے ساتھ باتیں کیا کروں لیکن وہ مجھ سے تو بولتا ہی نہیں''۔

''نہ ہی بولے تو اچھا ہے''___ نیاز نے کہا۔

دو اور دن ہنستے کھیلتے گزر گئے اور میٹھی عید میں چند ہی روز باقی رہ گئے۔ بھاٹی دروازے والے اکھاڑے کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ استاشیرا داتا دربار پر دو دیگ چاول چڑھا چکا تھا اور اب ایک ماہ سے مرید کے والے جھگی والے پیر کی مٹھی چاپی کر رہا تھا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ جھگی والے پیر نے مُردے زندہ کئے ہیں اور وہ مشکل کشا ہے۔ استاد شیرے کو پیروں فقیروں پر بہت بھروسہ تھا اور ہاتو پر تو وہ جان چھڑک رہا تھا۔ ہاتو نہ ہوتا تو اس کا کوئی پٹھا شرابے کے مقابلے میں دو منٹ کے لیے بھی ٹکنے کے قابل نہ تھا۔

نیاز اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ نیاز جو رات دو بجے کے بعد سویا تھا، دوپہر سے پہلے کیسے جاگ اٹھتا لیکن وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کسی نے اسے

جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ آنکھیں مل کر دیکھا۔ زینت کھڑی تھی۔ سخت گھبرائی اور ہانپی ہوئی۔

''رات شرابے نے خون کر دیا ہے''___ زینت نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''کس کا؟''

''گامے دس نمبریئے کا''۔

نیاز کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی لیکن شرابا؟

''رات گاما آیا اور استاد چچا کو کہنے لگا کہ میں میٹھی عید کے دوسرے ہی روز زینت کو بیاہ لے جائے گا تم لوگ اس کا زیور کپڑا تیار کر لو''___ زینت تیزی سے بول رہی تھی___ ''چچا اور چچی نے اسے ٹالا کہ کیا جلدی ہے دو چار ماہ گزر جانے دو لیکن گاما غصے میں آ گیا اور بولا___ ''تم لوگ مجھے ٹرخا رہے ہو''___ تم جانتے ہو نیاز! چچا اور چچی گامے کے احسان مند ہیں، وہ جھک گئے۔ چچا بولا___ ''اچھا! جیسے تم کہتے ہو، میں ٹال تو نہیں رہا''___ زینت دروازے کی طرف چوروں کی طرح دیکھ کر نیاز کے پاس بیٹھ گئی۔ نیاز اس کہانی میں جذب ہو چلا تھا لیکن اس کا دل ڈوب رہا تھا زینت کہہ رہی تھی___ ''جب چچا نے ہاں کر دی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سوچا اب چپ رہی تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی اور کہہ دیا کہ میں کسی دس نمبریئے بدمعاش سے شادی نہیں کروں گی۔ ذبح کر دو پر میرے منہ سے ہاں نہ سنو گے۔ گاما کلموا لال سرخ ہو گیا اور چیخ کر بولا___ ''پھر کس یار سے شادی کرے گی تُو؟ ذرا نام تو لے اس کا''___ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چچا نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے سوچا اگر صاف بتا دوں کہ میں نیاز سے شادی کروں گی تو وہ تمہیں اس وقت سوتے سوتے پار کر جاتا۔ میں نے سوچا کہ شرابے کا نام لے دوں۔ شرابے کے نام سے تو گاما کوسوں دور بھاگتا ہے نا! سوال تو گامے کو ٹالنے کا تھا۔ سو میں نے کہہ دیا کہ میں شرابے کے سوا کسی کو منہ نہ لگاؤں گی۔ میں کسی کی کچھ نہیں لگتی، جوان ہوں، سیدھی کچہری پہنچ جاؤں گی''۔

''پھر سنو کیا ہوا!''___ زینت نے کہا___ ''گامے نے جیب سے چاقو نکال لیا اور کھول کر اٹھ کھڑا ہوا، بولا___ ''پہلے میں اس شرابے بھینسے سے نپٹ لوں پھر دیکھتا ہوں تم کس طرح راہ پر آتی ہو''___ اس کا یہ کہنا تھا کہ دھماکے سے کمرے کا دروازہ کھلا اور شرابا نمودار ہوا۔ وہ بجلی کی طرح نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ گامے کو دبوچ کر سر سے اوپر اٹھا

چکا تھا۔ چچا کو تو بیچ بچاؤ کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور نہ گامے کو چاقو چلانے کی فرصت ملی۔ شرابے نے گامے کو اٹھا کر یوں دیوار سے پٹخ دیا جیسے بچے دیوار پر گیند مارتے ہیں۔ گاما دیوار سے لگا تو سارا مکان ہل گیا پھر وہ مردود اٹھ ہی نہ سکا۔ وہیں بے ہوش ہو گیا اور اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ ہم سب گم صم کھڑے تھے۔ شرابے نے گامے کو ٹخنے سے پکڑا اور گھسیٹ کر دروازے سے باہر پھینک آیا۔ چچا اور چچی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شرابے نے بڑے اطمینان سے کہا___ ''استاد! کتے کے لیے دودھ نہیں بچا، گھر میں ہو تو دے دو نہیں تو تھوڑے سے پیسے دے دو، کتا بھوکا ہے''___ چچی نے اسے دودھ کی بالٹی دی اور شرابا بولا___ ''میں باہر کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ میں دودھ لینے آیا تھا اور تم سب کی باتیں سننے باہر رک گیا تھا۔ اسے اٹھا کر پھینک آؤ ورنہ میں اپنا کتا لے آؤں گا اور کتا اسے کھا جائے گا''۔

استاد کامو نے ڈاکٹر کو گھر ہی بلا لیا اور اسے ایک سو روپیہ دے کر کہا کہ کسی سے ذکر نہ کرے ورنہ شرابا گرفتار ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر تو دی لیکن کہا کہ صبح تک ہوش میں آ گیا تو بچ جائے گا ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ دوسری صبح گامے کو ہوش آ ہی گیا۔ استاد کامو نے اسے دو سو روپے دے کر منت کی کہ تھانے میں رپورٹ نہ کرے۔ گامے نے مری سی آواز میں کراہنے کے انداز میں کہا___ ''میں اب زینت سے شادی نہیں کروں گا۔ سالی کنجری ہے، بدچلن ہے۔ میں ذرا اٹھ لوں پھر شرابے سے بدلہ لوں گا''___ اس نے دو سو روپیہ لے کر سرہانے تلے رکھ لیا۔

نیاز کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ گاما بھی مار کھا گیا اور میدان سے نکل گیا اور شرابا بھی گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ زینت بھی ہاتھ سے نہ گئی لیکن اگلی ہی صبح شرابا ہنستے مسکراتے طوفان کی طرح اس کے گھر میں داخل ہوا اور اسے اسی طرح جھنجھوڑ کر جگایا جس طرح اسے زینت نے جگایا تھا۔ وہ پھر ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

''نیازے! سن بے نیازے!''___ شرابے نے اس کے سر کو جھنجھوڑ کر کہا___ ''میں رات کتا اسی گھر میں پھینک آیا ہوں جہاں سے لایا تھا۔ جانتے ہو کیسے؟ کل آدھی رات کو میں کتے کو ساتھ لے گیا اور اسے اٹھا کر مکان کی دیوار کے اوپر سے پھینک دیا''۔

''کیا کہہ رہے ہو شرابے؟''___ نیاز نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا___ ''کتا خود ہی

واپس کر آئے اور اس قدر خوش بھی ہو؟ کیوں؟ اب پیار کس سے کرو گے؟ اب تمہارے ساتھ کھیلے گا کون؟''

''زینت!''___ شرابے نے بھرپور مسکراہٹ سے کہا___ ''جانتے ہو رات زینت نے کیا کہا ہے؟ زینت نے کہا ہے کہ میں شرابے کے سوا کسی کو نزدیک نہیں پھٹکنے دوں گی۔ اسی لیے تو میں نے گامے کا سر کھول دیا ہے کیونکہ وہ زینت کے نزدیک پھٹکا تھا''۔

زینت کی محبت کے جنوں میں شرابا بولتا ہی چلا جا رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس قدر زیادہ اور بے ساختہ بول رہا تھا مگر نیاز کا خون کھولنے لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ شرابا غلط فہمی میں الجھ گیا ہے۔ زینت نے تو گامے کو ڈرانے کی خاطر شرابے کا نام لیا اور یہ سچ ہی سمجھ بیٹھا۔

''سنو شرابے!''___ نیاز بولا___ ''تمہیں غلطی لگی ہے......''___ اور اس نے شرابے پر واضح کیا کہ زینت نے کیوں کہا تھا کہ ___ ''میں شرابے کے سوا کسی سے منہ نہیں لگاؤں گی''___ نیاز نے اسے بتایا کہ یہ تو اچھا ہوا کہ گاما ہماری راہ سے ہٹ گیا ہے___ ''اور شرابے!''___ نیاز نے جذباتی سا ہو کے کہا___ ''اس پیپل کے پتوں سے پوچھو کہ زینت مجھے کس قدر چاہتی ہے اور ہم نے رات کے اندھیروں میں کس طرح ایک دوسرے سے پیار کیا ہے......زینت میری ہے شرابے! ہم ایک دوسرے کے لیے جی رہے ہیں''___ نیاز نے شرابے کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور بھکاریوں کی طرح کہا___ ''خدا کے لیے شرابے تم ہماری راہ میں نہ آنا''۔

''اوہ!''___ شرابے کے منہ سے جیسے آہ نکل گئی ہو۔ اس نے اداس سی سرگوشی کی ___ ''یہ بات تھی...... میں سمجھ نہ سکا''___ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں صبح کاذب کی طرح ہلکی سی مسکراہٹ کا دھوکا چمکا اور تبسم کا یہ واہمہ وہیں کہیں گم ہو گیا۔ اس نے زیر لب کہا___ ''مجھے کون چاہے گا! کون ہوں میں!''___ اور وہ اٹھ کر چل پڑا پھر رک گیا اور سر جھکا کر اس طرح آہستہ آہستہ چل پڑا جیسے اعصاب پر منوں بوجھ اٹھائے چلا جا رہا ہو۔

وہ چاہتا تو نیاز کا بھی وہی حشر کر سکتا تھا جو اس نے گامے کا کیا تھا لیکن نیاز اس کا دوست تھا۔ نیاز نے بھی محسوس کیا کہ شرابے نے اس پر کتنا عظیم کرم کیا ہے کہ خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ گیا ہے۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے گھاس کا تنکا اڑ کر پرے ہو

جاتا ہے۔ نیاز اس بھیانک حقیقت سے آگاہ تھا کہ شرابا گھاس کا تنکا نہیں، طوفان ہے۔

نیاز سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھا۔ شرابا صحن میں چلا جا رہا تھا۔ نیاز اس کی راہ میں جا کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ لپٹ گیا پھر اس کا گول مٹول چہرہ ہاتھوں میں تھام کر کہا___ ''ناراض ہو چلے شرابے؟ اگر زینت میری بیٹی یا بہن ہوتی تو میں اسے تمہارے قدموں میں ڈال دیتا لیکن زینت......''___ نیاز پر رقت طاری ہو گئی۔

شرابے کے ہونٹ ذرا سے لرزے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے جنہیں پلکوں نے وہیں دبوچ لیا۔ شرابے نے بڑے پیار سے نیاز کا گال تھپکایا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

اور شرابا جانے کدھر کو نکل گیا۔ عید میں چند ہی روز باقی تھے اور شرابا گم۔ گاما دس نمبریا ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ اس کا زخم گہرا تھا۔ وہ ٹھیک بھی ہوتا تو اب شرابے کو تلاش کرنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کرتا۔ استاد کامو بوکھلا گیا۔ اس کی شکست خوردگی کا یہ عالم تھا کہ شرابے کی تلاش میں آدمی دوڑانے کی بجائے داتا دربار گیا اور مزار کی پائنتی زار و قطار رویا۔ رو رو کر دعا کی___ ''یا پیروں کے پیر! شرابے کو ڈھونڈ دے۔ ایک دیگ میٹھے چاول اور ایک دنبہ کاغانی تیرے حضور غریبوں کو کھلاؤں گا''۔

وہاں سے وہ شاہی محلے والے سائیں کے پاس گیا اور دس روپے نذرانہ دے کر دو تعویذ لئے۔ ایک اکھاڑے میں دبایا اور دوسرا شرابے کے دروازے کے ساتھ باندھ دیا۔ سائیں جی نے کہا تھا کہ شرابے کے صحن میں سوا پندرہ سیر چاول پکا کر غریبوں کو کھلاؤ۔ استاد کامو نے یہ خیرات بھی دی۔ سائیں جی نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا___ ''تمہارا آدمی تیسرے روز جب سورج اندر باہر ہو گا آپ ہی آپ گھر آ جائے گا''۔

نیاز زینت سے ملا اور اسے کہا___ ''تم نے اسے غلط فہمی میں الجھا کر اسے پاگل بنا دیا ہے۔ ورنہ وہ کتے کے ساتھ بہت خوش تھا۔ تم نے اسے محبت کا فریب دیا اور وہ کتا لوٹا آیا''۔

''وہ اس غلط فہمی سے خوش تھا؟''___ زینت نے پوچھا___ ''وہ بہت خوش تھا؟''

''ہاں تو! وہ تو تمہارے نام پہ دیوانہ ہو رہا تھا''۔

''اوہ!''___ زینت کے منہ سے جیسے آہ نکل گئی ہو۔ اس نے زیر لب کہا___ ''اوہ

شرابے!''۔۔۔ اور وہ یوں آہستہ آہستہ وہاں سے چل پڑی جیسے نیاز وہاں تھا ہی نہیں۔

تیسرے دن کا پچھلا پہر تھا۔ استاد کا مو کے پاس ایک اجنبی آدمی آیا اور پوچھا کہ شرابے نام کا کوئی پہلوان اس کے اکھاڑے میں ہوتا تھا۔

''ہاں! ہوتا تھا''۔۔۔ استاد کا مو نے اچھل کر کہا اور اس آدمی کے کندھے جھنجھوڑ کر پوچھا۔۔۔ ''کہاں ہے وہ؟ جلدی بتاؤ دوست! تمہارا منہ میٹھے سے بھر دوں گا۔ جلدی بولو''۔

''وہ پرانی انارکلی کی حوالات میں بند ہے''۔

''کہاں؟ حوالات میں؟''۔۔۔ استاد کو چکر آنے لگے۔

''ہاں وہ قتل کے جرم میں گرفتار ہو گیا ہے''۔۔۔ ''اس آدمی نے کہا۔۔۔ ''چوبرجی کے پاس ایک سفید حویلی ہے، لکڑی کوئلے کے ٹال کے قریب۔ وہ جالندھر والے صوبیدار افضل خان کی حویلی ہے۔ اس کا کتا گم ہو گیا تھا اور ایک رات کتا خود ہی دیوار پھلانگ کر گھر آ گیا۔ پرسوں آدھی رات کے وقت ایک ہٹا کٹا آدمی جس نے تھانے میں اپنا نام شرابا بتایا ہے، دیوار کود کر صحن میں آیا اور کتے کو کھول لیا۔ صوبیدار کی آنکھ کھل گئی۔ صوبیدار کی بیوی کا بیان ہے صوبیدار نے برآمدے کی بتی جلائی تو دیکھا کہ کتا اس آدمی کے پاؤں چاٹ رہا تھا اور اس طرح پیار کر رہا تھا جیسے کتا اسی آدمی کا تھا۔ صوبیدار نے برآمدے میں پڑی ایک لوہے کی سلاخ اٹھالی اور اس آدمی پر، جس نے اپنا نام شرابا بتایا ہے، حملہ کیا لیکن کتا صوبیدار پر جھپٹ پڑا اور ناخنوں سے سے لہولہان کر دیا۔ صوبیدار کی بیوی کہتی ہے کہ وہ آدمی، جسے شرابا کہتے ہیں الگ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور کتا صوبیدار کو لہولہان کرتا رہا۔ بیوی آگے بڑھی تو شرابے نے اسے بازو سے پکڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ شور نہ کر سکے۔ صوبیدار نے بڑی مشکل سے کتے کو الگ کیا اور لوہے کی سلاخ کتے کے سر پہ اس قدر زور سے ماری کہ کتا گر پڑا۔ صوبیدار نے دوسرا وار کر کے کتے کو جان سے مار دیا......

''اس آدمی نے یعنی اس شرابے نے صوبیدار کی بیوی کو چھوڑ کر صوبیدار کو دبوچ لیا اور اسے سر سے اوپر اٹھا کے اس قدر شدت سے دیوار کے ساتھ پٹخا کہ صوبیدار وہیں مر گیا اور شرابا مرے ہوئے کتے کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صوبیدار کی بیوی نے شور مچایا تو محلے کے لوگ جاگ اٹھے اور صوبیدار کے گھر آئے۔ شرابے نے اپنے آپ

کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا اور تھانے میں آتے ہی اقبال جرم کر لیا۔ اس نے کہا کہ صوبیدار نے میرا کتا مار دیا ہے اور میں نے اسے مار دیا ہے''۔

اس آدمی نے استاد کا مو کو بتایا۔۔۔ ''میں اس تھانے میں کانسٹیبل ہوں۔ شرابے نے منت کی تھی کہ استاد کا مو، نیاز اور زینت کو اطلاع کر دوں۔ اس نے ان سب کو سلام کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ مجھے بخش دینا۔ شرابے نے کہا تھا کہ جمال اور اچھے کو ایک ضروری بات بتا دینا۔ انہیں کہنا کہ تم دونوں کشتی لڑتے بائیں پاؤں کو پیچھے رکھا کرو اور ہمیشہ دایاں پاؤں آگے رکھو۔ گھٹنے پوری طرح اکڑا اکڑا کر رکھا کرو۔ تم دونوں میں یہ کمزوری ہے کہ گھٹنے ڈھیلے رکھتے ہو۔ حریف گردن پر ذرا سا دباؤ ڈالتا ہے تو تمہاری ٹانگیں دوہری ہو جاتی ہیں۔ آنکھیں حریف کی آنکھوں میں ڈالے رکھو۔ بھاٹی دروازے والے ہاتو کو تم گرا لو گے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے''۔

استاد کا مو نے آنسوؤں کے دھندلکے میں اس آدمی کو پانچ روپے دے کر رخصت کیا اور اسی شام نیاز، جمال اور اچھے کو ساتھ لے کر پرانی انارکلی کے تھانے میں گیا۔ منت سماجت سے اسے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ سب نے شرابے کو کہا کو وہ عدالت میں اقبال جرم سے انکار کر دے اور ہم گواہ پیش کر کے ثابت کر دیں گے کہ شرابا واردات کے وقت نیو سٹار سینما میں پکچر دیکھ رہا تھا۔ واردات ساڑھے گیارہ بجے ہوئی ہے اور تیسرا شو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے لیکن شرابے نے کہا۔۔۔ ''میں نے اسے قتل کیا ہے کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا ہے۔ کتا مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس نے میری محبت کو قتل کیا ہے۔ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ میں کتے کو گھر لانے گیا تھا''۔

استاد کا مو وکیلوں سے ملا اور سب سے مہنگا وکیل کر لیا۔ جس نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، صوبیدار کی بیوی کا ابتدائی بیان اور پولیس کی ابتدائی رپورٹ دیکھی۔ ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ مقتول کے جسم پر کتے کے پنجوں کے زخم مہلک تھے۔ صرف یہی زخم موت کا باعث بن سکتے تھے لیکن جو چوٹ دیوار سے ٹکرانے سے آئی ہے وہ بھی شدید تھی۔ مقتول کے دائیں پہلو میں کتے نے دانتوں سے جو کاٹا تھا اس کا اثر پھیپھڑوں تک پہنچا تھا۔

عینی شاہد تین تھے۔ مقتول کی بیوی اور دو محلے دار جنہوں نے شرابے کو موقع پر پکڑا تھا۔ وکیل نے بھی شرابے کو کہا کہ وہ صحت جرم سے انکار کر دے۔ استغاثہ کی کہانی بہت

کمزور ہے لیکن مجسٹریٹ کے سامنے شرابے نے کہا___ ''میں نے صوبیدار کو قتل کیا ہے کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا تھا''۔

استاد کامو نے صفائی کے آٹھ گواہ پیش کیے جنہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شرابا نیو سٹار سنیما میں تیسرا شو دیکھ رہا تھا۔ دو گواہوں سے یہ بھی کہلوایا گیا کہ ملزم چونکہ گامے دس نمبریئے کا دوست ہے اس لیے پولیس نے اسے شک میں گرفتار کیا ہے اور مار پیٹ کر اقبال جرم کروالیا ہے۔ صفائی کے وکیل کی جرح اور دلائل وزنی تھے لیکن شرابے نے اپنی صفائی میں کسی کے پاؤں جمنے نہ دیئے۔ وہ بار بار اپنا اقبالی بیان دہراتا تھا۔

ایک ماہ بعد مقدمہ سیشن کورٹ میں منتقل ہو گیا اور میٹھی عید گزر گئی۔ استاد کامو جو پچپن برس کی عمر میں پھر سے جوان ہو گیا تھا، ستر برس کی عمر کا بوڑھا نظر آنے لگا۔ اسے ''بھاٹی دروجے'' والوں کو گرانے کا غم کھائے جا رہا تھا، لیکن استاد شیرا اوچھا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک رات استاد کامو کے پاس آیا۔ کامو کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ سمجھا کہ شیرے کا آنا اس پر بھرپور طنز ہے لیکن استاد شیرے نے کامو کو کہا___ ''ہم دونوں اکھاڑے کے بادشاہ ہیں۔ ہمارے دل بھی بادشاہ ہیں۔ اللہ گواہ ہے جب سے تمہارا شرابا گرفتار ہوا ہے، میں نے اپنا اکھاڑہ بند کر دیا ہے۔ کامو بھائی! تمہارے پٹھے میرے بچے ہیں۔ میں اس روز اپنے پٹھے اکھاڑے میں اتاروں گا جس روز تمہارا شرابا بری ہو کر باہر آجائے گا''___ استاد شیرے نے کامو کا ہاتھ دبا کر کہا___ ''سیشن کورٹ میں جھوٹے گواہوں کی ضرورت ہو تو میرے تمام پٹھے حاضر ہیں۔ انہیں جو بیان پڑھاؤ گے زبانی یاد کر کے عدالت میں سنا آئیں گے''۔

استاد کامو نے استاد شیرے کا ہاتھ دبایا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اس پر رقت طاری ہو گئی تھی۔

سیشن کورٹ نے فیصلہ سنا دیا___ ''جرم ثابت ہے۔ ملزم کو سزائے موت دی جاتی ہے''۔

شرابے کے چہرے پر اطمینان وسکون کی ایسی جھلک تھی جو اس کے چہرے پر پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے مسکرا کر استاد کامو، نیاز، جمال، اچھے اور دوسرے پٹھوں سے جو اسے کورٹ میں دیکھنے آئے تھے، ہاتھ ملایا اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہاتھ

جمال کے سینے پہ رکھ کر کہا___ ''کشتی لڑتے ہوئے جسم کو ذرا سا آگے جھکا کر رکھو اور پچھلا پاؤں زمین میں گاڑ دو۔ بھاٹی دروازے والے ہاتو کی طاقت تم سے زیادہ ہے لیکن عقل کم ہے۔ تم عقل استعمال کرو...... اللہ بیلی دوستو! خدا تمہارے ساتھ ہے''۔

سب نے آنسوؤں کی روانی میں شرابے کو موت کی راہ پہ رخصت کر دیا اور شرابا ہنستا مسکراتا چلا گیا۔

اسی شام اطلاع ملی کہ گامے دس نمبریئے کے سر کا زخم خراب ہو گیا تھا۔ وہ زخم ٹھیک ہونے سے پہلے ہی ہسپتال سے نکل آیا تھا اور کسی حکیم کی مرہم لگاتا رہا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ زخم میں پیپ پڑ گئی ہے۔ عین اس وقت جب شرابے کو سزائے موت کا حکم سنایا جا رہا تھا، گاما دس نمبریا مر گیا۔

دوسرے روز وکیل جیل جا کر شرابے سے ملا اور اس نے شرابے کو کہا کہ سیشن جج کے فیصلے کے خلاف اپیل کی جا رہی ہے لہٰذا وہ اس کاغذ پر انگوٹھا لگا دے لیکن شرابے نے صاف انکار کر دیا۔ بولا___ ''مجھے اس فیصلے کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے پھانسی چڑھنے سے روکو گے تو میں خودکشی کر لوں گا''۔

وکیل نے استاد کامو کو بتایا کہ شرابے کے دستخط یا انگوٹھے کے بغیر اپیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ استاد کامو جیل گیا اور شرابے سے ملا لیکن اس کی تمام آہ وزاری اور منت سماجت پھانسی کی کوٹھڑی میں دم توڑ گئی۔ استاد کامو کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی۔ جمال، اچھا، نیاز اور دوسرے پٹھے بھی جیل ہو آئے لیکن شرابے نے انہیں ہنس ہنس کے ٹال دیا۔

زینت کو معلوم ہوا کہ شرابے نے سب کے سامنے انکار کر دیا تو وہ نیاز سے ملی اور کہا___ ''خدا کے لیے مجھے استاد چچا سے اجازت لے دو۔ میں شرابے سے ملنے جاتی ہوں، شاید مان جائے''۔

''اری پگلی!''___ نیاز نے وارفتگی سے کہا___ ''تمہیں اس قصے سے کیا واسطہ؟ گاما اس طرح ختم ہو گیا۔ شرابا اس طرح جا رہا ہے۔ دونوں چٹانیں راہ سے ہٹ گئی ہیں۔ میں استاد سے بات کر لوں گا اور......''

''نیاز!''___ زینت نے سر جھکا کر کہا___ ''برا نہ جانو تو کہوں......''___ اور وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

"کہو زینت کیا کہنا چاہتی ہو؟"

زینت نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور بے تاب ہو کر بولی ــــ "مجھے شرابا زیادہ اچھا لگتا ہے" ــــ اور رکے ہوئے جذبات کا سیل نوجوان لڑکی کے سینے کے بند توڑ کر باہر آ گیا ــــ "شرابا نہیں ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بہت فریب دیئے ہیں نیاز! لیکن شرابے کو ہزار کوشش کے باوجود دل سے نکال نہ سکی۔ انسان اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ تجھے ان راتوں کی قسم نیاز! جن کے اندھیروں میں تم نے مجھ سے محبت کی ہے مجھے شرابے کے پاس لے چلو...... خدا کے لیے نیاز! اپنی محبت کا ثبوت دو"۔

نیاز پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ زمین بڑے زور سے ہلنے لگی۔ زینت کی جذباتی کیفیت دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی تھی جہاں نیاز کی ہر دلیل اور التجا محض بے کار تھی۔

نیاز کو یہ بھی خیال آ گیا کہ اس نے شرابے کو دوستی کا واسطہ دے کر اپنی اور زینت کی راہ سے ہٹایا تھا اور وہ خاموشی سے ہٹ گیا تھا۔

نیاز نے استاد کامو سے بات کی تو استاد ذرہ بھر مزاحم نہ ہوا، بولا ــــ "اگر زینت اسے منا سکتی ہے تو تم اسے جیل لے جاؤ اور وکیل سے اپیل بھی لیتے جاؤ"۔

دوسرے دن نیاز اور زینت جیل گئے اور ملاقات کی درخواست دی۔ جب انہیں ملاقات کے لیے بلایا گیا تو نیاز نے زینت کو کہا ــــ "تم اکیلی جاؤ میں باہر ٹھہروں گا"۔

زینت اکیلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا ــــ "شرابے نے اپیل پر انگوٹھا لگا دیا ہے۔ یہ لو"۔

ہائی کورٹ نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے متعلق رائے ظاہر کی کہ مقتول کی موت کا ذمہ دار کتا ہے۔ استغاثہ کے تین عینی شاہدوں کے مقابلے میں صفائی کے آٹھ گواہ تھے جن کے بیانات وزنی تھے۔ علاوہ ازیں وکیل صفائی کے دلائل زیادہ پُر مغز اور قابلِ قبول تھے۔

ہائی کورٹ نے شرابے کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔

چند روز بعد استاد کامو کے اکھاڑے کا ماحول ڈھولوں کی گونج سے مرتعش ہونے

لگا۔ اکھاڑے کے اردگرد زمین پر، منڈیروں اور درختوں پر، ٹرکوں اور بسوں کی چھتوں پر انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے جیسے سارا لاہور اکھاڑے پر ٹوٹ پڑا ہو۔ "بھاٹی دروجے" والا ہاتو اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔

شرابے نے استاد کامو کے گھٹنے چھوئے، کامو نے اس کی پیٹھ تھپکائی اور شرابے نے زندگی میں پہلی بار کھل کر "یا علی مشکل کشا" کا نعرہ لگایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ وہ رک گیا۔ گھوم کر پیچھے دیکھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ تماشائیوں کی طرف بھاگ اٹھا۔ وہاں نیاز بیٹھا تھا۔ شرابا نیاز کے سامنے آ کر جھک گیا۔ نیاز نے اٹھ کر اس کی پیٹھ تھپکائی، پھر ہاتھ ملایا اور شرابا اکھاڑے کی طرف چل پڑا۔

اس نے بائیں طرف ایک دومنزلہ مکان کی طرف دیکھا۔ جس کی کھلی کھڑکی سے ایک نرم و گداز بازو ہل رہا تھا۔ شرابا مسرت سے بھرپور مسکراہٹ مسکرایا۔ جواب میں ہاتھ ہلایا او کود کر اکھاڑے میں ہاتو کے سامنے آ گیا۔

بھاٹی دروازے والے ڈھول بجاتے آئے تھے۔ ڈھول پیٹھ پیچھے لٹکا کر لوٹ گئے۔ شرابے نے ہاتو اور ولیم کو گرا لیا تھا۔ بھاٹی دروازے کے ڈھول تو خاموش ہو گئے لیکن استاد کامو کے اکھاڑے کے ڈھول بجتے رہے۔ بلند، بلند تر، پھر ان کے ساتھ شہنائیاں اور باجے بھی شامل ہو گئے۔ دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھے دن ڈھول باجوں کے بے ہنگم شور شرابے میں شرابا اور زینت ایک ہو گئے۔

ایک اور کہانی استاد کامو کے اکھاڑے کی نرم و ملائم مٹی میں جذب ہو گئی۔

⌘ ⌘ ⌘

بھٹکی ہوئی منزل

حمیدی

حمیدی

ہاجرہ نے گھڑا بھرا اور اس کی نگاہیں اس ٹیکری کی طرف گھوم گئیں جس پر چڑھنے سے اسے ماں نے سو بار منع کیا تھا۔ اس نے گھڑا کنوئیں پر چھوڑا اور ٹیکری کی طرف چل دی۔ ماں کے الفاظ اب بھی اس کے گرد منڈلا رہے تھے ــــ ''گزرے دنوں کو اب کیا یاد کرو گی بیٹی! مت جایا کرو اس ٹیکری پر جہاں سے تمہیں وطن کی برفیلی چوٹیاں اور ہری وادیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہم سے چھن گئی ہیں۔ ہم ان سے چھن گئے ہیں۔ لوگوں نے سینوں سے دل نوچ لیے ہیں۔ ہاجرہ بیٹی! مت دیکھا کرو ان چوٹیوں کو۔ وہ اتنی ہی اداس ہیں۔ جتنی سپید ہیں۔ وہ افسردہ ہیں بیٹی! ہمارا کشمیر انہی میں دفن ہو گیا ہے، برف کی تہوں تلے دب گیا ہے......''۔

ہاجرہ ٹیکری کی چوٹی پر چڑھ گئی۔ اس کی نگاہیں دور بہت دور کے پہاڑوں کی بلندی تک جا پہنچیں۔ ہاجرہ کی آہ نکل گئی اور نگاہیں بلندیوں سے اتر کر انہی کے دامن میں گھومنے لگیں۔ اسے وہی منظر نظر آیا جسے وہ سینکڑوں بار دیکھ چکی تھی۔ اس کے پاؤں سے لے کر حدِ نگاہ تک بکھری ہوئی اونچی نیچی ٹیکریاں، کچھ بے آب و گیاہ بعض ہری ہری، ایک گاؤں یہاں ایک وہاں اور دور سینکڑوں کوس دور پس منظر میں گل پوش وادیاں جن پر نیلی نیلی دھند چھائی ہوئی تھی اور ان کی محافظ بلند ترین چوٹیاں جنہوں نے بڑی تمکنت سے آسمان کو تھام رکھا تھا۔

جہاں ہاجرہ کھڑی تھی وہاں سے جھرنے اور جھیلیں تو نظر آتی تھیں لیکن ہاجرہ کی شربتی آنکھوں کو دیکھو تو لگتا تھا جیسے وہ ندی کنارے بیٹھی ہے یا جھیل میں شکارا کھے رہی ہے۔ عہدِ رفتہ اس کی آنکھوں میں سمٹ آتا تھا اور ہاجرہ خلاء میں کھو جاتی تھی جس کی وسعت برف

سے لدی چوٹیوں تک تھی۔ اسی خلاء میں اس کا گاؤں اس کی ہنستی کھیلتی دنیا کھوگئی تھی۔

آج شام وہ ٹیکری پہ کھڑی ایڑیاں اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگی لیکن اسے وہی کچھ دکھائی دیا جو وہ ہر بار دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سوچا شاید ماں ٹھیک ہی کہتی ہے کہ ہمارا کشمیر انہی پہاڑوں تلے دفن ہوگیا ہے لیکن ہاجرہ کے تصوروں نے وہ قبر کھود ہی لی جہاں اس کا گاؤں دفن تھا۔

جانے اب وہاں کون لوگ رہتے ہوں گے؟ اس کے تصوروں میں ایک مکان ابھر آیا جس میں وہ ہنستی کھیلتی جوان ہوگئی تھی۔ مکان کے تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ تھا تو وہ جھونپڑا سا لیکن اس کے ماں باپ نے اسے بڑے سلیقے سے سجا رکھا تھا۔ یہ مکان ہوٹل بھی تھا۔ رہائش گاہ بھی، لیکن اس کی پیشانی پر کوئی بورڈ آویزاں نہ تھا۔ نہ بیرے تھے۔ گرمیوں کے آغاز میں میدانوں کی تپتی دھوپ سے بھاگ ہوئے دیس دیس کے لوگ ہاجرہ کے دیس میں آ پناہ لیتے تھے۔ ان میں دو چار ہاجرہ کے ہاں یوں رک جاتے تھے جیسے قافلے سے بچھڑ گئے ہوں۔ کوئی دق کا مریض یا دمے کا مارا یا کوئی اچھا بھلا تنگدست سا مسافر جو کسی بڑے ہوٹل میں ٹھہرنے سے معذور ہوکر ہاجرہ کے ہوٹل نما مکان میں رک جاتا تھا اور گرمیوں کے دو تین مہینے گزار جاتا تھا۔

ہاجرہ اس وقت چھ سات برس کی ننھی سی بچی تھی۔ اسے یہ ہما ہمی بڑی ہی بھلی لگتی تھی اور وہ مہمانوں کو پیاری لگتی تھی۔ گول مٹول گلابی گلابی سے گالوں والی گڑیا سی بچی...... بعض اسے دو چار آنے دے جاتے تھے جنہیں وہ مٹی کی پھولدار ڈولی میں ڈال دیا کرتی تھی۔ کتنی اچھی تھی وہ زندگی، کتنی پیاری، خوبصورت خواب کی طرح ادھوری ہی رہی۔

ہاجرہ برسوں بعد آج شام ٹیکری پہ کھڑی ایڑیاں اٹھا اٹھا کے دیکھ رہی تھی جیسے پہاڑوں کی اوٹ میں بچپن کو ڈھونڈ رہی ہو مگر اس کے بچپن پر وقت و زمانہ نے برسوں گھنی تہیں بچھا دی تھیں۔ اس کے بچپن اور آج کی شام کے درمیان ربع صدی حائل ہوگئی تھی اور اس کے گاؤں اور اس ٹیکری میں کوسوں اور برسوں کا فاصلہ حائل ہوگیا تھا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ہاجرہ نے دل ہی دل میں فریاد کی ___ ''مجھے کشمیر نہیں چاہئے۔ مجھے میرا گاؤں لوٹا دو۔ وہ گھر دے دو مجھے جہاں ہر روز مسافر آتے تھے۔ میں ان کے منہ دھلاتی تھی، انہیں سبز پوش وادیوں میں سیر کو لے جاتی تھی.....'' ہاجرہ کو دھچکا سا لگا

اور اس کے خیالوں میں بھونچال آ گیا۔ اس کی افسردہ یادوں میں اضطراب موجیں مارنے لگا۔ اس نے سر کو جھٹک کر یادوں کی کڑیوں کی کو توڑ پھینکنا چاہا جو وادیوں کی سیر سے وابستہ تھیں مگر ذہن میں نقوش ابھرتے ہی چلے آئے۔

اسے یاد آیا کہ اس کے مکان میں آ کے رکنے والے مہمان (جنہیں وہ گاہک نہیں مہمان کہا کرتے تھے) اس کے ساتھ کس قدر بے لوث اور بے غرض سا پیار کرتے تھے۔ جیسے وہ ان کی اپنی بچی تھی۔ وہ اسے گودی بٹھاتے تھے، گالوں کو چھیڑتے تھے، گدگدی کرتے تھے اور وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو ہو جاتی تھی۔ اس کے ماں باپ اور دونوں بڑے بھائی بھی اس کے ساتھ گڑیا کی طرح کھیلا کرتے تھے، آہ! وقت کس طرح اُڑتا چلا گیا۔ وہ مہمانوں اور گھر والوں کے لاڈ پیار میں مگن رہی اور وقت و زمانہ ہوا کے جھونکوں کی طرح اس کے گھر کے قریب سے گذر گیا۔ ہاجرہ کو محسوس تک نہ ہوا کہ اس کی عمر کا پندرھواں برس بھی بیت چلا ہے۔ اس کا قد عمر سے بھی دو ہاتھ اوپر ہوگیا تھا مگر اس کا ذہن بچپن سے دستبردار نہ ہوا۔ اس کی عمر آگے بڑھ گئی مگر اس کا ذہن چھ سات برس سے ایک روز بھی آگے نہ بڑھا۔ اس کی باتوں میں بھولا پن، حرکتوں میں کمسنی، انداز کی سادگی اور بچپنے والی معصومیت نہ گئی۔ گھر والے ابھی تک اسے گڈی کہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو گڈی کے نام سے پہچانتی تھی۔ آخر ایک شام ایک اجنبی نے اسے ہلکے سے جھٹکے سے بچپن سے نکال دیا۔ وہ واردات اس کی زندگی کا حزنیہ تھی۔ ایک ہی سال پہلے ہاجرہ کے اصرار پر ماں باپ نے اسے چھوٹی سی کشتی بنوا دی تھی جو ایک آدھ میل پرے دور دور تک پھیلی ہوئی جھیل کے کنارے بندھی رہتی تھی۔ ہاجرہ مہمانوں کو کشتی کی سیر کی دعوت دیا کرتی تھی اور جو اس کے ساتھ جاتے تھے اسے ایک دو روپے دے دیتے تھے لیکن ہاجرہ کو روپے پیسے کے ساتھ چنداں دلچسپی نہیں تھی، ہاجرہ اسے کشتی میں بیٹھے جھیل کی نیلاہٹ میں روحانی سا لطف آتا تھا۔

ایک شام ایک جوان سال مسافر آیا۔ اسے رات بھر کے لیے ہی رکنا تھا لیکن رات ہاجرہ نے اپنے مخصوص انداز میں اس سے باتیں کیں تو اس نے آگے چلے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اگلی شام ہاجرہ اسے کشتی میں بٹھائے جھیل میں تیر رہی تھی۔ شام ہونے والی تھی جب کشتی کنارے لگی۔ اس وقت وہ آدمی اس کے ساتھ ایسی ایسی باتیں کرتا رہا تھا جو اس

کے ساتھ پہلے کسی نے نہیں کی تھیں۔ وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا تھا جن سے اسے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن ہاجرہ نے کچھ بھی محسوس نہ کیا تھا۔ اجنبی کی نگاہ میں وہ ہاجرہ تھی مگر ہاجرہ اپنی نگاہ میں گڈی تھی جو کوئی بھی الٹی سیدھی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔

گھر کو آتے وہ درختوں کے جھنڈ سے گزر رہے تھے۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہاجرہ اس سے پوچھ رہی تھی ــــ ''آپ کہتے ہیں آپ نے ابھی تک بیاہ نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا؟ اتنے بڑے تو ہو گئے ہیں آپ؟''

وہ بے ساختہ اس کے سامنے آ گے رک گیا اور اس کے کندھے کو تھام کے بولا ــــ ''تم ابھی تک نہیں سمجھی ہاجرہ؟ میں تمہارے ساتھ بیاہ کرنے آیا ہوں، میں تمہیں لینے آیا ہوں......'' اور اس نے ہاجرہ کو اس قدر اپنے قریب کر لیا کہ ہاجرہ کے ماتھے پر اُڑتے بال اس آدمی کے ہونٹوں کو چھونے لگے۔ اس نے ہاجرہ کی ٹھوڑی تھام کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو ہاجرہ کی سہمی ہوئی نظریں اس آدمی کی نظروں سے الجھ گئیں جن میں جذبات موجزن تھے۔ جب ہاجرہ کے گرد لپٹے ہوئے دو بازوؤں کا گھیرا تنگ تر ہوا تو اس کی ہستی کا وہ تار جھنجھنا اٹھا جسے پہلے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ ذہن کی جھولی سے بچپن کے موتی لڑھک کر اجنبی مرد کے سینے پر بکھر گئے۔ اس کے ریشمی بالوں میں رینگتی مضبوط انگلیوں نے اسے بچپن کی معصومیت سے نکال کر جوانی کے ہیجان میں پھینک دیا۔ معصوم سی لڑکی کی ہستی میں عورت بیدار ہو گئی۔ گڈی ایک ہی جھٹکے سے ہاجرہ بن گئی۔

ہاجرہ اپنے آپ میں نہ رہی۔ ساکن اور پُرسکون جھیل میں چٹان سا پتھر اتنی زور سے آ کر گرا کہ ننھی سی ناؤ ڈوب ڈوب کے ابھر رہی تھی۔ ہاجرہ اس آدمی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس پر زہریلا سا طلسم طاری ہو گیا تھا لیکن اس زہر کی تلخی میں ہلکی ہلکی شرینی بھی تھی۔

''یہ لو...... آؤ...... اور بھی دوں گا......'' ہاجرہ چونک اٹھی۔ وہ آدمی اسے دس دس کے دو نوٹ دے رہا تھا۔ اسے کلائی سے تھام کر جھاڑیوں کی اوٹ میں لیے جا رہا تھا۔

طلسم ٹوٹ گیا۔ ہاجرہ نے اپنے بازو کو ذرا سا مروڑا تو اس کی کلائی آزاد ہو گئی اور وہ چپ چاپ گھر کو چل دی۔ اس آدمی نے اسے آوازیں دیں تو ہاجرہ کا جسم لرزنے لگا اور وہ اور تیز چل پڑی، اور تیز، بہت ہی تیز۔ اس کے سینے میں چنگاری سی جو سلگی تھی وہ شعلہ بن

گئی۔

اس شام اس نے ہر روز کی طرح کسی مہمان کا بستر ٹھیک نہ کیا، نہ کسی کو کھانا دینے گئی۔ سر درد کے بہانے سرِ شام ہی لیٹ گئی مگر سو نہ سکی۔ رات بھر ذہن کے گوشے گوشے سے بگولے سے اٹھتے رہے اور اس کے احساسات اور جذبات کو اُڑا کر پٹختے رہے۔ گاہے ذہن ہُو حق سے ویران گھر کی طرح خالی ہو جاتا اور اس کی داخلی دنیا میں سکوت سا چھا جاتا پھر اسی سکوت سے آندھی اٹھتی اور ہاجرہ تنکے کی طرح اُڑنے لگتی۔ وہ بے بس سی ہو گئی اور اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے تڑپ کے چاہا کہ کسی کو پاس بٹھا کر پوچھے ــــ ''اس آدمی کے لمس میں کیا بات تھی کہ میرا سراپا کانپ اٹھا تھا؟ میرے گالوں کو تو سبھی چھوا کرتے ہیں۔ اس نے مجھے سینے سے بھینچا تھا تو میرے سینے میں آگ سی کیوں لگ گئی تھی؟ میں نے اس سے بازو چھڑا کیوں لیا تھا؟ بھاگ کیوں آئی تھی؟ میرا بازو تو کئی لوگوں نے پکڑا ہے۔ میرے بالوں کو تو کئی لوگوں نے چھیڑا ہے! مجھے آج رات نیند کیوں نہیں آ رہی؟ مجھے آج غصہ آ رہا ہے لیکن کس پہ؟ مگر جی چاہتا ہے کسی سے پیار کی باتیں کروں لیکن کس سے؟......''

وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ کوئی نہ تھا جس سے وہ پوچھتی۔ کوئی نہ تھا جو اس سے پوچھتا ــــ ''گڈی آج تم مہمانوں کے کمروں میں کیوں نہیں گئیں؟ کسی نے چھیڑا تو نہیں؟''

اسے اپنی ایک سہیلی رجو کا خیال آتے ہی اسے رجو کی وہ باتیں یاد آ گئیں جو اس نے اسے جھیل کے کنارے چوری چھپے سنائی تھیں۔ ہاجرہ کے ذہن میں رجو کی شرمیلی اور جذباتی سرگوشیاں گونجنے لگیں...... اور سن ہاجرہ! بڑے مزے کی بات۔ یہ مرد شیطان ہوتے ہیں۔ شادی کے آٹھ دس روز بعد میں بھینس کو گھر لا رہی تھی تو وہ رستے میں ہی مل گیا اور لگا چھیڑنے۔ میں نے کہا ــــ ''ہٹو پرے۔ رات کو بھی جگائے رکھتے ہو اور دن کو بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں نے کلائی چھڑا لی تو اس نے مجھے سینے سے لگا کر اتنی زور سے دبایا کہ سچی ہاجرہ!''

ہاجرہ کے ذہن میں رجو کی سرگوشیاں یکبارگی تھم گئیں اور ایسا زلزلہ آیا کہ اس کا سراپا تھرتھر کانپنے لگا۔ اس کا بچپن پھسل کر رات کے مضطرب اندھیرے میں گرا اور چکنا چُور ہو گیا۔ کسی آواز نے جو شاید اس کے اپنے دل کی آواز تھی یا شاید یہ بھی رجو کی سرگوشی تھی

اسے کہا۔۔۔ ''تم اب بچی نہیں ہو ہاجرہ! تم عورت ہو۔ مرد بڑے شیطان ہوتے ہیں۔ راہ میں روک لیتے ہیں۔ تم منزل ہو ہاجرہ جہاں اب جانے کتنے بھولے بھٹکے، پیاسے مسافر آیا کریں گے......'' ہاجرہ بے تاب ہو کے اٹھ بیٹھی اور کشمیر پہ چھائے ہوئے اندھیرے خلاؤں میں تکنے لگی۔

اس کی نظروں کے سامنے سے وہ تمام مہمان آہستہ آہستہ گزرنے لگے جو اس کے ہاں چند گھنٹوں چند دنوں یا چند ہفتوں کے لئے ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلا کرتی تھی مگر آج رات ہر مہمان کی صورت اس آدمی سے ملتی جلتی تھی جسے وہ اس شام کشتی کی سیر کو لے گئی تھی۔ جن نظروں میں وہ بھائی اور باپ کا پیار دیکھا کرتی تھی آج ان میں تشنگی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ رجو بن گئی ہے اور ہر مہمان اس کا خاوند ہے۔

اسے گاؤں کے ہر اس آدمی خیال آیا جو اسے چھیڑا کرتا تھا۔ وہ کس بے تکلفی سے ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی مگر آج رات کی تیرہ و تار تہوں نے اس حقیقت سے پردے اٹھا دیے جسے آج تک اس نے قبول نہیں کیا تھا۔

ایسے میں اسے اپنے پیر جی یاد آ گئے۔ اسے خیال آیا کہ وہ بھی اسے گود میں بٹھا کر پیار کیا کرتے ہیں۔ اس کے گالوں کو بڑی زور زور سے چوما کرتے ہیں اور پیر جی کی بھوری بھوری داڑھی اسے اچھی لگا کرتی ہے۔ ''اوہ!''...... ہاجرہ کو شدید دھچکا لگا۔۔۔ ''کیا پیر جی بھی؟...... نہیں!...... وہ تو یا پیر دستگیر ہیں۔ خدا کے بعد پیر جی کا ہی درجہ ہے۔ ان کی روح تو عرش پر ہوتی ہے، میں ان کے پاؤں کی خاک ہوں، بچی سمجھ کر چھیڑ لیتے ہیں''۔۔۔ ہاجرہ کا ہاتھ آپ ہی آپ اس کے گلے میں لٹکے ہوئے تعویذ تک جا پہنچا۔ دوسرے لمحے تعویذ ہاجرہ کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ یہ تعویذ پیر جی نے چالیس روز کا چلہ کاٹ کر اس کے لیے لکھا تھا اور اپنے ہاتھوں اس کے گلے میں ڈال کر اس کی سپیدی مائل گلابی گردن کو وارفتگی سے چوم لیا تھا۔۔۔ ''اب ہماری گڈی بھوت پریت، جن چڑیل، پکڑ گھوٹ، آسیب، سائے اور ہر طرح کے شر شرار سے محفوظ رہے گی''۔۔۔ اس نے ایک بار پیر جی سے ایک شکارے کی دعا کرائی تھی تو ماں باپ نے اسے شکارا بنا دیا تھا۔ انہی گرمیوں میں اس نے پیر جی کو کہا تھا۔۔۔ ''یا پیر اس سال اتنے مہمان آئیں کہ ہمارا گھر پیسوں سے بھر جائے''۔۔۔ اور اس سال اتنے مہمان آئے تھے کہ ہاجرہ کے ماں باپ کو اپنا کمرہ بھی خالی کرنا پڑا۔

پیر جی کے نام پر ہاجرہ نے اپنی انگلیاں چوم لیں اور اسے سکون سا محسوس ہونے لگا جس طوفان کی لپیٹ میں وہ آ گئی تھی اس کا زور تھمنے لگا اور رات گزر گئی۔

''ہاجو بیٹا!''۔۔۔ صبح ماں نے اسے کہا۔۔۔ ''جاؤ تو ذرا جو مہمان جاگ اٹھے ہیں انہیں ناشتہ دے آؤ''۔

''نہ ماں جی!''۔۔۔ ہاجرہ ایسے لہجے میں بولی جس میں کل تک والا بچپن نہیں تھا۔۔۔ ''میں اب جوان ہو گئی ہوں نا! مجھے اب مردوں میں نہیں جانا چاہئے''۔

اس نے مردوں میں جانا چھوڑ دیا اور اسے مردوں سے ڈر آنے لگا۔ وہ تو اس کے ذہن میں ڈراؤنا سا نقش بن گیا جس نے اسے درختوں کے جھنڈ میں روک کر جوان کر دیا تھا۔

آج شام دس برس بعد ہاجرہ اپنے گاؤں سے کوسوں دور اس بے آب و گیاہ ٹیکری پر بیٹھی تصور کی نگاہوں سے کوسوں کے فاصلے طے کر رہی تھی اور وقت و زمانہ کے گئے گزرے لمحوں کو کرید رہی تھی۔

وہ چونک اٹھی۔ سورج ڈوب چلا تھا۔ وہ ٹیکری سے اٹھی اور گھوم کے دیکھا۔ اسے پنگھٹ پر اپنا گھڑا پڑا دکھائی دے رہا تھا اور وہ گاؤں بھی جہاں وہ اب ماں باپ اور بھائیوں سمیت پناہ گزیں تھی۔ چند ہی برس گزرے انہوں نے یہاں آ پناہ لی تھی۔

دس برس پہلے وہ رات کس قدر خوفناک تھی۔ الٹی سیدھی خبریں تو انہیں ملنے ہی لگی تھیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا مہاراجہ ان کی سرزمین کا سودا کر رہا ہے لیکن ہاجرہ کو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ اس سے اس کا گاؤں بھی اور دیس بھی چھن جائے گا، لیکن اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہندوستانی فوجیں اس کے گاؤں سے چند ہی میل دور پڑاؤ ڈال چکی ہیں۔ ان گرمیوں میں ان کے ہاں ایک بھی مہمان نہ آیا تھا۔ تینوں کمرے سُونے پڑے رہے تھے۔ انہی گرمیوں کی ایک رات تھی کہ ہاجرہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ہر طرف زرد پیلی روشنی اور دھواں پھیل رہا تھا۔ انسانوں کی چیخوں، گولیوں کے دھماکوں اور آگ کے شعلوں نے مل جل کر رات پر ہیبت طاری کر دی تھی۔

ہاجرہ نے اس تلخ یاد کو اُگل دینا چاہا۔ وہ اس وقت کی یاد سے لرز اٹھی جب وہ اس قیامت کی رات گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اسے ماں باپ اور بھائیوں کی دور بھاگتی آوازیں

سنائی دے رہی تھیں —— ''ہاجرہ! بھاگ آؤ...... ہاجرہ! بھاگ آؤ'' —— مگر وہ دم بخود قیامت کے ہنگامے میں کھڑی تھی جیسے اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بڑے بھائیوں کی آوازیں جلتی وادیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

ہاجرہ کمرے کے وسط میں گم صم کھڑی تھی۔ فوجی بوٹوں کے بھاگتے دھاکوں نے اسے چونکا دیا۔ بہت سے فوجی بھاگتے آگے نکل گئے مگر ایک بوٹوں کی آوازیں اس کے کمرے میں گھس آئیں۔ ہاجرہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں تیز روشنی سے خیرہ ہو گئیں۔ اس پر ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پھر روشنی اور بوٹوں کی آواز اس کی طرف بڑھنے لگیں اور وہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں لالٹین جل رہی تھی۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے دبوچ کر چارپائی پر پٹخ دیا۔ اس نے دیکھا ایک ہٹا کٹا فوجی رائفل پر سنگین چڑھائے اس کے پاس کھڑا ہنس رہا تھا۔ ہاجرہ کی چیخ نکل گئی۔ جو کمرے میں ہی بھٹک کے بجھ گئی۔

فوجی آگے بڑھا تو ہاجرہ اٹھ بیٹھی اور اس نے دل ہی دل میں فریاد کی —— ''یا دستگیر! پیروں کے پیر! تیرا ہی آسرا!'' اس کی ڈھکی چھپی قوتیں بیدار ہو گئیں اور وہ فوجی ڈوگرے سے الجھ گئی اور یہ تو اسے آج بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ رائفل سے سنگین کس طرح گر پڑی تھی جسے ہاجرہ نے لپک کر اٹھا لیا تھا۔ اسے اسی قدر یاد تھا کہ ڈوگرے کے دانت اس کے گول گول سے گالوں میں اترتے جا رہے تھے اور وہ اس کے قوی ہیکل جسم کے بوجھ تلے دب گئی تھی مگر فوجی تڑپ کے فرش پر جا پڑا تھا۔ ہاجرہ نے سنگین اس کے دل کے پار کر دی تھی اور سنگین کو نکالا نہیں تھا۔

آج دس برس بعد اسے وہ منظر یاد آیا تو وہ خوف سے اپنے آپ میں سکڑنے لگی۔ فوجی فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو آ رہے تھے، مگر آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ منہ کھل گیا تھا۔ چہرے پر درد کا مکروہ سا تاثر تھا۔ لاش نے دل میں اتری ہوئی سنگین کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور انگلیاں سنگین کے گرد اکڑ گئی تھیں۔ گہرا لال خون دہلیز تک جا پہنچا تھا۔

ہاجرہ کا دل پسلیاں توڑ رہا تھا۔ خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔ وہ رونے بھی لگی

تھی۔ باہر انسانی چیخوں اور آگ کی تڑاخ تڑاخ کا ہولناک شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اب چھپنے کی جگہیں تلاش کرنے لگی مگر وہاں کوئی پناہ محفوظ نہیں تھی۔ اسے مرے ہوئے ڈوگرے کی لاش سے ڈر آ رہا تھا جیسے لاش اٹھ کر اسے دبوچ لے گی۔

ایسے میں اسے بھائی یاد آئے جو بھاگ گئے تھے۔ باپ کا خیال آیا وہ بھی بھاگ گیا۔ اسے وہ مرد یاد آئے جو اس سے پیار کیا کرتے تھے۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں بھی اسے گودی میں بٹھا لیا کرتے تھے۔ مگر آج سبھی مرد گودیاں سمیٹ کر جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ اسے مردوں کے تصور سے ہی گھن آنے لگی۔ خوف کے ساتھ نفرت شامل ہو گئی اور اس نے مردوں کو ذہن سے اگل دیا مگر ایک مرد کا تصور اس کے ذہن میں زندہ رہا۔ وہ تصور تھا اس کے پیر جی کا جنہیں اس نے پکارا تھا تو ڈوگرے کی سنگین ڈوگرے کے ہی سینے میں اتر گئی تھی۔

اس نے تصوروں میں پیر جی کے پاؤں چھوئے اور ان کی بھوری جواں داڑھی کو چوما۔ اسے ایسا سکون محسوس ہوا جو اس کی روح تک اتر گیا۔ خوف نہ رہا، ہیبت نہ رہی اور اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وہ پیر جی کے قدموں میں جا گرے گی، جہاں کہیں بھی وہ مل گئے اور تمام عمر ان کے قدموں میں گزار دے گی۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ اگر پیر جی نے قبول کیا تو وہ اپنی کی بیوی بن جائے گی ورنہ کسی اور مرد سے بیاہ نہ کرے گی۔ عمر یوں ہی گزار دے گی۔ اسے معلوم تھا کہ پیر جی کی پہلے ہی دو بیویاں ہیں لیکن وہ اب انہی کے در کی جوگن بننا چاہتی تھی۔

آج شام اسے ٹیکری پہ کھڑے وہ رات یاد آ رہی تھی جب اس نے اپنی عفت کی حفاظت میں ایک ڈوگرے کو مار گرایا تھا اور باقی رات گھر سے بھاگ کر جھاڑیوں، کھائیوں، کھوہوں، اونچی نیچی اندھیری راہوں پہ چلتے، گرتے، اٹھتے، رینگتے، چھپتے، چھپاتے سرکتے گزار دی تھی۔ وہ اندھا دھند چلی جا رہی تھی۔ سمت کا اسے احساس نہ تھا، اسی قدر احساس تھا کہ وہ گاؤں کو جلتا چھوڑ آئی تھی اور ان لپکتے شعلوں نے اس کی روح اس کے پیار اس کے بچپن اور اس کے دل کو بھی بھسم کر ڈالا تھا۔ وہ اگر زندہ رہی تو کسی کو نہ چاہ سکے گی۔ کوئی اسے راہ میں روک کے چھیڑے گا تو اس کا جسم اس کے لیے برف کا تودہ ہو گا۔ اس کے دل و دماغ پر صرف پیر جی کے خیال کا تقدس طاری تھا۔ جن کے نام نے قیامت

کے وقت اس کی دستگیری کی تھی۔

اس کے گاؤں کے بچے کھچے بھاگے ہوئے لوگ دور نہیں گئے تھے۔ سورج بہت اوپر اٹھ آیا تھا۔ جب وہ پناہ گزینوں کے ایک قافلے سے جا ملی تھی۔ اسی قافلے میں اسے اپنی ماں باپ اور دونوں بھائی مل گئے جنہوں نے اسے سینوں سے لگایا، بلائیں لیں مگر ہاجرہ جذبات سے خالی تھی۔ بے حس۔ اس کے عزیز و اقارب برف کے تودے کو سینے سے لگا رہے تھے۔ اس کے گاؤں کے چند اور آدمیوں نے بھی ہاجرہ کو دیکھا تو اس کی طرف لپکے۔ کسی نے مبارک دی، کسی نے ہنس کے پیٹھ تھپکائی کوئی رو دیا مگر ہاجرہ کے احساسات کو مبارکبادیں، مسکراہٹیں اور آنسو ہلکی سی جنبش بھی نہ دے سکے۔

ہاجرہ نے ذرا بلندی پہ چلتے تمام قافلے پہ نگاہ ڈالی۔ ایک ایک چہرے کو دیکھا مگر اسے اپنے پیر جی کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ تو اب انہی چہرے کو تلاش کرنا چاہتی تھی۔

قافلہ کسی نامعلوم منزل کی جانب بڑھا جا رہا تھا۔ آخر طویل مسافت طے کرتے بھٹکے ہوئے راہی ایک منزل پر جا پہنچے لیکن ستانے بھی نہ پائے تھے کہ منزل بھٹکنے لگی۔ راہی بکھرنے لگے۔ راہیں جدا ہوگئیں۔ کوئی اس راہ چل پڑا کوئی اس راہ لگ گیا اور ہاجرہ کا کنبہ بھی خانہ بدوش ہو گیا۔ آخر پاؤں اور پیٹ کا چکر انہیں سرحد کے قریب اس گاؤں میں لے آیا جہاں آج شام ہاجرہ ٹیلے پہ کھڑی نگاہوں سے ان پہاڑوں کا سینہ چیر رہی تھی جن کی اوٹ میں اس کا گاؤں ہمیشہ کے لیے چھپ گیا تھا۔ اس گاؤں کی پناہ میں آئے انہیں سات آٹھ برس ہوگئے تھے۔ اس کے دونوں بھائی شہر میں کسی ہوٹل میں نوکر ہو گئے تھے وہ ہفتے کی شام گاؤں آتے اور اتوار کی شام لوٹ جاتے تھے۔ شہر میں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ گاؤں میں مفت کا مکان مل گیا تھا۔

اسی گاؤں میں تین اور مہاجر کشمیری کنبے بھی آن آباد ہوئے۔ باقی سارے کا سارا گاؤں پیشہ ور ڈاکوؤں، سمگلروں، بردہ فروشوں، مفرور ملزموں اور قیدیوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں تھا۔ یہ گاؤں شہر سے کوسوں دور اور سرحد سے دو ہاتھ پہ تھا۔ خطرے کے وقت جرائم پیشہ لوگ سرحد پار کر جاتے تھے۔ دن کے وقت گاؤں میں خاموشی طاری رہتی تھی اور رات کو اِن خاموشی سے پُراسرار سی ہماہمی ابھر آتی تھی۔ اس گاؤں میں بچے نہیں تھے نہ کوئی عورت تھی کبھی کبھی ایک دو عورتیں نظر آتی تھیں جو دو چار روز بعد جانے کہاں

غائب ہو جاتی تھیں اور ان کی جگہ ایک دو اور عورتیں آ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی گاؤں میں چوری کے بے شمار مویشی اور بھیڑیں بکریاں ہوتی تھیں اور چند روز بعد دو چار آدمی بڑی تیزی سے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر گلیوں سے گزر جاتے تھے۔ ان کی چال ڈھال میں ذرا اوناپن پایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی گھوڑے اور ٹٹوؤں کے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں، لیکن صبح کا اجالا نکھرنے سے پہلے ہی گلیاں پھر سنسان ہو جاتی تھیں بعض مکانوں پر تالے پڑ جاتے تھے، بعض کے دروازے آسیب زدہ مکانوں کی طرح کھلے رہتے تھے۔ تین کشمیری مہاجر خاندان اسی ویرانے کے ایک گوشے میں آباد تھے۔ وہ اکثر یقین کی حد تک محسوس کرتے کہ رات کو جوان گلیوں سے گزرتے ہیں وہ انسان نہیں جن بھوت ہوتے ہیں۔ وہ دم بخود ہو کے جی رہے تھے۔ وہ بے ضرر سے لوگ تھے انہیں کبھی کسی نہیں چھیڑا تھا۔ گاؤں والوں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وہ گاؤں کی کوئی بات کسی سے نہ کریں۔ وہ تو حالات کے کچلے ہوئے لوگ تھے، ان میں بھلا کہاں اتنی ہمت تھی کہ کسی کی راہ میں آتے۔

یہ گاؤں تین چار بار مورچہ بھی بنا تھا۔ رات بھر گولیاں چلتی رہی تھیں اور پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کیے رکھا تھا۔ پہلی بار تو ہاجرہ مارے خوف کے چارپائی کے نیچے چھپ گئی تھی۔ وہ ہر لمحہ اس ڈوگرے کی منتظر تھی جو رائفل پہ سنگین چڑھائے اسے دبوچ لینے کو آ رہا تھا لیکن وہ نہ آیا۔ صبح ہوئی تو بارڈر پولیس کے سپاہی آئے، سب کے گھروں کی تلاشی لی۔ کئی زخمی کراہ رہے تھے۔ پولیس نے انہیں گرفتار کیا اور گاؤں سے بے شمار گٹھڑیاں اور صندوق ساتھ لے گئی۔ یہ سب سمگل کیا ہوا یا لوٹا ہوا مال تھا لیکن یہ ہنگامے چھ سات برسوں میں تین چار بار ہی ہوئے تھے اور قانون شکنوں کی بادشاہی قائم رہی۔ پولیس شاید تھک ہار کے چپ ہوگئی تھی۔

یہ چھ سات برس ہاجرہ پر خاموشی سی طاری رہی۔ ہونٹ مسکراہٹ سے بیگانہ رہے۔ وہ اکثر خلاؤں میں کھوئی رہتی تھی اور اس کے سینے میں مردوں کے خلاف نفرت پرورش پا رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائیوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے لیے دو رشتے تلاش کیے۔ مگر ہاجرہ نے ایک بھی قبول نہ کیا۔ اس نے شدت سے انکار اور احتجاج کیا۔ ماں باپ تو چپ ہو گئے لیکن بھائی چین سے نہ بیٹھ سکے۔ ایک رات وہ شہر سے آئے تو ایک

بھائی نے ہاجرہ کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔۔۔ "اگلے اتوار تمہارا بیاہ ہو رہا ہے۔ عزت والے لوگ لڑکیوں سے نہیں پوچھا کرتے خبردار جواب کے انکار کیا تو......" لیکن ہاجرہ نے پہلے سے زیادہ شدت سے انکار کیا۔ دونوں بھائی اس پر ٹوٹ پڑے اور اور اسے بیدردی سے پیٹ ڈالا۔

اور ہاجرہ کے دل میں مرد کے خلاف نفرت اور زیادہ گہری ہو گئی۔ اگلا اتوار آیا اور گزر گیا۔ پھر کئی اتوار آئے اور گزر گئے لیکن نہ بارات آئی نہ ڈولی گئی۔ ہاجرہ کا دل کسی مرد کو قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ وہ روز بروز خود فراموش ہوتی چلی جا رہی تھی لیکن پچھلے ایک سال سے اس کے احساسات اور جذبات میں کچھ ایسی تبدیلیاں آنے لگی تھیں کہ وہ اپنے لئے سراپا معمہ بن گئی۔ کبھی تو اسے اپنا ہی سراپا اپنے آپ کو اجنبی لگتا جیسے اپنے آپ کو جانتی پہچانتی ہی نہیں۔ اس کے خیالات بھی بھٹک چلے تھے اور بے قراری بڑھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو چلتے چلتے رک جاتی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی پھر اپنی ہی آواز سے چونک کر گھبرا جاتی۔ اس نے اس ذہنی خلفشار سے سمجھوتہ کر لینے کے بہت جتن کیے لیکن کڑیاں جوڑ جاتی تھیں ہلکے سے جھٹکے سے پھر ٹوٹ جاتیں۔

ایک بار اس نے یوں بھی سوچا شاید اسے شادی کر ہی لینی چاہئے۔ رات کو تنہائی میں اس نے اپنے آپ پر خیالوں ہی خیالوں میں دلہن کا روپ چڑھایا مگر اس کے سامنے مرد کا تصور آیا تو وہ سہم گئی۔ مرد کی صورت بڑی ہی ڈراؤنی تھی۔ آنکھیں پتھرائی ہوئیں، منہ کھلا ہوا۔ چہرے پر درد کا مکروہ تاثر اور سنگیں دل میں اتری ہوئی، بے حس اور ہیبت ناک لاش۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنے ہونے والے خاوند کے تصور کو از سر نو آراستہ کیا۔ ایک جواں سال مرد، چوڑے چکلے سینے والا، بھرا بھرا چہرہ۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مرد مردوں کا ہجوم بن گیا۔ ہر طرف شعلے بھڑکنے لگے، ہجوم بھاگ گیا اور وہ شعلوں کے نرغے میں اکیلی رہ گئی۔

ہاجرہ نے دانت پیس لیے۔۔۔ "بزدل ہیجڑے گیدڑ"۔۔۔ اور اس نے منہ پرے کر کے تھوک کر ڈالا پھر اسے وہ مرد یاد آیا جس نے اس درختوں کے جھنڈ میں روک کر اس سے بچپن چھین لیا تھا۔ نفرت اور گہری ہو گئی۔

نفرت بڑھتی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اب تنہائی کا احساس ہونے لگا جو روز بروز تلخ تر ہوتا چلا گیا۔ اب تو کبھی کبھی وہ سوتے میں بولنے لگتی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی پھر

اندھیرے خلاؤں میں تکنے لگتی۔ ایسے میں اسے پیر جی یاد آتے اور بے اختیار یاد آتے۔ اس کے دل میں یہ ارادہ اور مضبوط ہو جاتا کہ وہ پیر جی کو ہی خاوند بنائے گی ورنہ عمر یونہی گزار دے گی۔

آج کی شام جو اس کی عمر کے اٹھائیسویں برس کی ایک شام تھی وہ گاؤں کے قریب ٹیکری پہ بیٹھی خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھوگئی تھی۔ آج تو دل زیادہ ہی اکھڑ گیا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔ آج نہیں تو کل پاگل ہو جائے گی۔ رات اس نے پیر جی کو خواب میں دیکھا تھا۔ مگر خواب ادھورا ہی رہا تھا۔ صبح ہوئی تو پہلے سے زیادہ بے چین تھی۔ وہ تمام دن بے چین رہی تھی۔ اب شام کے وقت بھی بے چین تھی۔

اس نے آنسو پونچھے۔ ٹیکری سے اتری۔ گھڑا اٹھایا گھر آئی تو دیئے جل چکے تھے۔ رات کا پہلا پہر ختم ہوا ہی تھا کہ دور کہیں بندوق کی تین چار گولیاں چلیں۔ پولیس کسی ڈاکو یا سمگلر کا تعاقب کر رہی تھی۔

گولیاں اور بھاگتے قدم تھوڑی ہی دیر بعد گاؤں میں آ پہنچے۔ ہاجرہ کے گھر کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ وہ صحن کو دو چار چھلانگوں میں عبور کر کے کمرے میں جا گھسا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہاجرہ اور اس کی ماں سہم گئیں۔ کچھ سمجھ نہ پائیں کہ کیا کریں کہ ان کے کھلے دروازے سے بارڈر پولیس کے چار پانچ سپاہی اندر آئے اور صحن میں بکھر گئے۔ ماں نے بھاگ کر لالٹین جلائی اور بے ساختہ بولی۔۔۔ "وہ اندر گھس گیا ہے۔ ابھی ابھی آیا تھا"۔

سپاہیوں نے دروازہ کھلوالیا اور اندر گئے۔ دوسرے لمحے وہ اس آدمی کو گھسیٹ کر باہر لائے۔ اس کے ایک بازو اور ٹانگ سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ وہ صحن میں گر پڑا اور سپاہی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ہاجرہ نے لالٹین کی روشنی میں اسے دیکھا تو اسے پہلے تو یقین نہ آیا۔ اس نے لالٹین کو اور قریب کیا اور چہرے کو اور قریب سے دیکھا۔ لال گلابی چہرہ جو اس قدر خون بہہ جانے سے بھی لال ہی تھا، بھورے رنگ کی پرنور داڑھی قرینے سے تراشی ہوئی۔ ہاجرہ کی چیخ نکل گئی اور وہ چلا کر بولی۔۔۔ "یا پیر دستگیر"۔۔۔ وہ اس کے پیر جی تھے۔

ہاجرہ زخمی شیرنی کی طرح اٹھی اور سپاہیوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا لیکن اس کا قہر

بجھ کے رہ گیا۔ سپاہی قہقہے لگا کے ہنس رہے تھے۔ ایک نے کہا۔۔۔ ''پیر جی سے تعویذ لکھوا لو ورنہ دو چار ماہ بعد پھانسی چڑھ جائیں گے پھر کیا کرو گی؟''

''پھانسی؟''

''ہاں پھانسی!''۔۔۔ دوسرا سپاہی بولا۔۔۔ ''یہ ڈاکو ہے۔ نامی ڈکیت۔ اس علاقے میں اس نے قیامت بپا کر رکھی ہے۔ عورتوں کو زبردستی اٹھا لے جاتا ہے اور سرحد پار بیچ آتا ہے۔ آج پہلی بار ہمارے ہاتھ لگا ہے۔ پانچ کوس دور اس کے گروہ نے آج رات ڈاکہ ڈالا ہے۔ ایک لڑکی کو یہ گولی مار آئے ہیں، تین چار کو زخمی کیا ہے۔ اس کے باقی ساتھی ادھر اُدھر بھاگ گئے ہیں''۔۔۔ سپاہی نے زمین پہ پڑے پیر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور پوچھا۔۔۔ ''کیوں پیر جی! ہم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟''

''تم نے بازی جیت لی دوستو!''۔۔۔ پیر کی مریل سی آواز سنائی دی۔ وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوا۔ ''ایک گھونٹ پانی تو پلا دو ہاجرہ!''

لیکن ہاجرہ کو چکر آ گیا تھا اور وہ چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔ اس نے منہ پرے پھیر لیا۔

اگلی صبح وہاں پیر تھا، نہ سپاہی، پیر کا جما ہوا خون ہاجرہ کے آنگن میں پڑا تھا جسے ہاجرہ نے غلاظت کی طرح کھرچ کھرچ کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ اس کا سینہ تلخیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ دل و دماغ میں بچھو ڈنک مارنے لگے۔ اس نے مشکل کے ہر لمحے پیر جی کا سہارا لیا تھا اور پیر جی کے تصور نے تنہائیوں میں اس کا ساتھ دیا تھا مگر وہ تصور بھی چھن گیا۔ ساتھ بھی چھن گیا۔ اس کے تصوروں کا مثالی مرد بھی ڈکیت اور عصمتوں کا بیوپاری نکلا۔

وہ ہفتے کی شام تھی۔ اس کے دونوں بھائی اتوار کی چھٹی منانے گھر آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ صحن میں بیٹھے تھے کہ دروازہ کھلا اور چار آدمی چہروں پہ صافے لپیٹے ہوئے اندر آئے۔

''رات ہمارے استاد کو تم نے پکڑوایا تھا!''۔۔۔ ایک نے کہا۔

''نہیں تو۔۔۔'' ہاجرہ کی ماں نے ڈری سی زبان میں کہا۔۔۔ ''پولیس اس کے پیچھے ہی آ گئی تھی''۔

''تم بکواس کرتی ہو''۔۔۔ ایک اور گرج کر بولا۔۔۔ ''ہماری بادشاہی میں رہ کے ہماری جڑیں کاٹتی ہو؟''

پیشتر اس کے کہ ہاجرہ کے بھائی دخل اندازی کرتے دو آدمیوں نے بڑھ کر ہاجرہ کو دبوچ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس کا باپ اور بھائی پیچھے دوڑے لیکن ایک آدمی نے پستول نکال لیا اور بھائی وہیں رک گئے۔

وہ آدمی ہاجرہ کو کھینچے لئے جا رہے تھے۔ ہاجرہ اور اس کی ماں کی چیخوں سے گاؤں کانپ رہا تھا۔ کئی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کشمیری مہاجر کواڑوں کی اوٹ میں چھپے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ہاجرہ کو چھڑانے کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ وہ سب چور اچکے اور سمگلر تھے۔ وہ ایک دوسرے کی راہ میں نہیں آیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے تعاون اور پشت پناہی پر ہی زندہ تھے۔

جب وہ لوگ ہاجرہ کو گھسیٹتے گاؤں کے وسط میں بڑے درخت تلے پہنچے تو ایک آدمی ان کے سامنے آ گیا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ادھیڑ عمر آدمی تھا، تراشی ہوئی نصف انچ داڑھی، چہرے پر جلال سا تھا اور آنکھوں میں انوکھی سی چمک۔ ہاجرہ نے اسے گاؤں میں صرف ایک ہی بار دیکھا تھا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ وہ رہزنی کا ماہر ہے۔ راتوں کو شہروں کے قرب و جوار میں گھومتا رہتا ہے اور دن کے وقت روپوش رہتا ہے۔ اس گاؤں میں آئے اسے چند دن ہی ہوئے تھے۔

''چھوڑ دو اسے!''۔۔۔ اس نے ان آدمیوں کو روک کر تحمل سے کہا۔

ایک آدمی نے بڑھ کر اس کے پہلو پہ پستول رکھ دیا بولا۔۔۔ ''راہ چھوڑ دو جامی!''۔۔۔ اس کا نام جامی تھا۔

''اسے چھوڑ دو''۔۔۔ جامی نے پستول کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

دو آدمی اس پر لپکے تو جامی نے پستول والے کے منہ پر ایسا گھونسہ جمایا کہ وہ آدمی دور پیچھے جا گرا اور پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جامی ایک ہی جست میں پستول تک پہنچا اور پستول اٹھا لیا۔ جس آدمی نے ہاجرہ کو کلائی سے پکڑ رکھا تھا اس نے بھی ریوالور نکال لیا اور یکے بعد دیگرے جامی پر دو گولیاں چلائیں لیکن دونوں گولیاں خطا گئیں۔ ہاجرہ نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی ریوالور والی کلائی پہ دانت گاڑھ دیئے۔ جامی نے اچھل کر اس آدمی کے پیٹ میں ایسی لات جمائی کہ ریوالور ایک طرف اور آدمی دور جا پڑا۔

باقی دو آدمیوں نے خنجر نکالے اور جامی پر حملہ آور ہوئے۔ جامی نے دونوں پستول

اپنی پاجامہ نما پتلون کی جیب میں ڈال لئے اور ان دونوں آدمیوں کو گھونسوں اور سر کی ٹکروں سے بے ہوش کر دیا۔ پہلے دو آدمی اٹھے تو جامی نے انہیں بھی گرا دیا۔ گاؤں کے لوگ ابھی تک تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جامی نے چاروں طرف دیکھا اور للکار کر بولا ـــ ''ہے کوئی اور حمایتی ان کا؟''

کوئی جواب نہ ملا۔ جانے کس نے کہا ـــ ''مان لیا استاد جامی! انہیں معلوم نہیں تھا تم آج یہاں ہو''۔

جامی نے ہاجرہ کو بازو سے پکڑا اور اس کے گھر پہنچا آیا۔ اس نے کہا ـــ ''اب تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا''۔

رات ماں باپ اور بھائیوں نے ہاجرہ کو ہاتھ جوڑ کے کہا ـــ ''خدا کے لیے شادی کر لو۔ جوان لڑکی کو گھر بٹھائے رکھنا سو خطرے مول لینے والی بات ہے کم از کم تم تو محفوظ ہو جاؤ''۔

ہاجرہ نے اب کے انکار نہ کیا۔ وہ گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ گھر کے تمام لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ گاؤں میں ہلکی ہلکی سی گرمی کا گماں ہوتا تھا۔ ہاجرہ جاگ رہی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ دبے پاؤں، چھپتی چھپاتی، گلیوں سے گزرتی وہ کچے سے ایک مکان کے باہر جا رکی۔ کواڑوں پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ صحن سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اندر چلی گئی۔ جامی صحن میں سویا ہوا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔

ہاجرہ کچھ دیر سوئے ہوئے جامی کے سرہانے کھڑی رہی پھر اس پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں سے رکے ہوئے دو آنسو بہہ نکلے جو جامی کے گالوں پہ جا پڑے۔ جامی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اچک کر اٹھا اور تیزی سے سرہانے تلے سے ریوالور نکال کر بولا ـــ ''کون ہو؟''

''ہاجرہ ہوں'' ـــ ہاجرہ نے سسکی سی لی اور دھڑام سے اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''تم؟'' ـــ جامی نے پوچھا ـــ ''کیوں آئی ہو یہاں؟''

وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''اپنے پیر کی پوجا کرنے!'' ـــ ہاجرہ نے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا۔

''میں تو ڈاکو ہوں لڑکی!'' ـــ جامی ہنس کے بولا ـــ ''رہزن، چور...... جاؤ پگلی لڑکی! چلی جاؤ''۔

''وہ بھی ڈاکو ہی تھا...... چور، رہزن!'' ـــ ہاجرہ نے آہستگی سے کہا اور گلے میں لٹکتے ہوئے تعویذ کو مٹھی میں پکڑ کے زور سے جھٹکا دیا۔ مضبوط دھاگہ تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ ہاجرہ نے تعویذ دور پرے پھینک دیا اور بے بس ہو کے سر جامی کی آغوش میں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر سر اٹھا کے پاگلوں کی طرح بولی ـــ ''میں نے قسم کھائی تھی شادی کروں گی تو اپنے پیر سے ورنہ عمریوں ہی گزار دوں گی۔ تم ہو میرے پیر، تم میرے مرشد ہو۔ کہو تم مجھے بیاہ لے جاؤ گے جامی! دل انگارے کی طرح جل رہا ہے۔ میں پاگل ہوں، میں سودائی ہوں......''

جامی نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور ہاجرہ نے سکون کی طویل آہ لی جیسے تھکا ماندہ راہرو منزل پر آ گرا ہو۔

⌘ ⌘ ⌘

رات کا بھید

حمیدی

حمیدی

گاؤں میں بھونچال آگیا۔ گائے نے کرہ ارض ایک سینگ سے دوسرے پر رکھ لیا۔ مٹی کی دیواروں کا لیپ اور اس پر چپکے ہوئے اُپلے جیسے لرز لرز کر اکھڑنے لگے۔ پنگھٹ پہ عرشو نائن سر پر دو گھڑے رکھے یوں رک کے دم بخود ہوگئی جیسے وقت و زمانہ ایک مقام پر کھڑے کانپ رہے ہوں۔ عورتیں پنگھٹ پر گھڑوں کی طرح جڑ کے بیٹھ گئیں۔ دو طرف دیکھا۔ نگاہیں گھڑوں سے کہیں زیادہ شدت سے ٹکرائیں لیکن فضا میں کچھ ایسی سنسنی تھی کہ نگاہیں ٹکرا کے گھوم گئیں۔

گاؤں کے چھ سات مرد لرزتے پیپل کے پھٹے پھٹے سائے تلے سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔ دو چار گاؤں کے جوہڑ کے کنارے رکے کھڑے تھے اور جو کہیں کھڑے تھے نہ بیٹھے تھے وہ کسی کے پاس کھڑے ہونے یا بیٹھنے کو بھاگ رہے تھے۔ اکبر شاد کا مقبرہ ابھرتے سورج کو اپنی اوٹ میں چھپائے ہمیشہ کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ گھر گھر سے دھوئیں جو اٹھ رہے تھے وہ بھی سہمے سہمے سے تھے۔

ڈاک خانے کا ہرکارہ جو پانچ میل دور قصبے کے ڈاک خانے سے ہر صبح خط بانٹنے آتا تھا گاؤں میں دو تین خط تقسیم کر چکا تھا، پڑھ کے سنا بھی چکا تھا، کسی گھر سے دو چار انڈے، کہیں سے مکئی کے چند بھٹے، باجرے کے دو مٹھی دانے اور پوٹلی بھر گڑ لے کر دوسرے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی لاٹھی کے ساتھ بندھے گھنگھروؤں کے چھنا کے گاؤں کی کھسر پھسر میں تحلیل ہو چکے تھے۔ گاؤں کی کچی پکی منڈیروں پر پُراسرار سے سائے رینگ رہے تھے۔ ہر گھر، ہر گلی کی نکڑ سے پیپل کی چھاؤں سے، جوہڑ کے گدلے پانی کے کنارے سے، آسمان اور زمین سے ایک ہی جیسی آوازیں اٹھ رہی تھیں:

''سنا تم نے؟''

''سنا تو ہے، سچ ہے یا کسی نے اُڑا دی ہے؟''

''سچ ہے بھئی بالکل سچ!''

نہیں تو، بتا تو سہی!''

''فضل داد کے بیٹے نے شہر میں شادی کر لی ہے''۔

''فضل داد کے بیٹے نے؟''

''ہاں! اشرف نے!''

''شہر میں!''

''ہاں شہر میں!''

''شادی کر لی ہے؟''

''استغفر اللہ''۔

''قیامت کی نشانیاں ہیں...... اب آئی کہ آئی''۔

جس نے سنا، یوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا جیسے زمین بڑی زور سے کانپ اٹھی ہو!

''بے چارہ فضل داد!''

''ایسی اولاد سے بے اولا بھلے''۔

ہرکارہ تو ہر روز کے سرکاری چکر پر آتا تھا لیکن ایسا خط دے گیا کہ فضل داد کے گھر کے علاوہ سارے گاؤں کو بنیادوں تک ہلا گیا۔ اب تو ہرکارہ ایک عرصے سے اچھی اچھی خبریں لانے لگا تھا۔ جنگ کبھی کی ختم ہو چکی تھی لیکن آج ہرکارے کی لاٹھی کے گھنگھرو اور قدموں کی گرد گاؤں میں جنگ کی ہولناک یادوں کو تازہ کر گئی۔ کس قدر ہیبت ناک زمانہ تھا...... چند ہی برس پہلے...... جب بے رحم دیوتاؤں نے زمین کا گولا جنگ کے تنور میں پھینک دیا تھا اور خود فضاؤں میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔

ہرکارے کی بظاہر بے ضر لاٹھی ٹھک چھنن ٹھک چھنن کی تال پر گاؤں میں داخل ہوا کرتی تھی تو ماؤں کے سینے دہل جاتے تھے۔ مامتا کچے پودے کی طرح تھر تھر کانپنے لگتی تھی۔ بڑے بوڑھوں کے دلوں کی دھڑکنیں سہم جاتی تھیں۔ پنگھٹ پر الہڑ جوانیاں یوں ایک

دوسری کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیتی تھیں جیسے ہر آنکھ نے ایک ایک بھید چھپا لیا ہو،...... لذت آگیں، ڈرا ہوا، سہا ہوا بھید...... اور ہر بھید کو کسی توپ کے گولے یا دستی بم یا ہوائی جہاز کے بم نے پرزے پرزے کر کے برما کے نمناک جنگلوں میں، اٹلی کی پتھریلی زمین میں یا لیبیا کے ریگزاروں میں ہمیشہ کے لیے چھپا لیا ہو اور گاؤں کی بے گناہ آہیں اور معصوم فریادیں ریت کے ذروں اور بارود کے دھوئیں سے گاؤں کے گبھروؤں کے خون کے قطروں کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔

ہرکارہ جب گاؤں میں آیا کرتا تھا تو ہر کوئی دل ہی دل میں دعا کرتا تھا—— ''یا خدا ہرکارہ ہمارے دروازے پر نہ رکے، یوں ہی گھنگھرو بجاتا آگے نکل جائے''۔

وہ زمانہ تو گذر گیا تھا جب ہرکارہ ملک الموت کے روپ میں ایک دو سرکاری تار اٹھائے آیا کرتا تھا تو گاؤں سے اٹھتے نالے، عورتوں کے بین اور سہاگنوں کی اجڑی ہوئی شرمائی ہوئی سسکیاں ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہرکارے سے کہا کرتی تھیں—— ''نہ آیا کرو...... خدا کے لیے نہ آیا کرو...... ہمارا کوئی چھیل چھبیلا لڑائی میں مر جائے تو ہمیں آ کے نہ بتایا کرو خدا کے لیے اس کے انتظار کی شیریں تلخیاں اور اس کے لوٹ آنے کی دلفریب امیدیں ہم سے نہ چھینو...... کسی کے چھٹی آنے کی خبر لاؤ، جنگ بند ہونے کی خبر لاؤ، انگریزوں کے مر جانے کی خبر لاؤ جنھوں نے مٹھی بھر راشن کے بدلے ہمارے سہاگ چھین لیے ہیں......''

لیکن ہرکارے کے قدموں کی گرد سے اٹھتی کھرپ کھسک کھرپ کھسک ان خاموش فریادوں کو کبھی بھی نہ سن سکی تھی۔ ہرکارے کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ سرسوں کے کھلے پھولوں کی اوٹ سے درد آلود صدائیں ابھر رہی ہیں۔ کوئی سہیلی، ترنجن سے ٹوٹی سکھی سہیلیوں سے چھپ چھپ کے رو رہی ہے:

توں تاں سپاہی ماہی
الہڑ جوانی میری
ایویں گنوائی ماہی

وہ زمانہ کبھی کا گذر چکا تھا گاؤں کے ننھے ننھے بچوں نے ان جوانوں کی جگہ پر کر دی تھی جو دور دیس میں، دور دیس کے انسانوں کی سلامتی کی خاطر اجنبی مٹی میں کھو گئے تھے۔ اب تو ہرکارہ لوگوں کو اچھا لگنے لگا تھا لیکن آج وہ ایک بار پھر بگولے کی طرح آیا اور فضل داد

کے سکون وچین اور گاؤں کے معصوم سے ٹھہراؤ کے پرخچے گرد آلود فضاؤں میں بکھیرتا اگلے گاؤں چلا گیا۔ گاؤں کی ہمدردیاں فضل داد کے صحن میں جمع ہوگئیں۔ فضل داد اور اس کی بیوی سر پکڑے گم صم بیٹھے تھے۔ ان کے گرد عورتوں اور مردوں کے ہجوم میں ہر کوئی بول رہا تھا۔

''بے چاروں کا ایک ہی بیٹا تھا''۔

''وہ بھی جیتے جی مر گیا''۔

''فرنٹ پر مر جاتا تو اچھا تھا، باپ کو چھ سات روپے ماہوار پنشن تو مل جاتی''۔

''......لیکن شہر کی چھوکری گاؤں کے اجڈ لونڈے کے پاس ٹھہرے گی نہیں''۔

''منہ زور ڈنگر اور شہری لڑکی ایک برابر ہوتے ہیں''۔

''فضل داد بھائی! غم نہ کر، تیرا بیٹا آخر لوٹ کے یہیں آئے گا''۔

''لڑکی اسے ایسا جل دے گی کہ لڑکے کی آنکھیں کھل جائیں گی''۔

اور جب شام کے بعد فضل داد اور اس کی بیوی گھر میں تنہا رہ گئے تو بیوی نے فریب خوردہ لہجے میں کہا— ''کسی اور سے چٹھی پڑھوا دیکھی ہوتی، ہرکارہ غلط ہی نہ پڑھ کے سنا گیا ہو۔

''اوں ہوں! غلط نہیں، اشرف نے صاف لکھا ہے کہ میں نے بیاہ کر لیا ہے اور آپ خالہ کو جواب دے دینا۔ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ساتھ ملا ہے اشرف نے یہ بھی لکھا ہے کہ گاؤں میں شکر تقسیم کر دینا اور سوا روپے کا گھی اکبر شاہ کے مقبرے میں جلانا''۔

''یہ نہیں لکھا کہ لڑکی والوں کی ذات کیا ہے؟''

''ذات؟''— فضل داد ذرا سی مسکراہٹ میں بہت بڑی طنز بھر کے بولا— ''شہر والوں کی تو ذات ہی کوئی نہیں ہوتی''۔

''میری بہن کے کرم پھوٹے''— اشرف کی ماں نے رندھیائی آواز میں کہا— ''بے چاری سترہ برس سے بیٹی کو ہمارے لیے پال رہی تھی''— ماں کے ادھیڑ عمر چہرے پر خون کی لالی چھا گئی جس نے آنکھیں بھی لال انگارہ کر دیں۔ غصے سے لرزتے لہجے میں بولی۔ ''اس وقت دہائی دیتی رہی کہ لڑکے کو سکول داخل نہ کراؤ۔ مسجد میں دو سیپارے پڑھ کر زمین باڑی سنبھال لے گا لیکن تیری کھوپڑی میں نہ آئی۔ دس پاس کراؤں گا۔ بارہ

پڑھاؤں گا...... وہ تو کم عقل بچہ تھا شہر جا کر باپ کی کمائی پر عیش موج اڑائے۔ اب چکھ لو مزا تعلیم کا...... کم بخت نوکری ملی تو اسے شہر میں ہی ملی''۔

''تو اس میں پڑھنے پڑھانے کا کیا قصور ہے؟ نوکریاں شہروں میں ہی ملا کرتی ہیں''— باپ کھسیانہ سا ہو کے بولا— ''قسمت میں یہی لکھا تھا دو بھتیجے اٹلی میں مر گئے تھے۔ بیٹا سمجھوں گا لاہور جا کے مر گیا''۔

مامتا ''مر گیا'' پر تڑپ اٹھی۔ باپ نے یہ الفاظ کہہ تو دیئے لیکن اس کا سراپا کانپ گیا۔ اندر ہی اندر اس کی تمام قوتیں موت کے مقابلے کے لیے یک جا ہوگئیں۔ اشرف اس وقت سات برس کا بچہ تھا جب اس نے ایک دن دہی کا بھرا ہوا مٹکا توڑ دیا تھا آٹھ دس سیر دہی مٹی میں مل گیا تھا اور ماں نے چیخ چیخ کر کہا تھا— ''تیرا کلیجہ کتے کھا جائیں تو نے اتنا نقصان کر دیا ہے''— اور تیسرے ہی روز ماں دودھ بلو رہی تھی کہ باہر شور بلند ہوا تھا— ''باؤلا ہے...... ہٹ جاؤ آگے سے...... مار ڈالو...... باؤلا ہے''— تو ماں چھاچھ ہلاتے ہلاتے اس قدر گھبرا کر باہر کو اٹھ بھاگی تھی کہ اس کی ٹھوکر سے مٹکا اوندھا ہو گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی نکلی تھی اور دروازے سامنے کھیلتے اشرف کو چیل کی طرح جھپٹا مار کر سینے سے لگا لیا تھا۔ باؤلا کتا تو مارا جا چکا تھا۔ اس کی کچلی ہوئی کھوپڑی اس نے دیکھ بھی لی تھی۔ پھر بھی اس نے شام تک بچے کو گود سے الگ نہیں ہونے دیا تھا۔

آج جب فضل داد نے کہا ''مر گیا'' تو ماں بنیادوں تک ہل گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی اپنی آرزوؤں اور اس کی بہن کی امیدوں پر اشرف نے پانی پھیر دیا ہے پھر بھی اس کے منہ سے بد دعا نہ نکلی وہ رات بھر اشرف کے باپ کو کوستی رہی— ''نہ اسے دس جماعتیں پڑھاتے نہ اسے شہر میں نوکری ملتی نہ آج کا دن دیکھنا نصیب ہوتا''۔

+ + +

ادھر اشرف کی خالہ کے گھر تو مکمل ماتم کا منظر بنا ہوا تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی زینب اشرف کی منگیتر تھی اس نے زینب کی پیدائش کے دو ہی دن بعد اشرف کی ماں سے کہہ دیا تھا— ''میں نے یہ بیٹی اشرف کے لیے جنی ہے بہن!''— اور بہن نے مسرت سے بھرپور مسکراہٹ سے اس رشتے پر رضامندی کی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس وقت اشرف اڑھائی برس کا تھا اور اسی وقت سے خالہ نے تمام تر پیار دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا...... اشرف

زینب...... اور یہ پیار اکثر ایک دعا میں سمٹ آتا...... ''یا خدا اشرف کو ایک بہن اور زینب کو
ایک بھائی دے دے''۔

اگر خالہ یہ دعا براہِ راست خدا سے مانگتی تو شاید عرش کی راہ سے بادل ہٹ جاتے
لیکن یہ دعا جو وقت کے ساتھ ساتھ حسرت بنتی جا رہی تھی، اکبر شاہ کے مقبرے میں بند پنچھی
کی طرح پھڑ پھڑاتی رہتی تھی۔ خالہ مایوس ہو چکی تھی لیکن اکبر شاہ مرحوم کی گدی پہ بیٹھے
ہوئے پیر چنن شاہ نے اسے بیزار نہیں ہونے دیا تھا مگر آج شہر سے اشرف کا جو خط آیا تو یہ
دعا مقبرے سے یوں نکل بھاگی جیسے بند پنچھی نے پنجرہ توڑ لیا ہو اور خدا کے حضور جانے کی
بجائے پیپل کے تنے کی کھوج میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا ہو۔

خالہ نے اشرف کی ماں سے تصدیق کرائی مگر اسے یقین نہ آیا اور خط مسجد میں لے
جا کر پیش امام کو دکھایا۔ ایک ایک فقرہ کئی کئی بار پڑھوایا اور خط بہن کو لوٹا کر یوں زار و قطار
رونے بیٹھ گئی جیسے اشرف اور زینب کا نکاح پڑھا جا رہا تھا کہ بجلی گری اور......

''بہن غم نہ کر''۔۔۔۔ اشرف کی ماں نے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ''اگر وہ اپنے
باپ کا بیٹا ہوا تو دو چار ہی روز میں اس کلموئی کو طلاق دے کر تیرے قدموں میں آ گرے
گا...... زینب میرا آنگن بسانے کو پیدا ہوئی تھی بہن! پیر و مرشد نے کرم کیا تو اسی گھر میں
آباد ہو گی''۔

اب سوال زینب کی آبادی بربادی کا نہیں تھا پیچیدگی تو یہ آ پڑی تھی کہ خالہ نے چک
والے رشتہ داروں کو زینب کا رشتہ نہیں دیا تھا اور ان کی بات ٹھکرا کر یہ بھی کہہ دیا تھا۔۔۔۔
''اللہ زندگی دے میرے گھرو بھانجے کو، میں نازوں پلی بیٹی کو غیروں کے دروازے پہ
کیوں بٹھا دوں''۔

چک والوں کو ''غیروں'' کا لفظ گولی کی طرح لگا تھا اور جب خالہ نے انہیں ٹھکرا لوٹائی
تو چک والی ایک عورت نے کہا تھا۔۔۔۔ ''ہم بھی دیکھیں گے تیری بیٹی تیرے بھانجے کے گھر
کس طرح آباد ہو گی''۔

پھر مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ خالہ نے منہ پر ہاتھ پھیر کر چیلنج قبول کر لیا تھا مگر آج اس
کے بھانجے نے اس کی آس امید اور دلیری کو چکنا چور کر کے چک والوں کے مقابلے میں
صرف نہتا ہی نہیں عریاں بھی کر دیا تھا۔ خالہ کو چک والے ڈھول بجا بجا کر ہنستے اور قہقہے

لگاتے سنائی دینے لگے۔ خالہ کبھی ہاری نہیں تھی۔ اس کا خاوند جو شادی سے پہلے نڈر جوان
مشہور تھا شادی کے دوسرے ہی مہینے ہار کے بیٹھ گیا تھا اور آج بیس برس گذر جانے کے بعد
تک گھر میں بیٹھا ہی ہوا تھا۔ اس کا گھر میں اسی قدر استعمال رہ گیا تھا کہ بیوی کی ہاں میں
ہاں ملاتا چلا جائے اور زینب کا ایک بھائی پیدا کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہے لیکن وہ ہاں
میں ہاں ملانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کا رونا اور مسکرانا زینب کی ماں کے چہرے کے
اتار چڑھاؤ پر منحصر تھا۔

آج جب اس نے سنا کہ اشرف نے شہر میں شادی کر لی ہے تو وہ چپ ہی رہا......
گریاں نہ خنداں...... گھر آ کے زینب کی ماں کو خبر سنائی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی وہ بھی سر پکڑ کے
بیٹھ گیا۔ زینب کی ماں غصے میں اٹھی۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیز قدم باہر نکل گئی تو وہ بھی تیز
قدم دروازے کی طرف بڑھا۔ زینب کی ماں جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ دروازے
میں رکا، ادھر اُدھر دیکھا اور واپس آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ ازدواجی زندگی میں یہ غالباً
پہلی آزادانہ حرکت تھی۔

زینب کا باپ ہی نہیں، گاؤں کے بیشتر مرد خالہ سے گھبراتے تھے۔ خالہ وہ عورت تھی
جس نے گیارہ برس گذرے، اپنے بھائی کا سر کھلوا دیا تھا۔ بات صرف دروازے کے
سامنے سے پانی گذرنے کی تھی۔ خالہ کے منہ سے نکل گیا تھا کہ شریکوں کا پانی دروازے
کے سامنے سے نہیں گذرنے دوں گی۔ سارے گاؤں نے سمجھایا تھا کہ چلو بھر پانی گذر بھی
گیا تو کیا لیکن خالہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔۔۔۔ ''پہلے میرے نیچے سے پانی گذارو پھر
میرے دروازے کے سامنے سے بھی گذار دینا''۔

سارا گاؤں چپ ہو گیا تھا خالہ کا بھائی بھی اس کی ضد کے خلاف تھا لیکن خالہ نے
بھائی کو الگ بٹھا کر کچھ ایسا بے طرح بھڑکایا تھا کہ وہ لاٹھی لے کے تین چار آدمیوں کو
للکار اٹھا۔ بھائی کا خون اسی جگہ بہہ گیا تھا جہاں پڑوسیوں کا ذرا سا پانی گزرنے سے پہلے
ہی خشک ہو گیا تھا۔ ایک آدمی پھانسی چڑھ گیا اور دو دس دس سال کے لیے قید ہو گئے تھے۔
خالہ کا خاوند تو کندھے سکیڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ خالہ کا سینہ چوڑا ہو گیا تھا۔ بھائی کی موت پر وہ
لحاف میں منہ چھپا چھپا کر روئی مگر گاؤں والوں کے سامنے منہ دھو کر اور سینہ تان کر پھرتی
رہی تھی۔ اس نے بھائی کی قبر پر ہرمل بو دیا تھا، اور چالیس روز پانی دیتی رہی تھی۔ پھر اسی

ہرمل کی دھونی اشرف اور زینب کو دیتی رہی تھی۔

خالہ کبھی کسی سے دبکی نہیں تھی۔ اس کا غصہ کوندتی بجلیوں سے کسی قدر کم نہ تھا۔ وہ دبکتی تھی تو صرف پیر چنن شاہ سے۔ چنن شاہ کی وہ شادی سے پہلے کی مرید تھی اور ہر سال چنن شاہ کی وہ شادی سے پہلے کی مرید تھی اور ہر سال چنن شاہ کے دادا اکبر شاہ کے مزار پر سبز چادر چڑھایا کرتی تھی۔

آج اس نے پیش امام سے خط پڑھوا کر اشرف کی ماں کو لوٹایا اور بھاگم بھاگ پیر چنن شاہ کے گھر پہنچی۔ اسے حال دل سنایا اور کتاب نکالنے کو کہا پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا ـــــ ''یا پیروں کے پیر! اگر اشرف اس لڑکی کو طلاق دے کر گھر آ جائے تو دودھ والی بکری اس دروازے پر باندھ جاؤں گی اور ایک دنبہ اکبر شاہ کے روضہ شریف پر ذبح کروں گی''۔

چنن شاہ اس عورت کو کنوار پنے سے جانتا تھا۔ اس کی زندگی کی کئی راتیں اس کے لیے چلہ کاٹتے گذری تھیں۔ اب وہ عورت بن گئی تو کیا ہوا۔ چنن شاہ بھی تو اب لال سرخ گبھرو نوجوان نہیں رہا تھا۔ راہی کو چھوڑی ہوئی منزل سے جو پیار تھا وہ روزِ اول کی طرح تازہ تھا۔ اس نے خالہ کو آدھی رات، ننگے پاؤں، گز بھر کورے لٹھے کے ایک کونے میں سوا پانچ روپے اور دوسرے کونے میں ذرا سا نمک باندھ کر لانے کو کہا۔ پیر چنن شاہ نے اس کے چہرے کو گہری نگاہوں سے دیکھا جس میں جوانی کی رمق ابھی تک دہک رہی تھی ...... وہ بجھتے ہوئے انگارے ایک بار پھر سلگ اٹھے۔

ساون کی رومان انگیز نمی اور شبنم سے دھلی رات نہا کے سوئے ہوئے بچے کی مانند گہری نیند سو رہی تھی۔ گیدڑ چیخ چیخ کر اور کتے بھونک بھونک کر سو گئے تھے۔ اکیلی دکیلی ٹیڑی ٹٹ ٹیون، ٹٹ ٹیوں کی پیاسی پیاسی صدائیں اندھیری فضا میں بکھرتی دور افق کی طرف نکل گئی تھی۔ زینب چھت پر لیٹی خوابوں کے کھنڈروں میں بھٹک رہی تھی۔ اس کا باپ شکست خوردہ سپاہی کی طرف ہاری ہوئی سی نیند سو رہا تھا۔ زمانہ ہی سو گیا تھا۔ صرف چنن شاہ جاگ رہا تھا اور چنن شاہ کے وجود میں ایک مرد پوری طرح بیدار تھا اور زینب کی ماں جاگ رہی تھی جس کے سینے میں مریدنی بیدار تھی مگر عورت سوئی تھی۔

مریدنی نے آخری بار گھوم کے دیکھا اور پیر کے گھر میں داخل ہو گئی۔ آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا اور اکبر شاہ کے مقبرے کی اوٹ میں بجھ گیا۔ دور کہیں گیدڑوں کی آنکھ کھل گئی۔

شب کی تیرگی اور سکوت یکبارگی لرز اٹھا اور سکوت نے لرز کر رات کا بھید اپنی دبیز تہوں میں یوں چھپا لیا جس طرح تھوڑی ہی دیر پہلے ساتویں کے چاند کو افق کی دھندلائی ہوئی لکیر ہڑپ کر چکی تھی۔

رات کانپ کے پھر سو گئی۔ پیر چنن شاہ کی قسمت جاگ اٹھی۔ خالہ کی اونگھتی ہوئی امید اور جوانی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔

+ + +

''سچی بتاؤ شاہ جی نے تمہارے سامنے کتاب کھولی تھی؟''

''ہاں تو میں جھوٹے تھوڑے ہی بول رہی ہوں'' ـــــ زینب کی ماں چوتھی صبح اشرف کی ماں کو سنا رہی تھی ـــــ ''شاہ جی نے کپڑے سے نمک اور روپے کھولے۔ نمک چارپائی کے نیچے اور پانی کا نوٹ تکئے کے نیچے پھینک کر زور سے ہاتھ تکئے پر مارا اور بولے ـــــ ''چل چڑیل چھوڑ دے ہمارے لڑکے کو، ...... پھر تین دفعہ کہا جا چلی جا۔ جا چلی جا۔ جا چلی جا۔ پھر لال سرخ آنکھیں نکال کر دروازے کی طرف دیکھا اور جلال میں آ کر مجھے کہا دروازہ بند کر دے ...... تُو یہاں آ جا ...... پھر کیا بتاؤں بہن ...... شاہ جی نے ...... ہاں! شاہ جی نے پھر ...... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ شاہ جی پھر غصے میں آ گئے ...... نہیں نہیں ...... پھر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور جلال میں آ گئے ...... بس ایسے ہی کچھ اونگھنے لگے اور کتاب نکال کر بولے، دیکھ ریشم جان! لڑکا اس لڑکی سے سخت تنگ ہے بس آیا کہ آیا۔ زینب کی روح اسے کھینچ رہی ہے۔ تم یوں کروں کہ زینب کو اکبر شاہ کے مزار کی مٹی صبح و شام کھلایا کرو۔ جوں جوں مزار کی مٹی جسم میں داخل ہوتی جائے گی، اشرف کی روح زینب کی طرف کھنچتی آئے گی''۔

''اچھا، تو ایسا کہا انہوں نے؟'' ـــــ اشرف کی ماں نے باچھیں کھلا کر پوچھا۔

''ہاں تو! ...... انہوں نے کہا تھا کہ تین روز تک کسی سے ذکر نہ کرنا کہ کتاب نکلوائی ہے۔ آج چوتھے روز تمہیں خوشخبری سنا رہی ہوں۔ آج چوتھا روز ہے کہ زینب صبح و شام دونوں وقت مقبرے پر جاتی ہے اور روضے کی خاک کھاتی ہے''۔

بہنوں کے مرجھائے ہوئے حوصلے ایک بار پھر کھل اٹھے۔ خالہ چلی گئی تو اشرف کی ماں نے اپنے خاوند سے کہا ـــــ ''جا مولوی صاحب سے اشرف کی طرف خط لکھوا اور کل

ہرکارہ آئے تو اسے دے دے...... تھوڑا سا گڑ لیتا جا...... اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ حالت تمہیں معلوم ہے جا کے سارا حال لکھوا دے اور اسے لکھوا کہ گدھے کے بچے! تُو اصل حرامی نکلا۔ تیری خالہ کمر پر ہاتھ رکھے تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ دے طلاق اس ماں کو اور جلدی گھر آ۔ یہ بھی لکھوا کہ ہم نے پرانے لحاف کی روئی دھنوا کر تیری شادی کے لیے نئی رضائی بھروا رکھی ہے۔ پھر لکھوا اسے کہ مردود کی اولاد! ہم گاؤں برادری میں سر اونچا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ آج چوتھا روز ہے چک والے الگ طعنے دے رہے ہیں...... ساری باتیں لکھوا دے اور خط بیرنگ بھیجنا۔ جلدی پہنچے گا اور یہ بھی لکھوا کہ خط کا جواب دے تو جوابی لفافہ ساتھ بھیجے۔ ہرکارہ لفافے مہنگے دیتا ہے۔ اس روز اس سے لفافہ لیا تو چھ پیسے الگ لے گیا، دوسیر بھٹے اور ایک انڈا الگ لے گیا...... یہ بھی لکھوا دے کہ بھینس دودھ دیتی ہے۔ کٹا ذبح کر کے اکبر شاہ کے مزار پر چڑھا دیا ہے اسے خارش ہوگئی تھی''۔

✦ ✦ ✦

پیش امام کا لکھا ہوا خط چلا گیا۔ جواب بھی آ گیا۔ اشرف نے طویل خط میں ماں باپ کو سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ اس کی بیوی بڑی اچھی ہے اس کا نام رضیہ ہے۔

اشرف کے ماں باپ کو شہر کی بے حیائی کا سب سے بڑا ثبوت مل گیا۔ انہوں نے جب خط میں اشرف کے قلم سے اپنی بیوی کا نام سنا تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر استغفار پڑھی۔ آگے چل کر اشرف نے لکھا کہ اس کے سسرال بڑھے بھلے مانس لوگ ہیں۔ وہ آپ کو بلاتے ہیں یا گاؤں آنے کی اجازت مانگتے ہیں۔

اس طویل خط میں اشرف نے برادریوں کے جھوٹے بندھن، رسومات اور بے جا تکلفات اور ناک کی خاطر حادثات کی تفصیل دہرائی جو گاؤں کے در و دیوار پر کبھی کی لکھی ہوئی تھی اور جو آئے دن دہرائی جاتی تھی۔

اشرف کے ماں باپ کو اشرف کی ہر بات سمجھ آ رہی تھی، لیکن بات جب ناک پر آئی تو انہوں نے ناک سکیڑ لی۔ عقل کی جگہ روایات نے لے لی۔

مولوی صاحب نے خط پڑھ کر کہا ''اسے یہ لکھواؤ کہ اللہ بخشے نور داد کا دادا سنایا کرتا تھا کہ برسوں گذرے گاؤں کے ایک چھوکرے نے شہر جا کر شادی کر لی تھی۔ اس کے ماں باپ نے لڑکے کو دلہن گاؤں لانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں شہر سے گاؤں کو

آ رہے تھے۔ جب قبرستان سے گذرے تو کسی پیر فقیر کو ایسی غیرت آئی اور پیر فقیر نے ایسی آہ لی کہ میاں بیوی چلتے چلتے، سیال پتھر، ہوگئے۔ جوگیوں کے ٹلے سے اڑھائی کوس قطب کی سمت دیکھو، ابھی تک وہاں پرانے قبرستان میں دو پتھر، ایک مرد اور ایک عورت کی شکل کا، کھڑے ہیں۔ بارش برستی ہے اور ہر سُو جل تھل ہو جاتا ہے مگر ان دو پتھروں پر ایک بوند نہیں پڑتی''۔

اشرف کے باپ نے اشرف کو خط لکھا اور واردات بھی لکھوا دی جس کی تمام عبرت انگیزی شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہیں پتھر کی طرح بے جان ہوگئی۔

پھر وقت گذرتا گیا۔

اشرف ماں باپ کو پچیس روپے ماہوار بھیجتا رہا۔ ماں باپ کبھی غصے اور کبھی پیار کا خط لکھوا لکھوا کر اسے گاؤں بلاتے رہے مگر انہوں نے ہر بار لکھا کہ وہ جب بھی آئے بیوی کو ساتھ نہ لائے۔ آخر انہوں نے خط بھیجنے بند کر دیئے مگر اشرف خط لکھتا رہا اور بیوی کو گاؤں لانے کی اجازت مانگتا رہا۔

زینب کی ماں دسویں بارھویں رات چنن شاہ کے حجرے میں ننگے پاؤں ندھیرے اجالوں میں بھٹکتی رہی، ایک بکری اور ایک دنبہ اس کے گھر میں پلتا رہا اور چنن شاہ اسے ہر رات نئی امید اور نئے سے نئے فریب میں الجھاتا رہا۔

اور زینب دونوں وقت اکبر شاہ کے مزار کی مٹی کھاتی رہی۔ گاؤں میں چہ میگوئیاں تھم نہ سکیں، کھسر پھسر بند نہ ہوئی۔ ہر آٹھویں دسویں روز ہرکارے کے گھنگھرو اشرف کا خط لے آتے اور ہر کسی کے کان ہر کسی کے کان کے ساتھ لگ جاتے ''کیا لکھا ہے اشرف نے؟...... آئے گا؟...... نہیں آئے۔ سامنے بیٹھ کے لوگوں نے ہمدردی کی، پیٹھ پیچھے جو منہ میں آیا کہا۔ جتنے منہ اس سے کئی گنا زیادہ باتیں اور باتوں کے بتنگڑ۔ ساون نے بھادوں کو سنائی، بھادوں نے آگے چلائی۔ بات چیت بیساکھ کی رُت تک پہنچی...... آٹھ مہینے گذر گئے۔

✦ ✦ ✦

صرف عرشو نائن تھی جس کا ردِعمل ہر کسی سے مختلف تھا۔ عرشو کی ہر بات نرالی اور انوکھی ہوا کرتی تھی۔ کوئی بھی اس کی بات کو نہ پا سکتا تھا۔ اس کی شخصیت میں جانے کتنے

اسرار نہاں تھے۔ گاؤں والوں کے لیے وہ سراپا بھید تھی...... چلتا پھرتا بھید جس کی رکھوالی وہ خود تھی۔

عرشو نائن کی عمر برسوں کے حساب سے تو چالیس کے قریب تھی لیکن شکل وصورت، چہرے کی رونق، آنکھوں کی چمک جسم کی ساخت اور پھرتی سے وہ بیس برس سے ایک دن زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ اس کا خاوند، پندرہ سال گزرے، اس کے ساتھ صرف چھ ماہ کی ازدواجی زندگی گذار کر مر گیا تھا۔ اس چھ ماہ کی زوجیت نے عرشو کے جسم و جان میں نہ جانے کیا پھونک دیا تھا کہ اس نے بیوہ ہو کر بھی خاوند کا سوگ نہ کیا۔ یوں ہنستی کھیلتی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ مرنے والے کی یادگار کو وہ کوکھ میں پالتی گاؤں کی گہما گہمی میں تحلیل ہو گئی۔ دوسری شادی کے لیے کئی رشتے آئے، پیغاموں کا ایک سلسلہ تھا جو تھمتا نہ تھا۔ آخر عرشو نے علان کر دیا..... "اب کوئی میرے رشتے کو آیا تو اس کی پگڑی گاؤں میں اتار کر سو جوتے ماروں گی"۔

عرشو کا یہ پہلا اور آخری غصہ تھا۔ ماں باپ بیٹی کے اجڑے ہوئے سہاگ کا غم لئے مر گئے لیکن عرشو زندہ رہی۔ اس کا حسن روز بروز نکھرتا ہی آ رہا تھا۔ نقش و نگار کی جاذبیت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

گاؤں میں کسی کے گھر شادی ہو، ختنہ یا کڑمائی ہو، عرشو لڑکیوں کے نرغے میں ہوتی تھی اور ڈھولک عرشو کی گود میں۔ اس کے ہاتھوں اور انگلیوں کی تھاپ اور سُر تال ہی نرالی ہوتی تھی۔ ترنجن کی وہ جان تھی۔ آواز میں وہ سوز اور موسیقیت جیسے کوئی شب بھر کی تھکی ماندی پری نور کے تڑکے کہکشاں پر گنگناتی جا رہی ہو۔ کسی گھر میں ماتم ہو جائے تو عرشو سر شام یوسف علیہ السلام کا منظوم قصہ لے کر میت کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور رات پُرسوز ترنم کی لہروں پر گزرتی جاتی تھی۔ کیا مجال کوئی عورت میت کے پاس بَین کر جائے۔

عرشو گاؤں بھر کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی، ایسا معمہ جس کا حل عرشو کے سوا کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ میں، کھڑ کھڑ ہنسی کے ترنم میں اور اس کے انگ انگ میں ایک سوال سرسراتا رہتا تھا..... "عرشو دوسری شادی کیوں نہیں کرتی؟ یہ جوانی اور یہ حوصلہ؟ آخر بیوگی اس قدر اطمینان سے کیسے کاٹ رہی ہے؟"

گاؤں والوں کو یقین تھا کہ مرحوم خاوند سے اسے بے پناہ پیار تھا اور وہ مرحوم کے

تصور میں ہی بے خود رہتی ہے لیکن عرشو کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ خاوند کو نفرت کی حد تک ناپسند کرتی تھی۔ یہ تو ماں باپ نے زبردستی کا بیاہ کرا دیا تھا۔ رات کا بھید اندھیروں کے سوا کون جانتا ہے؟ کسی کو معلوم نہ تھا کہ رات تو بڑی لمبی ہوتی ہے، عرشو نے رات کے چند لمحے بھی خاوند کو خاوند نہیں سمجھا تھا اور یہ تلخ راز مرنے والا اپنے سینے میں دبائے قبر میں لے گیا تھا۔

عرشو کی زندگی کی گئی گذری راتوں کی اندھیری تہوں کو کھولو تو آج بھی عرشو کی کنواری سرگوشیاں سنائی دیں گی..... "تجھے سو بار کہہ چکی ہوں کسی نہ کسی بہانے مجھے طلاق دے دے اور کوئی دوسری ڈھونڈ لے"..... اور ان سرگوشیوں کے ساتھ مرحوم شوہر کی منتیں اور تشنہ محبت کی آہ زاری بھی سسک رہی ہوگی..... "میری چاند عرشو! تجھے ان چار کلموں کی قسم جنہیں پڑھ کر میں نے تیرے نام پر انگوٹھا لگایا تھا، اپنے ہاتھوں زہر دے دے، ہنستے پی لوں گا عرشو! جیئوں گا تو تیرے ساتھ مروں گا تو تیرے ہاتھوں..... صرف ایک رات کے لیے عرشو! چند لمحوں کے لیے ہی سہی"۔

اور عرشو چھ کلموں کی لاج رکھ کر چارپائی پر ذرا پرے سرک گئی تھی اور اس کا خاوند جو دوزانو چارپائی کے قریب بیٹھا سسک رہا تھا اس کے قریب ہو گیا تھا، لیکن چند لمحوں کے لیے..... وہ شادی کے چوتھے مہینے کی ایک رات تھی۔ عرشو اس رات بہت روئی تھی۔ اس نے کنوار پنا چھ کلموں کی نذر کر دیا تھا اور اس رات کی یادگار ایک بچہ تھا جو باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اور چند دن زندہ رہ کر باپ سے جا ملا تھا۔

خاوند اسی ایک رات کے چند لمحے سینے سے لگائے تڑپتا رہا تھا اور یہ لمحے دق کے جراثیم بن کر اس کے پھیپھڑوں کو چھلنی کرنے لگے تھے۔ اس وقت پیر چنن شاہ بھی جوان تھا۔ اس نے ہر جتن کر ڈالا تھا کہ عرشو کے خاوند کے روگ کا پتہ لگا لے لیکن ہار گیا تھا۔ جس محبت کو نفرت نے ڈس لیا تھا اس کا علاج پیر فقیر کیسے کرتے..... چنن شاہ نے پہلی بار اعتراف کیا تھا کہ "پلے کچھ نہیں پڑتا"..... اور یہ بھید عرشو نے اپنے زیر لب تبسم میں یوں جذب کر لیا تھا جیسے ایک اور لاش قبر میں گم ہو گئی ہو۔

گاؤں کے بعض چھیل چھبیلے سمجھے بیٹھے تھے کہ عرشو کو کسی اور سے پیار ہے وہ اپنے آپ سے اکثر تنہائیوں سے پوچھا کرتے تھے..... "عرشو آخر چاہتی کسے ہے؟ وہ کون خوش

نصیب ہے؟''—— اور اکثر کنکھیوں سے اپنے سائے کی لمبائی چوڑائی چوری چھپے ناپا کرتے تھے لیکن عرشو وہ روائتی بلی تھی جس کی گردن میں صرف اس کے خاوند نے گھنٹی باندھنے کی کوشش کی تھی۔

تھی تو وہ گاؤں کی نائن، گھر گھر کی خدمت گذاری کرنے والی لیکن اس کی خدمت گذاری میں بھی حسن اور کمین پن میں بھی ایک وقار تھا۔ وہ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر اسے ہر کوئی اچھا لگتا تھا اور وہ ہر کسی کو پیاری لگتی تھی۔ سارا گاؤں اس کا اپنا کنبہ تھا۔ گاؤں کے گبھرو عرشو کے لڑکپن سے فوج میں بھرتی ہو کے جاتے رہے تھے۔ وہ گئے۔ وہ آئے، پھر چلے جانے کے لئے۔ کچھ ایسے گئے کہ ان کی جگہ سرکاری تار آیا اور زندگی کے تار ٹوٹ گئے۔ تار پھر جڑ گئے، پھر ٹوٹ جانے کے لیے!

یہ سلسلہ چلتا رہا تھا۔ عرشو سب کو گاؤں سے نکلتے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے نور کے تڑکے ڈھور ڈنگر چرنے چگنے جا رہے ہوں اور شام کو لوٹ آئیں گے، لیکن جس صبح اشرف نوکری کے لیے روانہ ہوا تھا تو عرشو گندم کے زرد پیلے خوشوں کی اوٹ میں چھپ کر اسے دیکھتی رہی تھی۔ یہی کوئی اڑھائی تین برس پہلے کی بات تھی جب عرشو کے خاوند کو مرے اٹھارہ انیس برس گذر چکے تھے۔

اشرف شہر کو روانہ ہوا تو عرشو اسے چھپ کر دیکھتی رہی تھی۔ اس میں چھپنے کی تو کوئی بات نہ تھی لیکن عرشو کے دل میں یوں ہی آئی تھی اور اس نے اشرف کو دور ہی سے الوداع کہی تھی۔ پھر اشرف اس کے آنسوؤں کے دھندلکے میں چھپ گیا تھا۔ اس نے خیالوں ہی خیالوں میں ایسی کوشش کی بھی تھی جیسے نئی نویلی دلہن پہلی رات کی طرف بڑھتی ہوئی سحر کو بازو پھیلا کر روک لینا چاہتی ہو۔

ان بے ہنگم سے خیالوں نے عرشو کے سینے میں تلخی سی پیدا کر دی تھی۔ اس نے جا کر اشرف کے سر پر ہاتھ کیوں نہ پھیرا تھا؟ اس نے اشرف کی نوکری لگ جانے کا اس سے ایک روپیہ کیوں نہیں مانگا تھا؟ نئے جوڑے کا تقاضا کیوں نہیں کیا تھا؟ اس کی خالہ کی طرح اشرف کے جوان گالوں کا بوسہ کیوں نہیں لیا؟ —— عرشو نے ایک ہی بار، گندم کے کھیت میں، یہ سارے سوال اپنے آپ سے پوچھ ڈالے تھے اور کوئی جواب نہ پا کر اشرف کی دہلیز پر آ بیٹھی تھی اور اس کی ماں کے ساتھ اشرف کی ہی باتیں کرتی رہی تھی۔

اشرف تو اس کے چھوٹے بھائی کے برابر تھا۔ وہ بیس برس کا لڑکا، یہ پینتیس چالیس کی لپیٹ میں آئی ہوئی عورت...... شاید عرشو نے کسی وقت آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا اور آئینے نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ شکل وصورت اور چہرے مہرے کی رونق سے وہ اشرف سے ایک دن بھی بڑی نہیں۔

صرف ایک بات تھی جو عرشو نے خاوند کے روگ کی طرح اپنی شگفتہ مزاجی میں چھپا رکھی تھی۔ پرانی بات تھی، جب اشرف کی عمر بمشکل ایک سال تھی تو اس کی ماں کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ عرشو پہلی عورت تھی جو اشرف کی ماں کے پاس سب سے پہلے پہنچی تھی۔ ماں درد سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ عرشو نے اس کے منہ میں شہد ڈالا تھا اور صوبیدار کرم داد کے گھر سے دو چمچ برانڈی لا کر اس کے منہ میں ٹپکائی تھی۔ ننھا منا اشرف بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ اتنے میں اشرف کی خالہ آ پہنچی اور بہن کی تیمارداری میں ایسی ہلکان ہونے لگی کہ اسے اپنے دودھ پیتے بھانجے کا ہوش ہی نہ رہا تھا لیکن عرشو کو اس بچے کا اس قدر خیال تھا کہ وہ چپکے سے اشرف کو اٹھا کے باہر نکل گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا اپنا بچہ مر گیا تھا۔

اشرف کی ماں بے ہوش پڑی تھی۔ دم اکھڑ گیا تھا اور وہ آٹھ روز موت وحیات کی کشمکش میں تڑپتی رہی تھی۔ یہ آٹھ دن اشرف کی خالہ نے اشرف کو جب بھی دیکھا عرشو کی گود میں سوتا دیکھا۔

اشرف کی ماں نے جب آٹھویں دسویں روز آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے نحیف آواز میں اشرف کا ہی پوچھا۔

''میرا منا، میرا اچھو'' —— اور عرشو نے اطمینان کی گہری نیند سویا ہوا اشرف اس کے پہلو میں لٹا دیا تھا۔ اس کی ماں کتنے ہی دن عورتوں سے پوچھتی رہی تھی کہ بچہ دودھ کہاں سے پیتا رہا ہے؟ سب نے ایک ہی جواب دیا تھا—— ''بچہ ہر وقت عرشو کے پاس رہا ہے'' اور ماں کا دل دہل گیا تھا کہ کہیں نائن نے اسے اپنا دودھ تو نہیں پلا دیا۔ اس نے عرشو سے پوچھا تو عرشو نے بتایا—— ''چمچ سے بکری کا دودھ پلاتی رہی ہوں'' —— یہ کہہ کر عرشو یوں باہر نکل گئی تھی جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔ کام اس قدر تھا کہ اس کی آنکھوں میں دو آنسو آ گئے تھے۔ جنہیں وہ چوری چھپے پونچھ دینا چاہتی تھی۔

اور اب جب کہ گذشتہ آٹھ مہینوں سے گھر گھر میں اشرف کا بیاہ موضوع بنا ہوا تھا

اور ہر کوئی نئی سے نئی بات گھڑ رہا تھا، صرف عرشو نائن تھی جس کا ردِعمل مختلف تھا اور اس کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ کے سوا کوئی رائے نہیں تھی۔ صرف ایک بار اس نے عورتوں کے جھرمٹ میں کہہ دیا تھا۔۔۔ ''شہر میں شادی کر لی تو کیا قیامت آ گئی۔ کوئی لڑکی اس کے دل کو بھا گئی ہو گی''۔

عورتوں نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی۔

وہ ساون کی بات تھی جب اشرف نے شادی کی اطلاع دی تھی۔ اب چیت بیساکھ کی رُت جوبن پر تھی۔ فطرت جھوم رہی تھی۔ گندم کی جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ آسمان کے ساتوں رنگ الگ الگ ہو کر نکھر گئے تھے۔ ہر شے اور ہر انسان نئی تازگی سے سرشار تھا لیکن اشرف کی خالہ کی بیٹی زینب جس کی عمر کا اٹھارواں برس آن لگا تھا، خزاں زدہ پتے کی طرح شاخ سے رشتہ توڑ رہی تھی، چہرے کی رنگت مٹی کی طرح ہو گئی تھی، ہونٹوں پر بنجر زمین جیسی لکیریں، آنکھیں زرد اور بے نور، نگاہیں بے امنگ جیسے جوانی کے خواب ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں مل گئے ہوں۔ دانت رگڑ رگڑ کر صاف کرنے کے باوجود گہرے بادامی رنگ کے ہوئے جا رہے تھے۔ بالوں کی چمک جو اس عمر میں سینے میں تپش کا پتہ دیا کرتی ہے، چلو بھر تیل ڈالنے کے باوجود پرانی رسیوں کی طرح ہو گئے تھے۔ پیٹ بڑھتا آ رہا تھا۔ سارا جسم ہی بے ڈھب ہو گیا تھا۔

اب تو وہ چارپائی سے اٹھنے سے بھی گریز کرتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اشرف کی محبت دل میں گھر کر گئی تھی بلکہ اس لیے کہ اکبر شاہ کی قبر کی مٹی جسم کی رگ رگ میں اتر گئی تھی۔ وہ گذشتہ آٹھ مہینوں سے دونوں وقت بلاناغہ مزار کی مٹی کھا رہی تھی۔ قبر کے جس کونے سے وہ مٹی کھاتی تھی وہاں پانچ چھ انچ گہرا اور اسی قدر چوڑا گڑھا ہو گیا تھا جو گہرا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ مزار کی مٹی اشرف کی روح کو زینب کی طرف نہ کھینچ سکی۔ زینب کی روح جسم سے کھچتی جا رہی تھی۔ اس کھچاؤ سے اس کا انگ انگ درد کر رہا تھا اور اعصاب ریزہ ریزہ ہو چکے تھے جگر بیکار ہو گیا تھا۔

زینب کی ماں کو یقین تھا کہ اشرف بیوی کو طلاق دے کر گاؤں آ جائے گا اور زینب کے ساتھ بیاہ کر لے گا۔ پھر زینب بھلی چنگی ہو جائے گی۔ پیر چنن شاہ بالکل مایوس نہیں تھا۔ چند ہی روز گذرے زینب کی ماں نے اس سے زینب کی حالت کا ذکر کیا تو چنن شاہ مسکرا دیا

اور چہرے پر وجدانی سی کیفیت طاری کر کے بولا۔۔۔ ''مزار کی خاک مبارک لڑکی کو نئی زندگی دے رہی ہے۔۔۔۔ اکبر شاہ نے مُردوں کو زندہ کیا ہے''۔

زینب کی اگر کوئی غم خوار تھی تو عرشو نائن تھی گاؤں میں پہلے بھی کسی نے زینب کی ماں کو مشورہ دیا تھا کہ لڑکی کو قصبے میں لے جا کر سیانے کو دکھاؤ، کچی عمر میں پچاس برس کی بڑھیا لگتی ہے لیکن جب گاؤں والوں کو پتہ چلا پیر چنن شاہ نے تسلی دی ہے اور لڑکی مزار کی خاک کھاتی ہے تو سب نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''پھر کوئی فکر کی بات ہی نہیں''۔۔۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

گاؤں والے تو مطمئن ہو گئے، لیکن عرشو نائن کو چین نہ آیا۔ اس نے زینب کے ماں باپ کے پیچھے پڑ کے ایک دن انہیں زینب سمیت قصبے بھیج ہی دیا۔

قصبہ چار کوس دور تھا۔ وہ صبح گئے اور دوپہر کو لوٹ آئے۔ ہاتھ میں دوا نہ دارو جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔ زینب کی ماں غصے سے لال سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ پیپل کے نیچے ہی اسے چند عورتوں نے روک لیا اور پوچھا کہ سیانے نے کیا کہا ہے؟

''کہا ہے سر اپنے جننے والوں کا کافر نے''۔۔۔ ماں یک بارگی غصہ اگلتے ہوئے بولی۔۔۔ ''نہ نبض دیکھی نہ سارا حال سنا بس پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بے شرم نے اس طرح دبایا جسے اس کی ماں کلموئی کا پیٹ ہو۔ زینب بے چاری مارے شرم کے دوہری ہو گئی اور اس کے منہ سے ''ہائے'' نکل گئی۔۔۔۔ پھر بولا لڑکی مٹی بہت کھاتی ہے تلی بڑھ گئی ہے۔ معدہ اور جگر برباد ہو چکے ہیں۔ اس سے مٹی چھڑاؤ ورنہ مر جائے گی اور یہ لو ٹیکے خرید لاؤ، ایک روزانہ لگے گا۔۔۔۔ ٹیکہ بھی وہ لمبی سوئی والا۔ مجھے جو غصہ آیا تو میں زینب اور اس کے باپ کو گھسیٹ کر باہر لے آئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''میری بیٹی ایسی نہیں کہ مٹی کھاتی پھرے۔ اکبر شاہ کے مزار کی خاک کھاتی ہے''۔۔۔۔ سنو بہنو تم ہی بتاؤ۔ مقبروں کی خاک بھلا مٹی ہوتی ہے؟ اللہ زندگی دے پیر چنن شاہ پیر دستگیر کو، اس روز بھی انہوں نے کتاب نکال کر کہا تھا۔۔۔ ''ریشم جان! غم نہ کر، زنیب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی''۔

عورتوں نے یہ روداد سنی تو ان کے چہروں پر غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے تاثر یوں بدل گئے جیسے ابھی جا کے اس ڈاکٹر کی تکا بوٹی کر دیں گی جس نے اکبر شاہ کے مزار کی خاک کو مٹی کہہ دیا تھا۔

جب سے زینب کی حالت بگڑنے لگی تھی عرشو نائن زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گذارنے لگی تھی۔ جس کا اثر زینب پر تو ہونا ہی تھا لیکن زینب کی ماں پر یہ اثر ہوا کہ اس نے عرشو کو اپنی مونس وغم خوار اور ہم راز بنالیا۔ بے تکلفی اور رازداری بڑھتی ہی گئی۔

✦ ✦ ✦

آٹھ مہینے گذر گئے تھے۔ اشرف کے خط بدستور چلے آرہے تھے۔ جو بھی خط آتا تھا، بیوی اور سسرال کی تعریفوں سے پُر ہوتا تھا۔ پیر چنن شاہ کے تعویذ اور ٹونے بے اثر ہوتے جار ہے تھے۔ عرشو نے ایک دو بار اشاروں میں زینب کی ماں کو چنن شاہ کے طلسم سے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ طلسم روح کی گہرائیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ایک بار خالہ نے عرشو پر راز فاش کر دیا کہ شاہ جی نے اشرف اور اس کی بیوی پر جادو کر رکھا ہے___ ''بس اشرف آیا کہ آیا''۔

اور تین ہی ماہ بعد جادو کا اثر عرشو نے بھی دیکھ لیا۔ اشرف گاؤں میں آ گیا لیکن شہری بیوی ساتھ تھی اور اس کی گود میں دو ماہ کا بچہ تھا۔ یہ معجزہ اس طرح رونما ہوا کہ دو ماہ ہوئے اشرف نے ماں باپ کو بچے کی پیدائش کی اطلاع دی تھی اور کچھ ایسے انداز سے منت ساجت کر کے لکھا تھا کہ یہ آپ کا خون ہے، اس معصوم سے دشمنی کیسی! ماں باپ کے دل موم ہو گئے تھے۔ اشرف کی ماں کو وہ بھولی بسری لوریاں جو اس نے کبھی اشرف کو دی تھیں، ذہن کے گوشوں سے امڈ آئیں اور اس کے سینے میں ماں بیدار ہو گئی، خیالوں ہی خیالوں میں گنگنانے لگی۔

اشرف کی ماں خیالوں ہی خیالوں میں جھوم اٹھی۔ بوڑھا باپ مسکرا دیا۔ اشرف کے ننھے کے تصور میں اسے اشرف کا بچپن دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک ننھے منے، ذرا جتنے بچے نے دور، گئے گذرے ماضی کو یوں بوڑھے دادی دادا کے سامنے لا پھینکا جیسے اشرف کا بچپن یہیں کہیں چلا گیا تھا اور لوٹ آیا......عمرِ رفتہ لوٹ آئی۔

ماں باپ جذبات سے ایسے بے بس ہو گئے کہ کسی سے کہے سنے بغیر ہرکارے کو اندر بٹھا کر خط لکھوایا تھا۔ انہوں نے ہرکارے کو تین انڈے، دو سیر ستو اور پاؤ بھر مکھن دیا تھا کہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دے کہ اشرف کو انہوں نے خود بلایا تھا۔ خط میں انہوں نے تاکیداً لکھوایا تھا کہ گاؤں آتے قبرستان سے گذر کے نہ آنا، جمالو کے آوے کی طرف سے آنا۔

سخت تاکید ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ ان کا بیٹا بیوی سمیت قبرستان میں سیال پتھر نہ ہو جائے۔

اشرف کے آنے تک اس کی ماں اور باپ سخت انتظار کی مسرت سے سرشار رہے مگر چوری چھپے ان کی مسرت پر خوف طاری رہا۔ گاؤں برادری سے ٹوٹ جانے کا ڈر، بہن سے چھوٹ جانے کا ڈر، بہو بیٹے کے ''سیال پتھر'' ہو جانے کا ڈر اور جانے کیسے کیسے خوف ڈراؤنی شکلیں بنا کر ان کی مسرت کو ڈراتے رہے تھے۔

لیکن اشرف کی بیوی نے آتے ہی سب خوف دور کر دیئے۔ وہ روایتی ''شہری لڑکی'' سے بالکل مختلف تھی۔ واجبی سی لکھی پڑھی، سلیقہ شعار اور ملنسار لڑکی تھی۔ گاؤں میں آتے ہی وہ گھورتی عورتوں اور لڑکیوں میں اس طرح گھل مل گئی جیسے وہ اسی گاؤں میں پل کے جوان ہوئی ہو۔ دوسری صبح تک عورتوں کے ماتھوں کی شکنیں غائب ہو گئیں۔ اسی صبح رضیہ ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیتوں میں گھوم پھر رہی تھی۔ رات کو وہ لڑکیوں کے ساتھ ڈھولک پر گیت گا رہی تھی۔ رضیہ سراپا ترنم اور شگفتگی بنی ہوئی تھی اور ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔

اگلی صبح گاؤں کے کنوئیں پر کسی عورت کو رضیہ کے سوا اور کوئی موضوع ہی سوجھتا تھا۔ مردوں تک کی رائے بدل گئی تھی۔ پھر یہ ساری باتیں، سب شکوے اور تمام شکوک چند لفظوں میں سمٹ آئے___ ''یہ تو اپنے گاؤں کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ ہم بھی سوچتے تھے کہ اشرف اتنا کم عقل تو نہ تھا''۔

عرشو کا یہ حال تھا جیسے اشرف کے ننھے کو بہلانے اور اٹھائے پھرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو بچے کو اٹھا کے نکل جاتی تھی سوجاتا تھا تو لے آتی تھی اس کی مسرت غیر معمولی تھی۔

صرف خالہ تھی جو تین روز تک باہر نہ نکلی بہن نے اسے بلا بھیجا۔ کچھ عورتوں نے کہا سنا تو بے دلی سے چلی آئی۔ رضیہ کو بڑی بے رخی سے دو روپے سلامی دی اور روٹھنے کے انداز سے الگ بیٹھ گئی۔ خالہ کو توقع تھی کہ اشرف کی ماں، بہو کے نقائص بیان کرے گی، بیٹے کی خودسری اور بیوقوفی کا رونا روئے گی، لیکن اشرف کی ماں نے رضیہ کی تعریفیں شروع کر دیں۔ خالہ کی ہستی میں آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑے اور وہ بہن کے گھر سے نکل کر نمبردار کے گھر جا گھسی۔ وہ نمبردارنی کے ہاں دل کا غبار نکالنے گئی تھی لیکن بات شروع نہ کرنے پائی تھی کہ نمبردارنی بول پڑی۔

''ریشم بوا! آباد رکھے، تیری بہن کی بہو تو بڑی سگھڑ ہے خدا قسمت والوں کو ایسی

بہو......''

خالہ اس سے آگے کچھ نہ سن سکی۔ اس کے سینے میں دھماکے ہونے لگے۔ جلی بھنی وہاں سے نکلی تو اپنے گھر کو چل دی۔ راہ میں دیواروں سے چپکے ہوئے اپلے بھی جیسے کہہ رہے تھے — ''خدا نے فضل داد کے بڑھاپے کو چار چاند لگا دیئے ہیں...... رضیہ کے سامنے زینب کیا ہے۔ مٹی کی ماری ہوئی مٹی کی ڈھیری''۔

راستے میں اسے تین چار عورتیں ملیں تو سب نے باری باری کہا — ''بہو کو دیکھ آئیں ریشم بوا؟ بڑی نیک لڑکی ہے، اللہ سب کو ایسی بہو دے''۔

یہ آوازیں خالہ کے جسم کے ساتھ گرم لوہے کی سلاخوں کی طرح چپکتی چلی گئیں۔ خالہ وہ عورت تھی جس نے دروازے کے سامنے سے دو گھونٹ پانی نہیں گزرنے دیا تھا۔ سارے گاؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئی تھی اور اپنے جوان بھائی کو قتل کروا دیا تھا۔ آج اس خالہ کی ناک کے اوپر سے جیسے غلیظ گندا پانی گزر رہا تھا اور وہ بے بس تھی۔

چک والے چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ بارے خالہ کو یوں لگا جیسے اس کے کپڑے اتار کر اسے گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا جا رہا ہو اور چک والے ڈھول بجا رہے ہوں۔

عورت کے سینے میں چڑیل بیدار ہو گئی۔

فصل کٹ چکی تھی۔ دانے گھروں میں آ گئے تھے۔ کھیت ستا رہے تھے۔ کسانوں کی نگاہیں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تلاش کر رہی تھیں۔ ساؤنی کی بوائی کے دن آیا چاہتے تھے۔ گرمی بڑھ رہی تھی۔

+ + +

ایسی ہی گرم رات تھی۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ گاؤں سویا ہوا تھا۔ فضل داد اور اس کی بیوی صحن میں اطمینان کی گہری نیند سو رہے تھے۔ اشرف اور رضیہ چھت پر لیٹے باتیں کر رہے تھے۔ اکبر شاہ کا مقبرہ اونگھ رہا تھا۔ خالہ کے گھر موت کا سناٹا تھا۔ اس کا خاوند شکست خوردہ سی نیند میں بے سدھ پڑا تھا۔ زینب علیل سے خراٹے لے رہی تھی مگر خالہ جاگ رہی تھی۔ اس کی پُراسرار سرگوشیاں کھرلی کے عقب میں سسک رہی تھیں اور رات کی ہولناک تاریکی میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ وہ دودھ کا بھرا ہوا مٹی کا پیالہ عرشو کو دے رہی تھی۔

''تم بے غم ہو جاؤ'' — عرشو نے پیالہ لیتے ہوئے سرگوشی کی — ''صبح تک تمہیں

تسلی ہو جائے گی''۔

اور سن عرشو!'' — خالہ کی لرزتی مگر پختہ کار سرگوشی سنائی دی — ''یہی پیالہ تمہیں دونیوں اور چونیوں سے بھر دوں گی...... اور ایک بار پھر سن لے۔ خیال رکھنا کہ یہ دودھ صرف اور صرف رضیہ پیئے، کہیں میرا بھانجا ہنسی مذاق میں ایک گھونٹ نہ لے''۔

''اچھا، اچھا فکر نہ کرو'' — عرشو نے کہا — ''میں چلی وہ ابھی جاگ رہے ہوں گے رات زیادہ تو نہیں گذری''۔

''اور سن'' — خالہ نے اسے پھر روک لیا اور اس کے کان میں کہا — ''ان کے پچھواڑے سیڑھی لگی ہوئی ہے...... اور دیکھ، لڑکی نے اگر پیالہ رکھ لیا اور دودھ نہ پیا تو لاڈ پیار سے ایک دو گھونٹ پلا کر باقی لے آنا۔ ایک ہی گھونٹ سے کام ہو جائے گا۔ پیر چنن شاہ نے بڑے کام کی چیز منگوا دی ہے۔ شاہ جی کہتے تھے کہ زبان پر ایک قطرہ رکھنے سے آدمی پار ہو جاتا ہے'' — خالہ نے مٹھیاں بھینچ لیں اور عرشو کے ہاتھ اس طرح کانپے کہ دودھ بھی چھلک اٹھا مگر عرشو نے سنبھال لیا۔

اور دو سائے رات کی تہہ در تہہ تاریکی میں مل گھل گئے۔

+ + +

چھت پر اشرف چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ رضیہ اس کے پاس نیم دراز تھی۔ اس نے پچھواڑے کی منڈیر سے ابھرتا ہوا ایک سر دیکھا اور وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ ڈر سی گئی اور پیشتر اس کے کہ اشرف کو بتاتی، سر اوپر اٹھ کر عورت بن چکا تھا اور عورت ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''میں جانتی تھی تم جاگ رہے ہو گے''۔

''ارے عرشو!'' — اشرف نے اٹھ کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''گھبرا کیوں گئے؟'' — عرشو نے ان کے قریب آ کر اپنے مخصوص اور شگفتہ لہجے میں کہا — ''میں اپنا حق انعام لینے آئی ہوں۔ اتنے روز خود نہ بولی اور تم ٹرخا ہی گئے...... یہ لے رضیہ! دودھ پی اور چل نیچے ٹرنک کھول کر نیا جوڑا نکال میرے لیے اور یاد رکھنا میں دوپٹہ فیروزی رنگ کا لوں گی''۔

''کیا وقت ڈھونڈا ہے حق انعام لینے کا'' — رضیہ نے ہنس کر کہا — ''دن کو کیوں نہ مانگا؟''

''صبح لے لینا''۔ اشرف بولا۔

عرشو چارپائی کے قریب بیٹھ گئی اور بولی ــــ ''اشرف!'' ــــ اس کے ساتھ اسے ابکائی آئی جیسے قے کر دے گی۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر سنبھل گئی۔ اس کی ابکائی نے عرشو کی تمام شگفتگی جیسے پیٹ میں پھینک دی ہو عجیب دُکھے ہوئے لہجے میں بولی ــــ ''کون جانے صبح آئے گی کہ نہیں...... لے اچھی دلہن! دودھ پی لے ٹھنڈا ہو رہا ہے...... حق انعام کیسا اشرف! آدھی رات کمین ذات اونچے گھروں کو کہاں کھٹکھٹاتے ہیں یونہی خیال آیا تھا کہ جب سے تم دونوں آئے ہو تمہیں دودھ نہیں پلایا''۔

دوسرے لمحے دودھ کا پیالہ رضیہ کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا۔ رات پُراسرار خاموشی سے گذر رہی تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرپور تھا۔ رضیہ نے آدھا دودھ چھوڑ دیا۔ عرشو نے پیالیہ اشرف کے ہاتھ میں دے دیا کہا ــــ ''لو نا! تم بھی پیو''۔

اور باقی دودھ اشرف نے پی لیا۔

عرشو نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اسے پھر ابکائی آئی۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ عرشو کا پسینہ نکل آیا بڑی مشکل سے تلخ سا گھونٹ نگل کر بولی ــــ ''اگر میں کہوں کہ دودھ جو تم نے پیا ہے اس میں زہر تھا تو تم کیا کہو گے؟''

''کہ عرشو نے زہر پلا دیا ہے'' ــــ رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

عرشو نے آسمان کی طرف دیکھا لمبی سانس لی جیسے جلتے ہوئے سینے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہو۔

''اشرف اور رضیہ!'' ــــ عرشو ایک ہاتھ اشرف کے گھٹنے پر اور دوسرا رضیہ کے زانو پر رکھ کر بولی ــــ ''اب میں جو کچھ کہوں خاموشی سے سنتے رہنا۔ مجھے روکنا ٹوکنا نہیں چند سانس باقی ہیں وقت پورا ہو گیا ہے......'' اشرف کچھ کہنے لگا تھا کہ عرشو نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا ــــ ''اس پیالے میں تمہاری خالہ نے دودھ میں زہر ملایا تھا''۔

''کیا کہا تم نے؟'' ــــ اشرف ہڑبڑا کر بولا۔

رضیہ کو جیسے چکر آ گیا ہو۔

''نہیں!'' ــــ عرشو نے آہستہ آہستہ سر ہلا کر کہا ــــ ''جو دودھ میں نے تمہیں پلایا

ہے، یہ میری گائے کا تھا۔ وہ زہر والا دودھ بکری کا تھا، اسی بکری کا جو تمہاری خالہ پیر چنن شاہ کے لیے پال رہی ہے''۔

''وہ دودھ کیا کیا تم نے؟'' ــــ رضیہ نے گھبراہٹ سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تھوڑی ہی دیر ہوئی آدھا چنن شاہ کو پلا آئی ہوں'' ــــ عرشو نے کہا ــــ ''اور باقی اس کے پاس بیٹھے خود پی لیا ہے...... یہ زہر چنن شاہ ہی نے منگوا کر دیا تھا، اسی کو پلا آئی ہوں''۔

''چنن شاہ کو کیوں؟'' ــــ اشرف نے گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں پوچھا۔

''اس لئے کہ اس نے تم دونوں پر جادو کر رکھے تھے'' ــــ عرشو نے کہا اور اسے ایک بار پھر ابکائی آئی۔ دونوں ہاتھ سینے پر اور سر گھٹنوں میں دبا کر سنبھل گئی۔ سر اٹھایا تو ہیبت ناک تیزی سے بولنے لگی ــــ ''تیری خالہ اور چنن شاہ رضیہ کی جگہ زینب کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ چنن شاہ کا دوسرا جرم یہ ہے کہ اس نے گاؤں کے نہ جانے کتنے بچے اپنے دادا کی قبر کی خاک کھلا کھلا کر قبروں میں اتار دیئے ہیں۔ اس کے تعویذوں نے نہ جانے نمونئے کے کتنے مریض مار دیئے ہیں...... اشرف! چنن شاہ نے اتنے خون کئے ہیں کہ گنے نہیں جاتے اور اب زینب کا خون بھی مقبرے کی مٹی چوس چکی ہے۔ چنن شاہ کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ زینب اس کی اپنی بیٹی ہے...... یوں حیران ہو کر میری طرف نہ دیکھو، یہ بھید راتوں کے اندھیروں سے پوچھو۔ ان اندھیروں کے پردوں میں جھانک کے دیکھو، تمہیں چنن شاہ مادرزاد ننگا نظر آئے گا۔ اس کی داڑھی کے بال تمہیں کہانیاں سنائیں گے۔ تمہاری خالہ چنن شاہ کی خاص مریدنی ہے۔ مجھ سے پوچھو کہ زینب کا باپ کون ہے۔ مجھے بھی ایک بار خالہ، برسوں گذرے، چنن شاہ کے پاس مریدی کے لیے لے گئی تھی اور میں آج رات تک چنن شاہ کی جان لینے کو تڑپتی رہی ہوں۔ اس علاقے میں صرف عرشو نائن ہے جو کسی پیر کی مرید نہیں۔ لوگ مجھے بے پیری کہتے ہیں اشرف! میں اپنی پیر ہوں اور اپنی مرید ہوں''۔

عرشو کو چکر آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چھت کی مٹی پر رکھ لئے اور ایسی سرگوشی میں بولی جس میں چیخیں رکی ہوئی تھیں ــــ ''اٹھو، بھاگو یہاں سے...... اٹھا لو بچے کو...... پچھواڑے کی سیڑھی سے اتر جاؤ، دیر نہ کرو۔ شہر اپنے گھر پہنچو، گاؤں میں چڑیلوں کی

بادشاہی ہے''۔

عرشو اٹھ کھڑی ہوئی اور سوئے ہوئے بچے کو اٹھا کر رضیہ کی گود میں ڈال دیا اور رضیہ کو کندھوں سے تھام کے اٹھا لیا۔۔۔ ''آہستہ بولو اشرف!''۔۔۔ اشرف جانے کیا کہہ رہا تھا کہ عرشو نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔۔۔ ''آہستہ بول تمہارے ماں باپ جاگ اٹھے تو تمہیں روک لیں گے۔ تمہاری خالہ رضیہ کو زندہ دیکھ کر نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ وہ رضیہ کا خون کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہے۔ چنن شاہ اس کے ساتھ ہے اور چنن شاہ اس علاقے کا خدا ہے...... رہنے دو ٹرنک اور زیور کو اشرف! تمہارے ماں باپ کے گھر میں رکھا ہے ماں باپ کو شہر بلا لینا تمہارا سامان لے کر آ جائیں گے''۔

اشرف اور رضیہ پر جادو کا سا اثر ہو رہا تھا۔ صورتِ حال اس قدر پُراسرار اور ہولناک تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو عرشو کے حوالے کر دیا۔ ان کی حالت سہمے ہوئے بچوں کی سی ہو گئی۔

✦ ✦ ✦

تھوڑی دیر بعد اشرف اور رضیہ رات کے بھیانک سناٹے میں عرشو کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ گاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ذرا پرے اکبر شاہ کا مقبرہ ایک سینگ والے دیو کی طرح کھڑا تھا۔

عرشو کو دم بھر کے لیے چین سا آ گیا بولی۔۔۔ ''سٹیشن دور نہیں...... یہ لو میں تمہارے لیے دس روپے لائی تھی تمہارے پاس پیسے نہیں ہوں گے''۔

''عرشو!''۔۔۔ اشرف ڈرے ہوئے معصوم سے بچے کی طرح بولا۔۔۔ ''ہم چلے جائیں گے''۔۔۔ اس نے دس کا نوٹ عرشو کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔۔۔ ''تم گھر چلی جاؤ اور جاتے ہی گھی اور کالی مرچیں کھا لو تمہیں قے ہو جائے گی اور زہر باہر نکل آئے گا''۔

''نہیں اشرف پیارے! اب عرشو جی چکی''۔۔۔ عرشو نے دونوں ہاتھ بجلی کی تیزی سے سینے پر رکھ لیے اور اس کے منہ سے دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔۔۔ ''ہائے میرا سینہ جل گیا''۔۔۔ اور وہ دانت پیس کر بیٹھ گئی۔

اشرف اس کی طرف بڑھا تو وہ زخمی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ بولی۔۔۔ ''چلتے چلو، چلتے چلو اور میری باتیں سنتے جاؤ''۔۔۔ اور اشرف اور رضیہ یوں اس کے ساتھ ساتھ چل

پڑے جیسے دو ننھے ننھے بچے زلزلوں کے شدید جھٹکوں سے ڈر کر بھاگ رہے ہوں اور ماں کے دامن میں چھپ جانا چاہتے ہوں۔

عرشو کہہ رہی تھی۔۔۔ ''میں نے بیوگی کاٹی ہے اور بھید سینے میں دبائے جیتی رہی ہوں۔ کس کو سناتی؟ آج کی رات تم سن لو...... لوگ مجھے ہنس مکھ اور زندہ دل عورت کہتے رہے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ میں نے ہنسی اور مسکراہٹوں میں کیسے کیسے روگ اور کیسے کیسے بھید چھپا رکھے تھے۔ میری ہنسی تو ایک فریب تھا اشرف! کوئی ایسا نہ ملا جسے دل میں بٹھاتی اور جس کا ہاتھ تھام کر اپنے دل پر رکھتی...... اشرف اور رضیہ! میں نے دل میں جو کچھ چھپا رکھا ہے وہ اس زہر سے زیادہ تلخ ہے جو میری انتڑیاں کاٹ رہا ہے۔ آج اُگل دیتی ہوں پھر میں تمہاری خالہ کے زہر کی تلخی محسوس کیے بغیر چین سے مر سکوں گی''۔۔۔ گاؤں گہری نیند سو رہا تھا اشرف اور رضیہ بچے کو سینے سے لگائے اور عرشو زہر کی تلخی رگ رگ میں جذب کرتی گاؤں کی فریب خوردگی سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ عرشو کبھی پیٹ کو اور کبھی سینے کو دباتی تھی اور سخت کڑوے گھونٹ نگل نگل کر بولے جا رہی تھی۔

''میں نے زندگی میں آج دوسری بار زہر پلایا ہے۔ اپنے خاوند کو میں نے زہر دیا تھا۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس روگ سے مرا تھا۔ وہ زہر ہی ایسا تھا...... اور آج چنن شاہ کو زہر پلا آئی ہوں''۔

وہ پھر رک گئی اور خوفناک سی ہنسی ہنس دی۔ اشرف اور رضیہ سہم گئے عرشو نے کہا۔

''ایک خون اور بھی میری گردن پر ہے۔ نمبردار کے گبھرو بیٹے کو میں قتل کیا تھا، گلا گھونٹ کر۔ اسی مقبرے کی اندھیری اوٹ میں۔ عزت بڑی پیاری چیز ہوتی ہے۔ رضیہ! کمین کو بھی عزت کا پاس ہوتا ہے۔ نمبردار کے بیٹے نے ایک رات مجھے وہاں روک لیا تھا۔ رات آج ہی کی طرح اندھیری تھی۔ اوپر ستارے ٹوٹ رہے تھے نیچے عرشو نائن کی انگلیاں ایک جوان راجپوت کی گردن میں دھنس رہی تھیں...... مرد کے سینے میں شیطان ناچا تھا عورت کے سینے میں چڑیل جاگ اٹھی تھی...... ایک دکھ اور ہے جو تمام عمر مجھے کھاتا رہا ہے اور یہی دکھ لئے مر رہی ہوں...... کتنا بڑا دکھ ہے کہ تاجا کمہار نمبردار کے بیٹے کے قتل میں بے گناہ پھانسی چڑھ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے جھوٹی گواہیاں دی تھیں۔ اوہ خدایا! میں نے اس وقت کیوں نہ کہہ دیا کہ قاتل میں ہوں تاجا کمہار تمام عمر روح کی طرح میرے آگے پیچھے منڈلاتا رہا

ہے۔ میں نے اسی لیے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ میں نے آدھی رات کے وقت نہا دھو کر مسجد میں جا کے قسم کھائی تھی کہ تاجی اٹھے تو اسی سے شادی کروں گی۔ نہ وہ زندہ ہوا نہ میں نے شادی کی۔ میں جانتی تھی۔ ایسے ہی ہوگا...... چلتے چلو چلتے چلو مجھ میں ابھی دم ہے زہر انتڑیوں کو کاٹ رہا ہے''۔

''لوٹ جاؤ عرشو! واپس چلی جاؤ''___ رضیہ نے رندھیائی ہوئی خوفزدہ آواز میں کہا اور بے اختیار رو دی۔ اشرف نے اس کندھے تھام لیے لیکن وہ خود بھی خوفزدہ تھا۔ اس کی مردانگی اور عقل و ہوش رات کے اندھیرے نے چوس لئے تھے۔

''مجھے لوٹ ہی جانا ہے رضیہ!''___ عرشو نے زہر آلود مسکراہٹ سے کہا___ ''تمہیں راہ پر ڈال کر چلی جاؤں گی...... اکبر شاہ کا مقبرہ وہ سامنے اندھیرے میں نظر آ رہا ہے۔ اس مقبرے میں جا کر مروں گی...... اکبر شاہ کی قبر کے اوپر...... کل لوگ چنن شاہ کو بھی اسی مقبرے کے نیچے دفن کریں گے۔ چنن شاہ کے باپ دادا بھی اسی مقبرے کے نیچے دفن ہیں قیامت کے روز جب مردے اٹھائے جائیں گے تو میں ان تینوں کے گریبان یہیں سے پکڑ لوں گی، ورنہ اس روز انہیں کہاں ڈھونڈتی پھروں گی...... اف خدایا! میری سانس رک رہی ہے''۔

اس پر اب ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر بلند آواز سے بولنے لگی___ ''اوہ! ابھی نہیں، میرے خدایا اس مقبرے تک پہنچ لینے دے...... ذرا سی دیر...... ذرا سی دیر......''

عرشو بیٹھ گئی۔ اشرف اور رضیہ اس کے پاس رک گئے۔ عرشو نے سر اٹھایا اور درد سے کراہتی ہوئی آواز میں بولی___ ''اشرف میں نے تمہیں آٹھ روز ان چھاتیوں سے وہ دودھ پلایا ہے جن میں آج زہر بھر گیا ہے۔ میرا اپنا بچہ انہی دنوں مرا تھا تو ایک سال کا تھا۔ تیری ماں بیمار ہوئی تو میں تجھے اٹھا لے جاتی تھی اور چوری چھپے تجھے اپنا دودھ پلاتی رہتی تھی۔ کسی نے پوچھا تو کہہ دیا تھا کہ بکری کا دودھ پلاتی ہوں۔ یہ بھید کسی کو معلوم ہو جاتا کہ راجپوت کے بچے کو نائن نے دودھ پلایا ہے تو نائن کے ٹکڑے نہ کر دیئے جاتے؟ میں نے تو دور دور بیٹھ کر تیری پوجا کی ہے اشرف! میں نے تجھے اپنے بچے کا دودھ پلایا ہے۔ کاش میں نائن نہ ہوتی یا تُو راجپوت نہ ہوتا، ہم دونوں انسان ہوتے''۔

عرشو کی آواز اکھڑ گئی۔ درد اور جلن سے دوہری ہوگئی۔ اسے تلخ سی کھانسی کا دورہ اٹھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر چیخ کر بولی___ ''ستارے ٹوٹ رہے ہیں...... آسمان ٹوٹ رہا ہے...... اشرف! رضیہ! کہاں ہو تم؟ بچہ کہاں ہے؟...... جاؤ! بھاگو...... مجھے میرا بچہ دکھائی دینے لگا ہے''۔

اشرف اور رضیہ خوفزدہ سے قدم اٹھاتے چل پڑے۔ عرشو وہیں بیٹھے بیٹھے بولی___ ''صبح مرغ اذانیں دیں گے، ہالی ہل جوتیں گے، دنیا جاگ اٹھے گی...... پر نہ چنن شاہ اٹھے گا نہ عروشو نائن جاگے گی''۔

عرشو ایک ہی جھٹکے سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح مقبرے کی طرف بھاگ اٹھی...... وہ چیختی چلاتی بھاگی جا رہی تھی۔

چھتوں پر سوئے ہوئے بعض لوگوں کی آنکھ کھل گئی لیکن وہ دبک گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ جوہڑ کے کنارے شیشم کے پیڑ میں جنوں اور چڑیلوں کا بسیرا ہے۔ یہ چیخیں انہی چڑیلوں کی ہیں۔ چنن شاہ نے بھی گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے جوہڑ میں چڑیل کو نہاتے دیکھا ہے۔

دوسری صبح جب لوگ اکبر شاہ کے مقبرے میں چنن شاہ کی قبر کھودنے گئے تو دیکھا کہ عرشو نائن کی لاش اکبر شاہ کی قبر پر پڑی تھی۔ قبر پر بچھی ہوئی سبز چادر کو عرشو کی لاش نے اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے روزِ قیامت کسی نے کسی کا گریبان پکڑ رکھا ہو۔

⌘ ⌘ ⌘

حویلی

حمیدی

حویلی اُجڑی ہوئی ہے۔

ہم کھیل رہے ہیں۔

اور کہاں جا کر کھیلیں؟ بچوں کو ہر جگہ کھیلنے بھی کوئی نہیں دیتا۔ خدا جانے گھر والوں کو دوپہر کے وقت سونے کا کیا خبط ہے اور ان کی یہ ضد بھی کہ ہم بھی سو جائیں۔ ماں باپ ہمیں دوپہر کے وقت صرف اس لیے سلانے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ وہ خود آرام کی نیند سو سکیں۔ ان ماؤں، باپوں، بڑے بہن بھائیوں اور بڈھے دادا کو ہم ذرا ذرا جتنے بچے کیسے سمجھائیں کہ ہم ان کی نیند میں نہیں بلکہ وہ ہمارے کھیل میں مخل ہو رہے ہیں۔ برآمدے میں کھیلو تو ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آنگن میں کودو تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ بتایئے ہم کہاں جا کر کھیلیں؟ جانے کیسی نیند ہے ان بڑوں کی! ہم بھی ہیں نا کہ رات بھر یوں سوتے ہیں کہ سر پر بجلی کڑکتی رہے ساتھ والے کمرے میں دادا جان چھت شگاف خراٹے لیتے رہیں، کیا مجال کہ ہم جاگ جائیں اور اگر ہم جاگ بھی جائیں تو ہم نے بھلا کبھی شکایت کی ہے کہ کسی بزرگ کی بلند سرگوشی نے ہمیں جگا دیا ہے؟

ہمیں دادا کے خراٹوں کے خلاف ہلکی سی شکایت ضرور ہے لیکن وہ ہم اس شرط پر برداشت کر لیتے ہیں کہ ہمیں دوپہر کے وقت برآمدے میں کھیلنے سے روکا نہ جائے۔ مگر ہمارے شرط کوئی سنتا ہی نہیں۔ نتیجتاً دادا کے خراٹے بند نہیں ہوتے اور ہم آنگن میں کد کڑوں سے باز نہیں ہوتے۔ گھر والے دوپہر کے وقت سونے سے باز نہیں آتے، ہم سونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

خدا ان اگلے وقتوں کے بچوں کو ان گنت بچے دے جنھوں نے محلے کی نکلے والی گلی

میں ایک اجڑی ہوئی حویلی دریافت کی تھی جس سے ہمارے بڑوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا ہے۔اب وہ دوپہر آرام سے سوتے ہیں اور ہم کسی کی نیند میں مخل ہوئے بغیر اس حویلی میں کھیلتے ہیں۔ بارہ بجے سکول سے چھٹی ہوتی ہے۔ایک بجے تک کھانے سے فارغ ہو کر ہم محلے کے تمام بچے...... ہر سائز اور ہر ڈیزائن کے......اس حویلی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں کوئی بزرگ سونے نہیں آتا۔ آئے بھی کیسے؟ یہاں ہماری حکمرانی ہے۔ اس کے علاوہ محلے والوں کا خیال ہے کہ یہ حویلی آسیب زدہ ہے۔ یہاں بدروحیں رہتی ہیں جو رات کے وقت چمگادڑوں کے روپ میں باہر نکل آتی ہیں۔

نکل آتی ہوں گی!

دادا جاں کہتے ہیں کہ یہ حویلی ان کے لڑکپن میں اجڑی تھی۔اس کے ایک اندھیرے کمرے میں گھر کے ایک آدمی کو اس کی بیوی نے قتل کر ڈالا تھا۔مقتول کی لاش کمرے کے فرش میں دبی ہوئی ملی تھی۔ محلے کے ایک آدمی کو شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا لیکن مقتول کی بیوی نے پولیس کے نام ایک خط لکھ کر خودکشی کر لی تھی۔اس نے اس آخری خط میں اقبال جرم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اپنے خاوند کی قاتل وہ خود ہے، کیونکہ وہ مقتول کے ساتھ خوش نہیں تھی۔شک میں گرفتار ہونے والا رہا کر دیا گیا تھا۔

دادا کہتے ہیں کہ وہ چند مہینوں بعد جانے کس روگ سے مر گیا تھا۔حویلی میں مقتول کے دو بھائی بھی رہتے تھے۔دونوں بال بچے دار تھے۔اس واردات کے چھ ماہ بعد وہ حویلی چھوڑ کر جانے کہاں چلے گئے تھے۔بعض کہتے ہیں ہندوستان، بعض کا خیال ہے کہ کراچی چلے گئے تھے۔ایک سال بعد ایک بھائی لوٹ کے آیا تھا۔گھر کا کچھ سامان بیچ کر باقی ساتھ لے گیا تھا۔دادا سناتے ہیں کہ محلے والوں نے پوچھا تھا کہ وہ کون سے دیس جا بسے ہیں؟ جانے والوں نے اسی قدر بتایا تھا کہ مقتول کی بدروح ان کے بچوں کو ڈراتی ہے اور آدھی رات کے وقت کبھی کبھی حویلی کی دیواریں بڑے زور سے لرزتی ہیں۔

دادا کے لڑکپن سے یہ حویلی غیر آباد ہے۔گویا اسی پچاسی برس سے۔حویلی کی شکل گول دائرے کی سی ہے۔گولائی میں بیس کمرے ہیں۔جن کے آگے ایک ہی برآمدہ گولائی میں چلا گیا ہے۔برآمدے کے بیس ستون ہیں۔بیس تھے۔اب چودہ باقی ہیں۔باقی دیمک نے کھا لئے ہیں یا چھت کے ملبے نے چھپا لئے ہیں۔باقی صحن ہی صحن ہے۔اگر صحن کے وسط

میں بڑ کا صدیوں پرانا چھتری نما درخت نہ ہوتا تو صحن اس قدر فراخ ہے کہ آسانی سے کرکٹ گراؤنڈ بن سکتا ہے۔ بڑ کا درخت اس قدر پھیل گیا ہے کہ تقریباً سارا صحن اس کے سائے تلے آ گیا ہے۔اس کی شاخیں ایک طرف سے منڈیر کو چھوتی ہیں۔ٹہنوں سے لٹکتی ہوئی رسوں کی طرح کی جڑیں زمین میں گھس کر موٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ درخت دور دور سے قصبے کے وسط میں بہت بڑے سبز گنبد کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

صحن اور برآمدوں میں کائی اگی رہتی ہے۔کہیں کہیں زمین سیم زدہ ہے۔سفید سی تہہ جمی رہتی ہے۔نشیبی جگہوں میں جنگلی بوٹیاں اگتی ہیں، بڑھتی ہیں، مرجھاتی ہیں اور سوکھ جاتی ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو پھر ہری ہو جاتی ہیں۔ساون میں سوائے سیم زدہ جگہوں کے سارے صحن اور برآمدوں میں اونچی اونچی گھاس اور ہماری پھینکی ہوئی آم کی گٹھلیوں سے آم کے پودے اگ آتے ہیں جنہیں ہم گٹھلی سمیت اکھاڑ کر گٹھلی کو دیوار کے ساتھ رگڑ کر ''پپنی'' (باجے) بنا لیتے ہیں۔منہ میں رکھ کر پھونک مارتے ہیں تو یہ بجتی ہیں۔ان میں سے کسی کی آواز باریک ہوتی ہے، کسی کی موٹی، کسی کی باریک نہ موٹی اور کسی کی آواز ہوتی ہی نہیں۔ پھونک مارنے سے شوں شوں ہوتی ہے، کیونکہ ان کے دوسری طرف بھی سوراخ ہوتا ہے۔

دیواروں میں بھی کہیں کہیں سبز کائی سی اگی ہوئی ہے۔ایک کمرے کے دروازے کے ذرا اوپر دیوار میں پیپل اگ آیا ہے۔ایک صدی کے مہیب عرصے نے دیواروں کا رنگ ایسا کر دیا ہے جس کا ذکر کائنات کے سات رنگوں میں نہیں آتا۔ سیاہ بھی نہیں۔ گہرا سبز بھی نہیں۔ دونوں کی آمیزش سے ایسا رنگ پیدا ہو گیا ہے جس میں رنگت کم اور ہیبت زیادہ ہے۔صرف دو کمروں کے کواڑ سالم ہیں۔ باقی انسانوں نے، زمانے نے، دیمک اور سفید چیونٹیوں نے ہضم کر ڈالے ہیں۔تین کمروں کی چھتیں گری ہوئی ہیں۔باقی کی جھکی ہوئی جن کا بوجھ مکڑی کے جالوں نے تھام رکھا ہے۔ جالے بھی یوں جیسے ململ کے میلے کچیلے چیتھڑے لٹک رہے ہوں۔ہم نے ایک کمرے کے جالوں میں ایک کبوتری کو الجھا ہوا اور مرتے دیکھا ہے۔

منڈیر مکمل گول دائرہ ہے جسے دیکھئے تو دادا جان کے پوپلے منہ کا خیال آ جاتا ہے۔ ہلتے ہوئے اور گرے ہوئے دانتوں کی طرح کہیں کہیں کوئی اینٹ باقی ہے جو گرنے کو

لٹک رہی ہے۔ ہوا کا جھونکا آتا ہے تو ''ساں، ساں'' کی پر ہول سی آواز برآمدے کے گول دائرے میں چکر کاٹتی ہوئی کمروں کے اندھیرے اور لٹکتے ہوئے جالوں میں گم ہو جاتی ہے جیسے دو سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے کسی کمرے میں جا چھپے ہوں۔ حویلی کی سیڑھیاں کبھی کی گر پڑی ہیں۔ چھت محلے کے بیس پچیس مکانوں کی چھتوں سے ملی ہوئی ہے۔ کوٹھے کی طرف سے حویلی میں اترنا ہو تو برآمدے کی دو جگہوں سے گری ہوئی چھت کے راستے اترا اور چڑھا جا سکتا ہے۔ چھت کی لکڑیوں نے چھت کو بڑی اچھی طرح تھام کر ڈھلان سی بنائی ہوئی ہے۔ ہم آنکھ مچولی کھیلتے ہیں تو اسی ملبے کے راستے اوپر آتے جاتے ہیں۔

اس ہوحق سی ویران حویلی میں بدروحیں اور چڑیلیں رہتی ہیں یا نہیں، ہم بچے کیا جانیں۔ امی جب بھی مجھے چڑیل کے نام سے ڈراتی ہے میں پوچھتا ہوں۔

''امی! چڑیل کیسی ہوتی ہے؟'' اور جب امی چڑیل کا حلیہ بیان کرتی ہے تو میں اس قدر سمجھ سکتا ہوں کہ چڑیل اچھی خاصی عورت ہوتی ہے، فرق صرف اتنا نظر آتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں الٹے ہوتے ہیں، عورتوں کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوتے ہیں لیکن دماغ کا زاویہ ذرا مشکوک نظر آتا ہے۔ امی کہتی ہیں کہ چڑیل کے دانت لمبے ہوتے ہیں۔ یہ بھی کوئی حیران کن بات نہیں۔ نہ اس میں ڈرنے والی کوئی بات ہے۔ اپنے مولوی صاحب کی بڑی بیٹی زبیدہ کے دانت بھی لمبے ہیں لیکن زبیدہ سے کوئی بھی نہیں ڈرتا سوائے اس کے اپنے خاوند کے۔ یہ بھی ہمیں کاہے کو پتہ چلنا تھا۔ ایک روز ابا امی سے کہہ رہے تھے کہ فضل دین کا نورداد اپنی بیوی سے بہت خوف کھاتا ہے اور امی نے ابا جان کو کچھ ایسی تفصیلات سنائی تھیں جو میری سمجھ سے بالا تھیں۔ صرف ایک بات پلے پڑی تھی کہ زراعت انسپکٹر کا جوان بیٹا، اشرف جب گلی میں سے گزرتا ہے تو نورداد کی بیوی زبیدہ دروازے کے ساتھ لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے اسے دیکھ کر ہنستی بھی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھی بھرتی ہے۔ بہر حال نورداد کی بیوی کے لمبے دانتوں سے ڈرنے کے لیے ہم بچوں کے پاس کوئی وجہ نہیں اور اگر چڑیلوں کی شکل و شباہت زبیدہ کی طرح ہوتی ہے تو ایسی چڑیلیں اجڑی ہوئی حویلی میں نہیں ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہاں پردے کا کوئی انتظام نہیں۔

ہم بچے تو حویلی کے دیمک خوردہ کواڑوں اور عمر خوردہ دیواروں کے ساتھ مانوس ہو

گئے ہیں۔ ہم نے ان سینکڑوں جنگلی چوہوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیا ہے جو کمروں اور برآمدوں میں پھدکتے پھرتے ہیں۔ ان خرگوشوں کے ساتھ بھی جو یہاں بچے پیدا کرنے اور انہیں بڑا کر کے ہجرت کر جانے کے لیے آتے ہیں۔ وہ دو آوارہ کتیاں بھی ہم پر نہیں بھونکتیں جو یہاں بچے جن کر ان کی حفاظت کے لیے بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان سینکڑوں چھپکلیوں کے ساتھ بھی اور چمگادڑوں کے غولوں سے بھی ہم مانوس ہو گئے ہیں جو دن کے وقت بھی اڑتے اور دیواروں سے ٹکراتے رہتے ہیں اور اس سانپ کے جوڑے کے ساتھ بھی جو ہمیں کھیلتا دیکھ کر جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ بڑ کی گھنی شاخوں میں دبکے بیٹھے ان گنت گدھ چیلیں اور کوے بھی ہمارے لیے اجنبی نہیں جو ساتھ والی سڑک پہ گزرتے ہوئے کسی ٹرک کے بیک فائر کے دھماکے سے ایسی ہیبت ناک پھڑ پھڑاہٹ سے بیک وقت اڑتے ہیں کہ در و دیوار کانپنے لگتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے کانپ کانپ کر گر پڑیں گے۔ پھر وہ ایک ایک کر کے فضا کی وسعت میں سے اتر کر شاخوں میں بیٹھتے ہیں جیسے بدروحیں آسمان سے اتر رہی ہوں۔ ہمیں حویلی کی ہیبت اور ہر شے سے پیار ہو گیا ہے۔ اگر یہاں واقعی بدروحیں آباد ہیں تو بخدا انہیں بھی ہم سے انس ہو گیا ہے اور ہم یہاں ڈرتے نہیں۔

لیکن جو آدمی بھولے بھٹکے پہلی بار اس حویلی میں قدم رکھتا ہے ایک بار تو اس پر ڈوبنے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے مان لیتا ہے کہ یہاں چند ایک بدروحیں ہی نہیں بلکہ فرشتۂ اجل، دنیا بھر کی روحیں، کیا نیک کیا بد، انہی کمروں میں لا بند کرتا ہے اور جن چڑیلوں کو اور کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا وہ اسی بڑ کے گھنے پیڑ میں اور جھکی چھتوں کے جالوں میں گھونسلے بنائے ہوئے ہیں اور یہ روحیں اور چڑیلیں رات بھر لڑ لڑ کر ریلوے کے زنانہ تھرڈ کلاس ڈبے کا منظر پیدا کرتی ہوں گی۔

ہم اس حویلی میں صرف دو دفعہ ڈرے ہیں۔ تیسری دفعہ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ ہم نے اس ڈر کے ساتھ بھی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ پہلی دفعہ یوں ہوا، اس وقت میری عمر چھ برس کے لگ بھگ تھی۔ عمر تو میری اب بھی چھ ہی برس ہے لیکن وہ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ ساون کے دن تھے۔ حویلی کے صحن میں جگہ جگہ آم اگے ہوئے تھے۔ ہم پندرہ بیس بچوں نے پودے اکھاڑ کر گٹھلیوں کو رگڑا۔ کوئی دس گیارہ پپنیاں بنائیں۔ طے پایا کہ سب

مل کر بجائیں۔ چنانچہ سب نے رگڑی ہوئی گٹھلیاں منہ میں رکھیں۔ ایک نے کہا۔۔۔ ’’ایک دو تین‘‘ ۔۔۔ اور بیک وقت ایسی ’’ٹیں‘‘ کی آواز بلند ہوئی جیسے کئی بگل اکٹھے بج اٹھے ہیں۔ یہ ’’ٹیں‘‘ بمشکل دو سیکنڈ طویل ہو گی لیکن ہم سہم گئے کیونکہ ’’ٹیں‘‘ کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی جبکہ ہم سب نے گٹھلیاں ہونٹوں سے ہٹا کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھیں۔

ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ’’ٹیں‘‘ کی آواز ابھی تک برآمدے کے دو فرلانگ احاطہ میں گھومتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور اس کے ساتھ ’’ساں‘‘ کی آواز جیسے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا جیسے دس بارہ بچے برآمدوں میں ’’پیپنیاں‘‘ بجاتے بے آواز پا بھاگ رہے ہیں اور ان کے قدموں کی بے معلوم سی سرسراہٹ ان کے پیچھے پیچھے اڑی جا رہی ہے۔ ہم نے پہلی بار یقین کیا کہ یہاں شر شرار ہے۔ ہم ابھی تک ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اتنے میں ہمارے سامنے زمین پر دھپ کی آواز بلند ہوئی۔ ہم نے دیکھا کہ دو انسانی انگلیاں، ایک شہادت کی اور ایک درمیانی، جڑی ہوئیں ہمارے درمیان آ گریں۔ یہ انگلیاں شاید اوپر سے گدھ کے پنجوں سے گری ہوں گی۔ ہم اس قدر تیز بھاگے کہ ایک دوسرے سے ٹکراتے گرتے چیختے چلاتے حویلی سے نکلے اور گھروں میں جا دبکے۔

’’تمہیں ہزار بار کہا ہے اسے حویلی میں نہ جانے دیا کرو‘‘ ۔۔۔ یہ ابا جان کی آواز تھی۔

’’تو میں کیا کروں! ذرا آنکھ چوکی اور یہ بھاگا‘‘ ۔۔۔ یہ امی کی آواز تھی۔

میں امی کی گود میں دبکا ہوا تھا۔

’’ذرا دیکھو تو! کس بری طرح کانپ رہا ہے‘‘ ۔۔۔ یہ ابا جان تھے، امی کی گود پر جھکے ہوئے ۔۔۔ ’’کہاں تھے منے؟‘‘

’’حویلی میں‘‘ ۔۔۔ یہ میری لرزتی ہوئی آواز تھی۔

’’دیکھو منے! آئندہ وہاں نہ جانا‘‘ ۔۔۔ یہ امی کی پیار بھری ہدایت تھی ۔۔۔ ’’جیسے یہ تمہارا گھر ہے نا! اسی طرح وہ چڑیلوں کا گھر ہے وہاں نہیں جاؤ گے تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی‘‘۔

پھر امی نے کاغذ کا ایک پرزہ الماری میں سے نکال کر پانی میں گھول کر مجھے پلایا تھا۔

’’لیکن وہ دو انگلیاں؟‘‘ میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن انگلیوں کے تصور سے روح کانپ رہی تھی۔ عمر بھی تو چھ برس ہے۔ اس عمر میں یہ بھی تو مشکل ہوتی ہے کہ کوئی سوال پوچھا کس طرح جائے۔ دماغ میں اتنے الفاظ نہیں ہوتے۔ ماں باپ ہماری بات سمجھتے نہیں اور ان کی ہمارے پلے نہیں پڑتی۔

دوسرے روز محلے کے بہت سارے آدمی گلی میں جمگھٹا کئے ہوئے تھے۔ ہم چند ایک بچے بھی جمع ہو گئے۔ ان آدمیوں کی باتیں سنسنی خیز تھیں۔ بعض آدمی خوفزدہ اور بعض غم زدہ سے تھے۔ مجھے بڑے بچوں نے بتایا کہ دور بہت دور، پرانے قبرستان سے بھی دور گہری کھائیاں ہیں، وہاں کسی آدمی کی لاش پڑی ہوئی ہے جسے گیدڑ اور گدھ کھا رہے ہیں۔ جسم کا کوئی کوئی حصہ باقی ہے۔ پولیس کو کسی نے آج خبر دی ہے۔ بڑے بچوں نے ان آدمیوں کی باتیں سن کر یہ بھی مجھے بتایا کہ ان کھائیوں سے آگے ایک گاؤں ہے وہاں کا ایک موچی کئی روز سے لاپتہ تھا۔ یہ لاش شاید اسی کی ہو گی لیکن شناخت ممکن نہیں۔ اسی مجمع میں ایک دیہاتی سا آدمی تھا، جو اسی گاؤں کا تھا اور شاید وہی پولیس کو خبر دے کر آیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ نمبردار نے اس موچی کے لاپتہ ہونے سے ایک روز پہلے اپنی کنواری بیٹی کو اس قدر مارا تھا کہ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔

’’تو اسے اسی کنواری نے مار کے پھینکا ہوگا‘‘ ۔۔۔ میں نے کہا۔

’’ہاں تو!‘‘ ۔۔۔ مجھ سے بڑے بچے نے تائیداً کہا ۔۔۔ ’’اسی لئے اسے نمبردار نے مارا ہے‘‘۔

’’کنواری بیٹی کیسی ہوتی ہے شمو؟‘‘ ۔۔۔ ایک چھوٹے بچے نے مجھ سے پوچھا۔

’’جو آدمیوں کو مار کر کھائی میں پھینک دیتی ہے‘‘ ۔۔۔ میں نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

’’نہیں بے!‘‘ ۔۔۔ سب سے بڑے بچے نے تردید کی ۔۔۔ ’’کنواری بیٹی ہوتی ہے جس کا خاوند مر جاتا ہے‘‘۔

’’ارے نہیں‘‘۔

’’ہاں!‘‘

اور ہم نے ان آدمیوں سے الگ ہٹ کر اپنا مجمع بنالیا۔ بہت تو تو میں میں ہوئی لیکن معمہ لاینحل ہی رہا۔

ہمارے بیشتر مسائل اور معمے باوا جما حل کیا کرتا ہے۔ باوا جما بہت پیارا بڈھا ہے۔ نہ بیوی نہ بچہ۔ تن تنہا جان ہے مگر سارے قصبے کی جان ہے۔ اس کی عمر ہم کیا جانیں۔ اس کے جسم پر جس قدر بال وقت وزمانہ کی دستبرد سے بچے ہوئے ہیں۔ دودھ کی طرح سفید ہیں اور چہرہ غیر آباد اور خشک زمین کی طرح۔ دراڑیں ہی دراڑیں۔ آنکھیں بھی سفید ہوتی جارہی ہیں اور ہاتھ کانپتے ہیں۔ وہ بھی کہتا ہے کہ یہ حویلی اس کے لڑکپن میں اجڑی تھی۔ گویا وہ ہمارے دادا کا ہم عمر ہے لیکن باوا جما میرے دادا کی طرح کبھی اونگھا نہیں اور نہ دن بھر کھاٹ پہ لیٹا رہتا ہے۔ جب دیکھو چست اور ہوشیار نظر آتا ہے۔ ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی ہے۔ جب مسکراہٹ نہیں ہوتی تو خراٹا نما قہقہے ہوتے ہیں۔ وہ بڑوں کی چنڈال چوکڑیوں میں بہت کم بیٹھتا ہیں اکثر اوقات محلے کے ایک دو بچے گود میں بٹھائے ہوئے انہیں کہانیاں سناتا رہتا ہے۔ جب بچے اس پر طرح طرح کے سوالوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں تو قہقہے لگا لگا کر لیٹ لیٹ جاتا ہے۔

''ارے! خی خِچ خی خی ہی ہی ...... اخ خرخر...... ارے سنو، ذری! خاخا خرخر ہی ہی...... دیکھو میرا منا پوچھتا ہے شہزادی کے کان بھی ہوتے ہیں؟ اخ خرخر خر......''

''ہاں منو!''۔۔۔ بابا پر شگفتہ سی سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔۔۔ ''شہزادی بالکل تیری چھوٹی بہن جیسی ہوتی ہے...... ننھی سی، گڑیا سی، پیاری سی......''

بادل تو برستے ہی ہیں اور چھتیں ٹپکتی ہی ہیں لیکن عورتیں اور مرد بارش کے بعد چھتوں پر مٹی کے ٹوکرے پھینکتے اور پھیلاتے، خدا جانے کسے کوس رہے ہوتے ہیں۔

''رات بھر کمبخت نیند نہیں آئی۔ چیونٹیوں بد بختوں نے چھت کو چھلنی بنادیا ہے اللہ غارت کرے۔ فنا کرے۔ تباہ کرے''۔

اور ایسے میں کوئی بچہ روٹی مانگ بیٹھے تو مائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔۔۔ ''ٹھہر جاؤ، نور کے تڑکے ہی فاقوں مرنے لگا۔ رات بھر کمرے میں سیلاب آیا رہا۔ ذرا مٹی پھینک لینے دے''۔۔۔ اور یوں برسنے کے بعد جب ٹپکنے کا علاج ہو رہا ہوتا ہے تو محلے بھر میں غم وغصہ کی شدید لہر دوڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کھیل کود سے ہٹا کر ہم سے مٹی اٹھوائی اور چھت پہ

ڈلوائی جاتی ہے لیکن باوا جما کو ایک دن سنا، کہہ رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔

''منو! حد ہوگئی رات کو تو! چھت چھ جگہوں سے ٹپک رہی تھی۔ ایک کے نیچے کٹورا رکھا۔ ایک جگہ پیالی رکھی۔ دو جگہوں پہ پرات آگئی۔ ایک جگہ گلاس اور دوسری جگہ دیگچی رکھ دی۔ فرش سوکھے کا سوکھا رہا اور رات بھر جل ترنگ بجتا رہا۔ اللہ قسم جوانی کے گیت یاد آگئے......''

''دیکھو بچو!''۔۔۔ باوا نے ہمیں کہا۔۔۔ ''ذری وہ برتن تو خالی کر آؤ''۔

اور ہم باوا کے صحن کی کیچڑ عبور کر کے اندر گئے۔ کچھ برتن گہرے پانی سے ادھ بھرے تھے، باقی بھرے ہوئے تھے۔ سب کو اٹھا کر صحن میں انڈیلا اور برتن جہاں باوا نے کہے وہاں رکھ دیئے۔ کمرے کا فرش یوں تھا جیسے کسی نے بڑے پیار سے ہلکا ہلکا چھڑکاؤ کیا ہو۔

باوا سے اب اچھی طرح چلا پھرا نہیں جاتا، پھر بھی کہیں ماتم ہو باوا محفل غم میں شریک ہوتا ہے اور جنازے میں ضرور شامل ہوتا ہے۔ وہ پوچھ لیتا ہے کہ جنازہ کس وقت اٹھے گا اور ایک گھنٹہ پہلے ہی قبرستان کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ رفتار کی سستی کے علاوہ اسے قصبے کے باہر ان کھیتوں میں جو قبرستان کے راستے میں پڑتے ہیں رکنا ہوتا ہے کسی ہل چلاتے ہوئے کسان کو ''ہلاشیری'' کرنی ہوتی ہے۔ کسی گھبرو پٹھے کو دیکھ کر اس کے گٹھے ہوئے جسم کی تعریف کرنی ہوتی ہے۔ کسی بچے کو دیکھ کر اسے گود اٹھا کر پیار کرنا ہوتا ہے کسی بڈھے کے پاس رک کر عمر رفتہ کی دو باتیں کہنی سننی ہوتی ہیں۔ کسی نئی نویلی سہاگن کو دیکھ کر اس کے خاوند اور سسرال کی تعریفوں اور سہاگ کی سدا ہریالی کی دعاؤں کے پل باندھنے ہوتے ہیں اور جنازہ قبرستان میں پہنچنے تک باوا جما قبرستان میں موجود ہوتا ہے۔ خدا خبر اس قدر ہنسوڑ اور زندہ دل باوا آنسو کہاں سے لے آتا ہے۔ اس روز پٹواری کا جوان بیٹا مر گیا تو باوا اس کی چارپائی پر جا جھکا اور یوں بولا جیسے سوئے ہوئے بچے سے باپ پیار کر رہا ہو۔ کہنے لگا۔۔۔ ''کیوں بیٹا! یہ تو نے کیا کیا؟ باری تو ہماری تھی اور تو چل پڑا''۔۔۔ باوا کی آنکھیں تو خشک تھیں مگر اس کی مسکراہٹ رو رہی تھی۔

باوا ہمارا ہمراز ہمدرد اور ہمجولی ہے۔ ہم دس پندرہ بچے اس کے گھر جا دھمکتے ہیں، لیکن کبھی کبھی۔ ہم چھ چھ سات سات برس کی عمر کے بچے کسی کے دکھ سکھ اور آرام و تکلیف کو کیا جانیں، لیکن باوا کے آرام کا ہمیں بہت خیال ہوتا ہے۔ صرف اس لیے ۔ وہ ہمیں کسی

بات اور حرکت سے روکتا نہیں۔ وقت بے وقت ہماری فرمائش پوری کر دیتا ہے، پھر ہم ضد کاہے کو کریں! ہم ضد تو ان کے ساتھ کرتے ہیں جو ہمیں بات بات پہ ٹوکتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے ماں، باپ ہی کیوں نہ ہوں

''یہ نہ کر۔ یہاں نہ کھیل'' ــــ سے ہمیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہمیں جس حرکت سے منع کیا جاتا ہے ہمیں وہی حرکت کرنے میں لطف آتا ہے۔ لطف اس لیے کہ منع کرنے والوں کے دلوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ہم ذرا ذرا جتنے بچے بڑوں سے اور انتقام لے ہی کس طرح سکتے ہیں۔ باوا جما ہمیں اپنے صحن میں کھیلنے سے منع نہیں کرتا تو ہم اس کے صحن میں نہیں کھیلتے، کیوں بے چارے کو تنگ کریں؟ وہ ہمیں مکئی کے بھٹے اپنے ہاتھوں بھون کے کھلاتا ہے، پھر ہم اس سے کیوں ضد کریں؟ ہم اس جو بات پوچھتے ہیں تفصیلاً بتا دیتا ہے۔

اس روز اس گمنام لاش کی بات سنی تو ہم تمام بچے سیدھے باوا کے ہاں پہنچے اور اس سے تین سوال پوچھے ــــ ''لاش کس کی تھی؟ کنواری بیٹی کیا ہوتی ہے؟ اور نمبردار نے اپنی کنواری بیٹی کیوں مارا ہے؟'' ــــ ہم کسی سنسنی خیز اور بڑی ہی ڈراؤنی بات کی توقع لے کے گئے تھے لیکن بات کچھ بھی نہ نکلی۔ باوا نے اپنے پاس بٹھا کر تمام واردات یوں سمجھائی کہ تمام خوف دور ہو گیا اور کنواری بیٹی کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا۔ مطلب بھی اس قدر نمایاں طور پر سمجھ میں آیا کہ ہمیں نمبردار کے ساتھ بھی اس کی کنواری بیٹی کے ساتھ اور مقتول کے ساتھ بھی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ پھر ہم نے باوا کو حویلی کی واردات سنائی اور پوچھا کہ ہماری گٹھلیوں کی آواز برآمدے میں کیونکر گھومتی رہی تھی اور وہ دو انگلیاں کہاں سے آئی تھیں ــــ ''باوا! کیا حویلی میں چڑیلیں اور بدروحیں رہتی ہیں؟''

باوا زور سے ہنسا۔ اس قدر زور سے کہ اس کا قہقہہ حلق میں ہی خرخر کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا ــــ ''سب جھوٹ ہے۔ تم نڈر ہو کے وہاں کھیل کرو'' ــــ اور اس نے ہمیں اس روز حویلی میں لے جا کر سمجھایا کہ وہ آواز کیا تھی۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا ــــ ''یا اللہ'' ــــ اور اس کی آواز کتنی ہی دیر برآمدے کی طویل گولائی میں گھومتی رہی۔ بلند ہوتی، ختم ہوتی پھر سنائی دیتی۔ اس کے بعد باوا نے وضاحت کی تو ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ گونج بھی کوئی چیز ہوتی ہے جس کا تعلق آواز سے ہوتا ہے۔ ان دو انگلیوں کے متعلق باوا نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ اسی موچی کی لاش کی ہوں گی جو کوئی چیل

یا گدھ وہاں سے اٹھا لایا ہو گا۔ ہم سب بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب کوئی بھی سہما ہوا نہیں تھا۔

اور دوسرے روز سے حویلی پھر ہماری گہما گہمی اور کھیل کود سے آباد ہو گئی۔

آٹھ دس روز بعد ہم ایک روز پھر ڈر گئے۔ آوازیں ہی ایسی تھیں جو کسی شرشرار کی معلوم ہوتی تھیں۔ ہوا یوں ہم بڑے ٹہنوں پر اتر چڑھ رہے تھے کہ ہمیں اس قسم کی آواز سنائی دی ــــ ''گرررررواوہو، اوہو'' ــــ اس کے بعد اس طرح آواز آئی جیسے کوئی سخت تکلیف میں ہے ــــ ''آہائے، آہائے'' ــــ ''یہ دونوں آوازیں بھیانک اور ہولناک تھیں۔ دونوں کسی انسان کی نہیں تھیں۔ ہم پہلے تو ٹہنوں پر ہی سن ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے اترے اور صحن میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ موٹی بھدی اور ڈراؤنی سی آواز آئی ــــ ''نکل جاؤ۔ کھا جاؤں گا'' ــــ اور ہم اسی طرح بھاگے جس طرح اس روز دو انگلیاں دیکھ کر بھاگے تھے۔

میں سب سے چھوٹا ہوں اس لیے ڈر جلدی جاتا ہوں اور بھاگنے میں سب سے پیچھے رہ جاتا ہوں۔ اگر رستہ صاف ہو تو سیدھا بھاگنے میں کوئی وقت نہیں ہوتی لیکن حویلی کے باہر والے دروازے اور صحن کے درمیان ڈیوڑھی حائل ہے۔ گلی کی طرف تو بڑا دروازہ ہے اور صحن کی طرف دو دروازے ہیں۔ ایک سامنے اور ایک دائیں طرف۔ سامنے والا صحن میں کھلتا ہے، دائیں طرف والا برآمدے میں۔ دونوں دروازے اس قدر اونچے لگائے گئے ہیں کہ چار چار سیڑھیاں صحن کی طرف اور چار ڈیوڑھی کی طرف ہیں۔ اس حویلی کے بنانے والے ہی جانتے ہوں گے کہ دروازے زمین سے اس قدر اونچے کیوں بنوائے گئے تھے۔

اس روز بھاگتے وقت میں سب سے پیچھے تھا۔ صحن کی طرف والی چار سیڑھیاں تو میں چڑھ آیا لیکن دہلیز سے ٹھوکر لگی اور میں ڈیوڑھی کی طرف والی سیڑھیوں پہ گر پڑا۔ باقی بچے ڈیوڑھی عبور کر کے جا چکے تھے۔ ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

''مت روبے!'' ــــ سیڑھیوں کے قریب سے آواز آئی ــــ ''دیکھ میں تیرے ساتھ ہوں'' ــــ یہ میرے سب سے بڑے ہمجولی کی آواز تھی۔ اس کی عمر بارہ سال ہے۔ چوتھی جماعت میں اس کا دوسرا سال ہے۔

میں اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس نے مجھے وہیں روک لیا اور کہا۔۔۔ ''مت بھاگ شمو! آؤ دیکھیں یہ کس کی آواز ہے''۔۔۔ میں نے اسے بھاگ چلنے پر مجبور کیا تو اس نے کہا۔۔۔ ''ڈرتا کیوں ہے؟ ٹھہر جا ذرا۔ کوئی سامنے آیا تو یہیں سے بھاگ دوڑیں گے۔ یہ کسی جن چڑیل کی آواز نہیں''۔

اور میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے وہیں چھپ کے بیٹھ جانے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ چند منٹوں بعد اندر برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم دونوں نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا۔ برآمدے میں زراعت انسپکٹر کا جوان بیٹا اشرف ہماری طرف پیٹھ کئے جا رہا تھا اور بار بار برآمدے میں سے کوٹھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھا؟''۔۔۔ میرے ساتھی نے کہا۔۔۔ ''اسی نے ہمیں ڈرایا تھا''۔

''کیوں؟''

''وہ سامنے دیکھ''۔۔۔ اس نے چونک کر کہا۔

''کدھر؟''۔۔۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر پوچھا۔

''ارے ادھر۔ وہ بڑی شاخوں میں سے دیکھ۔ سامنے کوٹھے پر۔۔۔ وہ اتری نیچے''۔

''کون؟''۔۔۔ میں نے ڈر کر اس کا بازو پکڑ لیا اور پوچھا۔

''کون؟ چڑیل؟''

''ارے نہیں یار!''

''ہاں! ہاں! وہ''۔۔۔ میں نے دیکھا کہ لمبے دانتوں اور سفید رنگت والی زبیدہ (نور داد کی بیوی) گری ہوئی چھت کے ملبے کی ڈھلان کے راستے نیچے اتر رہی تھی۔

''وہ دونوں کمرے میں کیوں چلے گئے ہیں؟''۔۔۔ میں نے اشرف اور زبیدہ کو ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''چل اب چلیں''۔

''کہاں؟''

''باوا جمے کے پاس''۔

دوسرے بچوں میں سے کچھ تو غائب ہو چکے تھے اور ذرا دلیر قسم کے بچے ہمارے

انتظار میں دور گلی میں کھڑے تھے اور چند منٹوں بعد ہم باوا جما کو نرغے میں لئے ہوئے اس کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی نے باوا کو سارا ماجرا سنایا۔ ہمیں توقع تھی کہ باوا بڑی زور سے ہنسے گا لیکن وہ اس طرح چپ ہو گیا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں کا رعشہ تیز ہو گیا تھا۔ چہرے کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے باوا کو اس کیفیت میں دیکھا۔ اس کی یہی حالت دیکھ کر تمام بچے بھی گم صم ہو گئے اور ہمارے لیے باوا کی یہ کیفیت ایک اور مسئلہ بن گئی۔ باوا جیسے ہماری موجودگی اور پیار کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر خلاؤں میں گھورتا رہا۔ جانے اسے وہاں کیا نظر آ رہا تھا۔ وہ بغیر بات کئے باہر نکل گیا اور ہم بھی چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے گلی میں نکل آئے۔ باوا جانے کہاں چلا گیا۔ ہم اپنے گھروں کو چل پڑے۔

دن کا پچھلا پہر تھا کہ میں باہر نکلا۔ دیکھا کہ باوا جما گلی میں زراعت انسپکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ باوا بہت غصے میں بول رہا تھا اور انسپکٹر سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں باوا کے صرف یہ الفاظ سن سکا۔۔۔ ''ننھے منے بچوں کو چھپ کر ڈرایا اور پھر محلے کی عزت خراب کی؟۔۔۔ تم انسپکٹر ہو گے تو اپنے محکمے میں ہو گے۔ میں دس بھلے مانسوں کو اکٹھا کر کے تمہارا اور تمہارے بیٹے کا منہ کالا کراؤں گا اور سارے شہر میں گھماؤں گا۔ تمہارے اس حرامی بیٹے نے محلے کے معصوم بچوں کو ڈرا کر اپنا مطلب پورا کیا۔۔۔ ہے بے غیرتو!''

اسی شام میں نے دیکھا کہ باوا جما مسجد کے سامنے مولوی صاحب کو روکے کھڑا تھا اور اسی غصے میں ان سے باتیں کر رہا تھا اور مولوی صاحب بار بار اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے تھے۔ باوا کہہ رہا تھا۔۔۔ ''باوا جما ابھی زندہ ہے۔ مجھے تیری عزت کا پاس صرف اس لیے ہے کہ میں نے تیرے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں ورنہ میں تیری اس بیٹی کا منہ کالا کر کے گلی میں کھڑا کر دیتا''۔

میں ابھی بہت چھوٹا ہوں، ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ باوا مولوی صاحب سے ہٹ کر میرے قریب سے گزرا تو خیال آیا کہ اس سے پوچھوں کہ باوا یہ کیا ماجرا ہے؟ لیکن باوا سخت غصے میں تھے۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ مجھے باوا سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر پہلی بار میں نے سرخی دیکھی تھی۔ میں ایک طرف ہو گیا تو وہ میرے پاس رک گیا۔ میں سہا ہوا اسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھا اور ہونٹوں پر اپنی مخصوص

مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ''منے! تم بھی آج حویلی میں کھیلنے گئے تھے؟''

''ہاں باوا!''۔۔۔ میں نے ڈرتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کھیلا کرو منو! وہیں کھیلا کرو''۔۔۔ باوا نے جھک کر میرے سر کو چوما اور کہا۔۔۔ ''وہیں جا کے کھیلا کرو۔ اب تمہیں کوئی نہیں ڈرائے گا''۔

''باوا جما خاں!''۔۔۔ چچا خیر دین نے قریب آ کر پوچھا۔۔۔ ''مولوی صاحب سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ معلوم ہوتا ہے کوئی......''

''کچھ نہیں خیر دین!''۔۔۔ باوا نے شگفتہ سے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ ''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مسجد کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں''۔

اور دوسرے دن ہم سکول سے چھٹی کے بعد پھر حویلی میں موجود تھے اور تھوڑی دیر بعد ہم بڑ کے ٹہنوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں ایک ٹہن پر کھڑا تھا۔ نیچے مجھے بھاگتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بڑ کے پتوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ دو لڑکیاں چھ سات برس کی عمر کی جو غالباً صحن میں آ گئی تھیں۔ بھاگ کر حویلی کے اندر والے دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نیچے اتر آیا اور لڑکیوں کے پاس گیا۔ ایک تو زراعت انسپکٹر کی چھوٹی بیٹی تاجی تھی۔ اشرف کی چھوٹی بہن اور دوسری اس کے ہاں دو چار روز کے لیے مہمان آئی ہوئی تھی۔ دونوں میری ہم عمر ہیں۔ میں تاجی کو جانتا ہوں وہ زراعت انسپکٹر کی بیٹی ہے، لیکن میں اس کے ساتھ کبھی کھیلا نہیں نہ وہ کبھی میرے ساتھ کھیلنے آئی ہے۔

مجھے لڑکیوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں سوائے اس کے کہ کوئی چٹیا والی لڑکی پاس سے گزرے تو پیچھے سے دبے پاؤں جا کر اس کی چٹیا کھینچ کر بھاگ جاتا ہوں۔ اس حرکت پر ہر بار گالیاں اور دو ایک بار مار کھائی ہے۔ مگر میں باز نہیں آتا۔ دو چار بار توبہ بھی کی ہے لیکن جب بھی کسی کی چٹیا دیکھتا ہوں ہاتھ اور قدم خود بخود اس کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ چوری چھپے، دبے پاؤں۔

سنا ہے ماہرین نفسیات نے ہماری نفسیات پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ بڑا ہو کر پڑھوں گا تو اپنی اس حرکت کی وجہ جان سکوں گا۔ ابھی تو ''کر گزرنے کی عمر ہے۔ کیوں؟'' بہت بعد کا سوال ہے۔

ماہرین نفسیات کے سلسلے میں خیال آتا ہے کہ اسے روز ابا جان امی سے کہہ رہے تھے۔۔۔ ''میں تمہیں بچوں کی نفسیات کی دو کتابیں لا دوں گا۔ منے کی تربیت کے لیے تمہیں اب ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے''۔۔۔ امی نے جواب دیا تھا۔۔۔ ''بچوں کی نفسیات پہ کتابیں لکھنے والوں کے ہاں شاید کوئی بچہ نہیں ہوتا ورنہ وہ کتابیں لکھنا چھوڑ دیں''۔۔۔ ابا جان ہنس پڑے اور کہنے لگے۔۔۔ ''یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایک فلاسفر نے لکھا تھا کہ شادی سے پہلے مجھے بچوں کی تربیت اور پرورش کے آٹھ اصول از بر تھے۔ اب آٹھ بچے ہیں اور اصول ایک بھی یاد نہیں''۔۔۔ امی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ میں اس لیے نہیں ہنسا تھا کہ ابا جان کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی بلکہ اس لیے کہ امی ہنسی تھی۔ امی کی ہنسی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو مجھے بھی ہنسی آ جاتی ہے اور ابا جان بھی مسکرانے لگتے ہیں۔ یہ منظر مجھے اچھا لگتا ہے۔ بعض اوقات میں شدت سے ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ والدین کی نفسیات کی کوئی کتاب ملے تو پڑھوں۔ ان کی بعض حرکتیں عجیب معمہ ہوتی ہیں۔ میں انہیں سمجھنا چاہتا ہوں۔

ہاں تو میں کیا بات کر رہا تھا؟...... چٹیا کی؟...... نہیں...... ہاں! تاجی کی...... تاجی کی عمر چھ برس ہے اور میں اس سے شاید ایک آدھ برس بڑا ہوں۔ ہم بچے چھوٹے بڑے کی تمیز عمر سے نہیں کرتے۔ ہم بڑا اسے سمجھتے ہیں جو قد میں بڑا ہو۔ حوصلے میں بڑا ہو۔ جو پولیس کے سپاہی سے بھی نہ ڈرے۔ جو کسی کو تھپڑ مار کر یا دھکا دے کر یا کسی کے کھلونے اٹھا کر بھاگ جائے اور ہاتھ نہ آئے۔ جو میری طرح گھر سے صرف ایک چمچہ چینی نہ چرائے بلکہ پوری پاؤ بھر اٹھا لائے۔ کھیت کے بیچ جا کر پکا ہوا خربوزہ توڑ لائے۔ جو مولوی اندھے کے پہلو میں گدگدی کر کے اس کی لاٹھی کی زد سے نکل بھاگے اور جو حویلی میں بڑ کے درخت پر سب سے اونچا چڑھ جائے۔

لیکن میں تاجی سے بڑا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میری عمر اس سے چند ماہ زیادہ ہے بلکہ اس لیے کہ وہ عورت ذات ہے اور میں مرد ہوں۔ اس روز تو مجھ میں بڑے پن کا احساس خاص طور پر پیدا ہوا جب میں ٹہنے سے نیچے اترا تو تاجی کو میں نے دوسری لڑکی کے ساتھ ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر سہما ہوا کھڑا دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ عورت ہے اس لیے ڈر ہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''آؤ تاجی! ہمارے ساتھ کھیلو گی؟''

''نہیں شمو! یہاں ڈر لگتا ہے''۔

''پھر آئی کیوں تھی یہاں؟''

''اسے حویلی دکھانے کو ساتھ لائی ہوں''۔

''آؤ۔ ڈرو مت''___ میں نے اپنے آپ میں مردانہ سا جذبہ محسوس کرتے ہوئے کہا___ ''میرے ساتھ آؤ میں جو ساتھ ہوں، آؤ''۔

اور دوسرے لمحے میں دونوں لڑکیوں کو پناہ میں لئے ہوئے برآمدے کے گول دائرے کی سیر کرا رہا تھا___ ''یہ دیکھو یہ ستون ہے۔ یہ لکڑی کا ہے۔ یہ کمرہ ہے۔ کواڑ کیڑوں نے کھالئے ہیں۔ اندر آؤ تمہیں مکڑی کے جالے دکھاؤں۔ دیکھو کتنے اچھے ہیں۔ نہیں یہ نہیں۔ آؤ ایک کمرے میں تمہیں مری ہوئی کبوتری دکھاؤں۔ وہ جالوں میں پھنس گئی تھی اور......'' یوں آواز آئی جیسے دو تین کتے ایک دوسرے کے تعاقب میں سرپٹ بھاگتے ہوئے ہمارے قریب سے گزر گئے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ایسی چیخ بلند ہوئی کہ میں بھی ڈر گیا اور تاجی بجلی کی سرعت سے میرے سامنے آکر میرے ساتھ بغلگیر ہوگئی۔ چیخ اسی نے ماری تھی۔ میں نے دیکھا کہ دو موٹے موٹے جنگلی چوہے بھاگتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں گھس گئے تھے۔ تاجی میرے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور اس کا دل اس قدر تیز اور اونچی آواز سے دھڑک رہا تھا جیسے دو جنگلی چوہے بھاگ رہے ہوں۔ میں نے اپنے بازو تاجی کے گرد لپیٹ کر اسے پناہ میں لے لیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں رات کو کبھی کبھی خواب میں ڈر کر جاگ اٹھتا ہوں تو امی مجھے سینے سے لگا کر بازوؤں کے گھیرے میں لے لیتی ہے۔

دوسری لڑکی میرے بائیں پہلو کے ساتھ لگی کھڑی کانپ رہی تھی اور مجھے رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

ڈر گئی تھی تاجی؟''___ میں نے امی کے پیار بھرے لہجے میں اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا___ ''یہ تو چوہے تھے، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ آؤ تمہیں اور چوہے دکھاؤں...... خرگوش کے بچے دیکھو گی؟ آؤ''۔

تاجی کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا___ ''شمو گھر جانا ہے مجھے گھر چھوڑ آؤ''۔

''نہیں تاجی! آؤ میرے ساتھ، دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ تمہیں دوسرے کمرے دکھاؤں۔ اچھا آؤ میں تمہیں گود میں اٹھا لوں''۔

میں نے اسے اٹھایا تو میں گر پڑا۔ میں نیچے پیٹھ کے بل اور تاجی اوپر۔ اپنے وزن کے بچے کو میں کیونکر اٹھا سکتا تھا؟ میں نہایت پھرتی سے اٹھا، اس پہلوان کی طرح جو ابھی چاروں شانے چت نہ گرا ہو۔ میں نے تاجی کے کپڑے جھاڑے اور ایک بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے آگے لے گیا۔ وہ ڈر رہی تھی اور میں اسے بازوؤں میں بھینچے ہوئے تھا۔ پھر اس نے اپنا بازو میری کمر کے گرد لپیٹ لیا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی چال میرے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ دوسری لڑکی کو میں نے دوسرے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ ایسے میں مجھے ایسی لذت، ایسا سرور اور ایسا غرور محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی دیو خوف زدہ پریوں کو اپنی پناہ میں لے کر محسوس کرتا ہو گا۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی بچے نے میری پناہ میں اماں پائی تھی، ورنہ ہمجولیوں کی ٹولی میں میں سب سے چھوٹا ہونے کی حیثیت سے سب کی پناہ میں رہتا ہوں اور وہ مجھے خطرے کے وقت حفاظت میں لے لیا کرتے ہیں۔ یوں مجھ میں کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس روز تاجی کے کانپتے ہوئے نازک سے جسم کو پناہ میں لے کر میں برتری کے احساس سے اپنے آپ میں پھیلنے لگا اور فخر سے سرشار ہونے لگا۔

ابھی نصف برآمدہ باقی تھا اور ہم ابھی گری ہوئی چھت تک پہنچے تھے کہ تاجی نے کہا___ ''اب گھر جاؤں گی۔ کل پھر آؤں گی...... اچھا شمو؟...... سچی کل آؤں گی''۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں چلی جائیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چلی گئیں تو میری تمام تر برتری، بڑے پن کا احساس اور مردانگی انہی کے ساتھ چلی جائے گی۔ پھر میں چھوٹا سا، ڈرپوک، ننھا منا بچہ رہ جاؤں گا اور دوسرے بچے مجھے کہیں گے___ ''آ شمو! تجھے گھر چھوڑ آئیں''۔

لیکن تاجی میرے پہلو سے ہٹ کر پھر میرے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور بڑے پیار سے، جس میں اب خوف نہیں تھا، کہہ رہی تھی___ ''سچی! کل پھر آؤں گی...... تم ساتھ ہو گے نا؟''

''ہاں تاجی! میں تمہارے ساتھ ہوں گا...... آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں''۔

''ہاں تو اور کیا! میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔ تیرے بغیر ڈر لگتا ہے''۔

اور میں اکڑتا ہوا دونوں لڑکیوں کو بازوؤں میں لپیٹ کر ڈیوڑھی کی طرف چل پڑا۔ بڑ کے گھنے پتوں میں سے آواز آئی۔

''تاجی!''

یہ کون ہے؟'' تاجی نے رک کر پوچھا۔

''روفی ہے۔ بڑ پر چڑھا ہوا ہے''۔

''رو.....وفی!''— تاجی نے زور سے جواب دیا۔

''نہ تاجی!''— جانے مجھے دکھ سا کیوں ہوا۔ میں نے اسے روکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا— ''تاجی! روفی بڑا گندہ ہے، اس سے نہ بولا کرو۔ دفع کرو۔ آؤ میرے ساتھ''۔

''چلو جی! میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گی''۔

حالانکہ روفی گندا نہیں بلکہ اس کا شمار میری نظر میں تین چار ایسے بچوں میں ہوتا ہے جو مجھے اچھے لگتے ہیں۔ روفی مجھ سے پانچ سال بڑا ہے اور وہ اکثر مجھے خربوزے توڑ کے کھلاتا ہے۔ کہتا ہے شمو! تم چھوٹے ہونا! میں تمہیں خربوزے توڑ کے لا دیا کروں گا خود نہ توڑنا۔ اچھا شمو! نہیں تو خربوزوں والی پکڑ کے مارے گی۔ روفی مجھ سے پیار کرتا ہے اور وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ ابا جان اکثر میرے لئے ٹافیاں لاتے ہیں تو میں دو ٹافیاں روفی کے لیے چھپا کے جیب میں رکھ لیتا ہوں اور حویلی میں جا کر اسے دیا کرتا ہوں لیکن اس روز معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جو مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں تاجی کو روفی کے ساتھ بات نہ کرنے دوں۔

دوسرے روز میں سکول سے واپس آیا تو دیکھا تاجی امی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ امی نے کہا— ''منے! دیکھ تاجی کب سے تیرے انتظار میں بیٹھی ہے''۔

میں نے بہت ہی اصرار سے اسے اپنے ساتھ کھانا کھانے پر آمادہ کیا۔ کھانے کے بعد اس نے میرا بستہ دیکھا۔ پہلی جماعت کا بستہ ہوتا ہی کیا ہے ایک قاعدہ، ایک تختی، ایک قلم اور مٹی کی دوات جس میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہوتا ہے اور جس کی سیاہی تختی پر کم اور قاعدے اور ہاتھوں اور منہ پر زیادہ لگی ہوئی ہوتی ہے، لیکن میں اس مختصر سے بستے پہ مطمئن نہیں ہوتا۔ میں ابا جان کے دو ناول، ایک اردو اور ایک انگریزی کا، امی کے دو تین پرانے رسالے بھی بستے میں ڈال کے لے جاتا ہوں۔ ایک دن پہلی جماعت کے مولوی نے میرا

بستہ دیکھا، ایک رسالہ اسے پسند آ گیا۔ اس میں خوبصورت عورتوں کی تصویریں تھیں۔ چھٹی کے وقت مولوی نے رسالہ لوٹا دیا۔ جب میں گھر آیا تو ابا جان بولے—

''منے! بستہ یہاں لا ذرا''— انہوں نے میرے بستے میں سے وہی رسالہ نکال کر امی کی طرف پھینکا اور کہا— ''یہ لے! صبح سے میری جان کھائے جا رہی تھی''۔

امی نے مجھے ڈرایا، دھمکایا اور سمجھایا کہ میں صرف اپنا قاعدہ ہی سکول لے جایا کروں لیکن میں راضی نہ ہوا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ رسالہ دن بھر مولوی پڑھتا رہا ہے۔

''جبھی!'' امی نے رسالہ ابا جان کو دکھاتے ہوئے کہا— ''دیکھئے! کمبخت مولوی نے یہ صفحہ ہی پھاڑ کے رکھ لیا ہے جس پر فرانسیسی لڑکیوں کی تصویریں تھیں''۔

تاجی نے میرا بستہ دیکھا تو وہ میری علمیت کی قائل ہو گئی اور للچائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ انگریزی رسالوں میں تصویریں دیکھتی رہی۔

''شمو! حویلی میں چلو گے؟''— تاجی نے پوچھا۔

''آہستہ بول''— میں نے سرگوشی کی— ''ابا اور امی سو جائیں گے تو چلیں گے''۔

''اچھا تو میں گھر جاتی ہوں۔ تم جاؤ گے تو مجھے بلا لینا۔ اچھا شمو!''

''اچھا''۔

''پر تم میرے ساتھ رہنا۔ بچی ڈر لگتا ہے وہاں''۔

اور وہ چلی گئی۔

''منے! آؤ سو جاؤ ذرا''۔

''اچھا امی! میں برآمدے میں سوؤں گا''۔

''پر سو جائیو''۔

''اچھا امی!''

میں برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، ابا اور امی گہری نیند سو گئے تھے۔ میں دبے پاؤں وہاں سے سرکا۔ اس روز میں نے تاجی کو ساری حویلی کی سیر کرائی۔

''تاجی! یہ کمرہ دیکھو''— میں نے اسے دور سامنے والا کمرہ اندر سے دکھاتے

ہوئے کہا ـــــ ''دادا جان کہتے ہیں کہ اس میں ایک آدمی کو اس کی بیوی نے مار کر فرش کے نیچے دبا دیا تھا۔ پھر وہ خود بھی مر گئی تھی'' ـــــ اور تاجی سہم کر میرے ساتھ لگ گئی، کہنے لگی ـــــ ''چلو شمو! اس کمرے سے نکل چلیں'' ـــــ وہ قدم قدم پر ڈر رہی تھی اور میں ایک بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے سیر کرا رہا تھا۔ کمروں میں بھاگتے ہوئے چوہوں کے قدموں کی آواز پر وہ میرے ساتھ لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ پھر میں اسے برآمدے کی گری ہوئی چھت کی ڈھلوان کی راہ کوٹھے پر لے گیا۔ اوپر کا منظر بہت ہی بھلا تھا۔ دور دور تک قصبہ نظر آتا ہے۔ تاجی یوں خوش اور مچلی ہوئی ہر طرف بھاگنے لگی جیسے پریوں کے سہانے دیس میں آ گئی ہو۔

باقی بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ کچھ بڑ کے ٹہنوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس روز میں ان کے ساتھ نہ کھیلا۔ تاجی کو بغل میں لئے سیر کراتا رہا۔

''شمو! گھر جاؤں گی، امی مارے گی، دیر ہو گئی ہے''۔

''آؤ تمہیں چھوڑ آؤں''۔

جب ہم کوٹھے سے نیچے اترے تو پھر آواز آئی ـــــ ''تا آ جی''۔

''رو اوفی'' ـــــ تاجی نے زور سے جواب دیا۔

مجھے پھر پہلے روز کی طرح روفی کی آواز پہ حسد سا محسوس ہوا۔ جب ہم دونوں حویلی میں سے نکلنے لگے تو روفی نے چلا کر کہا ـــــ ''لڑکیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ سر پر سینگ اگیں کے بچو!''

میرے چھوٹے سے سینے میں آگ سی لگ گئی لیکن میں کچھ نہ کر سکا۔ روفی مجھ سے بڑا ہے۔ میں نے راستے میں تاجی کو روفی کے خلاف بہت سی باتیں سنائیں جن میں بیشتر جھوٹ تھیں۔ میں نے اسے یہ بھی سنایا کہ وہ میری ٹافیاں کھا جاتا ہے لیکن یہ نہ بتایا کہ میں ٹافیاں اسے اپنی مرضی سے دیتا ہوں۔ میں نے تاجی کو یہ بھی بتایا کہ روفی چور ہے، لوگوں کے کھیتوں سے خربوزے توڑ لاتا ہے، لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ خربوزے میں بھی کھاتا ہوں۔

دوسرے دن تاجی میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس نے میرے ساتھ کھانا نہ کھایا۔ ہم دونوں تھوڑی دیر گھر میں بیٹھے رہے اور میں نے اسے تصویروں کا ایک اور رسالہ دکھایا۔ اس میں ایک کوٹھی کی تصویر ہے جسے میں بھی اکثر بہت شوق سے دیکھا کرتا ہوں۔

بہت خوبصورت کوٹھی ہے۔ سامنے باغ ہے جس میں رنگا رنگ پھولوں والے پودے ہیں۔ چار درخت بھی ہیں۔ تاجی نے یہ تصویر دیکھی اور خوشی سے چلا اٹھی ـــــ ''اخاہ! شمو! کتنا اچھا مکان ہے۔ یہ دیکھ پھول۔ یہ دروازہ'' ـــــ اور اس نے مجھے کوٹھی کی ایک ایک چیز اس طرح دکھائی جیسے میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی ـــــ ''دیکھو شمو! جب ہم دونوں بڑے ہو جائیں گے تو ہم اسی طرح کے مکان میں اکٹھے رہا کریں گے۔ تم ابا جان بننا، میں امی جان بنوں گی''۔

''ہاں!'' میں نے لمبی سی ''ہاں'' کہہ کر کہا ـــــ ''تاجی! یہ ٹھیک ہے'' ـــــ تجویز مجھے بہت ہی پسند آئی۔ میرے دماغ میں تو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

''اور دیکھو شمو!'' ـــــ تاجی نے پروگرام کا باقی حصہ بھی سنایا ـــــ ''پھر ہم ایک گڈا ایک گڑیا خریدیں گے۔ گڈے کا نام شمو رکھیں گے اور گڑیا کا نام تاجی......''

''ہاں!'' میں نے جوش مسرت سے کہا اور میں رسالہ اٹھا کے امی کے پاس جا پہنچا اور امی کو بتایا کہ تاجی یوں کہتی ہے۔ امی نے بھی تائید کی اور ابا جان جو دوسرے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے بولے ـــــ ''ہاں بیٹا! خدا تمہیں اس سے بھی خوبصورت مکان دے گا'' ـــــ میں تاجی کے پاس آ بیٹھا۔

''دیکھنا ذرا!'' ـــــ امی ابا جان سے کہہ رہی تھیں ـــــ ''دونوں گڈے گڑیا کی طرح لگتے ہیں''۔

اس روز میں تاجی کو حویلی میں لے جانے کی بجائے باوا جما کے گھر لے گیا۔ اس نے ابھی باوا جما نہیں دیکھا تھا۔ باوا صحن میں شہتوت کی چھاؤں میں لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور اس نے ہمارا استقبال ایسی ہنسی، مسکراہٹ اور پیار بھرے الفاظ سے کیا جو صرف باوا جما ہی کر سکتا ہے اور جس سے بچے اپنی ماؤں کو بھی بھول جاتے ہیں۔

''باوا! یہ تاجی ہے'' ـــــ میں نے تعارف کرایا ـــــ ''اب یہ میرے ساتھ کھیلتی ہے''۔

''اچھی گڑیا! یہاں آؤ۔ آ جا بیٹا! قریب تو آ ذری''۔

تاجی باوا جما سے جھینپ رہی تھی۔ میں نے اسے کھینچ کر باوا کے قریب کیا تو باوا نے لپک کر اسے گود میں بٹھا لیا ـــــ ''اری؟ تیرے بال کتنے اچھے ہیں...... اوہو!...... یہ چوڑی

تو میں نے دیکھی ہی نہیں تھی۔ بڑی خوبصورت ہے، میں نے تو تجھے آج دیکھا ہے۔ تو کس کی بیٹی ہے؟''

''ابا جان کی......'' تاجی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا___ ''اور امی کی''۔

''کیا نام ہے تیرے ابا جان کا؟''

''پتہ نہیں......شمو! گھر جانا ہے''۔

''نہیں تاجی! ابھی باوا کہانی سنائے گا۔ سچی اتنی اچھی کہانی کہ کیا بتاؤں...... باوا! یہ اس کے ابا جان کی بیٹی ہے، وہ ہے نا! وہ جس کی ہم نے اس روز تمہیں حویلی والی بات سنائی تھی۔ وہ جس نے ہمیں حویلی میں ڈرایا تھا''۔

''اچھا! وہ لڑکا......اشرف''۔

''ہاں باوا وہی، تاجی اشرف کی بہن ہے''۔

''اوہو!''___ باوا یک لخت سنجیدہ ہو گیا اور ذرا سی دیر بعد آہستگی سے بولا___ ''زراعت انسپکٹر کی بیٹی''۔

''ہاں باوا! یہ بیری والے مکان میں رہتے ہیں''۔

باوا بدستور سنجیدہ رہا اور چند ثانیے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت جیسے چونک اٹھا ہو۔ بولا___ ''منی! تو تو اچھی بیٹی بنے گی نا؟''

تاجی نے آہستہ سے سر ہلایا۔

''شاباش میری گڑیا! تو اچھی بیٹا بنے گی''___ بابا پھر اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔

''منی! گڑ کھاؤ گی؟''

تاجی نے نفی میں سر ہلایا۔

''شمو! گھر جانا ہے''۔

''اری نہیں میری گڑیا!...... جا شمو گڈے! اندر جا! دیکھ اس کونے میں مٹی کی چھوٹی ڈولی رکھی ہے وہ اٹھا۔ اس کے نیچے ویسی ہی ایک اور ڈولی رکھی ہے۔ وہ اٹھا۔ اس کے نیچے نئی ہانڈی رکھی ہے، وہ اٹھا اور اس کے نیچے دیگچی رکھی ہے۔ اس میں سے ایک ڈھیلا گڑ کا اپنے لئے اور ایک میری منی کے لیے لے آ''۔

میں بھاگا ہوا گیا۔ اوپر والی ڈولی اٹھائی تو وہ ہاتھ سے چھوٹی اور گر کر ٹوٹ گئی۔ نیچے والی ڈولی میں چاول پڑے ہوئے تھے۔ وہ اٹھا کے نیچے رکھی۔ نیچے والی ہانڈی میں مکئی کا آٹا تھا، ہانڈی اٹھا کے نیچے رکھی اور دیگچی میں سے تین ڈھیلے گڑ کے نکال رہا تھا تو باوا کی آواز آئی___ ''کون سی ڈولی توڑی منے؟''

''خالی! اوپر والی''۔

''ہے شیطان! اچھا اب انہیں اوپر نہ رکھنا۔ نیچے ہی پڑا رہنے دے اور گڑ زیادہ نہ لائیو۔ نہیں تو رات کو چونٹے کاٹیں گے''۔

میں نے ایک ڈھیلا تاجی کو دیا۔ دوسرا خود کھایا اور تیسرا باوا کو دیا۔ باوا کھل کر ہنسا اور بولا___ ''ارے! میں کیسے گڑ کھاؤں بیٹا! میرے دانت ہی کہاں ہیں۔ نہ منے! مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔ تم کھاؤ۔ کھاؤ منی کھاؤ''۔

''نہیں باوا منہ میں رکھ لو۔ چوس لو نا باوا''۔

اور باوا نے میری ضد پوری کرتے ہوئے گڑ کا ڈھیلا منہ میں رکھ لیا۔ میں نے تاجی کی خاطر کہانی کی فرمائش کی تو باوا نے گڑ کا ڈھیلا منہ میں پھیر کر ایک طرف کیا۔ گھونٹ سا نگلا اور کہانی سنانے کے لیے تیار ہوا۔

''بہت اچھی سی کہانی باوا! پریوں والی...... دیکھ تاجی! باوا کیسی کہانی سنائے گا''۔

''اچھا منی! ایک تھی پری......''___ باوا نے تاجی کو ٹھوڑی کو کانپتی ہوئی انگلیوں سے چھو کر کہا___ ''بالکل تجھ جیسی چھوٹی سی، منی سی، گڑیا سی۔ تیری طرح کے بال تھے اس کے اور ایک تھا شہزادہ......شہزادہ تھا شمو جیسا۔ ننھا سا چھوٹا سا۔ گڈا سا...... دونوں ایک باغ میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ پھولوں کا رس چوستے تھے۔ ان کے ساتھ اڑتے تھے اور ندی میں جا کر نہاتے تھے''۔

اور میرے ننھے سے ذہن میں ایک تصویر آ گئی جس میں مجھے ایک خوبصورت باغ دکھائی دیا۔ پھولوں اور مخمل جیسے سبزہ زار میں مجھے ایک پری اور ایک شہزادہ دکھائی دیا۔ پری کی شکل تاجی کی طرح اور شہزادے کی شکل میری طرح تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اڑے اور ایک درخت پر جا بیٹھے۔ ہر طرف رنگ برنگی چڑیاں اڑ رہی تھیں۔ پس منظر کے پہاڑ کی اوٹ سے روئی جیسے سفید بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور باغ کی طرف اڑتا ہوا آنے لگا۔

پری اور شہزادے نے اڑان لگائی اور بادل کے ٹکڑے پر جا بیٹھے۔ وہ باغ کے اوپر اوپر اڑ رہے تھے۔

''...... پہاڑ کی کھوہ میں ایک دیو رہتا تھا۔ کالا کلوٹا، بھدا بدصورت سا۔ اس نے پری کو دیکھا تو پہاڑ کی چوٹی سے آواز دی۔ 'نیلم پری'ــــ شہزادے نے آواز سنی تو پری سے کہاــــ 'اس کی آواز مت سنو۔ وہ بہت بدمعاش ہے۔ تمہارے پر نوچ لے گا اور......''

اور میں نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک دیو دیکھا۔ وہ پکار رہا تھاــــ ''تاجی! تاجی!''...... آواز مانوس سی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ بھدا! بدصورت سا تھا اور اس کی شکل روفی کی طرح تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی شکل روفی کی طرف نہ رہے۔ میں نے اس کی کئی شکلیں بنائیں لیکن وہ روفی کا ہی ہم شکل رہا۔

پھر باوا کہانی کے نشیب و فراز طے کرتا گیا لیکن مجھے باوا نظر آ رہا تھا نہ تاجی۔ نہ شہتوت کا پیڑ نہ باوا کا گھر۔ میں تاجی کے ساتھ بادل کے ٹکڑے پر اڑا جا رہا تھا اور دیو، تاجی کو پکار رہا تھا۔ باوا جما کے الفاظ میرے ذہن میں متحرک تصویریں بن بن کر آراستہ ہو رہے تھے۔ مناظر تبدیل ہو رہے تھے۔ میرے دل میں دیو کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھتا آ رہا تھا۔ پری غائب ہو گئی۔ شہزادہ غم اور غصے میں کپڑے پھاڑ رہا تھا۔ پھولوں کو توڑ توڑ کر پاؤں تلے مسل رہا تھا۔ تلوار لئے درختوں کے ٹہنے اور پہاڑ کے پتھر کاٹ رہا تھا۔ پھر مجھے ایک غار نظر آیا۔ پری اس میں قید تھی۔ دیو اسے اٹھا لے گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو شہزادے کے روپ میں غار میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں پری کو ساتھ لانے ہی لگا تھا کہ دیو آ گیا۔ تاجی کے بال و پر نوچے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ چلانے لگیــــ ''شمو! بھاگ جا یہاں سے، دیو تجھے کھا جائے گا''۔

''لیکن شہزادہ بہت دلیر تھا۔ بہت ہی بہادر، سنتی ہو منی؟ اس منے جیسا بہادر......''

میں نے دیکھا کہ دیو میری طرف لپکا اور میں نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تلوار کی نوک اس کے پیٹ پر رکھی۔ پیشتر اس کے کہ اس کے لمبے لمبے ناخن مجھ تک پہنچتے میری تلوار اس کے پیٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے بہتے ہوئے خون سے غار بھرنے لگاــــ ''اور شہزادہ نیلم پری کو لے کر اپنے باغ میں آ گیا اور پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جیسے تم دونوں رہتے ہو اور آپس میں کھیلتے ہو اور گڑ کھاتے ہو''۔

باوا جما نے کہانی تو ختم کر دی اور مجھے باوا بھی، تاجی بھی اور گرد و پیش کا ذرہ ذرہ نظر آنے لگا لیکن روفی کے خلاف جو نفرت میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی وہ نہ گئی۔ میرے خیالوں میں وہ دیوں کی شکل میں گھومنے پھرنے لگا۔

+ + +

چار پانچ مہینے گزر گئے ہیں۔

چار پانچ مہینے سے میں اور تاجی اکٹھے کھیل رہے ہیں۔ ہم اسی اجڑی ہوئی حویلی میں کھیلتے ہیں۔ کبھی الگ تھلگ، کبھی سب کے ساتھ۔ تاجی اب ڈرتی نہیں اس لیے میں اب اس کی کمر کے گرد بازو نہیں ڈالتا۔ اب وہ اپنا بازو میرے کندھے یا کمر میں ڈال لیتی ہے۔ تاجی اب بڑ پر بھی چڑھ جاتی ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ سہارا بھی دیتا ہوں کہ کہیں گر نہ پڑے۔ وہ گرتی نہیں پھر بھی میں اسے سہارا دیتا ہوں۔ سہارا دینے میں مجھے لطف سا آتا ہے۔ چاہتا ہوں کہ وہ ڈرے اور میں اسے حفاظت میں لے لوں۔ ہم دونوں بڑ کے ٹہنوں پر، ہیبت ناک کمروں میں، کوٹھے پر اور برآمدوں میں پھدکتے پھرتے ہیں۔ روفی کی آواز ابھی تک سنائی دیتی ہےــــ ''تاجی!...... تاآجی!''

اور تاجی اس کے ساتھ بولتی نہیں۔ میں اب روفی کو ٹافیاں بھی نہیں دیتا۔ معلوم نہیں میں ایسے کیوں کرتا ہوں۔ روفی نے مجھے کبھی گالی نہیں دی۔ کبھی مارا نہیں۔ اتنی سی بات ضرور ہے کہ اب وہ مجھے خربوزے توڑ کے نہیں دیتا۔ توڑے بھی کہاں سے؟ سردیوں کا آغاز ہے۔ گندم بیجی جا چکی ہے۔ خربوزوں کے کھیت کبھی کے ویران ہو گئے ہیں۔ پھر بھی روفی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں کس سے پوچھوں کیوں اچھا نہیں لگتا اور پوچھوں کیسے؟

ہم چھ چھ سات سات برس کی عمر کے بچے جانے کتنی ہی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ پوچھیں کیسے! جب پوچھ بیٹھتے ہیں تو ہمیں ٹال دیا جاتا ہے۔ بعض سوالوں پر جھڑک بھی دیا جاتا ہےــــ ''ہشت! ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے''ــــ اور یہ جواب ہمارے ذہن میں رینگتے ہوئے معموں میں اضافہ بن جاتا ہے۔

گذشتہ رات چھٹی مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ روفی دیو کے روپ میں پہاڑ پہ بیٹھا تاجی کو پکار رہا ہے اور میرے دل و دماغ میں اس کے خلاف نفرت کے بگولے اٹھ رہے ہیں۔ کل رات میں نے دیو کے پیٹ میں تلوار گھونپی تو آنکھ کھل گئی۔ امی کہہ رہی

تھی ـــ ''منے! کل سے تجھے الگ سلایا کروں گی''۔

''کیا کرتا ہے؟'' ـــ ابا جان امی سے پوچھ رہے تھے۔ ان کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔

''سوتے میں کہہ رہا تھا ـــ مار دیا۔ میں نے اسے مار دیا اور گھونسہ اتنی زور سے میرے پیٹ میں دے مارا'' ـــ امی ہنسنے لگیں اور میں ہزار کوشش کے باوجود روفی کی صورت کو ذہن سے اگل نہ سکا۔ میں امی کے ساتھ لپٹ کر سو گیا۔

آج میں اور تاجی حویلی میں گئے تو روفی نے مجھے پکڑ لیا اور بولا ـــ ''شمو! اب تیرے ابا ٹافیاں نہیں لاتے؟''

''لاتے ہیں!'' ـــ میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

''پھر میرے لئے کیوں نہیں لاتا؟''

''بس نہیں لاتا''۔

''کیوں شمو! مجھ سے روٹھ گیا؟''

''ہاں! روٹھ گیا''۔

''کیوں؟''

''تو تاجی کو کیوں بلاتا ہے؟''

''ارے! تو تیرا کیا جاتا ہے؟''

''بس میرا جاتا ہے'' ـــ اور میں روٹھ کے الگ ہو گیا۔

''اچھا بچو! نہ لا ٹافیاں۔ میں اب روز تاجی کو بلاؤں گا'' ـــ وہ بھاگ کر برجے پہ چڑھ گیا اور مجھے چڑا چڑا کر چلانے لگا ـــ ''تاجی! تاجی کی بچی، تاجی''۔

اور میں اور تاجی گری ہوئی چھت کے ملبے کی راہ کوٹھے پر چڑھ گئے۔

+ + +

حویلی اجڑی ہوئی ہے۔

ہم کھیل رہے ہیں۔

سات برس گزر گئے ہیں جب ہم چھ چھ برس کے تھے۔ اب میں مہینے اور سال گن لیتا ہوں اور اب عمروں کے لحاظ سے چھوٹے بڑے کا اندازہ کر لیتا ہوں۔ میری عمر تیرہ سال اور چار مہینے ہے۔ ابا جان نے بتایا تھا۔ تاجی کی عمر گیارہ سال اور سات مہینے

ہے۔ اس نے اپنے ابا جان سے پوچھا تھا اور روفی شاید اٹھارہ برس کا ہو گیا تھا۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں کی عمریں بھی یاد ہو گئی ہیں۔ کوئی دس سال کا ہے کوئی گیارہ کا۔ کوئی بارہ کے بھی ہیں اور سب سے بڑا روفی ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے پھر بھی ہمارے ساتھ کھیلتا ہے۔ ہمارے ساتھ اب چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ایک چھ سال کا ہے اور دو اس سے ذرا ذرا بڑے ہیں۔ روفی اب بھی انہیں ٹافیاں لانے پر اکساتا رہتا ہے اور انہیں طرح طرح کے لالچ دیتا رہتا ہے لیکن میں انہیں الگ کر کے منع کر دیتا ہوں۔

روفی کی عادتیں بہت خراب ہوتی جا رہی ہیں۔ بڑی گندی باتیں کرتا ہے۔ ایک دن تاجی سے اکیلے میں کہتا تھا کہ میرے ساتھ کھیلا کرو، میں تمہیں برفی دیا کروں گا۔ تاجی نے نہ کر دی تھی اور اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ وہ تاجی کو بہلا پھسلا کر اس کمرے میں لے گیا تھا جس میں دادا جان نے سنایا تھا کہ ایک آدمی کو اس کی بیوی نے قتل کر کے یا کروا کے لاش فرش کے نیچے دبا دی تھی۔ تاجی وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ اب میں ساری باتیں سمجھنے لگا ہوں اور اب میں یہ بھی سمجھنے لگا ہوں کہ مجھے روفی سے نفرت کیوں ہے۔ تاجی بھی اسے ناپسند کرتی ہے۔ روفی مجھ سے پانچ سال بڑا ہے اگر ذرا سا بڑا ہوتا تو میں اسے سنبھال لیتا۔ میں نے چند ایک لڑکوں کو اس کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا ہے۔ کسی دن ہم دو تین لڑکے اسے ماریں گے۔

ہمارے ماں باپ ابھی تک ہمیں حویلی میں کھیلنے سے روک رہے ہیں۔ پرانے بڈھے مرتے جا رہے ہیں لیکن ان کا یہ یقین اور عقیدہ ابھی تک زندہ ہے اور دن بدن پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ حویلی آسیب زدہ ہے اور اس میں خطرناک شر شرار کا بسیرا ہے۔ اس ساون میں برآمدے کا وہ حصہ بھی گر پڑا ہے جو قتل والے کمرے کے سامنے تھا۔ وہاں کی چھپکلیاں اور چمگادڑ دوسرے کمرے میں ہجرت کر آئے ہیں۔ حویلی میں ہیبت زیادہ ہو گئی ہے۔ اب لوگ اس حویلی سے پہلے سے زیادہ خوف کھانے لگے ہیں۔

چند روز ہوئے ہمارے قصبے میں ایک تھیٹر آیا تھا۔ ایک رات ہم چند ایک لڑکے دیکھنے گئے تھے۔ انہوں نے وامق عذرا کا ڈرامہ کھیلا تھا۔ بڑا اچھا ڈرامہ تھا۔ ایک منظر میں تلوار بھی چلتی ہے۔ یہ منظر مجھے بہت پسند آیا تھا۔ تھیٹر تو اگلے شہر میں چلا گیا ہے لیکن ہم نے حویلی میں اپنا تھیٹر جما لیا ہے۔ وامق عذرا کا ڈرامہ ہوتا ہے۔ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں کے

ڈرامے بھی ہوتے ہیں۔ ہر ڈرامے کی کہانی اور مکالمے ایک جیسے ہوتے ہیں۔صرف نام بدل دیئے جاتے ہیں۔ ہر ایک ایکٹر خود اپنا ڈائریکٹر ہوتا ہے یا ایک تھپڑ یا گالی سے دوسرے کا بھی ڈائریکٹر بن جاتا ہے۔ایک روز رانجھا روٹھ گیا تھا کیونکہ ہیر نے اسے ننگی سی گالی دے دی تھی۔ہم نے بڑی مشکل سے رانجھے کو ہیر کی سیج پر لٹا دیا تھا۔

ایک روز طے پایا کہ باقاعدہ لباس پہن کر ڈرامہ کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز محلے میں کئی عورتیں سر جوڑے نظر آئیں۔

''جمال بیگم! سنا ہے تمہارا سبز دوپٹہ گم ہو گیا ہے؟''

''ہاں بہن! صبح دھو کر اس رسی پر ڈالا تھا۔ جانے فرشتے لے گئے، جانے یہ مانگنے والی نٹیناں لے گئیں''۔

''اور ہماری بھی سن ذرا...... کل کی ہی بات ہے۔اجو کے ابا کی پگڑی دھوئی تھی اور کلاہ برآمدے میں دھوپ میں رکھ دیا تھا کہ ذرا یہ بھی سوکھ جائے، دیکھتی ہوں کہ غائب ہے''۔

اور ہمیں آرکسٹرا کی بھی ضرورت تھی۔اس کے بغیر ناچ کیسے ہوتا؟

''اری حشمت بی! آج میرے دو کٹورے گم ہو گئے ہیں۔گھر گھر پوچھتی پھرتی ہوں کہیں......''

''کیا بتاؤں بہن! نیا گھڑا کل ہی لگایا تھا۔ اللہ جانے کون اٹھا لے گیا ہے۔ دوپہر اندر سوئے، اٹھ کے دیکھا تو گھڑا غائب۔اری بہن کورا گھڑا''۔

زراعت انسپکٹر کی نئی بید کی چھڑی غائب تھی۔ پٹواری کی عینک جانے کون لے گیا تھا اور ایک گھر سے چارخانہ کا کھیس لاپتہ ہو گیا تھا۔غفورا جب بھی ہاتھ ڈالتا ہے کسی بڑی چیز پہ ڈالتا ہے۔

ہمارا اسٹیج سجا اور خوب سجا۔ نئے مکالمے بنائے گئے جن میں لڑ جھگڑ کر اپنی اپنی مرضی کے مطابق قطع و برید کی گئی۔ گھڑے اور کٹوروں کی بے ہنگم تھاپ پر ناچ ہوا۔ چارخانے کے کیس کا پردہ بنا جسے بڑ کی لٹکتی ہوئی جڑوں کے ساتھ باندھا گیا۔کسی کے ابا کا خاکی کلاہ کیدو کو پہنایا گیا جو اس کے کانوں سے بھی نیچے آ گیا۔ زراعت انسپکٹر کا بید اس کے ہاتھ دیا گیا۔ پٹواری کی عینک رانجھے کو پہنائی گئی جو چہرے کی ذرا سی حرکت پر صرف آنکھوں سے

ہی نہیں ناک سے بھی نیچے سرک آتی تھی۔ جب آنکھوں کے سامنے ہوتی تو رانجھے کے بیان کے مطابق، اسے نہ کیدو نظر آتا تھا نہ ہیر اور نہ اسے سٹیج کے اگاڑے پچھواڑے کا خیال رہتا تھا۔ بڈھے پٹواری کی گئی گزری نظر کی خاطر عینک بنی تھی، اس میں سے رانجھے کو کیا خاک دکھائی دیتا لیکن ڈرامے میں رانجھا عینک کے بغیر نامکمل رہتا تھا۔اس لیے نہیں کہ اصلی رانجھے مرحوم کی نظر کی کمزوری کے متعلق ہمارے پاس کوئی تاریخی ثبوت موجود تھا بلکہ اس لیے کہ ہمارے پاس عینک موجود تھی اور ہمارا ایکٹر عینک پہننے پر بضد تھا۔چنانچہ ہر ایکٹ میں رانجھے کو ایک ہاتھ عینک پر رکھنا پڑا۔

کیدو اور ہیر ہمکلام تھے۔ ایکٹ بڑا جاندار تھا۔ پردہ گرا۔ اوپر سے گانٹھ کھل گئی تھی۔کیدو نے ہیر سے کہا تھا—— ''الو کے پٹھے گانٹھ پکی دینی تھی نا!''——اور ہیر نے جو عمر میں کیدو سے بڑی ہے اسے تھپڑ مار کر کہا—— ''سور کے جنے! پردہ تو نے باندھا تھا''—— کیدو اور ہیر گتھم گتھا ہو گئے۔ ہیر کا نکاح پڑھانے والے قاضی نے بیچ بچاؤ کر کے انہیں الگ کیا۔ایک لڑکا کھیس کا کونہ منہ میں ڈال کر بڑ کی جڑ پر چڑھ گیا اور پکی گانٹھ دے دی۔ پردہ اٹھا تو لڑکا گر پڑا۔اچھا ہوا کہ وہ کیدو کے اوپر گرا ورنہ اس کے بہت چوٹ آتی۔

اس روز کا کھیل ختم ہوا تو دوسرے روز کے لیے ''لیلیٰ مجنوں'' طے پایا۔اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ سامان کو کدھر لے جائیں۔ چرالانا آسان تھا۔ واپس گھروں کو لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔آخر فیصلہ ہوا کہ حویلی کے کمروں اور برآمدے کی گری ہوئی چھتوں کے نیچے تمام چیزیں ایک ایک کر کے چھپا دی جائیں۔

دوسرے روز جب دن کے پچھلے پہر تا جی کے ساتھ حویلی کی طرف جا رہا تھا تو غفورا گھبراہٹ میں بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ کہنے لگا—— ''شمو! وہ ساری چیزیں لوگوں نے دیکھ لی ہیں۔ بہت سارے آدمی اور عورتیں حویلی کے سامنے کھڑے ہیں۔ دیکھ! کوئی پوچھے تو کہنا کہ مجھے پتہ نہیں...... اچھا تا جی! بالکل نہ بتائیو...... ہم سب کہہ چکے ہیں کہ ہمیں ان چیزوں کا کچھ پتہ نہیں''۔

ہم سراسیمہ سے حویلی تک گئے۔ حویلی کے دروازے کے سامنے محلے بھر کے آدمیوں کا جمگھٹا تھا۔ مال مسروقہ زمین پر رکھا ہوا تھا۔ چند چیزیں شناخت ہو چکی تھیں اور مالکوں کو دے دی گئی تھیں۔ ہمارے تھیٹر کے تمام فنکار الگ کھڑے تھے۔ روفی میرے

پاس آیا اور میرے کان میں وہی بات کہی جو غفورا کہہ چکا تھا۔ میں نے اسے غصے میں جواب دیا۔۔۔ ''مجھے معلوم ہے''۔۔۔ پھر اس نے تاجی کو وہی ہدایت دی تو میں نے اس کا فقرہ کاٹتے ہوئے غصہ میں کہا۔۔۔ ''اسے بھی معلوم ہے تم مت بتاؤ''۔۔۔ اتنے میں تین چار عورتیں آ گئیں۔ ایک نے اپنا کورا گھڑا شناخت کر کے اٹھا لیا۔ دوسری نے کٹورے سنبھال لئے۔ سبز دوپٹہ جا چکا تھا۔ کلاوہ جا رہا تھا۔ تاجی نے حد کر دی۔ اس نے اپنے ابا جان کی بید کی چھڑی دیکھی تو وہ اس کی طرف دوڑی جیسے یہ چھڑی وہ خود گھر سے چرا کر نہیں لائی تھیں۔ میں اس کی عقل پر بہت حیران ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف خوبصورت ہی ہے، وہ عقلمند بھی ہے۔ اس نے لپک کر اس آدمی کے ہاتھ سے چھڑی لے لی اور کہا۔۔۔ ''یہ میرے ابا جان کی ہے۔ پتہ نہیں یہاں کون لے آیا ہے''۔

''بھئی! کوئی آدمی اندر جا کے دیکھ لو، کچھ اور تو نہیں؟''۔۔۔ یہ باوا جما کی آواز تھی۔

میں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لئے کیونکہ میرے منہ سے نکلنے ہی لگا تھا۔۔۔ ''نہیں باوا! اور کچھ نہیں یہی کچھ تھا''۔

''اب یہ عینک رہ گئی ہے''۔۔۔ اجو کے باپ نے کہا۔

''پٹواری کی طرف آدمی بھیج رکھا ہے''۔۔۔ کسی اور کا باپ بولا۔۔۔ ''یہ عینک اسی کی ہے''۔

دیکھا کہ پٹواری چلا آ رہا ہے۔ منہ اوپر کی طرف اور آنکھیں نیچے کو کئے ہوئے۔ شاید عینک کے بغیر اسے اوپر دیکھنے سے زمین نظر آتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، وہ بستہ اٹھائے ہوئے بہت ہی تیز چلا کرتا تھا۔

''پٹواری میاں!''۔۔۔ باوا جما نے عینک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''یہ عینک تمہاری ہے شاید!''

''کہاں ہے عینک؟''۔۔۔ پٹواری نے بدستور منہ اوپر اٹھائے ہوئے پوچھا۔

''یہ ہے باوا جما کے ہاتھ میں''۔۔۔ کسی اور نے بتایا۔

''کہاں ہے باوا جما؟''

باوا جما نے عینک اس کے ہاتھ میں تھمائی تو اس نے جلدی سے آنکھوں پر چڑھا لی۔ پھر ہاتھ سے سرکا کر عینک ناک کی نوک پہ جمائی اور عینک کے اوپر سے دیکھ کر بولا۔۔۔

''اوہ! آپ سب یہاں کیسے؟ اور یہ عینک کہاں سے ملی؟ پرسوں سے گم ہے''۔

پٹواری کو بتایا گیا کہ فلاں آدمی پیشاب کرنے حویلی میں گیا تو اسے ملبے کے نیچے سبز دوپٹہ نظر آیا۔ اس نے جا کے اٹھایا تو پاس ہی ایک کٹورا پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں چیزیں لے کے باہر کی طرف آ رہا تھا کہ ایک کمرے کے کونے میں سے ایک چارخانہ کھیس دکھائی دیا۔ اس نے باہر آ کر لوگوں کو بتایا۔ سب نے اندر جا کر ساری حویلی کی تلاشی لی اور یہ چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ پرسوں سے گم ہوئی تھیں۔ کوئی کسی گھر سے کوئی کسی گھر سے۔

''یہ ان لونڈوں کے کرتوت ہیں''۔۔۔ پٹواری نے کہا۔

''نہیں!''۔۔۔ اسے بتایا گیا۔۔۔ ''تمام بچوں سے پوچھ گچھ کر لی ہے، وہ بے چارے خدا اور رسول کی قسمیں کھاتے ہیں''۔

''نہ جی!''۔۔۔ ایک اور بولا۔۔۔ ''بچے بھلا گھڑے اور کھیس کو کیا کریں گے؟''

''نہیں جی! یہ بچوں کا کام نہیں''۔۔۔ مسجد کے مولوی صاحب نے کہا۔۔۔ ''یہ حویلی ہے ہی آسیب زدہ۔ اس میں اب تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہاں شر شرار ہے۔ ورنہ ایک ہی دن ایک ہی وقت گھر گھر سے چیزوں کا غائب ہونا اور ہر چیز کا حویلی میں سے برآمد ہونا......''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مولوی صاحب!''۔۔۔ کئی آوازیں اٹھیں۔

''آپ سب محلے والے یوں کرو''۔۔۔ مولوی صاحب نے ہدایت دی۔۔۔ ''کہ سب مل ملا کر نذر نیاز دے دو۔ میں اپنے طور پر ایک چلہ کر لوں گا۔ کوئی ڈرنے والی بات نہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس حویلی میں جو جن رہتے ہیں وہ سید ذات کے ہیں۔ سید ذات جنات انسانوں کو کچھ نہیں کہتے۔ یہ کوئی، دوسرا شر شرار ہے۔ بعض جنات نیاز مانگتے ہیں، نہیں تو اسی طرح تنگ کرتے ہیں''۔

اور جن جن گھروں سے چیزیں گم ہوئی تھیں ان گھروں سے مولوی صاحب کو اب ہر جمعرات حلوہ، کھیر، روٹی اور طرح طرح کی چیزیں جاتی ہیں۔ محلے والوں کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے کہ جن کہیں ان کے گھر کے کسی آدمی پہ سوار نہ ہو جائے۔ اس واقعہ کو ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ جن تو ابھی تک کسی پر سوار نہیں ہوا، مولوی صاحب سب پر بری طرح سوار ہو گئے ہیں۔

+ + +

ہمارا تھیڑ ٹھپ ہو گیا تھا۔ پردہ نہ آرکسٹرانہ لباس۔ اب ہم چھوٹے چھوٹے بچے تو نہیں رہے کہ اپنا اپنا کوئی الگ الگ کھیل کھیل کر وقت گزار لیں۔ اب ہم اس عمر میں پہنچ گئے ہیں جہاں منظم کھیلے کھیلتے جاتے ہیں۔ دس پندرہ روز ہم متفرق کھیل کھیلتے رہے۔ مثلاً۔۔۔ ''سکول سکول''۔۔۔ ''چور اور تھانیدار''۔۔۔ ''گاڑی گاڑی''۔۔۔ وغیرہ۔

کل کا ماسٹر آج نالائق لڑکے کی حیثیت سے مرغا بنا ہوا ہے۔ کل کا تھانیدار آج چور ہے۔ آج کا چوکیدار کل ڈپٹی کمشنر ہوگا اور آج جو سٹیشن ماسٹر ہے وہ پرسوں بے ٹکٹ پکڑا گیا تھا۔

تاجی میرے ساتھ رہتی ہے لیکن اب وہ ضد کرنے لگی ہے کہ ہم دونوں الگ کھیلا کریں۔ میں کبھی کبھی اس کی ضد پوری کر دیتا ہوں۔ تاجی کو جانے آنکھ مچولی کیوں پسند ہے۔ اس کا کھیلنے کا انداز بھی عجیب ہے اور پیارا بھی۔ شاید اس لیے کہ یہ انداز تاجی کا ہے۔ میں حویلی کے برآمدے کے ستون کے ساتھ آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ فوراً کہہ دیتی ہے''۔۔۔ ''آ جا''۔۔۔ وہ چھپتی کہاں ہے؟ ساتھ والے کمرے میں جس کے دروازے کا ایک ہی کواڑ ہے۔ وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹا اور کھایا ہوا۔ تاجی کواڑ کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کے پاؤں بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے بعض اوقات وہ پوری کی پوری نظر آ جاتی ہے اور کتنی ہی دیر قہقہے لگا کر ہنستی رہتی ہے۔ اس کے کٹے ہوئے بھورے بھورے بال اس کے گلابی مائل سفید چہرے کو ایک طرف سے ڈھانپ لیتے ہیں جنہیں وہ ہاتھ سے جب پیچھے کرتی ہے وہ مجھے بہت ہی پیاری لگتی ہے۔ میں چھپتا ہوں تو وہ ڈھونڈ نہیں پاتی۔ پھر میں خود ہی سامنے آ جاتا ہوں تو وہ بھاگ کر میرے ساتھ لپٹ جاتی ہے اور چیخ چیخ کر ہنستی ہے۔ میں اس سے کہا کرتا ہوں کہ کہیں ایسی جگہ چھپا کرو جہاں سے میں ڈھونڈ نہ سکوں لیکن وہ اسی کواڑ کے پیچھے ہی چھپتی ہے۔ اس روز میں نے اسے کواڑ کے پیچھے دیکھا، پھر بھی میں جان بوجھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں سے نکل کر آگے چل پڑا۔ میں جا ہی رہا تھا کہ تاجی نے پیچھے سے آ کر مجھے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور وہ چیخنے لگی۔۔۔ ''چور چور''۔

ایک دن تاجی نے ستون کے ساتھ آنکھیں بند کیں تو میں ملبے کے راستے کوٹھے پر

چڑھ گیا اور کہاں۔۔۔ ''آ جا''۔۔۔ میں کوٹھے پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا اور جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ آخر سوچا کہ وہ ہار کر بیٹھ گئی ہوگی۔ میں نیچے اتر رہا تھا کہ دیکھا روفی نے تاجی کو بازو سے پکڑا ہوا تھا اور اسے بہلا پھسلا رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔ پوچھا تو تاجی نے بتایا کہ روفی اسے مٹھائی کا لالچ دے کر اپنے ساتھ کھیلنے کو لے جانا چاہتا تھا۔ وہ بھی اس دور کونے والے کمرے میں۔ تاجی میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

روفی مجھ سے پانچ سال بڑا ہے لیکن میں اس روز بالکل ہی بھول گیا کہ میں تیرہ برس کا بچہ ہوں۔ غصے اور نفرت نے مجھے پاگل بنا دیا۔ ذرا پرے ایک ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر ڈنڈا اٹھا لیا۔ میں نے چار پانچ ڈنڈے مارے جو اس نے بازوؤں اور ہاتھوں پر روکے۔ میں پوری طاقت سے اسے مار رہا تھا اور پیچھے ہٹ رہا تھا اور وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آخری ڈنڈا اس کی کلائی پر اس قدر زور سے لگا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ڈنڈا پکڑ لیا۔ میں اب اپنے حشر سے باخبر تھا لیکن میرا ایک دوست جو میرا ہم عمر ہے بڑ کے ٹہنے سے اتر آیا۔ اسے میں کئی دنوں سے ٹافیاں کھلا رہا تھا۔ اس روز اس نے ٹافیاں حلال کر دیں۔ وہ گولی کی طرح آیا اور پیچھے سے آ کر روفی کی ٹانگوں میں گھسا اور اسے زمین پہ دے پٹخا۔ پھر میں نے اور اس دوست نے روفی کو گھونسوں سے اس قدر مارا کہ اسے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔

میں جب تھک گیا تو خیال آیا کہ اتنے سارے لڑکے حویلی میں موجود ہیں، وہ ہمیں چھڑاتے کیوں نہیں؟ میں نے دیکھا کہ سبھی لڑکے ہمارے اردگرد کھڑے تھے اور خوشی سے چلا رہے تھے۔۔۔ ''اور مارو حرامزادے کو اور مارو۔ خوب مارو''۔

لڑکیوں نے آخر بیچ بچاؤ کرا ہی دیا۔ تین چار لڑکوں نے اسے پکڑ لیا اور ہم دونوں نے موقعہ غنیمت جان کر دو چار گھونسے اور جما دیئے۔ روفی بڑ کے نیچے جا بیٹھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور اوپر والا ہونٹ سوجتا جا رہا تھا۔ وہ بے تحاشا ننگی گالیاں دے رہا تھا۔ لڑکے پھر اس کے اردگرد جا کھڑے ہوئے اور وہ مجھے اور میرے دوست کو خبردار کر رہا تھا کہ وہ بدلہ لے گا۔ اس پر ایک لڑکا جو اس سے دو اڑھائی سال چھوٹا ہے بول پڑا۔۔۔ ''ارے سالے! تو کیا بدلہ لے گا۔ بیڑیاں اور تار کے سگریٹ پی پی کر تیرا یہ حال ہو گیا ہے کہ ذرا ذرا سے بچوں نے تیرا حلیہ بگاڑ دیا ہے''۔۔۔ دو چار نے تائید کر دی اور روفی دبک

کے رہ گیا۔

اس روز مجھے پتہ چلا کہ روفی دو سال سے بیڑیاں اور سستی قسم کے گھٹیا سگریٹ پی رہا ہے۔لڑکوں نے تفصیلاً بتایا کہ اس نشے کی خاطر وہ کیا کیا پاپڑ بیلتا ہے گھر سے چوری بھی کرتا اور بسوں کے اڈے پر ڈرائیوروں اور کلینروں کے ساتھ بھی اٹھتا بیٹھتا ہے اور جانے کیسے کیسے لوفر لفنگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے پھر ہمارے کھیل کے وقت حویلی میں بھی آجاتا ہے اب اس روز سے پٹائی کے بعد اس نے حویلی میں آنا چھوڑ دیا ہے اور اس روز سے میں اور میرا دوست اکٹھے سکول آتے جاتے ہیں اور اس روز سے تاجی مجھ سے اس قدر پیار کرنے لگی ہے کہ میں بعض اوقات تنگ سا آجاتا ہوں۔ وہ مجھے ہیرو سمجھنے لگی ہے۔

روفی کے خلاف میرے دل میں اب اس قدر نفرت بھر گئی ہے کہ اس کے نام سے ہی متلی سی ہونے لگتی ہے۔

+ + +

حویلی اجڑی ہوئی ہے۔

ہم کھیل رہے ہیں۔

میں اب نویں جماعت میں پہنچ گیا ہوں۔ تاجی ساتویں میں ہے۔ میں پندرہ برس کا ہو گیا ہوں۔ تاجی تیرہ برس کی۔ اس روز کہہ رہی تھی ___ ''اب امی کہتی ہے کہ زیادہ دیر باہر نہ رہا کرو اور لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلا کرو'' ___ لیکن وہ چوری چھپے نکل ہی آتی ہے اور حویلی میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی آنکھ مچولی والی ضد اور آنکھ مچولی کھیلنے کا انداز وہی ہے۔ وہ اب بھی میرے ساتھ لپٹ جاتی ہے اور یوں بے ساختگی سے لپٹ جانا مجھے بچپن کی طرح پیارا لگتا ہے لیکن اب مجھ پر وارفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ محسوس کرتا ہوں کہ اجنبی سی ایک لذت اور انوکھا سا سکون میری روح کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔

پہلے تاجی کی ضد ہوتی تھی کہ آنکھ مچولی کھیلیں اور میں دوسرے چوتھے روز اس کی ضد پوری کر دیا کرتا تھا۔ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھی کھیلنا چاہتا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ہر روز اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلوں، لیکن چند روز سے میں اس کے ساتھ نہیں کھیل سکا کیونکہ ہم نے اپنا سرکس بنا لیا ہے اور میں رنگ ماسٹر ہوں، میرے بغیر شیر اور گھوڑے کام نہیں کرتے اور نہ کسی اور سے سائیکل چلتی ہے۔

ہمارے سرکس کا شیر بہت ہی منہ زور اور خطرناک ہے۔ کسی اور کے ہاتھ پر کام ہی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شیر کو میں نے سرکس کے لیے تیار کیا تھا ورنہ وہ کسی اور سے تیار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ رنگ ماسٹر بننا چاہتا تھا، آخر میں نے اسے ایک پیسے کی ریوڑیوں کا وعدہ دیا تو وہ مان گیا۔ یوں تو اور کئی شیر تیار ہو گئے تھے لیکن یہ شیر غراتا اور گرجتا خوب ہے۔ آج آٹھ روز سے وہ ریوڑیوں پر میرے ہنٹر اور اشارے پر کرتب دکھا رہا ہے اور اس کی آٹھ روز کی ریوڑیاں میرے ذمے ہو گئی ہیں۔ کل یہ شیر رنگ میں تماشے کے دوران ہی بگڑ گیا تھا۔ کہنے لگا پہلے پچھلی ریوڑیاں دو نہیں تو دوسرا شیر ڈھونڈ لو۔ بڑی مشکل سے کل کے وعدے پر کرتب کرائے۔

گھوڑے بے چارے بڑی اچھی نسل کے ہیں۔ ذرا سا اشارہ کرو تو شلوار قمیض اتار کر رنگ میں آجاتے ہیں اور ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہو کے گول دائرے میں بھاگنے لگتے ہیں۔ دو روز ہوئے فضا ذرا بگڑ گئی تھی۔ ایسے میں منت سماجت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہنٹر بے کار ہو جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک گھوڑا ذرا موڈ میں آ گیا تو اس نے دوسرے گھوڑے کے پہلو میں دولتی جما دی۔ دوسرا گھوڑا روٹھ کر رنگ سے باہر نکل گیا اور شلوار پہن کر تماشائیوں میں جا بیٹھا۔ بہت منت سماجت کی لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ بے چارے کو لات لگی ہی بہت زور کی تھی۔

تماشائیوں کی عمر چھ سے دس سال تک ہے۔ عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام ہے جہاں تاجی بیٹھتی ہے۔

سائیکل کی مشکل پیش آ گئی تھی۔ بغیر مڈگارڈ اور بریکوں کی سائیکل کی شدید ضرورت تھی ورنہ سرکس ہی کیا جس میں سائیکل ہی نہ ہو۔ تلاش بسیار کے بعد ہمیں سائیکل مل گئی۔ یہ سائیکل غیر متوقعہ طور پر ہمارا مقصد پورا کر رہی ہے۔ ہم نے ایک اور لڑکے کو شامل کر لیا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں اس کے قد کی لمبائی بلا مبالغہ پانچ فٹ سے ذرا ہی کم ہو گی۔ جسم بانس کی طرح خشک اور دبلا۔ ٹانگیں جس قدر ٹخنوں کے قریب سے موٹی ہیں رانوں تک اسی قدر موٹی ہیں۔ بازوؤں کے تمام حصے اور پٹھے کلائیوں جتنے باریک ہیں۔ ہاتھ بے تحاشا لمبے، گردن بھی لمبوتری۔ اس گردن کے اوپر ٹوٹرا سا سر، پستول کے کارتوس کے سکے کی شکل کا چہرہ بھی لمبوترا اور سامنے والے دو دانت آگے کو بڑھے ہوئے جن کی لمبائی اگر ایک ایک

انچ نہیں تو پون انچ بھی نہیں۔ انچ اور پون کے درمیان ہوگی۔ غرض اس کی ہر چیز لمبوتری ہے۔ یوں سمجھ لیجئے جیسے چار بانسوں کو جوڑ جاڑ کر ان میں ایک پیٹ اور ایک سرفٹ کر دیا گیا ہے۔ ہم اس کی شلوار قمیض اتار کر اسے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل نہیں، پائیوں کے بل کر دیتے ہیں۔ اس حالت میں وہ جو کچھ بن جاتا ہے اسے ہم سرکس کی سائیکل کہتے ہیں۔ تصویر میں جس نے کبھی کنگرو کو چاروں پاؤں پہ کھڑا دیکھا ہو وہ اس سائیکل کا تصور اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اس سائیکل کا تصور اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اس سائیکل کے اونٹ جیسی اونچی کوہان پر بیٹھ کر میں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل کو چلاتا ہوں۔

اب کے حویلی کے جنوں نے محلے کے کسی گھر سے کوئی چیز نہیں اٹھائی، سوائے ایک موٹی رسی کے اجو جو اپنے گھر سے کسی پرانی چارپائی کی ادوائن نکال لایا ہے اسے ہم نے بڑ کے ٹہنے کے ساتھ باندھ کر سرکس کی ''پینگ'' بنایا ہوا ہے اور اجو پانچ فٹ کی خوفناک بلندی سے چھلانگ لگایا کرتا ہے۔

✦ ✦ ✦

1943ء کا آغاز ہے۔ برلن سے اٹھی ہوئی چنگاری نے دنیا بھر میں آگ لگا دی ہے۔ شعلے تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ انسان ایندھن کی طرح جل رہے ہیں۔ زمین کے جس گوشے میں ابھی جنگ نہیں پہنچی وہاں کی حالت میدان جنگ سے بدتر ہے۔ انگریز نے ہندوستان میں بہت سارا انسانی ایندھن جمع کر رکھا ہے جسے وہ تیزی سے تنور میں جھونکتا جا رہا ہے۔ فریب خوردہ دیس کے بھوکے انسانوں کے لیے آٹے اور چاولوں کے سرکاری گوداموں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں۔ بھرتی ہونے والے ڈاگ بسکٹوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ ''کتا بسکٹ'' کی خاطر انسانوں نے جانیں دے دی ہیں۔ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مخلوق کو انگریز نے خاکی وردی میں لپیٹ کر برما کے گھنے جنگلوں میں، لیبیا کے صحراؤں میں اور اٹلی کی چٹانوں میں بکھیرنا شروع کر دیا ہے۔ دیس کے لوگ جانے کس دیس کی حفاظت کے لیے پردیسی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ماں باپ چپ چاپ اور گم صم سے ہو گئے ہیں۔

تعویذوں اور ٹونے ٹوٹکوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔ ہماری مسجد کے مولوی صاحب کو اب حویلی کے شر شرار کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اب وہ زیادہ دیر تعویذ لکھنے میں

مصروف رہتے ہیں۔ وہ اب پیشین گوئی بھی کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ــــ ''کتاب جھوٹ نہیں بولتی'' ــــ چند روز ہوئے جمالے موچی کی بیوی نے کتاب نکلوائی تھی۔ مولوی صاحب نے سوا روپیہ ہدیہ لے کر اسے خوشخبری سنائی ــــ ''تمہارا بیٹا اٹلی کے فرنٹ پر بھلا چنگا ہے اور بالکل خیریت سے ہے اور وہ بندوق کی گولی سے نہیں مرے گا''۔

اسی دن پچھلے پہر ڈاکیے نے جمالے موچی کے گھر ایک سرکاری لفافہ لا پھینکا۔ پڑھا تو کہرام مچ گیا۔ سرکار انگریزی نے اسے بصد افسوس اطلاع دی تھی کہ ''تمہارا بیٹا محمد اقبال برما کے فرنٹ پر مارا گیا ہے''، لیکن مولوی صاحب کی کتاب نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ دو ماہ بعد معلوم ہوا کہ مرحوم بندوق کی گولی سے نہیں مرا۔ جاپانی دستی بم نے اس کی دونوں ٹانگیں اور ایک بازو اڑا دیا تھا۔

مائیں اور باپ تیزی سے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ سہاگ گولی کی رفتار سے اجڑتے جا رہے ہیں۔ الھڑ جوانیوں کے سہانے سپنے اور تصوروں کے محل توپ کے دھاکے کی طرح پھٹتے جا رہے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی غراہٹ سے زمین دہل رہی ہے۔ لوگ اخباروں اور ریڈیو کے گرد جمگھٹا کئے رہتے ہیں۔ باوا جما بچوں کے ساتھ اب پہلے سے زیادہ پیار کرنے لگا ہے۔ آسمان کی وسعت میں ہوائی جہاز کی آواز سنائی دیتی ہے تو باوا جما کا چہرہ لال سرخ ہو جاتا ہے اور وہ بچوں کو یوں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے جیسے چیل کو دیکھ کر مرغی نے اپنے بچے محفوظ کر لیے ہوں۔ اب باوا باتیں کم کرتا ہے۔ کوئی نئی خبر، کوئی نئی پیش قدمی یا کوئی نئی پسپائی کی خبر سنتا ہے تو وہ سراسیمہ اور حیرت زدہ لہجے میں اسی قدر کہتا ہے ــــ ''انسانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ محبت اور برادری کہاں مر گئی؟'' ــــ بعض اوقات اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ ایک روز مجھے میرے دو تین دوستوں کے ساتھ جاتا دیکھ کر باوا نے ہمیں روک لیا اور کہا ــــ ''بچو! ابھی جوان نہ ہونا۔ ابھی نہیں۔ لڑائی ختم ہو لینے دو''۔

قصبے کا رنگ روپ اڑ گیا ہے۔ لڑائی ابھی بہت دور ہے لیکن ڈاکیے کے روپ میں اس کی دستک قصبے کے دروازوں پہ اکثر سنائی دیتی ہے۔

حویلی تو اجڑی ہوئی ہے۔ قصبہ بھی اجڑنے لگا ہے۔

قصبے کے ڈاک بنگلے میں بہت رونق رہتی ہے قمیض اتارے اور شلواریں ناف میں

اڑسے ہوئے بیسیوں جوان اور نوعمر لڑکے ڈاک بنگلے کے سامنے قطاریں بنائے کھڑے رہتے ہیں۔ دو آدمی ان کے قد، چھاتی اور وزن ناپتے تولتے رہتے ہیں۔ جن کی چھاتی اٹھائیں، تمیں ہوتی ہے۔ اس کی بھی بتیس، چونتیس لکھ لی جاتی ہے۔ انسان غائب ہوتے جارہے ہیں لیکن قطاریں لمبی ہوتی جارہی ہیں۔

لوگوں کی علیت میں اضافہ ہوگیا ہے اب موجونائی بھی آٹے کو راشن اور سمندر پار کو اور سیز کہتا ہے۔ بلیک مارکیٹ اور ٹھیکیداریاں عام ہوگئی ہیں۔ ہمارا معصوم سا قصبہ بھی ان سے محفوظ نہیں رہا۔ راشن کی جگہ لوگوں کو راشن کارڈ دے دیئے گئے ہیں۔

زراعت انسپکٹر کا بیٹا (تاجی کا بھائی اشرف) سپلائی کور میں حوالدار سٹور کیپر بن کر چلا گیا ہے۔ تاجی اس کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہے روفی گھر سے بھاگ گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں بھرتی ہوگیا ہے، بعض کہتے ہیں بھرتی نہیں ہوا جیل میں ہے۔ میرے دس گیارہ اور ہمجولی دس دس جماعتیں پاس کر کے خاکی وردی میں گم ہوگئے ہیں۔

زبیدہ کا خاوند نورداد دق کے آخری مراحل طے کر رہا ہے۔ سنا ہے چندروز کا مہمان ہے۔ زبیدہ کو دیکھا ہے۔ پہلے سے زیادہ موٹی ہوگئی ہے۔ اس کے سفید چہرے پر کیلیں اور سرخ سرخ سے دانے نکل آئے ہیں۔ اس کی آنکھیں بے چین سی رہتی ہیں۔ مولوی صاحب نے نورداد کے لیے کوئی تعویذ نہیں لکھا حالانکہ وہ ان کا داماد ہے۔ کہتے ہیں جو خدا کو منظور ہوگا۔ نورداد کو معلوم ہے کہ خدا کو کیا منظور ہے۔

✦ ✦ ✦

1944ء کے چار پانچ مہینے گزر گئے ہیں۔ قصبے کی آبادی بہت زیادہ اور رونق بہت کم ہوگئی ہے۔ بجلی گھر میں ایک اور جنریٹر لگا دیا گیا ہے۔ کولھو اور آٹا پیسنے والی مشینیں بھی بجلی سے چلنے لگی ہیں۔ قصبے سے چار میل دور ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں دور دور تک پتھر اور سیمنٹ کوٹ کوٹ کر ہوائی جہازوں کے اترنے کی سڑک بنادی گئی ہے۔ کسان قصبے میں محنت مزدوری کو آنے لگے ہیں اور ان کے مویشی جو اس ہنگامی ہوائی میدان کو ابھی تک اپنے کھیت سمجھ کر وہاں چلے جاتے ہیں انہیں کچہری کے پھاٹک میں بند کر کے ان کے مالکوں پہ جرمانے کیے جارہے ہیں۔ حیوانوں کو کون سمجھائے کہ ان کی ہریالی پر سرکار کا قبضہ ہوگیا ہے۔ میں نے پرسوں پھاٹک میں دو بیل منہ جوڑے کھڑے دیکھے، جیسے ایک

دوسرے سے پوچھ رہے ہیں ــــ "کیوں نیلے! تو ہی کچھ بتا۔ جن کھیتوں میں ہم نے عمر بھر ہل کھینچا ہے وہ کہاں غائب ہوگئے ہیں؟"

قصبے میں شادیوں کا زور ہے۔ ماتم کی رفتار بھی کم نہیں۔ کئی گھر سونے پڑے ہیں لیکن آج میرے ابا جان اور امی بہت خوش ہیں۔ نتیجہ آگیا ہے۔ میں میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا ہوں۔ ابا جان تو اس قدر خوش ہیں کہ انہوں نے اپنا رنگدار چشمہ مجھے دے دیا ہے اور امی نے دو روپے دیئے ہیں۔

میرے اور تاجی کے درمیان ٹاٹ کا پردہ حائل ہوگیا ہے جو آہنی پردہ بنتا جارہا ہے۔ تاجی مجھ سے ایسے بھونڈے طریقے سے چھپ گئی ہے کہ میں نے کئی بار کہا ہے ــــ "آجا" ــــ وہ نہیں آتی۔ تصورات کی آوازیں کون سنتا ہے۔ کبھی کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی فصیل کی اوٹ سے جھانک لیتی ہے۔ وہ بھی اس وقت جب اسے معلوم ہو جائے کہ میں گلی میں سے گزر رہا ہوں۔ سکول سے آتے جاتے میں اسے راستے میں نہیں روکتا، لوگ باتیں بناتے ہیں۔

آج وہ آہی گئی۔ میں نے اسے جی بھر کے دیکھا ہے۔ اس کے گالوں پر سرخی آگئی ہے۔ آنکھوں میں چمک، ایک شکوہ اور جانے کتنی ہی باتیں۔ ہونٹ کچھ کہنے کو ذرا سا لرزتے ہیں لیکن شرمیلی سی مسکراہٹ مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ سیاہ برقعے میں وہ باوا جی کی کہانی کی پری معلوم ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ ابا جان گھر نہیں تھے اور امی نے ٹوکا نہیں۔ تاجی بڑی ہی بے تکلفی سے آئی اور بے ساختگی سے کہا ــــ "شمو پاس ہوگیا؟ مبارک ہو۔ مبارک ہو خالہ جان!"

میں کمرے میں بیٹھا تھا اور تاجی برآمدے میں میرے سامنے چند قدم دور امی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس نے برقعہ اتار دیا۔ تاجی کتنی جلدی اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہاتھ کی بند مٹھی امی کی طرف بڑھا کر کھولی اور کہا ــــ "خالہ جان! یہ رومال میں شمو کے لیے تحفہ لائی ہوں"۔

امی نے رومال لے کے کھولا۔ ریشمی رومال ہے، ایک کونے میں تاجی نے رنگ برنگے دھاگے سے کاڑھا ہے ــــ "شمس" ــــ امی بہت خوش ہوئیں۔ میں نے اٹھ کے رومال لے لیا اور پھر کمرے میں تاجی کے سامنے آبیٹھا۔ امی نے تاجی سے سرگوشی میں

کہا۔۔۔ ''اری ڈائن! تو خود ہی کسی دن تحفہ بن کے آجا۔ میرے شمو کا تو کوئی چچا یا تایا بھی نہیں''۔۔۔ تاجی نے امی کو ہاتھ سے دھکا سا دیا اور شرما کر میری طرف دیکھا کہ میں نے سن نہ لیا ہو۔ میں نے فوراً منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے میں نے سنا نہیں۔

خدا خوش رکھے پڑوسن حشمت بی کو جس نے بڑے ہی موزوں وقت امی کو کوٹھے سے آواز دی۔۔۔ ''اری بہن! کہاں ہو! سامنے تو ہو ذرا۔ اری ان شیخوں کا بیٹا لام پر مارا گیا ہے، چل ذرا ہو آئیں''۔۔۔ اور امی۔۔۔ ''ہائے بے چارے تباہ ہو گئے''۔۔۔ کہہ کر برقعہ اوڑھ کر باہر نکل گئی۔ خدا ابا جان کو بھی خوش رکھے جو تاجی کے آنے سے ذرا ہی پہلے باہر نکل گئے تھے۔

جب یقین ہو گیا کہ امی گلی کی نکڑ سے آگے نکل گئی ہو گی تو تاجی بھاگ کر کمرے میں آگئی اور میرے ہاتھ تھام کر منت سماجت کے لہجے میں کہنے لگی۔۔۔ ''شمو! اللہ کے واسطے بھرتی نہ ہو جانا''۔

''تاجی!'' میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔۔۔ ''تاجی! اب آنکھ مچولی کھیلنے کو جی نہیں چاہتا''۔

''کیوں نہیں چاہتا، چھپ تو گئی ہوں آؤ ڈھونڈ لے''۔۔۔ وہ مسکرائی لیکن اس میں تلخی سی رچی ہوئی تھی۔ مجبور سی مسکراہٹ۔

''تاجی!''۔۔۔ خدا جانے میری جذباتی کیفیت میں کیا زلزلہ سا آ گیا تھا کہ میں اپنے آپ سے بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی ہی آواز اجنبی سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اسی اجنبی آواز سے کہا۔۔۔ ''تاجی! ذرا اس کواڑ کے پیچھے چھپ جاؤ، میں تمہیں ڈھونڈوں گا''۔

اور تاجی بے ساختگی سے میرے ساتھ لپٹ گئی لیکن زور سے چیخ کر ہنسی نہیں۔ میں نے کنپٹیوں سے تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا۔۔۔ ''تاجی! بات پوری نہیں ہوئی۔ تم نے چیخ مار کر قہقہہ تو لگایا نہیں''۔۔۔ لیکن میں کہہ نہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں دو آنسو تھے۔ میں نے اس کا دیا ہوا ریشمی رومال اس کی آنکھوں سے لگا دیا۔ دونوں آنسو رومال نے اپنے ریشمی تاروں میں محفوظ کر لئے۔ میں نے رومال تہہ کر کے اس سے کہا۔۔۔ ''تمہارا تحفہ تاجی''۔۔۔ اور میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

''امی نے جو کچھ تم سے کہا تھا وہ سچ ہو سکتا ہے تاجی؟''

''تم نے سن لیا تھا؟''

''ہاں!''

''تو امی سے کہو نا میری امی کے پاس جائیں''۔۔۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔۔۔ ''پر ابھی نہیں شمو! میں میٹرک کر لوں''۔۔۔ اور سر جھکا کر زیر لب بولی۔۔۔ ''اور میں چھوٹی ہوں نا ابھی شمو! ابھی نہیں''۔۔۔ جانے اسے کیا ہوا یا کیا خیال آیا کہ یک لخت چل پڑی اور برقعہ پہن کر۔۔۔ ''اچھا شمو! چلتی ہوں''۔۔۔ کہہ کر چلی دی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ دروازے میں رک گئی، گھوم کے میری طرف دیکھا اور نہایت آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگی۔ میں کمرے کے دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ وہ عجیب تشنہ اور مجبور سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے میرے سامنے آ رکی اور میرے دونوں گال تھام کر التجا کے لہجے میں بولی۔۔۔ ''شمو! بھرتی نہ ہو جانا۔ دو ماہ سے اشرف بھائی جان کا کوئی خط نہیں آیا۔ خدا خیر کرے''۔

میں نے اس کے گال تھام لیے۔ یوں لگا جیسے دل اچھل کے حلق میں آ ٹکا ہو۔ میں کچھ کہہ نہ سکا اور تاجی کی بھولی بھالی سی صورت دھندلا گئی۔ شاید میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جنہیں تاجی نے اپنے دوپٹے میں جذب کر لیا۔ اس نے اپنے گالوں پہ رکھے ہوئے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر پر عزم لہجے میں کہا۔۔۔ ''شمو! میں تم سے ملا کروں گی''۔۔۔ اور وہ چلی گئی۔

+ + +

حویلی اجڑی ہوئی ہے۔

بچے کھیل رہے ہیں۔

اور میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

میں حویلی کی ڈیوڑھی کی دیوار سے کندھا لگائے کھڑا ہوں۔ بچے بڑ کے ٹہنوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور خوب شور مچا رہے ہیں۔ انہیں میری موجودگی کا علم نہیں ہوا۔ نہ ہو تو اچھا ہے میں اپنے بچپن کو بڑ کے گھنے پتوں میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ رہا میرا بچپن۔ وہ سامنے والے ستون سے لگا آنکھیں بند کیے۔۔۔ ''آجا''۔۔۔ کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اس

کے عقب میں ٹوٹے ہوئے کواڑ کے پیچھے تاجی کی معصومیت چیخ چیخ کر قہقہے لگائی چھپی ہوئی نظر آرہی ہے۔حویلی کی ہیبت مسکرا رہی ہے۔فضا کا ہول مچل رہا ہے۔ہوحق سی ویرانی ہنس رہی ہے۔گری ہوئی منڈیر سے ذرا پیچھے مجھے دو سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔شاید دو بچے ہیں چھوٹے چھوٹے۔بازو ایک دوسرے کی کمر میں ڈالے ہوئے محبت اور معصومیت ایک دوسری میں گھل مل گئی ہے۔

''تاجی! تاآجی''۔

اوہ! کس قدر بھدی آواز۔کس قدر نفرت انگیز انداز اور ایسے حسین لمحے کہ جب میرے تصورات میرے اور تاجی کے بچپن کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

روفی کی برسوں پرانی آواز خیالوں میں بیدار ہوئی، بہت غصہ آیا۔اس قدر غصہ کی تصوروں کے تانے بانے الجھ گئے اور میں وہاں سے ہٹ آیا جانے کتنی ہی دیر روفی کا بھدا سا خیال ذہن اور اعصاب پر سوار رہا۔بڑی مشکل سے اس خیال سے گلوخلاصی کرائی۔اگر روفی جیل میں ہے تو خدا اسے وہیں رکھے۔

ابا جان نے کہا تھا___''بیٹا! آگے پڑھانے کی ہمت نہیں''___میں ان کی مجبوری سمجھتا ہوں۔خدا کا شکر ہے کہ میرا اور کوئی بہن بھائی نہیں ورنہ ابا جان روٹی کپڑے کے چکر میں الجھ کر جانے کب کے بوڑھے ہو چکے ہوتے۔اب وہ ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں اور اطمینان کی نیند سوتے ہیں اور امی کی شگفتہ مزاجی کا تو یہ عالم ہے جیسے ان کی عمر آگے بڑھ نہیں رہی۔انتالیس برس کی عمر میں وہ بائیس تئیس کی لگتی ہیں۔ابا جان کی تنخواہ ایک سو پچیس روپے ہے۔نوے روپوں پر انہوں نے مجھے قصبے میں ہی مونسپل کمیٹی کے دفتر میں ملازم کرا دیا ہے۔اس کے علاوہ میں نے محلے کے تین لڑکوں کی ٹیوشن کر لی ہے۔تیس روپے مل جاتے ہیں۔اسی طرح ابا جان کی اور اپنی آمدنی ملا کر دو سو پینتالیس روپے ہو جاتے ہیں۔گو مہنگائی بہت ہو گئی ہے تاہم اتنی رقم تین انسانوں کے لیے کافی ہے۔ہم غلاموں کو اور کیا چاہئے؟ ہمارے جینے کا یہی تو مقصد ہوتا ہے۔40-2-48 کے بھاؤ پر ہم دھکے کھا کھا کے اپنی جوانی کی امنگیں کسی دفتر کے لیے انگریز کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور جب گریڈ 48-4-80 ہو جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ جینے کا مقصد پورا ہوا اور ہم بڑھا پا لاٹھی اور ستائیں روپے پنشن کے سہارے گزار جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے ایک جھنڈے تلے جمع ہونا شروع کر دیا ہے اور اپنے لیے اسی ہندوستان میں الگ سرزمین کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔اسے پاکستان کہتے ہیں۔اس روز ابا جان، امی اور میں رات بہت دیر تک حصول پاکستان کے عملی پہلو پہ باتیں کرتے رہے۔ابا جان کو یقین ہے کہ پاکستان بن کے ہی رہے گا۔خدا کرے کہ ایسا ہو۔مسلمان کچلے جا رہے ہیں۔

میٹرک پاس کیے ساتھ مہینے گزر گئے ہیں۔

میونسل کمیٹی میں ملازم ہوئے پانچ مہینے گزر گئے ہیں۔

باوا جما کو فوت ہوئے دو مہینے گزر گئے ہیں۔

زبیدہ کے خاوند نور داد کو تپ دق سے مرے تین مہینے گزر گئے ہیں۔

تاجی سے ملے آج دسواں روز ہے۔

شب و روز کی رفتار سُست ہو گئی ہے۔

دیکھئے تاجی ملی کہاں تھی! کہتے ہیں لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ عقل مند ہوتی ہیں لیکن تاجی ضرورت سے زیادہ (یا غالباً ضرورت کے پیش نظر) عقل مند ہے۔یہ جتن اور ہتھکنڈے تو مجھے سوچنے چاہئیں تھے لیکن یہ کام تاجی کر رہی ہے۔مجھے اطلاع ملی کہ دوپہر گیارہ بجے حویلی میں آنا۔تاجی چھت کی راہ آئے گی۔اطلاع دینے والی زبیدہ تھی۔میں بیٹھک میں بیٹھا تھا کہ زبیدہ نے چپکے سے آ کر اطلاع دی۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے زبیدہ کو اتنے قریب سے دیکھا اور اس کے ساتھ ہمکلام ہوا۔اس کا جسم پھولتا جا رہا ہے اور اب وہ ادھیڑ عمر عورت بن گئی ہے۔میرے پاس آئی تو ایسی بے تکلفی بلکہ بے حجابی سے ہمکلام ہوئی جیسے وہ برسوں سے مجھ سے متعلق ہے یا جیسے میں اشرف ہوں۔جس کی خاطر وہ ایک بار (یا جانے کتنی بار) اجڑی ہوئی حویلی کے کوٹھے سے اتری تھی اور اس کے ساتھ ایک کمرے میں گھس گئی تھی۔اس کا بولنے کا انداز ہی فحش اور عریاں تھا۔میں ذرا گھبرایا۔سوچا بلیک میلنگ نہ شروع کر دے۔میں نے اسے ٹالنا چاہا اور کہا___''جا زبیدہ! میں کسی تاجی کو نہیں جانتا''۔

اس نے ہاتھ لمبا کر کے میرا کان پکڑ لیا اور میرے سر پر ہلکی سی چپت مار کر بولی___''دائی سے پیٹ چھپاتے ہو؟ تاجی نے مجھے خود ساری باتیں بتائی ہیں۔تیری قسم! وہ تو

مرتی ہے تیرے پیچھے...... گھبراتا کیوں ہے بدھو؟ میں تیرے ساتھ ہوں۔ تیری قسم! میں نے دھوکہ دیا تو گلی میں ننگا کر دینا......؟

اور اس نے جانے کیسی کیسی باتیں کر کے مجھے یقین دلا دیا کہ اس سلسلے میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہے اور وہ میری اور تاجی کی ہمراز ہے۔ میں نے از راہ ہمدردی اس کے خاوند کی موت کا افسوس کیا تو وہ گردن کو عجیب طرح کا خم دے کر اور لمبے لمبے دو دانتوں کو اور باہر نکال کر بولی ــــ ''افسوس کا ہے کا۔ میرے پاپ جھڑے'' ــــ اور وہ ایسی مسکراہٹ مسکرائی جو ہر بیوہ نہیں مسکرا سکتی۔

میں دفتر سے پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے گیارہ بجے حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ تاجی نے وقت اچھا دیا تھا۔ بچوں کو سکول سے چھٹی نہیں ہوئی تھی۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو دل یوں دہل گیا جیسے حویلی کے کمروں اور بڑ کے دور دور تک پھیلے ہوئے پتوں کی اوٹ میں چڑیلوں اور بدروحوں نے گھونسلے بنائے ہوئے ہوں۔ بچپن کا بھی کیا خوب زمانہ تھا۔ نہ ڈر نہ خطرہ۔ جہاں جی میں آئی بے دھڑک جا گھسے۔ بڑے ہو کر جانے کیا کیا خوف دل میں اتر آتے ہیں۔ اسی حویلی میں، میں اور تاجی کمر میں باہیں ڈالے سب کے سامنے کھلے بندوں گھوما کرتے تھے۔ آج اسی تاجی سے ذرا کی ذرا ملنے میں مارے ڈر کے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ بے اختیار منہ سے دعا نکلی، یا خدا چند لمحوں کے لیے ہی سہی مجھے اور تاجی کو بچپن لوٹا دے۔ ذرا کی ذرا ہمیں عمر رفتہ بخش دے۔ بچگانہ سی دعا تو منہ سے نکل گئی بچپن لوٹ کے نہ آیا۔ پھر خیال آیا کہ تاجی کو پیغام بھیج دوں کہ یوں ملنا اچھا نہیں۔

باوا جما کا برسوں پرانا۔ مرجھایا ہوا مگر شگفتہ چہرہ سامنے آ گیا۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا۔ جب ایک روز ہم ڈراؤنی سی آوازوں سے حویلی سے نکل بھاگے تھے اور میں نے ایک ساتھی کے ساتھ رک کر دیکھا تھا کہ تاجی کا بھائی اشرف برآمدے میں چلا جا رہا تھا اور زبیدہ ملبے کی راہ کوٹھے سے اتر رہی تھی۔ مجھے اس وقت کا ایک ایک لمحہ، اس واقعہ کی ایک ایک تفصیل اور باوا جما کے سنجیدہ چہرے کا ایک ایک خط یاد آیا۔ میں ڈیوڑھی میں کھڑا تھا۔ جہاں سے مجھے سامنے والی منڈیر اور گری ہوئی چھت نظر آ رہی تھی۔ نگاہیں بار بار ادھر کو اٹھ رہی تھیں۔ گلی میں گزرتی ہوئی ہر چاپ سے میں لرز لرز جاتا تھا۔ ایک خیال سا میرے ذہن میں آیا۔ اشرف کسی کی بیوی سے چوری چھپے ملنے اسی جگہ آیا کرتا تھا اور آج اس کی اپنی بہن

مجھ سے ملنے اسی جگہ آ رہی تھی۔ کیا قدرت اس سے انتقام لے رہی تھی؟ کیا قدرت کو مجھے ہی آلہ کار بنانا تھا؟

''اور پھر محلے کی عزت کو خراب کیا؟'' ــــ یہ باوا جمال کی برسوں پرانی آواز تھی جو میرے ذہن کے کونے سے بڑے ہی زور سے گونج اٹھی ــــ ''تم انسپکٹر ہو گے تو اپنے محکمے میں ہو گے۔ ہے بے غیرتو!'' ــــ میں نے تصور میں زراعت انسپکٹر کو باوا جمے کے سامنے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میں نے باوا مرحوم کے واہمے کا سامنا کیا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میں شاید وہاں سے ہٹ آنے کی سوچ رہا تھا کہ لاشعوری طور پر میں نے سامنے دیکھا۔ پتوں کی اوٹ میں سے مجھے تاجی گری ہوئی چھت کی طرف آتی دکھائی دی۔ میرے خیالوں میں بجلی سی کوندی اور میں نے اپنے سینے سے اٹھتی ہوئی ایک آواز سنی ــــ ''لیکن میں محلے کی عزت خراب کرنے نہیں آیا۔ میں نے بچوں کو ڈرایا نہیں۔ مجھے تاجی سے محبت ہے۔ گناہ کا ارادہ نہیں۔ مجھے تاجی سے عشق ہے۔ میں اب لوٹ نہ سکوں گا۔ میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ باوا جما! ناراض نہ ہونا۔ کہانی تم ہی نے تو سنائی تھی''۔

اور دوسرے لمحے میں اور تاجی کمر میں ہاتھ ڈالے اس ویران اور ہیبت ناک کمرے میں گھوم رہے تھے جہاں کسی کو کسی کی بیوی نے قتل کر کے فرش میں دبا دیا تھا۔ ہم نے بہت ساری باتیں کیں۔ بہت کچھ یاد کیا۔ عمر رفتہ کو آوازیں دیں۔ ہم ہنسے ہم مسکرائے اور تمام وقت ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے رہے۔

''ہم برآمدوں میں یونہی ٹہلا کرتے تھے'' ــــ تاجی نے یاد دلا دیا۔

''آؤ برآمدے میں چلیں'' ــــ میں نے کہا۔

ہم کمرے کی دہلیز تک آئے تو ہم جھجک گئے ــــ ''نہیں! کوئی دیکھ لے گا''۔

ہم پھر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

جوانیاں قید ہو گئی ہیں۔

+ + +

حویلی اجڑی ہوئی ہے۔

ہم چوری چھپے ملتے ہیں۔ کبھی کبھی۔

زبیدہ ندی کے دو کناروں کے درمیان ایسا پل ہے جو مضبوط نظر آتا ہے۔ زبیدہ میری امی کے ساتھ بہت بے تکلف ہوگئی ہے اور تاجی نے بتایا ہے کہ اس کی امی کے ساتھ بھی کھل گئی ہے۔ کبھی کبھی ضمیر پر یہ بوجھ آن گرتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ مگر ایسا نہیں۔ میں تاجی کی آبرو کا رکھوالا ہوں۔ میں اپنے بچپن کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

زمانے کے رنگ ہی بدل گئے۔ وہ بات ہی نہیں رہی۔ جنگ ایک دنیا کو ختم کر کے ختم ہو چکی ہے۔ سائنس نے اٹیم بم سے دنیا کے دو عظیم شہر ایشیا کے نقشے سے صاف کر دیئے ہیں۔ دنیا کی آدھی آبادی نے دوسری آدھی کو ختم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ انسان ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جس سے آگے صرف ایک مقام باقی ہے اور وہ مقام اللہ کا ہے۔ دنیا کا ایک طبقہ تو خدا کے نام سے ہی منکر ہو گیا ہے۔

ہمارا قصبہ اب شہر بن گیا ہے۔ دور دور تک پھیل گیا ہے۔ جنگ کے بل بوتے پر بہت سے لوگ لکھ پتی بن گئے ہیں۔ مستری اللہ داد جو ڈیڑھ روپیہ روز پر زندہ تھا، آج گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ جھونپڑے پر محل کھڑا ہو گیا ہے۔ قمیصیں ختم ہو گئی ہیں۔ لوگ اب بش شرٹیں پہنتے ہیں۔ بش شرٹوں کی شکل وصورت بھی تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ شلواریں تو اب بڈھوں کے سوا کوئی پہنتا ہی نہیں۔ سفید برقعے نظر ہی نہیں آتے۔ کالے برقعے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ بعض گھروں سے تو، کیا سفید کیا سیاہ، برقعہ ہی غائب ہو گیا ہے۔ دوپٹے بھی غائب ہوتے جا رہے ہیں۔

جنگ ختم ہوتے ہی لوگوں کو جانے کیا سوجھی ہے کہ بے تحاشا بچے پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ ایک ہمارا وقت تھا کہ حویلی میں دس پندرہ بچے کھیلا کرتے تھے۔ اب تیس پینتیس سے کم نہیں ہوتے۔ گلیوں میں دیکھو تو بچے ہی بچے، عورتوں کی گودیوں میں الگ بچے۔ پرانے مکان گرنے شروع ہو گئے ہیں نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ لوگوں نے اب مکانوں کو کوٹھیاں کہنا شروع کر دیا ہے۔

حویلی اجڑی ہوئی ہے۔

بچے کھیل رہے ہیں۔

میں دفتر آتے جاتے حویلی والی گلی میں سے گزرتا ہوں تو حویلی کے دروازے کے سامنے میرے قدم رکنے لگتے ہیں۔ بچوں کے قہقہے اور شور وغل سنتا ہوں تو دل میں خلش سی

محسوس کرتا ہوں۔ اس خلش میں لذت سی بھی ہے۔ بے اختیار تاجی یاد آجاتی ہے۔

تاجی کہتی ہے مونچھیں رکھ لو۔ ہلکی ہلکی لیکن ڈاڑھی کے ساتھ مونچھوں کو بھی صاف کر دیتا ہوں۔ وہ کہتی ہے چھوٹی چھوٹی مونچھیں اچھی لگتی ہیں۔ مونچھیں رکھ لینے میں یوں تو کوئی ہرج نہیں لیکن مونچھوں کے ساتھ یوں لگتا ہوں جیسے بوڑھا ہونے لگا ہوں۔ رکھ لوں گا، تاجی جو کہتی ہے۔

آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت ہی خوش۔ زبیدہ مجھ سے بھی زیادہ خوش ہے۔ بھاگی ہوئی آئی تھی۔ وہ مجھے میری بیٹھک میں ملتی ہے اور جانتی ہے کہ میں کس وقت اکیلا ہوتا ہوں۔ آئی تو باچھیں کھلا کر اور سامنے کے دو دانت پوری طرح نمایاں کر کے بولی——

''اوئے شمو! اوئے رانجھے! تیری تاجی نوکر ہو گئی ہے''۔

''کہاں؟''

''لڑکیوں کے سکول میں استانی لگ گئی ہے۔ 80 روپے تنخواہ پر لگی ہے، تیری قسم! کہتی تھی شموں کو بتا آ''۔

میں اس روز اس قدر خوش نہیں ہوا تھا جس روز تاجی میٹرک میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میں نے صرف مبارک باد دی تھی اور وہ دوسرے روز مٹھائی لے کر گیارہ بجے حویلی میں آئی تھی۔ ہم دونوں نے اسی مخصوص کمرے کی پراسرار ہیبت میں بیٹھ کر جشن منایا تھا۔ اب اس کی ملازمت کی اطلاع ملی ہے تو میں نے مبارک باد بھیج دی ہے۔ اس موقعہ بلکہ تقریب پر تحفہ لازمی سمجھتا ہوں۔ میں تحفہ بھی لے آیا ہوں۔

+ + +

مہینے گزرتے جا رہے ہیں۔ قصبے کے کئی جوان برما فرنٹ نے نگل لیے ہیں جو نگلے نہیں جا سکے انہیں انگریز نے اگل دیا ہے، وہ ڈسچارج کر دیئے گئے ہیں۔ بعض رہ گئے ہیں، چھٹی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ بعض اپنا ایک ایک بازو جاپانیوں کو سونپ آئے ہیں۔ تاجی کا بھائی اشرف جو سپلائی میں حوالدار سٹور کیپر بن کے گیا تھا ڈسچارج لے کے واپس آگیا ہے۔ تاجی نے بتایا ہے کہ اشرف بے انداز دولت ساتھ لایا ہے۔ آتے ہی باپ سے کہا ہے کہ وہ پنشن لے لے۔ تاجی سے بھی ملازمت چھڑوا رہا تھا لیکن تاجی مانی نہیں۔ اس کے لیے وہ بڑے بڑے قیمتی سوٹ اور زیورات لایا ہے۔

تاجی تیزی سے بڑی ہوتی جارہی ہے۔میری امی نے تاجی کی امی سے دوستانہ گانٹھ لیا ہے۔امی بہت خوش ہے۔روفی ابھی لاپتہ ہے۔ایک اطلاع ملی تھی کہ وہ جیل میں مر گیا ہے۔ایک نے بتایا ہے کہ وہ کلکتہ میں کوئی زمین دوز کاروبار کرتا ہے۔اس کے گروہ کی اپنی دخانی کشتیاں اور دو ٹیکسیاں چلتی ہیں۔معلوم ہوا ہے کہ وہ شہزادوں کی طرح رہتا ہے اور پولیس کے ساتھ اس کا اور اس کے آدمیوں کا گٹھ جوڑ ہے۔خدا جانے یہ کہاں تک سچ ہے۔اگر وہ جیل میں ہے تو خدا اسے نکال لے۔آخر بچپن کا ساتھی ہے، گو اب بھی اس کے نام سے جل اٹھتا ہوں۔اب اگر آ بھی جائے تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔تاجی اب اس کے ساتھ تھوڑی ہی کھیلے گی۔

تاجی کچھ زیادہ ہی جوان ہوگئی ہے۔بچپن میں ہم کھیلا کرتے تھے۔اب چوری چھپے ملتے ہیں تو کھیلتے تو نہیں لیکن ہماری باتیں کھیلنے جیسی ہی ہوتی ہیں۔بعض اوقات جذباتی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔کبھی کبھی ہم دیوانے سے بھی ہو جاتے ہیں۔ہم خود سپردگی کی حالت میں کبھی کبھی ایک دوسرے میں گم بھی ہو جاتے ہیں۔سوائے اس آزار کے کہ ہم آزادی سے مل نہیں سکتے۔ہم نے کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔

+ + +

اب ایک حقیقت افسانے پر منڈلانے لگی ہے۔تاجی کہتی ہے کہ اس کے ہاں ایسے ایسے لوگ آنے لگے ہیں جو پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ان آنے والوں میں زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں۔بعض تاجی کو دو چار روپے بعض ایک جوڑا کپڑوں کا، بعض چند سیر گھی یا اور کوئی چیز دے جاتی ہیں۔یہ ان دیکھے، ان جانے مہمان دور پار کے گئے گزرے رشتے آن جگاتے ہیں۔ان میں دو تو ایسے ہیں جنہیں تاجی کے والدین نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاجی کے والد کے قریبی رشتہ دار ہیں۔تاجی کے ابا اور امی ان لوگوں کوٹرخا تو رہے ہیں لیکن دونوں پر گہری سوچ اور فکر کی کیفیت طاری رہنے لگی ہے۔تاجی اس آمدورفت کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔میں بھی سمجھتا ہوں۔میری امی بھی تو وہاں جاتی ہے۔تاجی مجھے تسلیاں دیتی ہے۔کہتی ہے کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ میری ہی خاطر زندہ رہے گی ورنہ......

لیکن میں کیسے مان لوں کہ اسے میری ہی خاطر زندہ رہنے دیا جائے گا۔میں نے

ایسے ہوتا کبھی دیکھا نہیں۔زبیدہ سے پوچھو تو بتائے کہ صرف ہمارے محلے میں تین مثالیں موجود ہیں ''ورنہ'' کے بعد کے حادثات ان گنت ہیں۔یہ سلسلہ جانے کب سے چل رہا ہے اور جانے کب تک چلتا رہے گا۔میں اور تاجی آسمان کی مخلوق تو نہیں ہیں۔اسی معاشرے کے بےبس سے ذرّے ہیں۔اڑ جائیں گے جدھر ہوا اڑاتی پھرے گی۔

تاجی کے والدین کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔اس کے ابا کو ہمارا قصبہ اس قدر پسند آیا ہے کہ وہ ملازمت کا تمام عرصہ یہیں پورا کر رہے ہیں۔ان کی جوانی یہیں گزری تھی۔بڑھاپا بھی یہیں گزارنا چاہتے ہیں۔وہ لالہ موسیٰ کے رہنے والے ہیں۔مگر وہ تو اب ماضی کا قصہ بن گیا ہے۔اشرف نے بات ہی ختم کر ڈالی ہے۔اس نے اچھا ہی کیا ہے۔وہ لالہ موسیٰ جا کر آبائی مکان فروخت کر آیا ہے اور یہی کرائے کا مکان خرید لیا ہے جسے وہ نئے سرے سے بنوا رہا ہے۔اس کے علاوہ اشرف نے راولپنڈی کوئی ٹھیکہ لے لیا ہے۔جس میں اسے بہت آمدنی ہو رہی ہے۔

کیا اشرف ایسے آدمی کو ازدواجی بھائی بنائے گا جس کی تنخواہ ابھی ایک سو روپے تک بھی نہیں پہنچ سکی؟......کون جانے!

سنا ہے اشرف اپنے ماں باپ سے کہہ چکا ہے کہ وہ تاجی کے رشتے کی بات کسی کے ساتھ پکی نہ کریں۔میری امی مجھے دو تین بار بتا چکی ہے کہ وہ تاجی کے رشتے کی بات تاجی کی امی کے ساتھ کر چکی ہے۔اس نے صاف نہ بھی نہیں کی اور ہاں بھی نہیں کی۔

دونوں ماؤں کی دوستی قائم ہے۔شاید گہری ہو رہی ہے۔تاجی کے ابا جان میرے ابا جان کے پاس آتے ہیں۔دونوں بڈھے بہت دیر جوانی کی باتیں کہتے سنتے رہتے ہیں۔

میں اور تاجی حویلی میں ملتے ہیں اور بہت دیر بچپن کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

آج تاجی نے بتایا ہے کہ گھر میں اب اشرف کے ایسے دوست بھی آنے لگے ہیں جو تاجی کے ساتھ بےتکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اشرف ان کی بھی اور تاجی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔تاجی کو وہ برقعہ اتار پھینکنے کو کہہ رہا ہے لیکن تاجی مانتی نہیں۔تاجی نے اشرف کے اٹیچی کیس میں وسکی کی بوتل بھی دیکھی ہے، لیکن اس نے اپنے ابا جان کو نہیں بتایا۔کہتی ہے بےچارے اس ضعیفی میں پریشان ہوں گے۔

+ + +

عمر کس طرح گزرتی جا رہی ہے۔ کس نے کہا تھا کہ وقت اڑتا ہے؟ وقت بہت تیز اڑتا ہے۔ چھ برس گزر گئے ہیں۔

رشتے ناطے کی باتوں اور چوری کی ملاقاتوں میں ہی چھ برس گزر گئے ہیں۔

پاکستان بنے آج دو سال اور آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔

اشرف کو شادی کیے تین سال ہو گئے ہیں۔

مولوی صاحب (زبیدہ کے والد صاحب) کو فوت ہوئے چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ اب ان کا بڑا بیٹا پیش امام ہے۔

تاجی کا رشتہ مانگنے والوں کی قطار لمبی ہو گئی ہے۔

تاجی کا نیا مکان بن کر پرانا بھی ہو گیا ہے۔

اور اس کے باپ کی قبر ابھی نئی ہے۔ اسے فوت ہوئے آج پندرھواں روز ہے۔ اشرف کی بدولت اس گھر میں دولت کے انبار لگتے جا رہے ہیں۔ باپ کی موت نے سب بندھن توڑ ڈالے ہیں۔ اشرف شاید باپ کے مرنے کا منتظر تھا۔ اس نے گھر کی ہر پرانی چیز جس سے پرانی تہذیب کی بو آتی ہے اٹھا کے باہر پھینک دی ہے۔ بوڑھی ماں اور انسانیت کو بھی ایک کونے میں پھینک دیا ہے۔ تاجی ابھی تک محفوظ ہے۔ اس نے ابھی تک برقعہ نہیں اتارا نہ سکول کی ملازمت چھوڑی ہے۔ ماں بیٹی اکثر میری امی کے پاس آ بیٹھتی ہیں اور بہت روتی ہیں۔ اشرف کی بیوی نئی روشنی کی عورت ہے جسے اشرف سے کم اور اس کی دولت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ تاجی کی جوانی اور غیر معمولی حسن اس کے لیے وبال جان بنتا جا رہا ہے۔

زبیدہ کے دونوں لمبے لمبے دانت گر پڑے ہیں اور نیچے والے تین ہلتے ہیں۔ اس کی کنپٹیوں پر چند ایک بال سفید ہو گئے ہیں۔ دانت تو اس کے گر بھی پڑے ہیں اور ہل بھی رہے ہیں، لیکن وہ خود مضبوط تر ہو گئی ہے۔ اب اس کی باتوں میں وہ شوخی اور عریانی تو نہیں رہی ایک قسم کا فلسفہ سا آتا جا رہا ہے۔ جانے وہ کیسی محرومی اور تشنگی سے دوچار ہے کہ اب میرے ساتھ اور تاجی کے ساتھ بے ساختہ پیار کرتی ہے۔ اپنا تو اس کا کوئی بچہ نہیں، ہمیں ہی اپنے بچے سمجھے ہوئے ہے۔ اب تو ہم اسے پیسے دیتے ہیں تو نہیں لیتی۔ ایک دن میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔۔۔ ''شمو! مجھ پر جوانی آئی تھی۔ وقت جو تاجی پر گزر

رہا ہے۔ وہ مجھ پر گزر چکا ہے۔ میں جانتی ہوں تم دونوں کی منزل کتنی کٹھن ہے، میں بہت دور نکل گئی تھی۔ تم تو ابھی رہ گزر میں ہو...... شمو! تاجی تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گی۔ لڑکھڑا نہ جانا۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں.....'' خدا جانے وہ اور کیا کچھ کہتی لیکن اس کے آنسو نکل آئے۔

تاجی کے جذبات جیسے شعلہ بن گئے ہیں۔ جس میں وہ خود بھی جل رہی ہے اور مجھے بھی جلا رہی ہے۔ اب تو وہ حویلی میں ملتی ہے تو اس چوری کی ملاقات کے دوران میں ایک ثانیہ بھی مجھ سے الگ ہو کے نہیں بیٹھتی۔ اس کی عمر تئیس برس کی ہو چکی ہے اور اس طویل کنوارپن پر لوگ انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔ اشرف کی تعیش پرستی اور طرح طرح کے دوستوں کا گھر میں کھلا آنا جانا تاجی کو رسوا کرنے لگا ہے۔ وہ اب بات بات پر رو پڑتی ہے۔

تاجی کے امیدواروں میں اب دو بڑے افسر اور تین ٹھیکیدار جن میں ایک حاجی ہے شامل ہو گئے ہیں۔ میری تنخواہ ایک سو تین روپے ہے۔

محبت افسانہ بن گئی ہے۔ افسانے کا پلاٹ گھسا پٹا سا ہے۔ امیر غریب کی رقابت انجام سے کون بے خبر ہے۔

اس روز امی کہہ رہی تھی۔۔۔ ''شمو بیٹا! تاجی کی ماں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس بے چاری کو اب کون پوچھتا ہے۔ کرتا دھرتا اشرف ہے۔ کیوں نہ تمہاری بات کہیں اور کر دیکھیں''۔

میں نے ہنس کے ٹال دیا اور کہہ دیا کہ تاجی کا رشتہ ضرور مل جائے گا۔

میری عمر چھبیس برس ہو گئی ہے اور پاکستان کی عمر چار برس۔ اس عمر کا اہم ترین واقعہ بلکہ معجزہ تو اس روز رونما ہوا ہے۔ روفی واپس آ گیا ہے لیکن لوگ مانتے نہیں۔ کہتے ہیں یہ روفی نہیں۔ بخدا پہلے روز تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا کہ یہ روفی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ شہر کا میں پہلا شخص تھا جو اس سے ملا۔ ہوا یوں کہ میں میونسپل کمیٹی کے کسی کام کے سلسلے میں ڈاک بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ ڈاک بنگلہ شہر سے باہر ہے۔ ایک لمبوتری سی، نئے نمونے کی کار شہر کی طرف آ رہی تھی۔ کار میرے قریب سے گزری تو کار کی بریکیں زور سے چیخیں اور کار پندرہ بیس گز کے فاصلے پر رک گئی۔ میں اس چیخ سے گھبرا گیا۔ آواز ہی سنسنی خیز تھی۔ دیکھا کہ کار الٹے گیئر میں تیزی سے پیچھے آ رہی تھی۔ میں تماشا دیکھنے رک گیا۔ کار بہت خوبصورت تھی۔ میرے قریب آ رکی۔ کار میں تین جواں سال آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی شکل وصورت چرس اور گانجا پینے والے ڈرائیوروں جیسی تھی۔ کھردرا سا چہرہ زرد زردسی آنکھیں، مونچھیں سیاہ اور سروں سے مروڑی ہوئیں، بال پیچھے کو کنگھی کیے ہوئے۔ کئی بال سفید تھے۔ لباس امیرانہ تھا۔ بوسکی کی قمیض اور دلفریب رنگ کی بوٹائی لگائے ہوئے تھا۔ منہ میں پائپ تھا۔

''ارے شمو!''۔۔۔ ڈرائیور مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں اس بھاری سی آواز کو پہچان نہ سکا۔ آواز بھی اور چہرہ بھی اجنبی تھا۔

''میں عبدالرؤف ہوں! بدھو! تم نے پہچانا نہیں۔ یہ میرا بچپن کا ساتھی ہے''۔۔۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا۔۔۔ ''اسے ہم شمو کہا کرتے تھے''۔

''معاف رکھنا صاحب!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں نے پہچانا نہیں''۔

''ارے میں عبدالرؤف ہوں بھائی! جسے تم بچپن میں روفی کہا کرتے تھے''۔

میں نے حیرت واستعجاب سے اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور اس نے امیرانہ بے رخی سے ہاتھ ملایا۔ یہ شکل وصورت تو روفی کی ہی ہوسکتی تھی۔ میں کار، اس کے لباس اور پائپ پر حیران ہو رہا تھا۔

جب میں پچھلے پہر دفتر سے واپس آیا تو محلے کے چند ایک آدمیوں کو اجڑی ہوئی حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑا دیکھا۔ میں ان کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ میں ان سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ روفی اور اس کے ساتھی حویلی میں سے نکلے۔ ان کے ساتھ کچہری کے دو اہلکار تھے۔ روفی اپنے ساتھیوں سمیت بازار کی طرف چلا گیا اور یہ خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔۔۔ ''روفی نے اجڑی ہوئی حویلی خرید لی ہے''۔

لوگ خوش تھے۔ اچھا ہوا فروخت ہوگئی ہے۔ اب آباد ہو جائے گی لیکن میری دنیا اجڑ گئی۔

معلوم ہوا روفی کے ساتھ جو آدمی آئے تھے وہ اس حویلی کے مالک کے دوہتے پوتے تھے۔ وہ کراچی رہتے ہیں اور وہاں بہت بڑا کاروبار کرتے ہیں۔ روفی نے انہیں وہاں جا گھیرا تھا۔ وہیں سودا طے کر کے حویلی کی رجسٹری اور انتقال کے لیے انہیں ساتھ لایا تھا۔ روفی نے حویلی بیس ہزار میں خریدی ہے۔ حویلی والوں نے کوڑیوں کے دام پھینکی ہے۔ چار ایکڑ کی جائیداد آج کل اور وہ بھی بیچ شہر بیس ہزار پہ کون دیتا ہے، لیکن وہ اسے

پھینکنا چاہتے تھے۔ سنا ہے انہوں نے کراچی میں کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔

حویلی کے بک جانے پر محلے والے خوش ہیں لیکن وہ حیران تھے کہ حویلی روفی نے خریدی ہے۔ آخر یہ معمہ بھی حل ہوا۔ کراچی سے آئی ہوئی اطلاعوں نے تمام حیرت دور کر دی۔ روفی گھر سے بھاگ کر کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ وہاں جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ جا ملا تھا۔ وہیں سے اس نے سمگلنگ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ جب پاکستان آباد ہو گیا اور کراچی بین الاقوامی سمگلروں اور کالے تاجروں کا مرکز بننے لگا تو روفی بھی کراچی پہنچ گیا۔ سنا ہے وہ عرب سے سونا اور پاکستان سے افیون اور چرس سمگل کرتا ہے اور اب لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اس کے ماں باپ تو جنگ کے دوران ہی فاقوں مر گئے تھے لیکن روفی کو چنداں افسوس نہیں۔ اس کا اپنا جھونپڑا حویلی کی طرح اجڑ گیا تھا جسے اس نے فی سبیل اللہ ایک مہاجر کے نام رجسٹری کر دیا ہے۔ اس پہلی سخاوت نے ہی محلے والوں کے دلوں میں روفی کی جگہ بنا دی ہے۔

میری عمر کے چھبیسویں سال کا ایک حادثہ۔۔۔ ''حویلی آباد ہوگئی ہے روفی نے دو مہینوں میں حویلی کا حلیہ ہی بدل ڈالا ہے۔ لاہور سے معمار بلائے گئے تھے۔ بڑ کا درخت جڑوں سے اکھاڑ دیا گیا ہے اور اس کے ٹہنے اور شاخیں جن پر ہمارے بچپن کی یادیں ابھی تک کھیل رہیں تھیں، محلے والوں کے لیے چھ ماہ کا ایندھن بن گیا ہے۔ صحن میں باغیچہ بنا دیا گیا ہے اور اس کے وسط میں فوارہ لگا ہوا ہے۔ باغیچے کے لیے ایک مالی رکھا گیا ہے۔ کمرے گرا کر نئے سرے سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ڈیوڑھی کو نئی شکل دے کر اوپر ایک اور منزل بنا دی گئی ہے۔ اب ڈیوڑھی اور حویلی کسی بادشاہ کے محل کا منظر پیش کرتی ہے۔ برآمدے کی گولائی اور محیط اسی طرح ہے اور کمرے اتنے ہی ہیں لیکن اب پہچانے نہیں جاتے۔ ہر کمرہ دوسرے سے دلکش اور روح افزا ہے اور فرنیچر بھی ایسا کہ دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ کھڑکیوں دروازوں کے پردے ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی پانی کی لہروں کی طرح ہلتے ہیں۔

اکیلا انسان اتنی وسیع وعریض حویلی اور اس قدر کمروں میں کیا کرے گا؟ سب دولت کا کھیل ہے۔

اب بچے گلیوں میں کھیلتے ہیں۔

میری اور تاجی کی دنیا ویران ہوگئی ہے۔

روفی کے متعلق ایک اور انکشاف یہ ہوا کہ وہ صرف عبدالرؤف نہیں حاجی عبدالرؤف ہے۔

ایک اور انکشاف یہ کہ وہ اشرف کا گہرا دوست بن گیا ہے اور ایک اور انکشاف یہ کہ تاجی کے امیدواروں کی قطار میں روفی کو پہلا نمبر دیا جا رہا ہے۔

روفی نے اس قلیل مدت میں ہی شہر کی سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری شخصیتوں کو دولت کی خیرہ کن چمک سے مٹھی میں لے لیا ہے۔ شہر کے رجسٹر غنڈے اس کے اشاروں پر ناچنے لگے ہیں۔

اب تاجی مجھے میرے کمرے میں آ کر ملتی ہے۔

محبت جواں ہوتی جا رہی ہے۔ امید بوڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ سہارے ٹوٹ رہے ہیں۔

اس روز تاجی ملنے آئی تو غصے سے اس کی بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ روفی اس کے گھر گیا تھا۔ اشرف اس کے ساتھ تھا۔ اشرف اسے تاجی کے پاس چھوڑ کر خود باہر نکل گیا اور روفی نے تاجی کا ہاتھ تھام کر کہا—— ''تاجی! میں نے یہ حویلی صرف تمہارے لیے خریدی ہے۔ آؤ اور اس میں آباد ہو جاؤ''۔

''روفی!''—— تاجی نے ہاتھ چھڑا کر جواب دیا—— ''بہتر یہ ہوگا کہ آئندہ یہ الفاظ مجھے نہ کہنا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ مجھے کہاں آباد ہونا ہے''۔

بہت ساری باتوں کے بعد روفی کا لب و لہجہ سخت ہونے لگا تو تاجی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا—— ''میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں کہ میں شمو کو اپنا چکی ہوں۔ میں صرف اپنی بوڑھی ماں اور مرے ہوئے باپ کی عزت و آبرو کے خیال سے چپ ہوں اور اپنے بھائی کے منہ کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ اگر وہ راہ پر نہ آیا تو میں اپنی راہ خود بنا لوں گی''۔

''کون؟ شمو؟'' وہ بولا—— ''ٹاٹ میں ریشم کا پیوند؟ تاجی ہوش کرو۔ کار اور محل کو چھوڑ کر تم اس شخص کے پاس جانا چاہتی ہو جسے ابھی سائیکل بھی نصیب نہیں ہوئی؟ میرا دل اور میری دولت تیرے لیے ہے تاجی!''

''روفی! آخری بار سن لو۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ آج سے نہیں، اس روز سے جس

روز تم نے مجھے اس حویلی میں بہلا پھسلا کر الگ کمرے میں لے جانے کی کوشش کی تھی۔ شمو کے ڈنڈے نہ بھولو روفی! دولت کا غرور تمہیں تباہ نہ کر دے''۔

اسی شام روفی نے مجھے اپنے ہاں بلایا۔ اسی حویلی میں، میں جانا تو نہ چاہتا تھا لیکن چلا گیا۔ بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ کمرے میں صوفے پر بٹھا کر مجھے کہنے لگا—— ''شمو! میں نے تمہیں صرف اسی لیے بلایا ہے کہ تم غریب آدمی ہو۔ بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دو۔ تم ایسی کلاس کے آدمی ہو کہ میری دنیا کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے''—— اس کی باتوں میں طنز یا غصہ نہیں تھا۔ بزرگانہ سی نصیحت کا انداز تھا، کہہ رہا تھا—— ''میری راہ میں نہ آنا۔ میں تاجی سے شادی کر رہا ہوں۔ میں تم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ دو سو، چار سو، پانچ سو روپوں کی ضرورت ہو تو لے جاؤ تمہارے کام آئیں گے۔ دیکھو شمو! خود ہی سوچو، تم تاجی کے قابل نہیں۔ میں تمہاری شادی کسی درمیانہ سے گھر میں کرا دوں گا''۔

اور میرے ذہن میں بیڑیاں اور گھٹیا قسم کے سگریٹ پینے والا روفی آ گیا۔ دل میں نفرت اور حقارت کے بگولے اٹھنے لگے اور ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہوا۔

''روفی!'' میں نے لہجے میں طنز بھر کے کہا—— ''تم روفی ہو۔ میں دولت سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ تم سے ٹکر لے سکتا ہوں۔ آؤ کشتی لڑ لو۔ ڈنڈے سے لڑ لو۔ چاقو سے لڑ لو۔ آؤ لوگوں کے سامنے مردوں کی طرح فیصلہ کر لیں''۔

''شمو!''—— اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا—— ''میری حیثیت اور اپنی اوقات کو پہچانو''۔

''روفی! بات تاجی کی ہو رہی ہے۔ حیثیت اور اوقات کی نہیں، ہمارے درمیان تاجی کھڑی ہے۔ وہ آج سے نہیں، بیس برس سے ہمارے درمیان کھڑی ہے۔ تم بیس برس پہلے بھی اسے اپنا نہیں بنا سکے تھے''۔

''میں اب اسے اپنا بناؤں گا اور وہ بنے گی''۔

''تم تاجی کو خرید سکتے ہو جیت نہیں سکتے۔ اشرف بہن کو بیچ سکتا ہے۔ تمہارے ساتھ نکاح نہیں پڑھا سکتا''۔

''کیوں؟''

''کیوں کہ تاجی تیرے نام پہ کبھی ہاں نہیں کہے گی''—— اور میں دروازے کی طرف

چل پڑا۔

''شمو! بتا کے جاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ جواب دے کے جاؤ''۔

میں دروازے میں ذرا سا رکا اور میں نے دروازہ کھولا ــــ ''شمو!'' ــــ اس نے چیخ کر کہا۔

اور میں نے باہر نکل کر دروازہ تڑاخ سے بند کیا اور چلا آیا۔

تیسرے روز میں دفتر گیا تو ہیڈ کلرک نے جو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہتا تھا، مجھے اپنے پاس بلا کر کہا ــــ ''شمس! کل سے تمہاری ملازمت ختم ہے۔ وجہ شاید تمہیں معلوم ہو۔ مجھے افسوس ہے۔ تم میرے بیٹے ہو لیکن میرے عزیز! تم شاید نہیں جانتے کہ اس دھرتی سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ میں تمہیں راولپنڈی کمشنر کے دفتر میں ملازمت دلوا دوں گا'' ــــ اور میں اس کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے نکلنے لگا تو بولا ــــ ''شمس! مجھے بددعا نہ دینا۔ میں بال بچے دار ہوں ورنہ میں بھی استعفےٰ دے دیتا''۔

ابا جان اور امی کے آنسو نکل آئے ہیں۔ میں نے تسلی دی کہ نوکری مل جائے گی آپ کیوں غم کرتے ہیں؟ لیکن ماں باپ ہیں کیوں نہ غم کریں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ دکھ بھی ہے کہ تاجی کا رشتہ نہیں ملا، اب کہاں ٹکر ماریں۔ میری تسلیاں انہیں سہارا نہیں دے سکیں شاید اس لیے کہ میری تسلیوں میں جان ہی نہیں۔ میں انہیں تو تسلی دے لیتا ہوں لیکن میرے دل پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔ سوائے زبیدہ کے۔ وہ بڑی جانفشانی سے ہماری کشتی کھینچ رہی ہے۔ اب اس نے تاجی کے ساتھ مل کر ایک سکیم بنائی ہے لیکن وہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ بوڑھے ماں باپ کو اس عمر میں اکیلا چھوڑ کر تاجی کو ساتھ لے کے کیسے بھاگ جاؤں؟ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور بوڑھی روحوں کا اکیلا سہارا انہیں اس ضعیفی میں کیسے غموں میں ڈبو جاؤں۔ اگر ابا جان اور امی مجھے تاجی کے ساتھ شادی کرنے سے روکتے تو بات دوسری تھی، لیکن انہوں نے تو تاجی کا رشتہ حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کر ڈالی تھی۔

+ + +

اور اب کوششوں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ تاجی فروخت ہو چکی ہے۔ روفی اسے دلہن بنا کر اسی حویلی میں لے گیا ہے جہاں وہ ایک دن اس کے ساتھ کمرے تک جانے

سے گریز کرتی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اشرف نے بیس ہزار روپیہ لیا ہے۔ بعض پچاس ہزار بتاتے ہیں۔ کچھ بھی ہے بات ہزاروں کی ہے۔ زبیدہ ملی تو رو پڑی، کہتی ہے ــــ ''تاجی دن رات رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ جب جاتی ہوں تو کہتی ہے ایک بار شمو سے ملا دو لیکن اس کلموئے نے اس پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ اس نے روفی سے صاف کہہ دیا ہے کہ میں تمہاری بیوی نہیں۔ میں نے نکاح میں ہاں نہیں کہی تھی۔ روفی اسے روز مارتا پیٹتا ہے''۔

''مارتا ہے؟'' ــــ میں نے پاگلوں کی طرح کہا ــــ ''روز مارتا ہے؟ روفی؟ تاجی کو؟''

اور میں پاگل ہو ہی گیا۔ جانے کتنے دن پاگلوں کی طرح پھرتا رہا ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ ابا جان اور امی میری اس حالت پر پریشان ہوتے ہیں۔ ابا جان نے مجھے لمبے لمبے لیکچر بھی دیئے ہیں لیکن ذہن میں بچپن کی ایسی ایسی یادیں ابھر آئی ہیں جن میں ایک بھی حسین نہیں۔ مجھے اجڑے ہوئے ہولناک سے کمرے نظر آتے ہیں جن میں تاجی بھولی بھالی سی معصوم سی بچی، ڈری سہمی ہوئی ان کمروں میں اور ان برآمدوں میں بھٹکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ مجھے وہ مری کبوتری بھی یاد آئی جو اسی حویلی کے ایک کمرے کے جالوں میں الجھ کر مر گئی تھی۔ آج ایک اور کبوتری سونے کے تاروں کے جالے میں الجھائی گئی ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ سسک رہی ہے مجھے حویلی کی ہو حق سی ویرانی اور ہیبت میں روفی کی پرنفرت گونج سنائی دے رہی ہے ــــ ''تاجی۔ تاجی'' ــــ میں بڑ کے ہر پتے میں روفی کا مکروہ چہرہ دیکھ رہا ہوں اور میں خیالوں ہی خیالوں میں ڈنڈا لیے بڑ کے نیچے کھڑا ہوا ہوں۔

+ + +

چند دن ہوئے شام کو زبیدہ آئی، کہنے لگی ــــ ''آج موقع ہے شمو! تاجی شمو شمو پکار رہی ہے۔ آج رات اشرف بہت بڑی دعوت دے رہا ہے۔ پنڈی سے بھی کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ روفی اور تاجی کو بھی بلایا ہے، لیکن تاجی جانے سے انکار کر رہی ہے۔ وہ بات کی پکی ہے۔ دعوت میں نہیں جائے گی۔ روفی ضرور جائے گا۔ تم رات گلی میں ٹھہرنا یہی کوئی آٹھ نو بجے کے درمیان۔ اگر تاجی گھر میں اکیلی ہوئی تو تمہیں خبر دوں گی لیکن جانا ضرور ورنہ وہ پاگل ہو کے اپنا سر پھوڑ لے گی۔ اس کی حالت بہت بری ہے''۔

اور رات زبیدہ نے گلی میں مجھ سے کہا ــــ ''جاؤ۔ وہ اکیلی ہے۔ روفی نے اسے بہت مارا ہے اور خود اشرف کے ہاں چلا گیا ہے۔ وہ آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئے

گا۔سور کے جنے رات شراب پئیں گے۔رنڈیاں ناچیں گی۔جاؤ شمو! دیر نہ کرو"۔

اور میں گردوپیش سے بے خبر حویلی میں چلا گیا۔تاجی میری راہ دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں کبھی ہم آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔بہت خوبصورت کمرہ ہے۔ وہاں پہنچے تو تاجی میرے ساتھ لپٹ گئی۔روئی اور اس قدر روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔مجھ پر رقت طاری تھی۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے صرف اس قدر دیکھا کہ اس کے رخساروں پر سرخ سرخ خراشیں تھیں اور سفید گردن پر بھی نیلی نیلی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ایک ہاتھ کی الٹی طرف اچھا خاصا زخم تھا۔

"شمو! اگر تم میرا سارا جسم دیکھو تو......"

میں آگ میں جلنے بھننے لگا۔ہم دونوں ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں اس کمرے کے حسن میں وہ ویرانی اور ہیبت ڈھونڈ رہا تھا جس سے ہمیں پیار تھا اور جس میں ہمارا بچپن گزرا تھا۔تاجی اپنی داستان خونچکاں شروع کرنے ہی والی تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔گھبرا کر بولی___ "ذرا سنو! شاید کوئی آ رہا ہے"۔

میں نے سنا۔برآمدے میں کوئی تیز قدم آ رہا تھا۔

"وہ آ گیا ہے......شمو! تم بھاگ جاؤ۔وہ مجھے دیکھنے آیا ہے"۔

لیکن میرا ارادہ بھاگنے کا نہیں تھا اور نہ اب اتنا وقت تھا۔روفی کمرے کا دروازہ کھول کر کھڑا تھا۔راہ مسدود ہو چکی تھی۔

"اوہ! شمو!"___ روفی نے دوستانہ لہجے میں مسکرا کر کہا___ "میرا بچپن کا دوست میں جانتا تھا تم آؤ گے،اسی لیے یہ جا نہیں رہی تھی۔ میں تمہاری ہی خاطر تواضع کے لیے آیا ہوں"۔

میں نے اس کا سامنا کیا لیکن تاجی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔روفی نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور میز کی طرف تیزی سے بڑھا۔ جونہی اس نے دراز پر ہاتھ رکھا،تاجی چیخ اٹھی___ "وہ پستول نکال رہا ہے۔شمو! بھاگ جاؤ"۔

یہ سب کچھ اس قدر سرعت سے ہوا کہ میں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ روفی کے خلاف نفرت نے دیوانہ بنا دیا۔میری آنکھوں کے سامنے صرف روفی اور سینے میں انتقام کی آگ تھی۔روفی میری طرف پیٹھ کر کے دراز کھولنے لگا تھا۔جونہی تاجی نے پستول کا نام لیا میں

ایک ہی جست میں روفی پہ جا پڑا۔میرا خیال تھا کہ وہ اس قدر ہٹا کٹا ہے، مجھے گرا لے گا لیکن میں نے محسوس کیا کہ شراب اور عیاشی نے اس کے جسم کو کھوکھلا کر دیا تھا۔میں نے اسے کمر سے دبوچ کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ دے پٹخا۔

"شمو! اب بھاگ جاؤ"۔

"تاجی! اب نہیں بھاگوں گا۔زندگی میں ایک ہی موقعہ ملا ہے"۔

روفی اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے ایک گھونسہ اس کے پیٹ میں اور دوسرا اس کے منہ پر اس قدر زور سے مارا کہ وہ پھر دیوار کے ساتھ جا لگا۔اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا تھا۔وہ گرا اور اٹھ نہ سکا۔

لیکن میں اب ان آوازوں کی دنیا سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا، بغیر سوچے لپک کر تاجی کا دوپٹہ کھینچ لیا اور اسے دو چار بل دے کر روفی کی گردن کے گرد لپیٹ کر دوپٹہ مروڑنا شروع کر دیا۔روفی پیٹ کے گھونسے سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔شاید اس کا اوپر والا ہونٹ میرے گھونسے سے پھٹ گیا تھا۔میں تیزی سے دوپٹے کو بل دے رہا تھا اور روفی کی گردن کے گرد پھانسی کا پھندا تنگ تر ہو رہا تھا۔

"شمو!"___ تاجی زور سے چیخی اور میرے ہاتھ پکڑ لیے___ "خود بھی پھانسی چڑھ جاؤ گے۔بھاگ جاؤ"۔

لیکن نفرت،حقارت اور انتقام خون بن کر مجھے اندھا کر چکے تھے۔میں نے تاجی کو ایک بازو سے دھکیلا تو وہ صوفے پر جا پڑی۔میں نے اور تیزی سے ہاتھوں کو گھما گھما کر دوپٹے کو مروڑنا شروع کر دیا۔جب نائیلون کا دوپٹہ مکمل طور پر پھانسی کا رسہ بن کر روفی کی گردن کو دبانے لگا اور اس کی آنکھیں کھوپڑی سے باہر آنے لگیں تو میں نے اس کے کندھے پر ایک پاؤں رکھ کر دوپٹے کو زور سے کھینچا___ "کڑک"___ کی سی آواز آئی۔روفی کا جسم بہت زور سے تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

"مار دیا تم نے؟"___ تاجی نے خوفزدہ آواز میں کہا اور بھاگ کر اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔

"شمو!___" تاجی کی آواز تھرتھرا گئی۔شمو! بھاگ جاؤ۔یہ مر گیا ہے"۔

"ابھی نہیں تاجی"___ میں نے تاجی سے پیار اور اطمینان سے کہا___ "اسے

ٹھکانے لگالوں''۔

میری رگوں میں ایسا سکون اور ایسا قرار سرایت کرنے لگا جیسے خدا نے مجھے اور تاجی کو بچپن لوٹا دیا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ویران برآمدوں میں ٹہل رہے تھے۔ میں ہلکا پھلکا ہو گیا۔ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو کر میری روح کو ہلکی ہلکی لذت آگیں تپش دینے لگی۔ جیسے کوئی سردی سے اکڑا ہوا آگ کے پاس آ بیٹھا ہو۔

''یہاں کوئی ایسا کمرہ ہے جس میں ٹائلیں نہ لگی ہوں؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں ہے!''۔۔۔ تاجی نے کانپتی ہوئی سراسیمہ آواز میں جواب دیا۔۔۔ ''اس طرف دو کمرے ہیں جن میں بیکار سامان پڑا ہے۔ دونوں کے فرش کچے ہیں۔ ایک میں مالی کا سامان پڑا ہے''۔

''پھر وہاں کدال بھی ہوگی!''

''شاید ہوگی''۔

''چلو تاجی! میرا ہاتھ بٹاؤ ذرا''۔

رات کے اسرار بے پاؤں تیرگی کے ساتھ رینگتے جا رہے تھے۔ حویلی کی وسعت اسی طرح خاموش تھی جس طرح کبھی ہوا کرتی تھی۔

+ + +

دو گھنٹوں کی مشقت کے بعد میں نے سامان اور کوڑا کباڑ والے کمرے میں دو فٹ گہرا اور چھ فٹ لمبا گڑھا کھود لیا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا۔ شاید میرا ذہن خالی تھا۔ میں نے گڑھا ذرا گہرا کرنے کو کدال ماری تو ایک لمبوتری سی ہڈی ٹوٹ کر اچھلی۔ میں نے کدال آہستہ آہستہ چلائی تو انسانی ہڈیوں کا ایک پورا پنجر بے نقاب ہونے لگا۔ میں نے پنجر کو ننگا کر لیا۔ اس کی گردن کے گرد ایک رسی دیکھی۔ میں سمجھ گیا۔ ایک صدی پہلے کی کہانی سچ ثابت ہو رہی تھی۔ دادا جان نے سنایا تھا کہ ایک صدی پہلے ایک بیوی نے اپنے خاوند کو قتل کر کے ایک کمرے میں دفن کر دیا تھا اور خودکشی کر لی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کسی کو بتا دیا تھا کہ اس کے خاوند کی لاش فلاں کمرے میں دفن ہے۔ غالباً گھر والوں نے لاش پولیس کو دکھا کر اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسی کمرے میں دفن کر دی تھی اور وہ خود حویلی کو ویران چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے تھے۔

پنجر کی گردن کے گرد رسی بتا رہی تھی کہ اسے پھانسی دے کر قتل کیا گیا تھا۔ میں نے تاجی سے کہا۔۔۔ ''ایک صدی پہلے بھی یہاں ایک عورت کو خرید کر لایا گیا تھا۔۔۔۔ زمانہ بدل گیا ہے، عورت کی قسمت نہیں بدلی''۔

میں نے روفی کی لاش اس پنجر پر رکھ دی اور گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ کچی مٹی پر میں نے پرانا سامان اور چارپائیاں رکھ دیں۔۔۔ ''تاجی! اب آرام سے سو جاؤ''۔۔۔ میں نے تاجی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر کہا۔۔۔ ''چند دنوں میں حالات کا رخ ہمارے حق میں ہو جائے گا''۔

لیکن تاجی پر ہول طاری تھا۔ وہ جیسے میری کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ رو رو کر میرے ساتھ لپٹ رہی تھی۔۔۔ ''شمو! تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے۔ اب کیا ہوگا شمو! تم بھاگ کیوں نہیں جاتے''۔

میں نے بہت تسلیاں دیں کہ میں قانون کی زد سے بہت دور ہوں۔ پولیس کو اگر پتہ چل گیا تو اسے میرے خلاف کوئی شہادت نہیں ملے گی لیکن تاجی میری سلامتی کی خاطر دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ نہ کوئی بات سن رہی تھی نہ سمجھ رہی تھی۔ جب میں وہاں سے چلنے لگا تو وہ پھر میرے ساتھ لپٹ کر اس طرح روئی جیسے میں پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہوں۔

''شمو! تم گرفتار نہ ہو جاؤ۔ خدا نہ کرے۔ خدا نہ کرے''۔۔۔ اور ایک ثانیے میں اس کے لب و لہجے اور مزاجی کیفیت میں تبدیلی آ گئی۔ پرعزم لہجے میں بولی۔۔۔ ''شمو! اگر تم گرفتار ہو گئے تو تاجی تمہارے پیچھے دولت لٹا دے گی۔ عدالت میں دس وکیل کھڑے نہ کر دوں تو کہنا تاجی نے شمو کو کبھی چاہا ہی نہیں تھا۔ تم مرد ہو، تم نے چھپ کے قتل کیا ہے۔ میں عورت ہوں، میں دنیا کے سامنے آ کر تمہیں بچاؤں گی''۔

تاجی کا لب و لہجہ تو پرعزم تھا، لیکن یہ لہجہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ انداز غیر معمولی تھا۔ اس کی جذباتی حالت متزلزل نظر آتی تھی۔ میں نے شدت سے چاہا کہ اسے اس ذہنی حالت میں ایسے گھر میں اکیلا چھوڑ کے نہ جاؤں جہاں ایک پرانا پنجر اور ایک تازہ لاش دفن ہے۔ او خدا میں وہاں سے کس طرح نکل آیا تھا۔ اگر صرف اپنی جان کا خطرہ ہوتا تو میں وہیں رہتا۔ تاجی کے پاس لیکن تاجی بھی خطرے میں تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ قتل کے جرم میں

پکڑی جاسکتی تھی۔ میں اسے تسلیاں دے کر اپنے گھر آ گیا اور لیٹ گیا، لیکن سو نہ سکا۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال ستا رہا تھا کہ آج اس حویلی میں تاجی پھر ڈر رہی ہو گی۔ اسے آج کون کمر کے گرد بازو ڈال کر اپنے ساتھ لگائے گا۔ آج وہ حویلی کے ہول اور وحشت میں اکیلی ہے۔ میں دو تین بار اٹھ کے بیٹھ گیا۔

رات کا آخری پہر تھا کہ آنکھ ذرا سی لگ گئی۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایسے آواز آئی جیسے میرے قریب ہی تاجی چیخی ہو ___ ''شمو!'' ___ اور اس کے ساتھ ہی دو موٹے موٹے جنگلی چوہوں کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ واہمہ تھا۔ میں پھر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ سورج نکل رہا تھا کہ امی نے مجھے جگایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ___

''شمو! اٹھنا ذرا، تیرے ابا چلے گئے ہیں''۔

''کہاں امی؟''

روفی کی حویلی میں خون ہو گیا ہے۔ کہتے میں رات تاجی نے روفی کو گلے میں دوپٹے کا پھندا ڈال کر مار دیا ہے اور خود پولیس کے نام خط چھوڑ کر خودکشی کر لی ہے''۔

''تاجی نے؟'' ___ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا اور باہر کو بھاگا۔

دونوں لاشیں روفی اور تاجی کی، حویلی کے سامنے چار پائیوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ لاشیں چادروں سے ڈھانپی ہوئی تھیں۔ تاجی نے پولیس کے نام خط لکھ کر چھت کے پنکھے کے ساتھ رسی باندھ کر اپنے آپ کو پھانسی دے لی تھی۔ اس نے خط میں لکھا ہے۔

''پولیس اور قانون کے نام''۔

''مجھے میرے بھائی نے عبدالرؤف کے ہاتھ چالیس ہزار روپوں پہ فروخت کیا تھا اور آج پانچ ماہ سے عبدالرؤف مجھے ہر رات مارتا ہے۔ میں اس کی قانونی بیوی نہیں ہوں۔ اس قتل کا پہلا مجرم میرا بھائی اشرف ہے۔ دوسرا وہ مولوی جس نے میری نہ کو ہاں بنایا اور نکاح کے رجسٹر پر میرے دستخط کسی اور سے کروائے۔ وہ دو گواہ بھی مجرم ہیں جنہوں نے ایک ایک سو روپیہ لے کر بھری محفل میں کہا تھا کہ میں نے ہاں کہی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس قتل کا مجرم خود مقتول ہے جس نے اپنے چالیس ہزار کی ایک ایک کوڑی میرے جسم سے وصول کرنے کی خاطر مجھے ہر رات بے دردی سے پیٹا۔ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کا معائنہ کیا جائے اور میرے چہرے پر خراشیں دیکھی جائیں......

''رات مقتول سویا ہوا تھا تو میں نے نائیلون کے دوپٹے سے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر دوپٹہ مروڑ مروڑ کر اسے مارا ہے اور لاش سامان والے کمرے میں دبا دی ہے۔ چار پائیاں اور کرسیاں ہٹاؤ گے تو نیچے کھدی ہوئی مٹی نکلے گی، اس کے نیچے لاش ہے۔ اس کا ہونٹ سوجا ہوا ہے اور منہ پہ خون بھی لگا ہوا ہے۔ وہ جلدی مرتا نہیں تھا تو میں نے پیپر ویٹ اس کے منہ پر مارا تھا۔ نائیلون کا دوپٹہ صوفے پر پڑا ہوا ہے اور پیپر ویٹ میز پر......

''میں چھت کے پنکھے کے ساتھ رسی باندھ کر اپنے آپ کو پھانسی دے رہی ہوں۔ میری صرف ایک وصیت ہے کہ میری قبر مقبول کی قبر سے بہت دور کھودی جائے۔ میری روح تمہیں دعائیں دے گی۔ مجھے باوا جما کے پہلو میں دفن کیا جائے اور روفی کے قتل کے سلسلے میں کسی اور کو پریشان نہ کیا جائے۔ قاتل میں ہوں، روفی کی بھی اور اپنی بھی میں نے تمام نشاندہی کر دی ہے۔ میرے بھائی سے بغیر سلام صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ بھائیوں نے کبھی بہنیں بیچی نہیں تھیں......

''اے قانون اور اے قانون کے محافظو! اگر تم میں ذرا سی بھی سکت، جان اور دیانتداری باقی ہے تو خیال رکھنا ایسے حادثے اور بھی ہوں گے''۔

حویلی اجڑ گئی ہے۔

بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں۔

تاجی کو باوا جمے کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔

رات چاندنی ہے، آدھی گزر گئی ہے۔ پیپل کے سائے میں دو قبریں ہیں، میں ان کے سرہانے کھڑا ہوں۔ چاندنی میں دونوں قبریں یوں نظر آتی ہیں۔ جیسے کسی ڈرے ہوئے بچے کو دوسرے بچے نے اپنے ساتھ لگا لیا ہو۔

میں تاجی سے کہا کرتا تھا ___ ''تمہیں آنکھ مچولی کھیلنی نہیں آتی۔ کواڑ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی ہو۔ ایسی جگہ چھپا کرو کہ میں تمہیں ڈھونڈ نہ سکوں''۔

سوچتا ہوں کیا ایک صدی پہلے بھی اس حویلی میں ایسا ہی ہوا ہو گا؟ دادا جان نے بات پوری نہیں سنائی تھی۔

⌘ ⌘ ⌘

ادھوری کہانی

حمید ی

حمیدی

اونچی نیچی پگڈنڈی پر گاؤں کا چھکڑا سا تانگہ بے ہنگم ہچکولے کھا رہا تھا۔ کچھ تو تانگے کے پہیئے ڈھیلے تھے اور کچھ وہ گہری گہری نالیاں جو بیل گاڑیوں کے پہیوں نے بنا ڈالی تھیں تانگے کو سیدھا چلنے ہی نہ دیتی تھیں۔ خدیجہ کا گاؤں کھڑے فصل کی ہریالی کے عقب میں چھپ گیا تھا۔ ہریالی کے اس سمندر سے اسے اپنے مکان کی دوسری منزل ابھی تک نظر آرہی تھی جیسے دور سمندر پر جھومتا ہوا جہاز دور ہی ہٹتا جارہا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے گھوم کے دیکھا۔ اگلی سیٹ پر اس کا خاوند بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ خدیجہ نے اپنے خاوند کے چوڑے کندھوں، بھری بھری گردن، چمکتے بالوں اور کانوں کی لالی کو بڑی غور سے دیکھا۔ اس نے اپنے جواں سال سینے میں شدید ہل چل محسوس کی اور اس کے بازو انگڑائی میں پھیلنے کے لیے بے تاب ہونے لگےلیکن خدیجہ نے بازوؤں کو یوں سینے پہ رکھ کر دبایا جیسے کسی ہمراز سہیلی کو گلے لگا کر پوری قوت سے بھینچ رہی ہو۔ اس نے انگڑائی کو بازوؤں میں دبا کر سینے میں ہی ختم کر دیا۔ اس کے جسم کا انگ انگ چیخ اٹھا۔ اسے بے اختیار سی ہنسی آگئی۔ ہنسی روکنے کے لیے بھی اسے انگڑائی روکنے جتنی جدوجہد کرنی پڑی۔ خاوند کے پُر شباب جسم نے اس کی نسائیت میں جو ہنگامہ برپا کر دیا تھا وہ تھمتا نظر نہیں آتا تھا۔ اچھا ہوا کہ ماحول میں بندوق کا دھماکہ ہوا۔ خدیجہ نے چونک کے دیکھا۔ ساتھ والے کھیت کی مینڈھ پہ کھڑے ایک آدمی نے فاختہ پر گولی چلائی تھی۔

گولی کے دھماکے سے گھوڑی بدک گئی اور تانگے نے اتنی زور سے ہچکولہ کھایا کہ خدیجہ کا سر کرمے مزارعے کے کندھے سے جا ٹکرایا اور کرمے کا گال خدیجہ کے سر سے ٹکرا گیا۔ پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ اس کا نوجوان مزارع بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے

خاوند کو بیٹھنا چاہیے تھا لیکن خاوند بہت بڑے زمیندار جاگیردار کا بیٹا تھا۔ اس نے لاہور گلبرگ میں کوٹھی بنوائی تھی۔ اسے گوارا نہ تھا کہ مزارعہ اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ خدیجہ کو اس ہچکولے سے پگڈنڈی پر غصہ آ گیا جو کار کے قابل نہیں تھی ورنہ اس کے خاوند کی اتنی بڑی کار تھی جو اسے گاؤں سے شہر لے جاتی۔

کرمے کے گالوں اور خدیجہ کے سر کے تصادم نے خدیجہ کے خیالوں کا دھارا موڑ دیا۔ نوجواں جسم کے لمس نے اس کے پہلو میں گدگدی کر دی۔ کرما سکڑ کر پرے ہو گیا۔ خدیجہ کے رس بھرے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ آ گئی اور اس کے سینے میں ایک اور انگڑائی تڑپنے لگی۔ تصوروں کا بگولہ اٹھا اور خدیجہ کے رنگ رنگیلے خیالوں کو تانگے کی پچھلی سیٹ سے اٹھا کر دو برس پیچھے کماد کی اوٹ میں لے گیا۔ دو برس پہلے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ رُت چیت بیساکھ کی تھی۔ ماحول اور فضا کی ہلکی ہلکی تپش خدیجہ کے سینے کی تپش سے ہم آہنگ ہو کر خمار بن گئی تھی۔ خمار رومان پرور تھا۔ خدیجہ کھیتوں کو چلی جا رہی تھی۔ وہ گاؤں کے بادشاہ کی بیٹی تھی۔ جب گلی سے گذرتی تھی تو گاؤں والے جو سب کے سب مزارعے تھے راہ چھوڑ کر پرے ہو جاتے تھے اور خدیجہ یوں گردن کو خم دیتی گذر جاتی تھی جیسے قلوپطرہ اپنے ہاتھوں مارے ہوئے غلاموں کی لاشوں کے قریب سے گزر رہی ہو مگر اس روز خدیجہ یوں قدم قدم پر گھوم کے پیچھے دیکھ رہی تھی جیسے چوری کرنے جا رہی ہو۔ جب وہ گاؤں سے نکلی تو سانسوں کا تسلسل ہی اکھڑ چکا تھا۔ گاؤں کی شہزادی قدم جھینپ جھینپ کے رکھ رہی تھی۔

آگے گئی تو گندم کی اونچی فصل اور کماد نے اسے پناہ میں لے لیا۔ اسے سیف الملوک کے بیت سنائی دینے لگے۔ سرسوں کی مہک اور کماد کی میٹھی میٹھی بو کے ساتھ کرمے مزارعہ کی پُرسوز لَے نے خدیجہ پر طلسم طاری کر دیا۔ وہ ترنم کے تعاقب میں چل پڑی۔ کماد کی اوٹ میں، مینڈھ پر بیٹھا، کرما گا رہا تھا۔ خدیجہ نے یہ بیت اور کرمے کی آواز کئی بار سنی تھی، کبھی توجہ نہ دی تھی۔ اس دوپہر کرمے کی سُریلی آواز خدیجہ کے بےکل شباب سے ٹکرائی تو اسے کچھ ایسی لذت محسوس ہونے لگی جیسے کرما اس پر سحر طاری کرنے کے لیے گا رہا ہو۔ عطر بیز ہوا کے جھونکے اس کے گالوں کو سہلانے لگے اور وہ بھول گئی کہ کرما مزارعہ ہے اور وہ مزارعوں کے بادشاہ کی بیٹی۔ اس کی نگاہ میں اس لمحے کرما مرد تھا۔ سترہ اٹھارہ

برس کی عمر کا گٹھا ہوا خوبرو مرد جس کے پسینے میں نہائے ہوئے پٹھوں کی پھدکتی مچھلیوں کو اس نے کئی بار دیکھا تھا۔ ان کھیتوں کے وسط میں اس کا محل جیسا دومنزلہ مکان مزارعوں کے جھونپڑوں پر حکمرانی کر رہا تھا مگر اس دوپہر خدیجہ یوں کرمے کی طرف جھینپ جھینپ کے چلی جا رہی تھی جیسے اس کے نیم عریاں جسم سے بھیک مانگنے جا رہی ہو۔

کرمے پر خود فراموشی طاری تھی۔ خدیجہ اس کے قریب جا پہنچی تو کرمے نے گھوم کے دیکھا۔ سیف الملوک کے مترنم بول ہکلا کر خاموش ہو گئے۔ کرما اس قدر بوکھلا گیا کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ اس کی حسین اور چنچل مالکن سر پہ کھڑی ہے جس کی تعظیم کے لیے اسے اٹھنا ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتا اور اٹھتا۔ خدیجہ اس کے پاس مینڈھ پر بیٹھ گئی۔ کرما اٹھنے یا ذرا پرے سرکنے لگا تو خدیجہ نے اس کا بازو پکڑ کر کہا ـــــ "بیٹھے رہو بدھو! یہیں بیٹھے رہو" ـــــ کرما جانتا تھا کہ یہ خدیجہ کا انکسار نہیں حکم ہے۔ وہ حکم کی تعمیل کی خاطر بیٹھا رہا۔

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا جس میں غلامانہ جھلک نمایاں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی بی بی اسے چھیڑنے آئی ہے۔ مزارعوں کے نوعمر لڑکوں کو چھیڑ چھیڑ کر دق کرتے رہنا خدیجہ کا محبوبہ مشغلہ تھا۔ اسے چھڑی سے پیٹنا، اسے گھوڑا بنا کر پیٹھ پہ چڑھ بیٹھنا، ہنٹر مارنا، بھگانا، کسی کو پانی بھرے کھیت میں دھکا دے کے گرا دینا اور چیخ چیخ کر ہنسنا، مزارعوں کی نوبیاہتا لڑکیوں سے پہلی رات کی تفصیلات سننا، بچپنے میں ہی نہیں، اس کا یہ شغل منگنی ہو جانے تک جاری رہا تھا۔ جس روز وہ کرمے کے پاس جا بیٹھی تھی اس سے ایک روز پہلے بھی اس نے کرمے کو گھوڑا بنا کر سواری کی تھی حالانکہ اس کی عمر سولہ برس تھی اور کرما اس سے ڈیڑھ دو سالہ بڑا تھا۔ کرما اس پھول سے بوجھ تلے کبھی نہ تھکتا، وہ تو مزارعہ تھا، مویشیوں جتنی مشقت کر لیتا تھا مگر سولہ برس کی دلکش لڑکی کو پیٹھ پر بٹھا کر دو ہی قدم چلا تو اس کا دم اکھڑ گیا۔ رگ رگ میں آگ لگ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے پیٹھ پر جلتا ہوا تنور اٹھا رکھا ہو۔ اچھا ہوا کہ اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا، ورنہ اس آتشیں بوجھ تلے وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔

کرما تھکے ماندے جسم کو چارپائی پر پھینکا کرتا تھا تو دوسرے لمحے آنکھ لگ جایا کرتی تھی مگر اس رات وہ سو نہ سکا تھا۔ جسم بخار کی سی کیفیت میں جھلس رہا تھا۔ شاید یہی کیفیت اب بھی طاری تھی کہ وہ کماد کی اوٹ میں سیف الملوک گانے بیٹھ گیا تھا۔ خدیجہ پھر قریب آ بیٹھی تو وہ غلامانہ ہنسی ہنس کے بولا ـــــ "بی بی جی! میں گھوڑا نہیں بنوں گا" ـــــ اس نے

کہہ تو دیا مگر اس کی ذات ریزہ ریزہ ہوگئی۔ وہ ڈرنے لگا کہ بی بی گھوڑا بننے کا حکم نہ دے پھر اسے یہ ڈر بھی پریشان کرنے لگا کہ اس نے ایک آزاد انسان کی طرح اپنی مرضی کی بات کہہ دی تھی۔

کرمے کے تمام خوف اور خدشے بے بنیاد تھے۔ وہ سیدھا سادا دیہاتی اور کچھ نہ سمجھ سکنے والا مزارعہ تھا۔ مزارعے کچھ سمجھنے کے حق سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ کرما جان ہی نہ سکا کہ چھوٹی بی بی کے جن لال گلابی ہونٹوں پر شوخی اور شرارت سے لبریز مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی ان ہونٹوں پر یہ انوکھا سا تبسم کیوں ہے؟ نہ کرمے کو یہ پتہ چلا کہ چھوٹی بی بی کی موہنی آنکھوں میں چنچل پن کی جو چمک ہوتی تھی وہ آج پیاسی پیاسی کیوں لگ رہی ہے؟ کرمے کو ذرہ بھر علم نہ تھا کہ جس عجیب اور لذت آگیں بخار میں وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا ہے وہی بخار چھوٹی بی بی کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔

کرمے نے ایک بار پھر کھسیانا سا ہو کے ہنسنا چاہا مگر ہنس نہ سکا کیونکہ خدیجہ سرک کر اس کے اتنا قریب ہوگئی تھی کہ وہ اس کے جسم کی تپش بلکہ دل کی دھڑکنوں تک کو محسوس کرنے لگا تھا۔ ریشمی کپڑے کھدر کے گرد آلود کرتے سے ہمکنار ہو گئے تھے۔ خدیجہ کا دوپٹہ کرمے کے ننگے بازو پر جا پڑا۔ کرمے کے جسم نے جھرجھری لی۔ رات والا بخار اور تیز ہوگیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

یوں تو مزارعوں کا ہر ایک لڑکا خدیجہ کا کھلونا تھا لیکن کرما اس کا محبوب کھلونا تھا۔ کرمے کی ماں خدیجہ کے گھر کام کیا کرتی تھی۔ کرما اس کی گودی تھا۔ خدیجہ ننھی سی بچی تھی۔ بچپن سے ہی اس سے کھیلنے لگی تھی۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی جسے دولت مند ماں باپ نے اکلوتے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ باپ جب بھی شہر جاتا اس کے لیے طرح طرح کے کھلونے لے آتا تھا مگر خدیجہ کو صرف ایک کھلونہ پسند تھا اور وہ تھا کرما۔ خدیجہ اسے انسان کا بچہ نہیں بلکہ مٹی کا کھلونا سمجھ کر کھیلا کرتی تھی۔

بعض اوقات کرمے کی ماں کا کام ختم ہو جاتا تھا پھر بھی اسے چھٹی نہیں ملتی تھی کیونکہ ننھی خدیجہ کرمے سے کھیل رہی ہوتی تھی۔

جب دونو بچے کدکڑے لگانے کی عمر کو پہنچے تو خدیجہ نے کرمے کو گھوڑا بنا کر سواری شروع کر دی۔ اگر کرما تھک کر بیٹھ جاتا تو خدیجہ اسے چھڑی سے پیٹنے لگتی تھی۔ اس وقت

کرمے کی عمر دس برس اور خدیجہ کی آٹھ نو برس تھی جب اس نے کرمے کو پہلی بار چھڑی ماری تھی۔ کرما بچہ تھا۔ بچہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اس نے خدیجہ سے چھڑی چھین کر توڑ ڈالی اور خدیجہ کو ایسا بھرپور تھپڑ مارا کہ وہ چکرا کر اوندھے منہ گری تھی۔ دس برس کا خوددار بچہ خوش تھا کہ اس نے انتقام لے لیا ہے مگر ذرا دیر بعد خدیجہ کے باپ پھر اس کی اپنی ماں اور باپ کے ظالمانہ تھپڑوں اور گھونسوں نے اسے قائل کر لیا تھا کہ مزارعوں کے بچے مویشیوں کے بچوں سے بہتر نہیں ہوا کرتے۔ کرما اسی عمر میں سمجھ گیا تھا کہ مویشی کو حق حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے احتجاجاً سینگ، دُم یا دولتی مار دے مگر مزارعوں کو آقاؤں کی لعن طعن اور پھٹکار چپ چاپ سہنا ہوتی ہے۔

خدیجہ کی چھڑیاں کھاتے کھاتے کرما سترہ اٹھارہ برس کا ہو گیا۔ اس عمر تک خدیجہ اس پر سواری کرتی رہی۔ کرمے کا جسم اب پتھر ہو گیا تھا۔ اس پر اب نہ چھڑی کی ضرب اثر کیا کرتی تھی نہ خدیجہ کے جسم کا کوئی ابھار اسے پریشان کرتا تھا مگر اس روز خدیجہ اس کی پیٹھ پر چڑھی تو جانے کیا ہوا کہ کرمے کا پتھر جسم گوشت پوست بن گیا۔ شاید اس لیے کہ خدیجہ نے اپنے بازو اس کے سینے پر بڑی زور سے لپیٹ لیے تھے اور اس کی گرم گرم سانسیں اس کی گردن پر گدگدی کر رہی تھیں۔

کہاں وہ دن کہ کرما خدیجہ کے گداز اور اشتعال انگیز جسم تلے پتھر بنا رہتا تھا اور کہاں اُس روز دوپہر کے یہ لمحے کہ اس کے دوپٹے کے لمس نے اس کے اندر زلزلے بپا کر دیئے۔ کرمے نے پہلی بار اپنی چھوٹی بی بی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ وہ چونکا۔ ان آنکھوں میں اسے عورت نظر آ رہی تھی۔ کم سن، الہڑ عورت جو جوانی کی قیامت خیزیوں سے گھبرا کر جذبات کی دہلیز پر اوندھے منہ آ گرتی ہے۔

کرمے کو معلوم نہ تھا کہ ابھی ابھی کھانا کھا کہ چھوٹی بی بی لیٹی تو اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اس نے خواب میں قصے کہانیوں والے شہزادے کو دیکھا تھا۔ وہ اسے پیٹھ پر بٹھائے بادلوں میں اُڑا جا رہا تھا۔ وہ اسے بادل کے ایک ٹکڑے پر لے گیا اور وہاں جا کر لٹا دیا۔ خدیجہ نے اسے کہا کہ کوئی کہانی سناؤ تو شہزادے نے کہانی شروع کر دی۔ سناتے سناتے شہزادہ اس پر جھکا اور اس کی پیشانی چوم لی اور اس کا ہاتھ خدیجہ کے سینے پر رینگنے لگا۔ خدیجہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر اس قدر زور سے دبایا کہ خواب

پر دھندلاہٹ چھا گئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں مگر شہزادہ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے پلکوں کے اندھیرے میں بادل کے اس ٹکڑے کو بہت ڈھونڈا لیکن وہاں اب کچھ بھی نہ تھا۔ خدیجہ کا سینہ زور سے تھرک رہا تھا اور نتھنے سانسوں کی غیر معمولی گرمی سے تپ رہے تھے۔ اس نے بیداری میں وہی خواب پھر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ تصوروں میں شہزادے کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھی مگر وہ شہزادہ نہیں کرما تھا۔ اس کی سوچ مفلوج سی ہوگئی۔ شہزادہ تو غائب ہو چکا تھا، کرما یہیں تھا۔ وہ اٹھی اور کھیتوں کی طرف چل دی تھی۔

کرما سوچ رہا تھا کہ چھوٹی بی بی پھر اسے گھوڑا بنائے گی لیکن خدیجہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔۔۔ ''کرمے! آج کوئی کہانی سناؤ''۔۔۔ وہ کہنا تو یہ چاہتی تھی کہ کرمے! وہی کہانی سناؤ جو شہزادہ ادھوری سنا گیا ہے۔

''مجھے کہانی تو نہیں آتی بی بی جی!''۔۔۔ کرمے نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جھوٹ!''۔۔۔ خدیجہ نے اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں الجھا دیں۔

کرمے کا سراپا کانپ اٹھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لینا چاہا مگر جرأت ہی نہ ہوئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں بولا۔۔۔ ''ایک ہی تو کہانی آتی ہے مجھے''۔

''وہی سنا دو''۔

کرمے نے گھونٹ سا نگلا۔ ذرا سا کھانسا اور ازبر کیا ہوا سبق سنانے کے لہجے میں بولا۔۔۔ ''سنی سنائی سناتا ہوں، سنانے والے کی گور گردن۔ ایک تھا بادشاہ۔ میرا تیرا خدا بادشاہ، وہ بادشاہ سات نگر پر راج کرتا تھا......''

خدیجہ کی پیاسی نظریں کرمے کے معصوم چہرے پر جم گئیں۔ سترہ اٹھارہ برس کے لڑکے کے خدوخال میں تنومند مرد کی قوت کے آثار عیاں ہونے لگے۔ خدیجہ ان خدوخال میں اور اوٹ پٹانگ سی کہانی میں تحلیل ہونے لگی۔ خواب جو وہ دیکھ چکی تھی پھر پلکوں میں لوٹ آیا۔ گھنا کماد بادل کا ٹکڑا بن گیا۔ مزارعوں کا بیٹا شہزادہ بن گیا مگر کہانی کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کرما بدک کے پرے ہٹ گیا۔ طلسم ہی ٹوٹ گیا۔

کرما اس لیے بدکا تھا کہ خدیجہ نے اپنا گال اس کے گال سے لگا دیا تھا اور کرمے نے یوں محسوس کیا تھا جیسے اس کا گال جلتے ہوئے مکان کی دیوار سے چھو گیا ہو۔ کرما اٹھ

کھڑا ہوا۔

چھکڑا سے تانگے نے ایک اور ہچکولہ کھایا تو خدیجہ کماد کی اوٹ سے تانگے کی پچھلی سیٹ پر آ پڑی جہاں کرما اس سے پرے ہٹ کر سکڑ گیا تھا۔ دو برس پہلے مینڈھ پر بیٹھے کرما اسی طرح بدک کر پرے ہٹا پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خدیجہ نے اگلی سیٹ پر دیکھا۔ اس کا خاوند اکتایا سا بیٹھا تھا اور تانگے والا بم پر بیٹھا گھوڑے کی دُم مروڑ رہا تھا۔

خدیجہ نے ایک بار پھر کرمے کو دیکھا۔ وہ دائیں طرف گردن گھمائے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ خدیجہ کو ہنسی آ گئی۔ اب کے اس کی زیرِ لب ہنسی میں جاگیردار کی بیٹی کا جلال اور دولتمند دولہا کی نئی نویلی دلہن کا انداز تھا۔ وہ تو اب لاہور گلبرگ کی ایک کوٹھی میں رانی بن کے جا رہی تھی جہاں اتنی لمبی کار اس کی منتظر تھی۔ وہ تو گاؤں میں بھی رانی ہی تھی مگر کہاں گاؤں اور کہاں لاہور۔ وہ دن بہت پیچھے رہ گئے تھے جب اس نے کرمے کو شہزادے کا روپ دے ڈالا تھا۔ اس واردات کو دو برس گزر چلے تھے جب کرما کہانی ادھوری چھوڑ کر خدیجہ کو مینڈھ پر اکیلے چھوڑ بھاگا تھا۔ چھوٹی بی بی کی حکم عدولی معمولی جرم نہ تھا لیکن چھوٹی بی بی نے اسے کوئی سزا نہیں دی تھی۔ کرمے کو ہر لمحہ خدشہ تھا کہ وہ اسے چھڑی سے پیٹے گی لیکن خدیجہ اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ دونوں عیدوں پر اس نے کرمے کو نئے کپڑے سلوا دیئے تھے اور اسے اکثر چوری چھپے پیسے بھی دینے لگی تھی۔ شہر کا کوئی کام ہوتو وہ کرمے کو ہی بھجوایا کرتی تھی تاکہ اسی بہانے سے گھوم پھر آئے لیکن کرما ان عنایات پر ذرہ بھر خوش نہ تھا۔ وہ خدیجہ کو دور سے دیکھ کر ادھر اُدھر ہو جاتا تھا۔

اس دوپہر کے بعد خدیجہ کی شوخیاں اس کے سینے میں سمٹ آئی تھیں اور اسے بے کل کیے رکھتی تھیں۔ اس بے کلی میں وہ کرمے کو ڈھونڈتی رہتی تھی۔ وہ مل جائے تو اسے تنہا گوشوں کی طرف گھسیٹتی تھی مگر کرما کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر غائب ہو جاتا تھا۔ ایک بار اس نے کرمے کو مویشیوں کے کمرے میں جا پکڑا تھا۔ وہ اندر اکیلا تھا۔ خدیجہ کھرلی پہ جا بیٹھی اور پنڈلیوں سے شلوار اوپر کر کے بولی۔۔۔ ''کرمے! ذرا پنڈلیاں دبا دو دُکھ رہی ہیں''۔

کرمے نے سولہ برس کی گوری گوری ننگی پنڈلیاں دیکھیں تو اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ ہونٹ خشکی سے پھٹنے لگے اور دل کی دھڑکن ایسی بلند ہوئی جسے وہ سن بھی سکتا تھا۔ اس نے بھاگ جانا چاہا مگر حکم عدولی کے جرم کے خوف نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے

خدیجہ کی پنڈلیوں کو دیکھا پھر اپنے ہاتھوں پہ نگاہ ڈالی۔اس کے ہاتھ گیلے بنولوں اور بھوسے سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ خدیجہ کو دکھا کر بولا___ ''ہاتھ دھو آؤں بی بی جی؟ بہت گندے ہیں''۔

''جلدی آؤ''۔

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔اس نے گاؤں سے بھاگ جانے کی ٹھان لی لیکن سیدھا سادا دیہاتی لونڈا کبھی ایک رات بھی گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔اس نے سوچا، چلو، بی بی کی پنڈلیاں دبا ہی دوں۔ پنڈلیوں کے تصور نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جو پنڈلیاں اس کے سامنے رکھی گئی ہیں وہ چھوٹی بی بی کی نہیں ایک عورت کی پنڈلیاں ہیں۔نوخیز اور چنچل عورت کی گوری گوری پنڈلیاں۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ چھوٹی بی بی کو ذرہ بھر تھکان نہیں نہ اس کی پنڈلیاں دکھ رہی ہیں۔ وہ حکم کی نوعیت کو خوب سمجھتا تھا۔

ان الٹے سیدھے خیالوں نے شعلے بھڑکا دیے۔وہ گاؤں سے نکل گیا لیکن وہ گول گول پنڈلیاں اس کی نظروں کے سامنے نکھرتی چلی آئیں اور اس کے سینے کے شعلے بھڑکتے چلے گئے۔وہ گاؤں سے ذرا دور جوہڑ کے کنارے جا پہنچا جہاں بھینسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے کپڑے اتارے اور جوہڑ میں اتر کر ڈبکیاں لگانے لگا۔گھنٹہ بھر بعد پانی سے نکلا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

دوسرے روز خدیجہ نے اسے کھیتوں میں جا لیا اور تحکمانہ لہجے میں چلائی___ ''کرمو!''___ وہ بھاگتا آیا تو خدیجہ اس کے گال پر تھپڑ مار کر چلائی___ ''حرام زادے، کمین ذات، کام چور...... دن بدن سر چڑھا جا رہا ہے''۔

کرما دوسرے تھپڑ کے انتظار میں بت بنا کھڑا رہا۔ چند مزارعے ایک خالی کھیت میں پانی لگا رہے تھے۔وہ دبکو دبکو ہو کر یوں کام پہ جھک گئے جیسے سر اٹھایا تو قلم کر دیا جائے گا۔وہ سوچنے لگے کہ ہر وقت ہنسنے کھیلنے اور شوخیاں کرنے والی چھوٹی بی بی کو غصہ جو آیا ہے تو کوئی بہت بڑی بات ہوگئی ہے۔

''دفع ہو جا، کھڑا منہ کیا تک رہا ہے''___ خدیجہ ایک بار پھر گرجی___ ''کھال ادھیڑ لوں گی حرام خور!''

کرما یوں پرے ہٹ گیا جیسے کسی کی ٹھوکر سے پتھر لڑھک گیا ہو۔ خدیجہ تیزی سے گھومی اور گھر کی طرف چلی گئی۔ مزارعوں نے کنکھیوں دیکھا۔ ایک نے کرمے سے پوچھا___ ''کیا کیا تو نے مردود! چھوٹی بی بی نے پہلے تو کبھی اتنا غصہ نہیں کیا تھا؟''

کرمے نے کدال کو سر سے اوپر اٹھایا اور اس قدر زور سے زمین پر دے مارا کہ کدال دھرتی کے سینے میں دستے تک اتر گئی۔اس دھچکے سے اس کا سراپا ہل گیا اور اس کی آنکھوں میں اٹکے ہوئے دو آنسو لڑھک کر کٹھے کے مٹیالے پانی میں تحلیل ہو گئے۔اس نے قہر آلود نگاہوں سے اس دومنزلہ مکان کو دیکھا جو گاؤں کے وسط میں بڑی شان سے ایستادہ تھا۔کرمے کو معلوم نہ تھا کہ اس محل نما مکان کے بند کمرے میں چھوٹی بی بی پلنگ پر اوندھے منہ پڑی سسکیاں لے لے کے رو رہی ہے۔

اُس روز کے بعد خدیجہ نے کھیتوں کی طرف جانا چھوڑ دیا۔اس کا مونس و غمخوار اور ہمراز اس کا نرم و گداز سرہانہ تھا جسے ہر رات سینے سے لگا کر سو جاتی تھی اور کرما مٹی کے ڈھیلوں کو سینے سے لگا کر سب کچھ بھول گیا۔

دو اڑھائی مہینوں بعد خدیجہ کی منگنی ہوگئی۔اس کا منگیتر بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ لاہور میں اپنی کوٹھی تھی۔ زرخیز مربعوں کے علاوہ شہر میں تین کوٹھیاں کرائے پر چڑھا رکھی تھیں۔صرف ان کوٹھیوں کے سوا دو ہزار روپے ماہوار آجاتے تھے۔اس کی تعلیم تو واجبی سی تھی لیکن دولت اور جائیداد نے سب عیب چھپا رکھے تھے۔ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔خدیجہ کے ماں باپ کو اس بات کا ذرہ بھر رنج نہ تھا کہ ان کے ہونے والے داماد کی ایک بیوی مر چکی ہے اور وہ دوسری کو طلاق دے چکا ہے۔وہ تو خوش تھے کہ ان کی بیٹی شہر جا رہی ہے۔انہوں نے اسے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ایسی بیٹی کے لیے انہیں دولت مند خاوند کی ضرورت تھی۔

خدیجہ تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔وہ سہیلیوں سے کہا کرتی تھی___ ''انہوں نے میری ہی خاطر دوسری بیوی کو طلاق دی ہے''۔

خدیجہ کا جسم تو گاؤں میں رہا مگر ذہن اور دل شادی سے پہلے ہی شہر پہنچ گئے۔اس کے ذہن میں ایک کار گھومنے لگی۔رات کو وہ چہرے پر سرخی پاؤڈر کی تہہ جمائے اور اونچی ایڑی والا سینڈل پہنے سینما ہال میں بیٹھنے لگی۔اسے گاؤں سے نفرت ہوگئی۔چال ڈھال ہی

بدل گئی۔ ایک روز سہیلیوں نے اسے کھیتوں کی طرف چلنے کو کہا تو وہ ناک سکیڑ کر بولی___ ''اونہہ، کیا رکھا ہے کھیتوں میں؟ جدھر جاؤ بدبو......'' اس نے انگڑائی لی اور کہنے لگی___ ''لاہور کے باغوں کے مقابلے میں یہ کھیت کیا ہیں؟''

سرسوں کی بھینی بھینی خوشبو پر ولائتی عطر چھا گیا۔ ایک کار گاؤں کے الھڑ پن کو کچلتی گذر گئی۔ کماد سے گھن آنے لگی۔ حدِ نگاہ تک جھومتی ہریالی کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور خدیجہ کو اپنا دومنزلہ مکان یوں بے رونق سا دکھائی دینے لگا جیسے اس کی بالائی منزل گر پڑی ہو۔ اس نے کرمے کو اس طرح دل سے اتار دیا جس طرح کپڑے سے جوتا صاف کر دیا جاتا ہے۔

آخر وہ دن آ گیا جب وہ دلہن بن کے لاہور پہنچ گئی۔ تیسرے روز واپس آئی اور آج چوتھے روز خاوند کے ساتھ لاہور جا رہی تھی۔ ماں باپ نے اسے جہیز میں ایک بھینس بھی تھی لیکن خدیجہ کے خاوند کے شہری ملازم بھینس کی دیکھ بھال سے بے بہرہ تھے۔ بھینس چارہ تو سارا ہی کھا جاتی تھیں مگر کسی کے ہاتھ پر دودھ ہی نہیں دیتی تھی۔ یہ کام کسی گوالے یا دیہاتی کا تھا۔ آج جب خدیجہ خاوند کے ساتھ شہر جا رہی تھی، اس کے ماں باپ نے بھینس کے لیے کرمے کو ساتھ کر دیا تھا اور وہ مستقل طور پر خدیجہ کی کوٹھی میں رہنے کے لیے جا رہا تھا۔

خدیجہ نے دیکھا۔ اس کا گاؤں کماد اور درختوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ اسے ذرہ بھر رنج نہ ہوا نہ اس کے ذہن میں کوئی ایسا گیت گونجا۔

نہ میں لڑی نہ بولی نی مائے
گھر رکھ لے میری ڈولی نی مائے

اس نے بچپن کی شرارتوں اور لڑکپن کی کنواری شوخیوں کو بھی یاد نہ کیا۔ اسے تو رہ رہ کے تانگے اور اس کے مریل سے گھوڑے پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے پھر اس نامراد پگڈنڈی پر غصہ آنے لگا جس پر کار نہ چل سکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کرمے کو دیکھا تو اسے ہنسی آ گئی پھر اسے افسوس سا بھی ہوا کہ کم عقلی میں کس کمین ذات سے کھل کھیلنے لگی تھی۔ اس نے اپنے آپ میں جھینپ سی محسوس کی۔ آخر اس خیال سے اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ لاہور کی محل جیسی کوٹھی کو دیکھ کر یہ مردود سب کچھ بھول جائے گا۔ کسی کو بتائے گا تھوڑے ہی!

تانگے کے ہچکولے ختم ہوئے تو گاڑی کا ہنگامہ خیز سفر شروع ہو گیا اور جب وہ دن بھر کے سفر کے بعد گلبرگ کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو تھکے ماندے اعصاب ٹھکانے آ گئے اور سر

جو دکھنے لگا تھا ہلکا پھلکا ہو گیا۔ یوں تو کوٹھی کا ہر کمرہ نرالا تھا لیکن سونے کا کمرہ خیالی شہزادوں اور پریوں کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ اس کمرے میں داخل ہوئی تو اس پر بڑے ہی خوبصورت خواب کا تاثر طاری ہو گیا۔ اس نے خاوند کو خمار آلود نگاہوں سے دیکھا تو خاوند نے پختہ کار مسکراہٹ سے کہا___ ''نہا تو لو''___ نوکر کرمے کو اپنے کوارٹروں میں لے گئے اور اسے الگ کوارٹر دے دیا۔ اس نے بستر کمرے میں پھینکا اور بھینس کی طرف چل پڑا۔

دوسرے ہی دن خاوند اسے سینما لے گیا۔ اس نے پوٹیٹو چپس کے دو لفافے لے کر ایک خدیجہ کو دیا تو خدیجہ نے پوچھا___ ''ان میں کیا ہے؟''___ خاوند نے کہا___ ''پوٹیٹو چپس''___ خدیجہ نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا تو خاوند کو کہنی مار کر بولی___ ''اونہہ! یہ تو آلو ہیں باریک باریک کٹے ہوئے''___ خاوند کو دھچکہ سا لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے آئس کریم کو قلفی کہہ دیا تو خاوند سٹپٹا اٹھا۔ اس نے اسی رات اسے ذہن نشین کرا دیا کہ پوٹیٹو چپس آلو نہیں ہوتے اور آئس کریم کو قلفی نہیں کہتے۔ اسی رات سے اس نے خدیجہ کو شہری محفلوں کے آداب سکھانے شروع کر دیئے۔

اس رات کے بعد وہ ہر روز اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے، خدیجہ کو اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور کھانے پینے کے جدید طریقے سکھانے لگا۔ اس نے اسے ہنسنے اور مسکرانے کے طور طریقے بھی سمجھا دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ کس قسم کے آدمی کے لیے کس قسم کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ پھر اس نے اسے میک اپ اور کپڑے پہننے کا سلیقہ بتایا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ریہرسل ہوتی رہی اور دیہات کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی بے ساختگی اور الھڑ پن پر تصنع، ظاہرداری، فیشن اور نمائش کی دبیز تہیں بچھتی چلی گئیں۔ خدیجہ یہ سب کچھ بڑے ہی شوق سے سیکھتی چلی گئی۔

اس کا خاوند چاہتا تو کسی بھی فیشن پرست لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا تھا۔ دولت، جائیداد اور کار بڑا ہی کامیاب جال تھا لیکن فیشن پرست لڑکیاں بن بیاہی اس جال میں ہنستی کھیلتی چلی آئیں تو شادی کے جھنجھٹ کی کیا ضرورت؟ خدیجہ کو وہ اس لیے بیاہ لایا تھا کہ گھر میں مستقل بیوی کا ہونا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ خدیجہ کا حسن اور جسم جثہ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

ایک روز دو دبلی پتلی لڑکیاں خدیجہ سے ملنے آئیں۔ خاوند نے تعارف کرایا اور

خدیجہ سے کہا کہ یہ تمہیں سب کچھ سکھا پڑھا دیں گی۔ خدیجہ نے لڑکیوں کی بے تکلفی اور بے حجابی دیکھی اور انہیں بے تکے قہقہے لگاتے دیکھا تو وہ احساسِ کمتری سے اپنے آپ میں سکڑنے لگی۔ لڑکیوں کے بال کٹے ہوئے تھے۔ دوپٹے کندھوں پر، قمیصیں اور شلواریں ایسی کہ وہ ان کپڑوں کے ہوتے ہوئے بھی عریاں لگتی تھیں۔ خدیجہ کو ان کی ڈیل ڈول اور بے حجابی پہ رشک آنے لگا۔ ایک لڑکی اسے یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں لے گئی کہ آؤ تمہیں میک اَپ سکھائیں۔ دوسری لڑکی اسی کمرے میں اس کے خاوند کے ساتھ بیٹھی رہی۔

خدیجہ کو اس لڑکی نے گھنٹہ بھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھائے رکھا۔ اسے میک اَپ کرایا اور اس کا جوڑا بھی بنایا۔ جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آئیں تو خدیجہ کا خاوند اور وہ لڑکی وہیں بیٹھے تھے۔ خدیجہ کو دیکھ کر انہوں نے تالیاں بجائیں اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ خدیجہ کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ جب وہ اس لڑکی کے ساتھ دوسرے کمرے میں گئی تھی اس کا خاوند دوسری لڑکی کے ساتھ سونے والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ خدیجہ کو کیسے پتہ چلتا کہ اس لڑکی کے پرس میں دس روپے بھی پورے نہیں تھے لیکن اب اس کے پرس میں پورے ساٹھ روپے تھے۔

خدیجہ نے خاوند کا دیا ہوا بہروپ چڑھا لیا اور وہ دولت اور تہذیب جدید کی بے حیائی کا جزو بن گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کے بچپن کا کھلونا جس کے ساتھ وہ منگنی ہو جانے تک کھیلتی رہی تھی، اسی کوٹھی کے احاطے میں دو چار ہی قدم دور رہتا ہے۔ مگر کرما تو اب خدیجہ کے دیہاتی ماضی کا ایک ذرہ تھا جسے وہ ذہن سے کھرچ کھرچ کر اتار چکی تھی۔ وہ اب ہر پہلو سے شہزادی تھی۔

لیکن دو چار مہینے گذرے تو وہ تشنگی سی محسوس کرنے لگی۔ بعض اوقات یوں لگتا جیسے کہ وہ کوئی چیز کہیں رکھ کے بھول گئی ہو۔ پہلے تو اس نے کوئی توجہ نہ دی لیکن یہ احساس بڑھتا گیا کہ کوئی بڑی ہی پیاری شے کھو گئی ہے۔ اس احساس کا تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون سی چیز ہے جو کھو گئی ہے۔ ایک روز وہ ڈرائنگ روم میں کھڑی، دیوار سے آویزاں ایک نیم عریاں عورت کی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا خاوند دبے پاؤں آیا اور اس نے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

اس نے خدیجہ کے ساتھ بے تکلفی کا یہ پیارا سا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا۔ خدیجہ پلک

جھپکتے گاؤں کی الھڑ لڑکی بن گئی۔ وہ تیزی سے گھومی۔ خاوند کے ہاتھ آنکھوں سے ہٹ گئے۔ خدیجہ نے اسے کندھوں سے تھام کر گھما دیا اور کود کر اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھی۔ اس نے خاوند کے سر پر اسی طرح بھرپور تھپڑ مارا جس طرح کرمے کو گھوڑا بنا کر مارا کرتی تھی۔ بچوں کی سی شوخی سے بولی ۔۔۔ ''چل بھاگ''۔

خاوند نے ڈانٹ کر اسے پیٹھ سے اتار دیا اور بولا ۔۔۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے''۔

خدیجہ کے دل کو شدید چوٹ لگی۔ ملتجی اور ہارے ہوئے لہجے میں بولی ۔۔۔ ''ذرا کھیلنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آپ برا مان گئے.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی اور اس کا خاوند پُرنفرت انداز سے باہر نکل گیا۔ خدیجہ کھسیانی سی ہو کے وہیں کھڑی رہی۔ اسے دکھ تو بہت ہوا لیکن اس پر یہ انکشاف ہو گیا کہ وہ جس چیز کی کمی محسوس کر رہی تھی وہ کیا ہے۔ وہ خاوند کو گھوڑا بنا کر سواری کرنا چاہتی تھی، وہ اس کے پہلو میں گدگدی کر کے اس کے قہقہے سننا چاہتی تھی اور خود بھی اسی طرح چیخ چیخ کر ہنسنا چاہتی تھی، جس طرح وہ کسی مزارعے کے لڑکے کو پانی بھرے کھیت میں دھکا دے کر ہنسا کرتی تھی۔ اسے نئی زندگی کے مصنوعی چاؤ چونچلوں اور نمود و نمائش سے بھی پیار ہو گیا تھا مگر وہ تھوڑی سی دیر کے لیے ان جھوٹے بندھنوں سے آزاد ہو کر کدکڑے لگانے، خاوند پر چڑھ بیٹھنے یا اس سے کشتی کرنے کی خواہش کو دل سے مٹا نہ سکی۔

اس کا خاوند لڑکوں کی طرح ہنسنے کھیلنے کی عمر سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس کی جوانی کی چنگاری دو اپنی بیویوں، چند دوسروں کی بیویوں، کچھ آوارہ لڑکیوں، شراب اور شب بیداریوں نے سرد کر ڈالی تھی۔ خدیجہ نے تو کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ اس کے خاوند کے کسی نہ کسی دوست کی بیگم اکیلی یا اپنے خاوند کے ساتھ، آئے دن آئی ہی رہتی تھی۔ وہ دوستوں سے کم اور ان کی بیگموں کے ساتھ زیادہ باتیں کیا کرتا تھا۔ سینما میں بھی دو تین عورتیں ساتھ ہوتی تھیں، پکنک پر بھی۔ آج اپنے ہاں ڈنر ہے تو کل کسی کے ہاں چائے پارٹی ہے۔ خدیجہ نے یہ سب کچھ قبول کر لیا تھا کیونکہ یہ اس سوسائٹی کی باتیں تھیں جس کی وہ جزو بن چکی تھی مگر اس روز جب خاوند نے اسے جھٹک کر پیٹھ سے اتار دیا تو اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اسے خاوند صرف رات کو سونے کے وقت تنہا ملتا ہے، وہ بھی صرف خاوند کے روپ میں۔ اس کے تصوروں کا شہزادہ جسے اس نے گاؤں میں دیکھا تھا، شراب میں ڈوب گیا تھا۔ اسے

خاوند کا صرف جسم ملتا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا ادھیڑ عمر جسم، شراب زدہ سیلپنگ سوٹ کے کفن میں لپٹا ہوا بدبودار جسم، روح اور جذبات سے خالی، گوشت پوست کا بے جان ڈھانچہ!

ایک وہ زندگی تھی جو شہر سے دور، ریلوے سٹیشن سے بھی پرے، شہر کے تہذیب و تمدن سے ہٹی ہوئی زندگی جسے خدیجہ نے گندی اوڑھنی کی طرح اتار پھینکا تھا اور کہا تھا___

’’کیا رکھا ہے ان کھیتوں میں؟ ہر طرف بدبو‘‘___ اور ایک یہ زندگی، تہذیب جدید سے سجی سجائی فرانسیسی عطر سے معطر زندگی جو خدیجہ کو بہت ہی عزیز تھی۔ وہ اُڑ کر یہاں پہنچنا چاہتی تھی۔ مگر شادی کے پہلے ہی سال وہ دو زندگیوں میں معلق ہوگئی۔ وہ خلا میں بھٹکنے لگی، سینے میں غبار سا بھر گیا اور وہ بے چین رہنے لگی۔

اس نے اس بے چینی اور اکتاہٹ کا اظہار خاوند سے کرنا چاہا مگر چپ رہی۔ سوچا یہ بھی بدتمیزی نہ ہو۔ اس نے چاہا کہ خاوند کو پاس بٹھا کہ سر اس کی آغوش میں رکھ دے اور پوچھے___ ’’تم میرے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی اتنی دور کیوں محسوس ہوتے ہو؟ تم تو میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔ اب خواب رہے نہ تم۔ تم نے میرے جذبات کو بھی فیشن اور سوسائٹی کے آداب کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ میں تو دل کھول کر قہقہے لگایا کرتی تھی تو کوئی روکتا نہ تھا۔ تم نے میری مسکراہٹوں کا بھی موقع اور وقت مقرر کر دیا ہے۔ تم تو برف کا تودہ ہو اور میں آگ کا شعلہ، قریب ہوتے ہو تو نہ تم پگھلتے ہو نہ میں بجھتی ہوں۔ بتاؤ نا میں اپنے شعلوں کو کہاں لے جاؤں؟ میں پاگل تو نہیں ہوگئی؟‘‘

لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خاوند نے کبھی موقع ہی نہ دیا تھا۔ اس کے باوجود خدیجہ نے اسی شاہانہ ماحول سے سمجھوتہ کیے رکھا۔ دل میں اسی ماحول کا پیار زندہ رکھا اور جذبات اور اُمنگوں پر سرخی پوڈر کی تہیں جماتی چلی گئی۔ اس نے لان میں ٹہلتے یا بیٹھے کئی بار کرمے کو دیکھا لیکن اسے اجنبی جان کر ذرہ بھر توجہ نہ دی۔ کرما بھی اپنی چھوٹی بی بی سے دور رہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں والی بی بی مرگئی ہے۔ اس نے بھینس سے دل لگا لیا تھا۔

شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ کوٹھی میں ڈنر کا اہتمام تھا۔ تیس چالیس مہمان مدعو تھے، مرد بھی۔ عورتیں بھی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ کوٹھی میں بے ہنگم قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ مسرت سے بیزار قہقہے۔ خدیجہ بھی ہنس رہی تھی اور سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند بہت ہی خوش تھا۔ اس لیے کہ آج اس کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ وہ ایسی کئی

سالگرہ ہیں منا چکا تھا بلکہ اس لیے کہ خدیجہ اونچی سوسائٹی کے معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ وہ انگریزی کے وہ تمام الفاظ باموقع استعمال کر رہی تھیں جو خاوند نے اسے یاد کرائے تھے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی دیہات میں جنی پلی ہے۔ خود خاوند کو شک ہونے لگا کہ یہ وہ خدیجہ ہے جسے وہ دور دیہات سے بیاہ لایا تھا۔ اس کی پورے ایک سال کی محنت ضائع نہیں ہوئی تھی۔

شراب کا دور چلا تو خاوند نے خدیجہ کے انکار کے باوجود اسے دو پیگ پلا دیئے۔ اس نے شراب دیکھی تھی چکھی کبھی نہیں تھی۔ اسے کڑواہٹ تو بہت محسوس ہوئی لیکن ذرا دیر بعد اس کے وجود میں لذت آگیں ہل چل بپا ہوگئی۔ تیسرا پیگ اس نے اپنی مرضی سے پی لیا۔ سینے میں چنگاریاں سے سلگنے لگیں جن کی تپش پُر کیف تھی۔ محفل کی رونق اور زیادہ نکھر آئی۔ اسے محفل کا ہر انسان اور ہر شے پیاری لگنے لگی۔

نصف شب تک محفل کی سرگرمی اور ہنگامہ عروج پر پہنچ گیا۔ مربعوں اور کوٹھیوں کی اندھی آمدنی قہقہوں میں اُڑ رہی تھی۔ مزارعوں کا پسینہ شراب بن کر انسانوں کی رگوں میں اُتر رہا تھا۔ متعفن قہقہوں سے کوٹھی گونج رہی تھی۔

شراب نے لاشعور کی تہوں تک کو ہلا ڈالا۔ تہوں میں جو کچھ نہاں تھا ابھر کر سطح پر آگیا۔ تحت الشعور کی گہرائیوں سے ایک طوفان اٹھا پھر آندھیاں چلنے لگیں جنہوں نے مغربیت اور امارت کے پردے تار تار کر دیئے۔ خدیجہ پرکاہ کی طرح اُڑنے لگی۔ وہ مہمانوں کے ہجوم سے نکلی اور کمرے سے نکل گئی۔ اسے باہر نکلتے کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کا خاوند کسی اور کی بیوی سے باتیں کر رہا تھا اور اس بیوی کا خاوند کہیں اور مگن تھا۔

خدیجہ برآمدے سے بھی نکل گئی اور یوں خراماں چلتی چلی گئی جیسے خواب میں گھوم پھر رہی ہو۔ اس وقت خدیجہ پر بے خودی اور مدہوشی طاری تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور سر ڈول رہا ہے۔ وہ مسرور تھی کہ آج اس نے وہ طلسماتی دنیا پالی ہے جو کسی نے اس سے چھین لی تھی۔

کرما اپنے کوارٹر میں تھکا ہارا بیٹھا تھا۔ کوٹھی کے اندر اور باہر بھاگ بھاگ کر اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ وہ لیٹنے ہی لگا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے دیکھا اور اُچھل کر اٹھا۔ دروازے میں خدیجہ کھڑی تھی۔ وہ جب سے اس کوٹھی میں آئی تھی آج پہلی

بار کرمے نے اسے اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ آج خدیجہ کو اپنے ویران کمرے میں دیکھ کر وہ ایسا گھبرا کر اٹھا کر حقہ گرا دیا۔ اسے اتنی بھی جرأت نہ ہوئی کہ حقے کو اٹھا لے۔ خدیجہ کھل کر ہنسی اور لڑکھڑاتی ڈگمگاتی اس کی چارپائی پر جا بیٹھی۔

''بیٹھو کرمے! گھبرا کیوں گئے؟''۔۔۔ خدیجہ کی زبان بھی قدموں کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

کرما سن ہو کے رہ گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر خوفزدگی اور حیرت سے کہا۔۔۔ ''چھوٹی بی بی! آپ نے بھی؟......''

خدیجہ نے اسے زیادہ بولنے نہ دیا۔ لپک کر اس کی کلائی پکڑی اور گھسیٹ کر اسے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔ حیرت اور اضطراب سے کرمے کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے خدیجہ سے پرے سرکنے کی بھی کوشش نہ کی۔ بولا۔۔۔ ''بی بی جی! آپ یہاں کیوں آ گئیں؟ جا کے سو جائیے''۔

''وہ کہانی تم نے پوری نہیں سنائی تھی نا!''۔۔۔ خدیجہ نے تشنہ سے لہجے اور شرابی انداز سے کہا۔۔۔ ''آج وہ سننے آئی ہوں۔ یاد ہے نا تمہیں وہ تین سال پرانی، ادھوری کہانی؟''

خدیجہ ہنس پڑی۔ کرمے نے بھی ہنسنے کی کوشش کی مگر ہنس نہ سکا۔ اس نے ذرا پرے سرکنا چاہا لیکن خدیجہ نے بازو اس کے کندھوں پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ کرما گم صم بیٹھ گیا۔ خدیجہ کا بازو جو اس کے کندھے پر رکھا تھا اس کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور دوسرے لمحے خدیجہ کا تپتا ہوا گال کرمے کے خنک گال سے جا لگا۔ کرما آزاد ہونے کو تڑپا لیکن خدیجہ کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

''بی بی جی!''۔۔۔ کرمے نے التجا کی۔۔۔ ''جا کے سو جائیے۔ چلئے میں ساتھ چلتا ہوں''۔

''مت بھاگ کرمے!''۔۔۔ خدیجہ نے بے ساختہ اور بے اختیار ہو کے کہا۔۔۔ ''اب بھاگنے نہ دوں گی۔ مجھے سیف الملوک کے وہی بول سنا دے جو تو نے کماد کی اوٹ میں گائے تھے۔ وہ بول ادھورے رہ گئے تھے۔ وہ کہانی بھی ادھوری رہ گئی تھی......''

کرمے کی چارپائی دیوار کے ساتھ تھی۔ خدیجہ نے گھوم کے دیکھا۔ بلب کا بٹن

قریب تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن آف کر دیا۔ اسے اس قدر پیچھے جھکنا پڑا کہ پیٹھ کے بل چارپائی پر گر پڑی۔ کمرہ تاریک ہو گیا۔ خدیجہ نے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔ اس نے کرمے کو کمر سے پکڑا اور اپنے اوپر گرا لیا۔

کرما ایک بار پھر تڑپا مگر وہ جس بگولے کی لپیٹ میں آ گیا تھا وہ بہت ہی تند تھا۔ اس تندی میں جوانی کی تشنگی تھی۔ جذبات کے شعلے تھے، شراب کی مدہوشی تھی۔ کرما بگولے کی لپیٹ سے بھاگ نہ سکا۔ وہ ہار گیا۔ خدیجہ جیت گئی۔

دوسرے دن، دوپہر کے ذرا بعد خدیجہ کی آنکھ کھلی۔ اس کا خاوند اس کے پہلو میں بے ہوش سو رہا تھا۔ خدیجہ نے اسے ہاتھ لگایا تو یوں ہاتھ کھینچ لیا جیسے لاش کو چھو لیا ہو۔ خاوند نے لمبی سانس لی اور کروٹ بدل لی۔ خدیجہ کے ذہن میں رات کی واردات نکھرنے لگی۔ کرمے کا خیال آتے ہی اس نے جذبات سے بھرپور انگڑائی لی اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جس میں تشنگی نہیں تھی، مسرت اور اطمینان تھا۔

وہ بستر سے نکلی اور طنز آلود نگاہوں سے خاوند کو دیکھا۔ وہ شاہانہ چال چلتی کمرے سے نکلی تو ملازمہ نے اس کا زیرلب تبسم پامال کر ڈالا۔ ملازمہ نے کہا۔۔۔ ''کرما بوریا بستر سمیٹ کر چلا گیا ہے وہ واپس نہیں آئے گا بیگم صاحب! بھینس کو کون سنبھالے گا؟''

خدیجہ پھر سونے کے کمرے میں چلی گئی اور یوں خاوند کی پائنتی بیٹھ گئی جیسے جواری جیتی ہوئی بازی ہار گیا ہو۔

⌘ ⌘ ⌘

کفارہ

حمیدی

رات گزرتی جارہی ہے۔
جیل کے گھڑیال نے میری عمر کی ایک اور ساعت کم کردی ہے۔
موت گھڑیال کی تال پر بڑھی چلی آرہی ہے۔
وارڈر کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ وہ قدم گھسیٹتا چلا آرہا ہے خدا کرے وہ گذر جائے، میری کوٹھڑی کے سامنے نہ رکے وہ رکے گا ضرور، مجھے گھورے گا ضرور، ملول سا ہو کے مسکرائے گا ضرور اور......
اوہ! وہ آگیا ہے، رک ہی گیا ہے، اس نے میری کوٹھڑی کی سلاخوں کا سہارا لے لیا ہے۔
میرے تصورات کا تانا بانا الجھ گیا ہے۔
''کہو دوست! کیا حال ہے؟''
''ٹھیک ہوں جمعدار!''
''ساتھ والی کوٹھڑی خالی ہوگئی ہے''۔
''ہاں جمعدار! وہ آج صبح پھانسی چڑھ گیا ہے''۔
''اور تم؟...... پرسوں؟''
''ہاں جمعدار! میں پرسوں پھانسی چڑھ رہا ہوں''۔
''خدا کو یاد کرو، درود شریف پڑھو۔ اللہ گناہ معاف کرے گا''۔
''ہاں جمعدار!''
''تمہارا نام آفتاب علی ہے نا؟''

''ہاں جمعدار!''

''سو جاؤ آفتاب علی! رات آدھی گذر گئی ہے۔ سو جاؤ، حوصلہ کرو''۔

''ہاں جمعدار!''

وہ چلا گیا ہے ہر نصف گھنٹہ بعد ملول سا ہو کے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں اسے کوئی ملال نہیں۔ میرے مر جانے کا اسے ذرہ بھر دکھ نہیں۔ وہ بارہ برس سے پھانسی کے قیدیوں پر پہرہ دے رہا ہے۔ ان کوٹھریوں میں سینکڑوں انسان آئے اور اس کے سامنے ان سب کی لاشیں نکل گئیں۔ وہ تو صرف دیکھنے آتا ہے کہ میں نے خودکشی تو نہیں کر لی! میں پھانسی چڑھ جانے سے پہلے ہی تو مر جانے کی کوشش نہیں کر رہا! یہ وارڈ جس کے مقفل پھاٹک پر لکھا ہے ''سزائے موت کے قیدی'' (CONDEMNED PRISONERS) موت کی دہلیز ہے جہاں ہمیں بٹھا دیا گیا ہے اور باری باری بلایا جا رہا ہے۔ پرسوں میری باری ہے۔

وارڈر کے پاؤں کی آہٹ زنداں کے مقید سکوت میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ آہٹ نصف گھنٹہ بعد اسی اندھیارے سکوت سے پھر اُبھرے گی۔ وارڈر کے قدم خاکی وردی میں لپٹے ہوئے ناگوار سے بوجھ کو گھسیٹتے میری کوٹھڑی کے سامنے پھر رکیں گے۔ وہ ایک بار پھر پوچھے گا۔ ''تم...... پرسوں؟''

وارڈر کے مریل سے چہرے کی پیلاہٹ کو دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے مر جانے کا رنج نہیں جتنا اس وارڈر کے جینے کا دکھ ہے۔ اس بے چارے کا جینا بھی کوئی جینا ہے؟ کبھی کبھی ہم پھانسی چڑھنے والوں کو یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے جیسے ہم سے پہلے پھانسی چڑھ جانا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی دکھ بھری داستان سنایا کرتا ہے جسے سن کر ان انسانوں کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے جنہوں نے ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو وردی میں لپیٹ لیا ہے ورنہ فٹ پاتھ پر پڑا ٹھٹھر رہا ہوتا یا اسی جیل میں جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ سزائے قید بھگت رہا ہوتا۔

اس روز میری کوٹھڑی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بہت خوش تھا۔ اس کے علیل چہرے پر رونق سی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جمعدار؟ خوش ہو آج تو!''

کیکر کی خشک چھال کی طرح پھٹے پھٹے ہونٹوں کو مسکراہٹ کا فریب دیتے ہوئے

بولا۔ ''ایک ناشپاتی ہے آفتاب علی!''

''کہاں سے ملی ناشپاتی جمعدار؟''

بولا۔ ''نو نمبر کوٹھڑی والے کے ملاقاتی آئے تھے۔ اسے ناشپاتیاں دے گئے ہیں۔ دو میں نے لے لیں۔ ایک کھا لی ہے ایک بچوں کے لیے لے جا رہا ہوں''۔ اس کی باچھیں اور زیادہ کھل گئیں۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے جمعدار؟''

اور اس کی باچھیں سکڑ کر ان ہونٹوں میں گم ہو گئیں جن کی ہیئت کیکر کی چھال سے کسی صورت بہتر نہیں۔ ان ہونٹوں سے جلتی ہوئی آہ یوں نکل گئی۔ جیسے کوئی پنچھی گھونسلے سے اُڑ گیا ہو۔ زیر لب بولا۔ ''سات ہیں'' اور اس کی آنکھیں جو ناشپاتی کے تصور سے چمک رہی تھیں یوں بجھ گئیں۔ جیسے کسی نے آندھی میں دیا جلایا تھا۔

لیکن میں اس دنیا سے دور، بہت دور، چلا آیا ہوں۔ اتنی دور چلے آنے کا مجھے ذرہ بھر رنج نہیں، کون رہنا چاہے گا اس دنیا میں جہاں سات بچے ایک ناشپاتی کے انتظار میں بلک رہے ہوں۔ جہاں عورت سات بچے جن کر گلی سڑی ناشپاتی کی طرح باورچی خانے کے کونے میں پھینک دی گئی ہو۔ جہاں عورت کے پیٹ نے بچے اگلے ہوں اور روٹی کے چند نوالے نگلنے نصیب نہ ہوتے ہوں۔

بہت دور نکل آیا ہوں۔ آہنی سلاخوں، دروازوں اور تالوں سے بھی دور...... وارڈر کے قدموں کی آہٹ اب یوں سنائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی بھولا بھٹکا تھکا ماندہ راہ رو، دور افق کی لکیر پر...... وقت و زمانہ کے اُس پار...... سر جھکائے چلا جا رہا ہو...... ایک دھبہ سا، رینگتا ہوا دھندلا دھندلا بجھا بجھا سا دھبہ۔

آج کی رات میری زندگی کی حسین ترین رات ہے۔ کوٹھڑی کی تنہائی مسکرا رہی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہے۔ ''آؤ آفتاب چلیں''۔ میں کہتا ہوں اس اندھیری رات میں؟ ذرا ٹھہرو۔ چلتا ہوں اس شب کی تیرگی سے وہ لمحات تو چن لینے دو جو راہِ حیات پہ بکھیرتا آیا ہوں۔ یہی تو میری متاع ہیں۔ ان بکھرے موتیوں کو پرو تو لینے دو۔

جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

سنو ذرا! کان لگا کے سنو اے میری تنہائی! تم بھی سنو۔ اندھیرے سکوت سے کسی کی آہٹ ابھر رہی ہے...... اس مقید ماحول کی آوازیں اپنے ہی ماضی کی آوازیں معلوم ہوتی ہیں...... کس قدر قریب، اس قدر دوری میں کس قدر قربت ہے، اتنی دور کی آواز کتنی قریب آ رہی ہے۔

یہ تو عذرا کے قدموں کی آواز ہے...... ہاں! عذرا ہی تو ہے۔ مگر اس قدر تیز؟ وہ شاید بھاگی چلی آ رہی ہے...... عذرا آ ہی گئی ہے، گھبرائی گھبرائی سی ہے۔

''کیوں عذرا! کیا بات ہے؟''

''حامد قتل ہو گیا ہے!''

''حامد؟''

''ہاں حامد! ناصر کا کلاس فیلو۔ پولیس ناصر کو پکڑ کر لے گئی ہے...... کچھ کرو...... ناصر کو چھڑا لاؤ...... اٹھو آفتاب! خدا کے لیے......''

آوازیں...... آہٹیں...... آوازیں...... میری پا بجولاں زندگی آوازوں اور آہٹوں کا لامتناہی سلسلہ بن گئی ہے۔ ماضی میرے ساتھ قید ہو گیا ہے۔ میں پرسوں مر جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرے ماضی کا بھی گلا گھونٹ دیا جائے گا اور میری ذات، میرا نام، ماضی کی ایک سنسنی خیز داستان بن جائے گا۔ لوگ اس میں اضافے کریں گے۔ اسے رومان انگیز بنائیں گے اور میں پُراسرار کہانی بن کر لوگوں کے دلوں میں اور ہوٹل کے اس کمرے میں ہمیشہ زندہ رہوں گا جس میں حامد قتل ہو گیا ہے۔

کوٹھڑی محدود ہے، بہت تنگ۔

ماضی لامحدود ہے، بہت وسیع۔

جیل کا گھڑیال پھر بج رہا ہے...... صبح کے چار بج گئے ہیں...... موت کس طرح، کس تمکنت سے میری طرف بڑھی آ رہی ہے...... آخری دن، زندگی کا آخری روز...... کل اس وقت، ٹھیک اسی وقت، جب میری زندگی کی آخری رات آخری سحر کو جنم دے رہی ہو گی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ کھل جائے گا اور مجھے لے جائیں گے جہاں سے میں لوٹ کے نہ آ سکوں گا۔

آہ سکون! کس قدر راحت ہو گی جان دے کر...... پر سوچتا ہوں، مر کے بھی چین نہ

پایا تو کدھر جائیں گے؟

پو پھٹ رہی ہے۔

پھانسی کی کوٹھڑیوں سے تلاوتِ قرآن کی آوازیں، اٹھنے لگی ہیں۔ یہاں آ کے قیدی تلاوتِ قرآن کرتے ہیں سجدوں پہ سجدے کرتے ہیں، بعض رات رات بھر ایک ٹانگ پہ کھڑے رہتے ہیں اور زندگی کے آخری چند روز تسبیح کے دانوں پہ لمحے گن گن کے گذار دیتے ہیں۔

ان کی تلاوت، ان کی عبادت اور ان کے رکوع وسجود میں عبادت اور توبہ کم اور فرار زیادہ ہوتا ہے...... اپنے آپ سے فرار، زندگی کے آخری گناہ سے فرار، بپھرے ہوئے ضمیر سے فرار، مقتول کے ہیبت ناک تصور اور پھانسی کے تختے سے فرار......

پھانسی کی کوٹھڑی میں پہلی رات قیدی کی زندگی کی طویل ترین اور تلخ ترین رات ہوتی ہے۔ بے بسی، تنہائی، قتل جیسے بھیانک جرم کا احساس اور ان سب پر محیط موت جو بڑی ہی زور زور سے دروازے پر دستک دے رہی ہوتی ہے۔ ذہن میں پھانسی کا تختہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ تنہائی طعنے دیتی ہے، ضمیر ننگا ناچنے لگتا ہے۔ شکست منہ چڑاتی ہے۔ قیدی کوٹھڑی کے کونوں کھدروں میں چھپتا ہے مگر چھپنے کی جگہ ملتی نہیں۔ کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی۔ ہوا کی سرسراہٹ ہو یا وارڈر کی آہٹِ پا، قیدی کو ہر آواز موت کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہر لمحہ موت سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے، مر مر کے جیتا ہے، جی جی کے مرتا ہے۔

تنگ سی کوٹھڑی میں اسے ہر سُو سسکیاں سنائی دیتی ہیں جیسے کوئی دکھیاری بیوہ گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی ہو۔

آخر قیدی یادوں کے سہارے، تصوروں کی اوٹ میں چھپتا چھپاتا بھاگ اٹھتا ہے اور اس دنیا میں جا پہنچتا ہے جہاں کوٹھڑی ہے نہ پھانسی کا تختہ۔ جہاں وہ ذرا جتنا بچہ تھا اور ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔

اسے باتیں یاد آتی ہیں...... کچھ بھولی بسری، کچھ کئی بار سنی ہوئی، قتل سے پہلے کی کہانیاں، اس سے پہلے کے قصے، اس سے بھی پہلے کی باتیں، بھولی بھالی معصوم سی وارداتیں...... اور وہ کہکشاں پر ٹہلتا ستاروں کے دیس سے بھی آگے نکل جاتا ہے مگر وارڈر کی وِسل کی سخت تیکھی آواز یا چابیوں کے گچھے کی جھنجھناہٹ یا کوٹھڑی کے پچھواڑے سے

گزرتے ہوئے قیدیوں کی بیڑیوں کی جھنکار اسے یوں کال کوٹھڑی میں واپس لے آتی ہے جس طرح چیل مرغی کے بچے کو پنجوں میں دبوچ اپنے گھونسلے میں لا پھینکتی ہے۔ پھر وہی سسکیاں، پھر سرگوشیاں، ضمیر کا پھر وہی ننگا رقص۔ قیدی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور یوں اپنی گردن پر ہاتھ رکھ لیتا ہے جیسے سوتے میں پھانسی کا رسہ لپیٹ دیا گیا ہے۔

ہول طاری ہونے لگتا ہے۔ موت کا خوف اعصاب کو دبوچ لیتا ہے۔ ایسے میں قیدی کے سینے کی گھٹن، موت کا خوف اور شکست خوردگی اس کے سینے سے مہیب دھماکہ بن کر نکلتی ہے...... ''حق اللہ ہو'' ...... درو دیوار لرز جاتے ہیں پھر ایک اور دھماکہ...... ''الا اللہ ہو'' ...... سسکیاں دب جاتی ہیں۔ پھر ایک اور دھماکہ...... ''یا علی مدد''۔ دیواریں پیچھے ہٹ جاتی ہیں چھت اونچی ہو جاتی ہے۔ موت کسی کونے میں دبک جاتی ہے۔

قیدی کو دم بھر کے لیے سکون سا محسوس ہوتا ہے اور وہ بڑے اطمینان سے جاگتا ہے ادھورے خواب کو وہاں سے دیکھنے لگ جاتا ہے جہاں اس کی آنکھ کھل گئی تھی......

ہم پھانسی کے قیدی یادوں کے لرزتے تاروں سے لٹکتے رہتے ہیں۔ درختوں کی شاخوں کے ساتھ الٹے لٹکے ہوئے چمگادڑوں کی طرح یہی صورت ہمارے لیے آرام دہ ہوتی ہے۔

میری کوٹھڑی میں تسبیح لٹک رہی ہے...... وہ سامنے دیوار کے ساتھ...... یہ مجھ سے پہلے کے قیدیوں کی یادگار ہے۔ اس روز وارڈر نے کہا تھا___ ''آفتاب علی! وہ تسبیح لے لو اور اللہ اللہ کرو''___ لیکن میرے سامنے تو گذرے ہوئے شب و روز کے لمحات کی مالا ہے جو جپ رہا ہوں۔ اس مالا کے دانے ایک دوسرے کے پیچھے بے معلوم سی ٹک ٹک کرتے گرتے جا رہے ہیں۔ گاہے بکھر جاتے ہیں۔ میں چن لیتا ہوں پھر لڑی میں پرو لیتا ہوں۔

میرے ساتھ والی کوٹھڑی خالی ہو گئی ہے۔ ادھر والی آٹھ روز بعد خالی ہو جائے گی۔ جواں سال آدمی ہے، کہتا ہے___ ''عزت کی خاطر قتل کیا تھا''___ عام سی کہانی سناتا ہے۔ یوں تو ہر کہانی عام سی ہی ہوتی ہے لیکن پھانسی کی کوٹھڑی میں آ کر یہ کہانی جرم و جاسوسی کی پُراسرار اور سنسنی خیز داستان بن جاتی ہے۔

مجھ سے بھی پوچھتے ہیں___ ''تم نے کیوں قتل کیا تھا؟''___ میں کہتا ہوں___ ''عزت کی خاطر''___ پوچھتے ہیں___ ''کس کی عزت کی خاطر؟''___ میں کہتا ہوں___

''اس لڑکی کی عزت کی خاطر جو مجھے چاہتی تھی اور اس آدمی کی عزت کی خاطر جو اسے چاہتا تھا''___ حیران ہو کے پوچھتے ہیں___ ''پھر تم نے قتل کسے کیا؟''___ میں کہتا ہوں___ ''جسے کوئی بھی نہ چاہتا تھا''۔

کوٹھڑی کی سلاخوں سے جھانک رہا ہوں۔ جیل کی بتیاں بجھ گئی ہیں۔ سحر کھلنے لگی ہے لیکن اس سحر میں وہ نکھار نہیں نہ وہ حسن ہے جو پتھروں کی ان اونچی دیواروں کے اس طرف ہوا کرتا ہے۔ زنداں کی سحر تو رنجیدہ اور دکھیاری سی ہوتی ہے...... شب کی تیرگی کی ڈسی ہوئی سحر...... میری زندگی کی آخری سحر۔ کل کی سحر کو تو میں نہ دیکھ سکوں گا۔ طلوع ہو رہی ہو گی تو میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی جائے گی۔

میری کوٹھڑی کے سامنے نیم کا گھنا پیڑ ہے۔ صبح کا اجالا اس کے پتوں میں سے چھن چھن کے آ رہا ہے۔ گھنی ڈالیاں جھوم رہی ہیں۔ اس درخت نے میرا ساتھ خوب نبھایا ہے اس کے لرزتے پتوں نے مجھے اَن گنت کہانیاں سنائی ہیں اور میں نے اس کی ہریالی سے بہت سی باتیں کی ہیں۔ سوچتا ہوں یہ نیم کا پیڑ نہ ہوتا تو میں تن تنہا رہ جاتا۔ کون سنتا میری، کون سناتا مجھے!

''آفتاب!...... آفتاب!''

کون؟ کس نے جھنجوڑا مجھے؟

گھوم کے دیکھتا ہوں...... کوئی نہیں۔ میں کوٹھڑی میں اکیلا ہوں۔

عذرا کی آواز تھی یہ تو!

آوازیں...... آوازیں...... کچھ گردوپیش کی کچھ اپنے سینے کی۔ کیسی دنیا میں آ پہنچا ہوں میں؟ جانی پہچانی مانوس آوازیں اجنبی لگتی ہیں۔ گاہے وارڈر سے باتیں کرتا ہوں تو اپنی بھی آواز اجنبی معلوم ہوتی ہے۔

بعض آوازیں بڑی ہی دور سے آتی ہیں اور میری کوٹھڑی میں شہد کی مکھیوں کی طرح اُڑنے لگتی ہیں...... غول در غول...... ان میں زہر ہے...... ان میں شہد بھی ہے...... مجھے ڈستی تو نہیں...... جب مل کے اُڑتی ہیں تو ترنم کی لہروں کا گمان ہوتا ہے جیسے کوئی دل جلا تانپورے کے تاروں پر آہستہ آہستہ انگلی چلا رہا ہو۔

میں اس گونجدار ترنم میں کھو جاتا ہوں...... ڈوب جاتا ہوں...... پھر ابھر آتا

ہوں...... جب ابھرتا ہوں تو میں پھانسی کی کوٹھڑی میں نہیں ہوتا۔ بہت دور پہنچ چکا ہوتا ہوں، کہکشاں کے رستے ستاروں کے دیس سے بھی آگے!

''آفتاب علی نمبر تین سو گیارہ!......تم ہو؟''

او خدا! ان لوگوں نے میرے تصوروں کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ تانپورے کے تار توڑ ڈالے ہیں۔

''وزن کرالو...... دودھ ملا تھا؟...... کھانے کے متعلق کوئی شکایت؟...... کوئی تکلیف؟...... تم کل پھانسی چڑھ رہے ہو نا؟...... ہسٹری ٹکٹ...... نوٹ کرلو ڈسپنسر! رات دس بجے ڈاکٹری معائنہ ہوگا''۔

ڈاکٹر تھا۔ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی اور میرے جواب سنے بغیر چلا گیا ہے۔ جیل کے عملہ کے دلوں میں جذبات تو ہوتے نہیں سرکاری پن ہوتا ہے۔ مجرموں کو انسانیت کا سبق سکھانے والے جذبات انسانی سے محروم ہوتے ہیں۔

اب جیلر آئے گا اور از بر کیے ہوئے سوال پوچھے گا___ ''دودھ ملا تھا؟ کھانا ملا تھا؟ کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟ پھانسی کب ہے؟ تاریخ آگئی ہے؟''___ پیشتر اس کے کہ میں جواب دوں وہ اگلی کوٹھڑی کے قیدی سے یہی سوال پوچھ رہا ہوگا۔

جی میں آتی ہے ان سلاخوں کے ساتھ ایک تختی لٹکا دوں اور اس پر لکھ دوں___

''مجھے دودھ ملا تھا، کھانا ملا تھا، کوئی شکایت نہیں، کوئی تکلیف نہیں، کل پھانسی چڑھ رہا ہوں، آج کا دن سکون سے جی لینے دو، آج کا دن مجھے دے دو''۔

''السلام علیکم دوست!''

''آؤ جمعدار! وعلیکم السلام!''

''کل تمہاری باری ہے!......نماز پڑھ لی؟''

''نہیں جمعدار!''

''کیوں؟''

''کیونکہ کل میری پھانسی ہے''۔

''کل خدا کے حضور جا رہے ہو گناہوں کی معافی کیوں نہیں مانگتے تم؟''

''کیوں کہ کل خدا کے حضور جا رہا ہوں''۔

کیا سوچ رہا تھا میں؟......شاید کچھ بھی نہیں مگر ذہن میرا خالی تو نہ تھا۔

ایک آنکھ والے دیو نے سمندر میں چٹان پھینکی تھی تو یولیسیس کا جہاز بہت دور نکل گیا تھا، بال بال بچ گیا تھا مگر جیل کے دو آنکھوں والے بھوت جو بھی چٹان پھینکتے ہیں میری کشتی کے قریب آ گرتی ہے۔ کشتی کو بڑی مشکل سے سنبھالتا ہوں۔ ہر لمحہ ڈوبنے کا گماں ہوتا ہے۔ کوٹھڑی تنگ تر اور تاریک تر ہو جاتی ہے۔ دیواریں قریب آنے لگتی ہیں۔ چھت جھک آتی ہے۔ ہول طاری ہو جاتا ہے۔ جیسے میرے اوپر مقبرہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔

اس وارڈ میں جسے بھی لایا جاتا ہے اس پر مقبرہ تعمیر ہو جاتا ہے لیکن یہ درگور انسان زندہ رہتے ہیں اور قبر کے گھپ اندھیرے میں آس کا دیا جلائے رکھتے ہیں۔ اگر ان کوٹھڑیوں کے قیدیوں کے سینوں سے آس امید اور ذہن سے ماضی کے حسین فریب نوچ لیے جائیں تو وہ ایک لمحہ بھی جی نہ سکیں...... پھانسی چڑھنے سے پہلے ہی دم گھٹ کے مر جائیں۔

آہ امید! جیسے نیم کے پیڑ تلے سوچ میں بیٹھی ہے سر جھکائے ہوئے!

خدا جنت نصیب کرے اس پھانسی چڑھنے والے کو جو صدیاں گذریں چند روایات تخلیق کر گیا ہے۔ یہ روایات پھانسی کے تختے پاؤں سے نکل جانے تک انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔

میں پہلے روز سزائے موت لے کر اس وارڈ میں لایا گیا تو پرانے قیدیوں نے ہی نہیں یہاں کے در و دیوار نے بھی اس قسم کے معجزے سنائے......

''ایک آدمی کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا جا چکا تھا۔ پھندا گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ پھانسی چڑھانے والا تختہ ہٹانے ہی لگا تھا کہ گورنر کا ایلچی ہاتھ میں اس کا معافی نامہ اٹھائے بھاگا ہوا آیا اور پھانسی چڑھنے والے کے رشتہ دار جو اس کی لاش کے انتظار میں جیل کے باہر بیٹھے تھے اسے زندہ و سلامت گھر لے گئے''۔

ایک اور روایت اس سے بھی زیادہ جانفزا ہے......

''ایک آدمی کو پھانسی کی سزا ہو گئی۔ تمام اپیلیں نامنظور ہو گئیں۔ اس کی بہن سائیں کا داں والے کے پاس گئی، روئی اور فریاد کی لیکن

سائیں جی نے اسے گالیاں دے کر واپس کر دیا۔ اسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا گیا اور جب تختے کھینچنے لگے تو اس نے کہا۔۔۔ ''یا کاواں والے سائیں کر مدد'' ۔۔۔ تختے ہٹ گئے لیکن وہ آدمی ہوا میں ہی کھڑا رہا۔ تختے بند کئے گئے۔ پھندا اور تنگ کیا گیا۔ تختے پھر جو ہٹنے لگے تو اس آدمی نے پھر نعرہ لگایا۔ ''یا کاواں والے سائیں! کر مدد'' ۔۔۔ وہ پھر ہوا میں ہی لٹکا رہا۔

وہاں مجسٹریٹ موجود تھا جو اتفاق سے سائیں کاواں والے کا مرید تھا اس نے اپنے سائیں کا نام قیدی کے منہ سے سنا اور دیکھا کہ اسے پھانسی ہو ہی نہیں رہی تو اس نے حکم دیا کہ اسے تو کوئی طاقت پھانسی دے ہی نہیں سکتی۔ اس نے جس مرشد کا نام لیا ہے وہ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتا ہے......

قیدی کو چھوڑ دیا گیا اور...... ''وہ آدمی ابھی تک زندہ ہے عمر سو برس سے زیادہ ہو گئی ہے''۔

ان روایات اور معجزوں پر سائیں کاواں والے کے علاوہ کئی اور پیروں اور مرشدوں کے لیبل لگے ہوئے ہیں اور قیدی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فراموش کر کے انہی پیروں مرشدوں کے وردوظیفوں میں سر پٹختے رہتے ہیں۔

ہر ہفتے، ہر روز لوگ پھانسی کے کنوئیں میں مر رہے ہیں لیکن پھانسی کی کوٹھڑیوں میں یہ معجزے اور روایات زندہ رہتی ہیں۔ ان کوٹھڑیوں کے قیدی جگر کا خون دے دے کر ان روایات کو زندہ رکھتے ہیں۔ یہ وہی روایتی تنکے ہیں جو ڈوبتوں کو سہارا دیتے ہیں۔

ان مرنے والوں کے رشتہ دار پیروں، مرشدوں، ملاؤں کو منہ مانگی قیمت دے کر تعویذ لاتے ہیں اور ان کی کوٹھڑیوں کے دروازوں کے ساتھ باندھ جاتے ہیں۔ تعویذ آہنی سلاخوں کے ساتھ لٹکتے رہتے ہیں اور ایک غیبی ہاتھ دروازے سے لپک کر کوٹھڑی کے مکین کو پھانسی کے کوئیں میں لٹکا آتا ہے۔

آہ پیر و ملا کا فریب...... کس قدر ناکام مگر کس قدر حسین!

پیر کے بجلی کے چراغوں کو روشن رکھنے کی خاطر نہ جانے کتنے دیئے بجھ جاتے ہیں،

کتنی عصمتوں کے ستارے ٹوٹ جاتے ہیں۔

مجھ سے بھی پوچھتے ہیں تمہارا پیر کون ہے؟ مجھے ہنسی آ جاتی ہے اور پوچھنے والوں کو غصہ آ جاتا ہے۔

وارڈر پھر آ رہا ہے۔ پہلے نصف گھنٹہ بعد آتا تھا آج ذرا ذرا سی دیر بعد آتا ہے۔

''کہو دوست کوئی ملنے نہیں آیا؟''

''آئیں گے جمعدار!''

''کون آئیں گے؟''

''جو ملنا چاہیں گے!''

میرے خیالوں کا تسلسل چکنا چور کر کے وارڈر آگے چلا گیا ہے۔ یہ روح افزا تسلسل جب ٹوٹ جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میں سیلابی موجوں میں مشکیزے پر تیر رہا تھا کہ کسی نے اس میں سوراخ کر دیا ہے۔ سیلابی موجیں مجھے دبوچ لیتی ہیں۔ میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں، ابھر آنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہوں، سوچتا ہوں اب تو کوئی قوت مجھے ڈوبنے سے بچا نہ سکے گی لیکن ایک حسین ہاتھ مجھے یوں باہر کھینچ لیتا ہے جیسے کسی نے دھیرے دھیرے ضمیر میں چھپا ہوا کانٹا نکال دیا ہو۔

میں کانٹا ہی تو ہوں...... دھرتی کے ضمیر میں چھپا ہوا کانٹا۔ جس کی خلش سے کل صبح یہ دھرتی آزاد ہو جائے گی۔

عذرا کا پہلا لمس...... وہ ایک لمحہ تھا۔

عذرا کا آخری بوسہ...... وہ ایک لمحہ تھا۔

اور یہ دو لمحات یوں نظر آتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے دو ستارے، ایک اُس پار، ایک اس پار، دونوں کے درمیان ایک لغزش نے آسمان جتنا وسیع خلا حائل کر دیا ہے......

آزادی اور اسیری میں ایک لغزش ہی کا تو فاصلہ ہوتا ہے جو کسی بھی وقت پھلانگا جا سکتا ہے۔

میں نے پھلانگ لیا یہ فاصلہ!

محبت کی کوکھ سے ایک لغزش نے جنم لیا۔

آہ! میری زندگی کا آخری روز...... کس تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔

آہ! میری موت...... کس تیزی سے بڑھی آ رہی ہے۔

آج عذرا آخری بار ملنے آئے گی۔ ناصر بھی ساتھ ہوگا۔ عذرا آج تو نہیں کہے گی۔

''آفتاب! کہہ دو مجھے تم سے محبت ہے۔ میری ذات سے یہ بوجھ اتار دو آفتاب!'' وہ آج یوں نہیں کہے گی۔ اس نے کئی بار یوں کہاں ہے اور میں نے ہر بار جواب دیا ہے۔ ''نہیں عذرا! تم مجھے اچھی لگتی ہو''۔

ناصر شاید آج مجھے ان نظروں سے نہ دیکھے جن سے وہ دیکھتا رہا ہے۔ ترس آتا ہے مجھے ناصر پر۔ وہ تو جیسے دو حصوں میں کٹ گیا تھا۔ اس نے کئی بار کہا تھا___ ''آفتاب! تم میرے اور عذرا کے درمیان آ گئے ہو''___ اور میں نے ہر بار، ان کی راہ سے ہٹ جانے کی کوشش کی تھی لیکن دونوں نے مجھے ہر بار گھسیٹ کر اپنے درمیان کھڑا کر لیا۔

اب میں کس کی راہ میں کھڑا ہو سکوں گا؟ اب کون مجھے اپنے درمیان کھڑا کر سکے گا؟

آج میں ان کے سینوں سے بوجھ اتار دوں گا۔ آج ناصر کے ٹوٹے ہوئے دل کے دونوں ٹکڑے جوڑ دوں گا۔ آج کے دن جو میری زندگی کا آخری دن ہے چاہتا ہوں کہ اپنے بوجھ بھی اتار پھینکوں اور ناصر اور عذرا کو بھی ایک ناگوار بوجھ سے آزاد کر دوں۔ آج عذرا کو ساری بات بتا دوں گا۔

اگر یہ بات پہلے ہی روز بتا دیتا تو آج کا روز میرا آخری روز نہ ہوتا۔

آج شاید عذرا دلہن بن کے آئے۔ میں قید ہوا تو اس کی شادی ہو گئی تھی...... ناصر کے ساتھ...... دونوں مجھے پہلی بار جیل میں ملنے آئے تو عذرا نے سیاہ قمیض پہن رکھی تھی۔ کانوں میں ہلکے سے رنگ بھی نہ تھے۔ انگلی میں انگوٹھی بھی نہ تھی۔ پیشانی کے تراشیدہ بال بھی اس نے چھپا رکھے تھے۔ سراپا ماتم بنی مجھے ملنے آئی تھی۔ میں تو اس کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کو تڑپ رہا ہوں۔

ایک روز ملنے آئے تو میں نے ناصر سے کہا تھا___ ''آخری روز ملنے آؤ گے تو عذرا کو دلہن بنا کر لانا، اسی جوڑے میں جو اس نے پہلے روز پہنا تھا''___ عذرا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی۔ ناصر کے بھی آنسو نکل آئے تھے۔

ناہید مرگئی ہے۔ اگر زندہ ہوتی تو کل مرجاتی۔ پھانسی تو میں اور کسی کے قتل پہ چڑھ رہا ہوں لیکن کون جانے میں قاتل ناہید کا ہوں۔ اس کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ ناہید کا

خیال آتا ہے تو دل مسرور ہو جاتا ہے۔ کل اس کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوگی، لیکن گلہ ضرور کرے گی___ ''عذرا کو اکیلا چھوڑ آئے؟''___ کل رات نیم کے پیڑ میں بڑی زور سے سرسراہٹ ہوئی۔ شاید فاختہ کے گھونسلے پہ گلہری نے حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس سرسراہٹ میں ناہید کی سسکیاں اور ہچکیاں سنیں۔ دیکھا وہ نیم کی ہریالی کی اوٹ سے مجھے جھانک رہی تھی۔ اس کے سانولے سلونے چہرے پہ وہی زیر لب تبسم تھا جو اس کے حسن کا لازمی جزو تھا لیکن تبسم ملول تھا۔ واہمہ تھا لیکن اس قدر نکھرا ہوا جیسے میں اسے چھو سکوں گا، محسوس کر سکوں گا۔

پھانسی کی کوٹھڑی میں آ کر ہر واہمہ ہر تصور اور ہر خیال اس قدر ٹھوس ہو جاتا ہے کہ چھوا بھی جا سکتا ہے محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔

آوازیں...... آہٹیں...... آوازیں...... آہٹیں...... پھر ابھرنے لگی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کا سرگم گونجنے لگا ہے...... لمحات کا کارواں پلٹ چلا ہے...... میں اسے روک لینا چاہتا ہوں مگر رکتا نہیں۔

ٹن ٹن...... ٹن ٹن...... ٹن ٹن...... ٹن ٹن...... ٹن۔

جیل کے گھڑیال نے نو بجا دیئے ہیں۔ گھڑیال کی سنگت میں وارڈروں کی وسلیں بج رہی ہیں لیکن آج ان کی ہولناکی ختم ہو گئی ہے۔

ایک وہ دن کہ میں جیل کے گھڑیال اور وسلوں کی کرخت چیخوں سے لرز اٹھتا تھا اور آج کا دن کہ میں ان میں موسیقیت محسوس کر رہا ہوں۔

آہ! انسان کی بے بسی، لاچارگی، شکست خوردگی، خود فریبی...... موت سے بھی سمجھوتہ کر لیتا ہے اور کہتا ہے میں نڈر ہوں موت سے بھی میں نہیں ڈرتا، لیکن وہ اپنے سینے میں بیٹھے ہوئے اس انسان کو چھپا نہیں سکتا جو موت کے خوف سے لرز رہا ہوتا ہے۔ جو اس قدر جلدی مرجانا نہیں چاہتا یا کم از کم پھانسی نہیں چڑھنا چاہتا۔ یہ پس پردہ انسان سسکیاں لیتا ہے۔ ہچکیاں لے لے کر روتا ہے۔ پھانسی کی کوٹھڑیوں سے جو ''حق اللہ ہو''۔ الا اللہ ہو''___ اور ''یا علی مدد'' کے دھاکہ نما نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں وہ انہی سسکیوں، ہچکیوں اور خوف کے لرزے کو دبانے کی لاشعوری کوششیں ہوتی ہیں۔

کیا میں نے بھی موت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ کیا میں بھی موت سے بھاگ

رہا ہوں؟ معلوم نہیں! آج تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں میں نے کیا کرلیا ہے؟ صرف اسی قدر احساس باقی ہے (اور کس قدر تسکین آمیز ہے یہ احساس) کہ گردوپیش کی ہولنا کی جیسے مسکرا رہی ہے۔

کوٹھڑی کے پچھواڑے قیدیوں کی ایک ٹولی کوئی گیت گنگناتی جارہی ہے۔ ان کے پاؤں سے بندھی بیڑیاں جل ترنگ کی طرح بج رہی ہیں جیسے کہکشاں پہ گذرتے فرشتے آسمانی راگ الاپ رہے ہوں...... تھکے تھکے سے قدم، اداس اداس سی لَے...... مگرکس قدر پُرسوز۔ روحیں بھی انگڑائیاں لے کے اٹھ بیٹھی ہیں...... ان انسانوں کی روحیں جو پھانسی کی کوٹھڑیوں میں چندروز رہ کر پھانسی کے کنوئیں میں لٹک گئے ہیں۔

آج کے روز، جو میری ابتلا کا آخری روز ہے، قیدیوں کا گیت، اس کی سنگت میں ان کی بیڑیوں کی جھنکار، ادھر گھڑیال کی ٹن ٹن، ٹن ٹن، اس کے ساتھ وارڈروں کی وسلیں...... قدرت نے جیسے انہیں ایک راگ میں منظّم کردیا ہے...... پابہ زنجیر انسانوں کا آزاد راگ...... یوں لگتا ہے جیسے لمحات کا تھکا تھکا سا قافلہ ماضی کے ریگ زاروں اور نخلستانوں میں حدی گاتا جارہا ہے۔

قافلہ رک گیا ہے۔

اس مقام پہ آکے رک گیا ہے جہاں میں نے ایسا ہی ایک راگ سنا تھا۔

آہ! وہ رات...... زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے ایسی رات!

وہ رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ یوں تو ہرسُو خاموشی تھی لیکن اس خاموشی میں چند آوازیں تیر رہی تھیں...... ریلوے سٹیشن پر شنٹ کرتے ہوئے انجن کی وسلیں، سڑک پر گذرتے ہوئے اکے دُکے تانگے کی ٹپاٹپ، بجلی گھر کے انجن کی ''زوم بوم زوم بوم'' کی گونج، کسی کار کا زناٹہ...... یہ سب آوازیں، اس رات قیدیوں کے گیت اور بیڑیوں کی جھنکار کی طرح الگ راگ پہ منظّم تھیں۔

کمرے کی فضا اگر بتیوں کی بو سے معطر تھی۔ تازہ پھولوں کی مہک نے سینوں میں فتنے جگادیئے تھے۔ میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ناہید سرخ گٹھڑی بنی، روایتی دلہن کی طرح نئے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ چھیڑ کے جاچکی تھیں اور نصف شب سے ذرا پہلے مجھے اس عطر بیز کمرے میں دھکیل دیا گیا تھا...... حجلۂ عروسی میں سکوت طاری تھا اور اس

سکوت میں ہنگامے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ناہید کو کس قدر خاموشی سے میری زندگی میں داخل کردیا گیا تھا۔

میں نے ناہید کو دیکھا۔ وہ سکڑی بیٹھی تھی جیسے کوئی اجنبی ہاتھ سرخ ریشم اور عطر میں ایک تلخ سی حقیقت لپیٹ کر میرے آنگن میں دھر گیا ہے...... حزنیہ داستان...... میں بھی تو ایک کہانی اٹھائے پھر رہا تھا جو کسی نے نہ سنی تھی اور جو میں کسی کو سنا ہی نہ سکا تھا۔

ناہید کو گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپے دیکھا تو دل اچھل کے حلق میں آن اٹکا۔ سینے میں میں چھپائی ہوئی داستان ہونٹوں پہ آگئی...... دل جل رہا تھا، انگ انگ جل رہا تھا...... دل نے کہا___ ''سنادو یہ داستان! اگل دو یہ انگارے''۔

''ناہید!''

نئے پلنگ پر لطیف سی حرکت ہوئی۔

''ناہید!''

سرخ ریشم ذرا سا لرزا۔

میں آگے بڑھا اور گھونگھٹ اٹھا دیا جیسے کمرے کی گھٹن سے گھبرا کر کسی نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے ہوں۔ دو مہندی بھرے ہاتھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ انگلیاں الجھ گئیں۔ کنوارے لمس نے میرے سینے کی آگ کو بھڑکا دیا۔ میں نے جھک کے مہندی کی سرخی کو چوم لیا۔

گھونگھٹ اٹھ گیا پلکیں جھک گئیں۔

چہرہ اٹھا پلکیں نہ اٹھیں۔

جذبات میں بھونچال آگیا...... میں بنیادوں تک ہل گیا...... کسی نے جیسے سرگوشی کی ہو۔ ''یہ ظلم ہے، یہ فریب ہے''۔

سینے سے شعلہ لپکا، میرے ہونٹوں تک آیا۔ میں نے نگل لیا مبادا ناہید کے بے عیب حسن کو جھلس دے...... کس قدر پاک چہرہ، کس قدر دلفریب خدوخال، کس قدر معصوم صورت!

اس صورت کی معصومیت نے کال کوٹھڑی کی تنہائی میں میرے زخمی دل کو خوب سہلایا ہے۔ کل رات سے ناہید کا تصور نکھر آیا ہے۔ گاہے حجاب آلودسی سرگوشی کر جاتی ہے...

"آ بھی جاؤ نا آفتاب! دیکھو تو قبر کی تنہائی میں کب سے راہ دیکھ رہی ہوں"۔

دیکھتا ہوں، کوٹھڑی کے کونے کھدرے میں جھانکتا ہوں۔ چھت کے جالوں میں نگاہیں الجھالیتا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں ہوتا۔ ناہید کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

اس رات ناہید میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس کی سانسیں بھی محسوس کر رہا تھا...... اس رات اور آج دن کے درمیان دس برس کا عرصہ حائل ہو گیا ہے...... دس برس...... پر یوں لگتا ہے جیسے کل رات جو گذر گئی ہے وہی رات تھی جو رہ رہ کر یاد آ رہی ہے، دس برس پہلے کی ایک رات......

میں نے بے قابو سا ہو کر ناہید کے گھونگھٹ کو اور پیچھے سرکا کر اس کا بھولا بھالا، گول گول سا سانولا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ناہید! میری طرف دیکھو! میری آنکھوں میں دیکھو ناہید!"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے اسے پیارا سا جھٹکا دے کر کہا___ "تجھے اس سانولے حسن کی قسم! ایک بار دیکھو...... آنکھیں کھولو"۔

اوہ! ان آنکھوں نے کسی غزال کی دلکشی چرا کے پلکوں میں چھپالی تھی۔

مجھ پر دیوانگی سی طاری ہوئی، پھر خود فراموشی، پھر بے خودی اور میں بہک گیا۔

پلکوں نے پٹ کھول دیئے جیسے کلی نے پتیاں وا کر دی ہوں مگر ایک ثانئے کے لیے...... ہونٹوں پر حجاب آلود تبسم بیدار ہوا...... جی میں آئی بھول جاؤں میں مرد ہوں اور اس تبسم کو کنورا ہی رہنے دوں پھر پوجا کروں مٹی کے اس بت کی جسے صانع قدرت نے جانے کتنی راتیں جاگ کر تراشا تھا اور اس رات سرخ ریشم میں لپیٹ کر میری زندگی میں رکھ گیا تھا۔

"ناہید!" میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اپنی طرف بڑھاتے ہوئے کہا___ "آنکھیں کھولو! میری آنکھوں میں دیکھو اور مجھے اپنی آنکھوں میں جھانک لینے دو"۔

ناہید نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید میرا لب ولہجہ پاگلوں کا سا تھا جس نے اسے چونکا دیا تھا یا شاید میرا انداز اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں

جھانکا۔

"میری آنکھوں میں تمہیں وہی خواب نظر آئیں گے جو میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں"___ ناہید کی نظریں جھک گئیں، چہرے کا تاثر بدل سا گیا۔ میں کہہ رہا تھا___ "کس نے خواب نہیں دیکھے ناہید! کنواری راتوں کے اندھیروں کو کس نے دلفریب تصوروں سے نہیں سجایا؟ کس نے تھرکتے سینے میں ایک شہزادے کو بٹھا کر چوری چھپے پیار بھری باتیں نہیں کیں؟ کس نے خیالوں کے محل بنا کر ایک رانی کو نہیں لا بسایا؟ اور......"

میں نے شاید بلند آواز سے کہا تھا___ "وہ کون ہے جس نے ٹاٹ کے پردے کو ذرا سا اٹھا کے گلی میں اپنے شہزادے کو نہیں دیکھا؟ وہ کون ہے جس نے ٹاٹ کے ذرا سے اٹھے ہوئے پردے کی اوٹ میں کھڑی اپنی رانی کو نہیں جھانکا......"

ناہید ایک بار پھر چونکی اور میں کہہ رہا تھا___ "ہر مرد نے ناہید! ہر عورت نے! اور شادی ایسا جھٹکا ہے جو ہمارے محلات کو مسمار کر دیتا ہے اور ہمارے خواب ان محلات کے ملبے میں دب کے رہ جاتے ہیں"۔

ناہید نے مجھے دیکھا۔ اس کی استعجاب آلود نگاہیں شاید پوچھ رہی تھیں___ "تم پاگل تو نہیں ہو گئے آفتاب؟"

میں پاگل ہو چکا تھا۔ میری اپنی آواز میرے لیے اجنبی تھی۔

"ناہید!" میں نے اس کے قریب تر بیٹھتے ہوئے کہا___ "تم نے بھی خواب دیکھے ہیں، سوتے بھی، جاگتے بھی...... ناہید! میں نے بھی خواب دیکھے ہیں، سوتے بھی، جاگتے بھی...... آؤ رفیقہ! ہم دونوں ان خوابوں کو ازدواجیت کی دہلیز پہ جھٹک دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں تمام عمر انہی خونچکاں ذروں کو چوری چھپے چنتے چنتے ایک دوسرے سے بیگانہ رہیں...... خواب دیکھو تو حسین لگتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں تو ان کے ذرے انگارے بن جاتے ہیں ناہید! انہیں چننے کی کوشش ہی نہ کرنا، اپنا آپ جلا لو گی"۔

ناہید نے نظریں جھکا لیں۔

"کنوار پنے کی ہر رات طوفانی رات ہوتی ہے ناہید! جذبات کے کواڑوں پر کوئی بڑی زور سے دستک دیتا رہتا ہے، بڑی ہی زور سے ناہید! بڑی ہی زور سے...... وہ کون ہے جس نے اٹھ کے کواڑ نہیں کھول دیئے؟ وہ کون ہے جس نے ایک اجنبی کے لیے اپنے

پٹ کھول نہیں دیئے اور اسے اندر بلا کر کواڑ بند نہیں کر لئے؟''

ناہید کی جھکی پلکیں اٹھیں۔اس کی آنکھوں میں استعجاب گہرا ہو چلا تھا۔

میں نے اسے بے ساختہ بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔اس نے مجھے اپنے قریب کر لیا۔اس قدر قریب کہ میرے سینے میں جو کہانی جل رہی تھی بجھ کے رہ گئی۔راکھ ہو کے دم توڑ گئی۔ناہید نے پہلے ہونٹوں کو بھینچا۔شرمائی، لجائی، چہرہ پرے بھی کیا سامنے بھی لے آئی۔ذرا سا سکڑی پھر اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں میں کھلنے لگے۔پھر کھل گئے۔اس کے سمٹے ہوئے بازو کھلے اور میرے گرد لپٹ گئے...... شب کے سکوت کو مرتعش کرتی ہوئی انجن کی وسلیں، کسی تانگے کی ٹپ ٹپا ٹپ، بجلی گھر کے انجن کی ''زوم بوم زوم بوم'' کی گونج اور سر پر گھومتے پنکھے کی سسک سسک'' ایک ہی سُر تال اور ایک ہی راگ پہ منظم ہوگئی۔

دس سال بیت گئے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس رات کے لمحے میری پھانسی کی کوٹھڑی کی دہلیز پر بیٹھے مجھے تک رہے ہیں۔جیسے ناہید کے پہلے بوسے کا لمس اور اس کی بے معلوم سی آواز میری کوٹھڑی میں بھٹک رہی ہے۔

قیدیوں کی پابہ زنجیر ٹولی کوٹھڑی کے پچھواڑے سے گنگناتی گزر گئی ہے...... مترنم گونج میری کوٹھڑی میں رہ گئی ہے۔اس مقید گونج سے میں وہ لمحات چن کر لڑی میں پرو رہا ہوں جو اس رات رنگ برنگی چڑیوں کی طرح میرے حجلۂ عروسی سے ایک ایک کر کے اُڑ گئے تھے۔

کنوار پنے کی آخری رات کی کوکھ سے ازدواجیت کی پہلی سحر نے جنم لیا۔

ناہید نے شرمائی شرمائی سی، تھکی تھکی سی مگر جذبات سے بھرپور انگڑائی لی تو میں نے اس کی انگڑائی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔جانے کون میرے سینے میں بول اٹھا___

''جی چاہتا ہے روک لوں بڑھ کے سحر کو میں!''

ناہید بولی___ ''رات آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ بہک گئے تھے آپ؟''

میں نے کہا___ ''میں ان خوابوں کی باتیں کر رہا تھا جو ہم اس رات تک دیکھتے رہے ہیں جو کل گزر گئی ہے''۔

ناہید مسکرا کر بولی___ ''میں تو خواب حجلۂ عروسی کی دہلیز پر جھٹک آئی ہوں...... اور آپ؟''

مجھ پر خاموشی طاری ہوگئی۔

''جھٹک دیں نا آپ بھی؟''

مجھ پر خاموشی ہی طاری رہی۔

''کیوں؟ جی نہیں چاہتا جھٹکنے کو؟''

میں چپ ہی رہا۔

ناہید نے آہ لی۔

میں آہ بھی نہ لے سکا۔

اگر ناہید میرا چہرہ مہندی بھرے ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے نہ چپکا لیتی تو اسے کہہ ہی دیتا___ ''ناہید! میں وہ خواب کبھی نہ جھٹک سکوں گا جو میں نے دیکھا ہے''۔

میری آنکھوں میں شاید آنسوؤں کی نمی تھی کہ ناہید کا چہرہ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا تھا۔ناہید نے لال دوپٹے کے آنچل سے میرے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرا دی...... آہ! وہ دکھیاری سی مسکراہٹ، شکوک سے لبریز!

کاش! ناہید میرے ضمیر سے ایک گناہ کی نمی بھی پونچھ ڈالتی۔

''میں نے آپ کے آنسو پونچھے ہیں''___ ناہید نے ملول سی مسکراہٹ سے کہا___

''دیکھ لیجئے! وہ سندر سپنے تو نہیں پونچھ ڈالے میں نے؟''

کس قدر بھرپور طنز، کس قدر پیارا تھپٹر!

''تم میرے ان سپنوں سے کہیں زیادہ سندر ہو ناہید!''

''تو لائیے! وہ سپنے مجھے دے دیجئے''___ اس نے دوپٹے کا آنچل میری آنکھوں کی طرف بڑھایا اور بولی___ ''نوچ لوں؟ لے لوں؟''

آہ! کس قدر معصوم انداز، کس قدر پیاری ادا، شرم کے پردے میں پنہاں وہ شوخی اور مسکراہٹ میں نہاں التجا!

اس نے آنچل میری آنکھوں پر رکھ دیا۔جانے مجھے کیا ہوا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔شاید میری ہچکی بندھ گئی تھی، جانے میں سو گیا تھا یا ان سپنوں میں کھو گیا تھا جنہیں ناہید میری پلکوں سے نوچ لینا چاہتی تھی۔

آنکھ کھلی تو میرا سر ناہید کی آغوش میں تھا اور وہ میرے بال سہلا رہی تھی۔میں نے

دیکھا۔ اس کا زیرلب تبسم میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑھتا ہی چلا آیا پھر پھیلتا چلا گیا۔ پھر یوں کہ جیسے وہاں کچھ تھا بھی اور وہاں کچھ بھی نہ تھا...... ایک لمس، ایک قرار...... ناہید کی ایک لٹ بکھر کر میرے گالوں کو چھو رہی تھی۔ سرخ دوپٹے نے مجھ پر یوں سایہ کر لیا تھا جیسے میرے گناہ آلود ضمیر کو پناہ میں لے لیا ہو۔ میں نے بے ساختہ کہا___ ''ناہید! میں نے اپنے خواب تیرے سانولے حسن اور نشیلے تبسم پہ نچھاور کر دیئے ہیں...... میں تمہارا ہوں''___ اور ناہید نے میری آنکھوں پہ یوں ہونٹ رکھ دیئے جیسے میرے سپنوں کے بکھرے ہوئے ریزے چن رہی ہے۔

آج وہ ریزے پھر بکھر گئے ہیں اور میں انہیں چن رہا ہوں۔

گاہے میں بے بس ہو کر خیالوں میں ناہید کی آغوش میں جا چھپتا ہوں لیکن ایک ہاتھ لپک کر مجھے گھسیٹ لیتا ہے اور کال کوٹھڑی میں لا پھینکتا ہے۔

ہم پھانسی کے قیدیوں کو نصف گھنٹہ کے لیے برآمدے یا وارڈ کے صحن میں ٹہلنے کے لیے نکالا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ ہم سنتے نہیں اپنی اپنی کہے جاتے ہیں۔ ہمیں کچھ کہنا ہوتا ہے۔ ہر کسی کو کچھ نہ کچھ کہنا ہوتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں اور ایک دوسرے کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم موت سے ڈر نہیں رہے۔ پھانسی کا تختہ ہم لوگوں کے لیے بنا ہے۔ ایسے میں جب ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی دلیری کا یقین دلا رہے ہوتے ہیں ہمارے دل ایک خوف کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر ہم اور زیادہ اونچی آواز میں باتیں کرتے ہیں تاکہ سننے والا یہ نہ سمجھے کہ یہ بزدل ہے اور اس کا دم گھٹ رہا ہے......

پھانسی کے قیدیوں کو ان کے رشتہ دار بھی ملنے آتے ہیں۔ یہ ملاقاتیں اسی وارڈ میں ہوتی ہیں۔ قیدی کوٹھڑی کے اندر بند ہوتا ہے اور ملاقاتی مقفل سلاخوں سے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ قیدی اپنے رشتہ داروں کے اس قدر قریب ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو سلاخوں سے ہاتھ بڑھا کر اپنے سہمے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر سکتا ہے یا ہچکیاں لے لے کر روتی ماں کا ہاتھ چوم سکتا ہے یا بیوی کا ہاتھ تھام سکتا ہے لیکن اس قربت میں ایسی دوری ہوتی ہے۔ جیسے یہ چند سلاخیں ہی نہیں ان کے درمیان ایک زمانہ حائل ہو گیا ہے۔ آسمان جتنا وسیع خلا۔ جیسے وہ اپنے عزیزوں کو خواب میں دیکھ رہا ہے یا ان کے درمیان

سیلابی دریا بہہ رہا ہے اور عزیز اس پار کھڑے اسے اشاروں سے بلا رہے ہیں۔

قیدی کو اپنے بیوی بچوں اور ماں باپ سے بہت کچھ کہنا ہوتا ہے، بہت ہی کچھ۔ وہ اپنی ماں کو دیکھتا ہے تو اس کا دل بڑی زور زور سے اچھلنے لگتا ہے۔ وہ ماں سے کہنا چاہتا ہے___ ''مجھے گود میں چھپا لو ماں، ڈر آتا ہے''___ وہ اپنے بچوں کو دیکھتا ہے، اپنی بیوی پہ نگاہ ڈالتا ہے تو کوئی چیز پھانسی سے پہلے ہی اس کا گلا دبوچ لیتی ہے۔ وہ ان جگر کے ٹکڑوں کو جگر تھام کے دیکھتا ہے اور مسکرانے کی سر توڑ کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اسی قدر کہتا ہے___ ''کوئی غم نہ کرنا۔ مرد ہی پھانسی چڑھا کرتے ہیں۔ ماں! میرے لیے رونا دھونا نہیں مردوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہی آیا ہے''۔

وہ سب کو تسلیاں دیتا ہے مگر ڈھارس وہ اپنی بندھا رہا ہوتا ہے۔

اس کے ملاقاتی چلے جاتے ہیں تو وہ آنسوؤں کو روک کر انہیں سلاخوں میں سے دیکھتا ہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو ان کی آہٹ سنتا ہے جو بجھتے بجھتے جیل کی مقید ہاؤ ہو میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وہ اس بجھی ہوئی آہٹ کے تعاقب میں وقت و زمانہ کے ان سبزہ زاروں میں پہنچ جاتا ہے جب وہ معصوم سا بچہ تھا۔ وہ ان سبزہ زاروں اور ہری بھری وادیوں میں گھومتا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ نہایت ہی آہستہ پھانسی کی کوٹھڑی میں واپس آجاتا ہے۔ ایسے میں اس کی نگاہوں میں محبت ہوتی ہے، تشنگی اور گناہ ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی شکست خوردگی اور پچھتاوے کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور جب اسے یاد آجاتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اس کے گلے میں پھندا ڈال کر پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی جائے گی تو اس کا جسم کانپنے لگ جاتا ہے پھر جیسے جسم بم کی طرح پھٹ جاتا ہے___

''حق اللہ ہو''___ جسم تو اپنی جگہ پہ آجاتا ہے لیکن کوٹھڑی لرزنے لگتی ہے۔

قیدی کو کوئی پناہ نہیں ملتی۔ آخر کوٹھڑی ہی اسے پناہ میں لے لیتی ہے۔

ناہید نے مجھے ازدواجی زندگی کی پہلی سحر آغوش میں پناہ دی تھی۔ آج بھی میں وہی حسین پناہ گاہ تلاش کر رہا ہوں۔

میں آٹھ برس ناہید کے پیار کی پناہ میں چھپا رہا۔ اس نے جیسے ہلارے دے دے کر میرے سینے میں چھپے بیٹھے اس انسان کو ابدی نیند سلا دیا تھا جو گناہ گار تھا اور جسے شادی سے پہلے ناہید سے محبت نہیں تھی۔ ناہید نے میری ہستی سے جیسے وہ کانٹا ہی نکال پھینکا جس کی

خلش نے مجھے پاگل بناڈالا تھا۔

اس نے مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ نہ ہی میں نے اسے کچھ بتایا۔ وہ اسی قدر جان سکی کہ شادی سے پہلے مجھے کسی سے محبت تھی۔ ناہید اس محبت کو میرے اعصاب سے دھونے کی کوشش میں مصروف رہنے لگی۔ آنسوؤں سے نہیں مسکراہٹوں سے، طعنوں شکووں سے نہیں پیاری سی چھیڑ چھاڑ سے، روٹھ روٹھ کے نہیں ہنس ہنس کے...... اور میں نے اپنی پہلی محبت ناہید کی ہنسی کی جلترنگ میں بہادی۔

جل ترنگ...... جل ترنگ...... جیل کا گھڑیال بج رہا ہے۔

میری عمر سے ایک اور گھڑی نوچ لی گئی ہے۔

شپ ٹنن...... شپ چھنن...... شپ ٹنن...... شپ چھنن!

دو چار قیدی میری کوٹھڑی کے پچھواڑے سے گذر رہے ہیں!

ماحول کی یہ مترنم آوازیں میرے وجود سے ٹکراتی ہیں تو میری ذات کا وہ تار جھنجنا اٹھتا ہے جسے پہلے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ اس تار سے نغمہ درد کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اور میری کوٹھڑی میں بھٹکنے لگتی ہے۔

کل اس وقت میں اس کوٹھڑی میں نہیں ہوں گا، میری آہیں رہ جائیں گی۔ دو ہی چار روز بعد کوئی اور قیدی سزائے موت لے کے اس کوٹھڑی میں آبیٹھے گا تو میری آوازوں کی مقید گونج اس آنے والے کی ''حق اللہ ہو'' کی دھاکہ نما آوازوں میں دم توڑ جائے گی۔

اور وارڈر اس قیدی کو کہا کرے گا___ ''تم سے پہلے جو یہاں بند تھا وہ ہر وقت نیم کے پیڑ کو تکتا رہتا تھا اور اپنے آپ ہی مسکراتا رہتا تھا جیسے اپنے آپ سے مذاق کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو'' ___ پھر اس قیدی سے پوچھے گا___ ''تمہارے ملاقاتی آئیں گے نا؟...... تمہارے لیے کیا لائیں گے؟'' ___ اور منہ پرے کر کے ہونٹوں سے رال پونچھ ڈالے گا___ ''حوصلہ کرو دوست! اللہ اللہ کرو'' ___ اور وہ ایک ناشپاتی کی خاطر دس دعائیہ فقرے کہہ کر آگے چلا جائے گا۔

وارڈر بے چارہ کیا جانے میں نیم کے پیڑ کی ہریالی میں کیا کچھ دیکھتا رہا ہوں۔ خاکی وردی میں لپٹے ہوئے اس انسان نما کو تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ قیدی سال دو سال کی قید کاٹ کر آزاد ہو جاتے ہیں اور جو پھانسی چڑھ جاتے ہیں وہ جیل سے ہی نہیں دنیا کے جہنم

سے ہی آزاد ہو جاتے ہیں لیکن یہ وارڈر، یہ سنتری اور داروغے عمر بھر کے لیے قید ہیں۔ ان کے شب و روز اسی قید خانے میں بسر ہو رہے ہیں۔ قیدی سلاخوں کے عقب میں بیٹھ کر خیالوں کی راہ فرار ہو جاتے ہیں لیکن وارڈروں کے تو خیال بھی قید ہیں۔ وہ جب دم بھر کے لیے اپنے سرکاری کوارٹر میں جا بیٹھتے ہیں تو ان کا دم گھٹنے لگتا ہے...... کوارٹر تنگ و تاریک، جیل کے برآمدے اور صحن وسیع...... وہ علیل بیوی کے جسم کو چھوڑ کر جیل کی طرف بھاگ اٹھتے ہیں۔ بیوی ہی تو ان کی تفریح ہوتی ہے اور بیوی ہی ان کے لیے لاینحل مسئلہ جو ہر سال ایک اور بچہ یوں جن دیتی ہے جس طرح جیل نوعمر مجرم کو پختہ کار مجرم بنا کر سوسائٹی میں اگل دیتی ہے۔

وارڈر بے چارا کیا جانے! میں اسے کہوں کہ دو برس پہلے میں راوی کے کنارے بیٹھا گنگنا رہا تھا اور وہ شام بڑی ہی حسین تھی تو وہ مجھے یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے گا جیسے کل پھانسی چڑھنے کے خوف سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔

دو ہی برس پہلے کی آوازیں سلاخوں سے چھن چھن کر اندر آرہی ہیں...... شپ شڑاپ شپ شڑاپ...... قیدیوں کی ایک ٹولی کوٹھڑی کے پچھواڑے سے گذر رہی ہے......

دو برس گذرے، ایک شام، میں راوی کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں بیٹھا گنگنا رہا تھا......

رُت آئے رُت جائے پنچھی
لوٹ کے پھر نہیں آئے

کسی کشتی کے چپو راوی کی ہلکی ہلکی لہروں کو اچھال رہے تھے...... قیدیوں کے قدموں کی طرح شپ شڑاپ شپ شڑاپ۔

اس شام جی میں آئی تھی کہ کسی ویرانے میں نکل جاؤں۔ وہ شام میری ازدواجی زندگی کے آٹھویں برس کی ایک شام تھی۔ طبیعت بوجھل سی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ناہید سے محبت نہیں تھی، نہ ہی اس لیے کہ میں نے ناہید سے پہلے کسی کو چاہا تھا اور نہ ہی اس لیے کہ ناہید مجھے طعنے دیا کرتی تھی۔ نہیں! ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ میری پہلی محبت ناہید کی معصومیت اور بھولے پن میں چھپ گئی تھی یا میں نے اسے ناہید کے سانولے سلونے حسن میں چھپا دیا تھا...... یہ ظلم تھا، یہ فریب تھا...... کاش! میں اسے بتا دیتا......

''ناہید! میری جوانی بے داغ نہیں اور ہماری محبت کو ایک عورت ڈس چکی ہے''۔

میں اسے بتا نہ سکا تھا اور یہ راز زہر بن کر میری رگوں کو کھائے جا رہا تھا...... آٹھ سال کھاتا رہا...... آٹھ سال ناہید نے مجھے اپنی آغوش اور مسکراہٹوں میں چھپا چھپا کر میرے زخم سہلائے...... کاش! ناہید میرا زہر بھی چوس لیتی۔

میں شادی کے آٹھ نو سال بعد ضمیر کے بوجھ سے بے چین رہنے لگا تھا۔ ضمیر کراہ رہا تھا۔

اس شام جی میں آئی تھی کہ ذرا کی ذرا کسی ویرانے میں نکل جاؤں جہاں میرے تعاقب میں ناہید نہ آ سکے۔ جہاں اس کے ملائم ملائم بالوں کی بو مجھ تک نہ پہنچ سکے اور وہاں جا کے میں سوچوں کہ وہ کہانی ناہید کو سنا دوں یا نہ سناؤں۔ میں آٹھ نو برس سے سوچ رہا تھا اور ناہید کی سانولی سی معصومیت میری سوچ پر غالب تھی۔

دریا کا کنارا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ لہروں کا جل ترنگ تھکے ماندے قیدی کی زنجیروں کی طرح بج رہا تھا۔ منظر اور ماحول نے مجھے بے خود سا کر دیا تھا اور میں اس بے خودی میں اس واردات کا تانا بانا سلجھانے میں محو ہو گیا جو میں ناہید کو سنانا یا نہ سنانا چاہتا تھا لیکن دلِ ناداں اس تانے بانے میں الجھ گیا اور ایک حسین سا تصور غول سے بچھڑے ہوئے پنچھی کی طرح فضا کی وسعتوں میں الگ تھلگ تنہا تنہا اُڑنے لگا۔

میں جو اپنے ماضی کو کہیں دفن کر دینے یا بہا دینے گیا تھا ماضی کے فریب میں الجھ گیا...... جس راز کو میں اگلنے نکلا تھا اس نے مجھے نگل لیا۔

میں دریا کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں بیٹھ گیا اور جانے کون میرے سینے سے اٹھ کر بھولا بسرا ایک گیت گنگنانے لگا۔ آواز بلند اور پُرسوز ہوتی چلی گئی۔ جب میں نے اپنی آواز کو پہچانا تو اس کے ساتھ ہی میں نے شپ شڑاپ شپ شڑاپ کی آوازیں سنیں۔

یہ آوازیں جھاڑیوں کے جھنڈ میں آ کے رک گئیں۔ لہروں کا ترنم اور بہاؤ تہہ و بالا ہو گیا۔ چھوٹی سی ایک کشتی کنارے لگ رہی تھی۔ ایک جواں سال مرد اور اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی کشتی میں بیٹھے تھے۔

لڑکی پہلی نظر میں میرے تصورات کا عروج معلوم ہوئی۔ اس کے ایک ایک نقش میں میرا ماضی، میرا بھید، مسکرا رہا تھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی ناک، گردن کا خم وہی،

تبسم وہی جس نے برسوں گذرے میری دنیا میں زلزلے بپا کر دیئے تھے اور اب زہریلا بھید بن کر میری نس نس کو ڈس رہا تھا اور جسے میں ناہید سے چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔

''معاف کیجئے گا!''___ وہ بولی___ ''ہم آپ کی تنہائی میں مخل ہوئے''۔

اس نے بات کی تو اس کے اوپر والے ہونٹ کی حرکت وہی، جس نے، ایک عمر گذری، مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا اور جس نے مجھے عورت کے پہلے لمس سے آشنا کیا تھا۔

میں اسے کہنے ہی لگا تھا___ ''خدا کے لیے چلی جاؤ، یوں یاد نہ آؤ، جھٹک لینے دو مجھے وہ اعصاب جن پر تم سوار ہو۔ بیس برس سے سوار ہو۔ نکل جاؤ میرے دل سے کہ میں اس دل میں ناہید کو چین سے بٹھا سکوں۔ یوں مجسم یاد بن کے میری راہ میں نہ آؤ''۔

لیکن اس کا ساتھی بول پڑا___ ''چلو عذرا! چلیں ہم واقعی مخل ہوئے ہیں معاف رکھئے گا''۔

اور میں چونک اٹھا۔ اس کا نام عذرا تھا۔ وہ میری یاد نہیں تھی نہ ہی میری گذری ہوئی زندگی کا نقش۔ وہ عذرا تھی۔

''جی نہیں۔ بالکل نہیں''___ میں یوں بول پڑا جیسے کھائی میں سے بول رہا تھا۔ میں کھائی میں سے اُبھر آیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا___ ''میں ذرا شفق میں کھو گیا تھا۔ یہ منظر مجھے بہت بھلا لگتا ہے''۔

وہ دونوں کشتی میں سے اتر آئے۔

''بیٹھ جائیے!''___ میں نے کہا۔ پھر میں نے جھوٹ بولا___ ''میں تنہائی سی محسوس کر رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ آ گئے''۔

''آپ پسند فرمائیں تو کشتی میں آ جائیں''___ عذرا نے کہا۔

میں اٹھ کے ان کی کشتی میں جا بیٹھا۔

وہ کشتی کو دریا کی مخالف سمت لے آئے تھے۔ ہم بیٹھے تو کشتی آہستہ آہستہ بہنے لگی۔

''آپ کی تعریف؟''

''مجھے آفتاب علی کہتے ہیں''۔

''میرا نام عذرا ہے...... عذرا جمال!''

''عذرا جمال؟''___ میں نے حیرت سے پوچھا___ ''مرزا جمال الدین بیگ کے

خاندان سے آپ کا.....''

''جی ہاں! وہی، وہ میرے والد صاحب ہیں''۔

''اوہ!.....'' میری ہستی میں جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا ہو۔ میں نے اس پہاڑ کی اگلی ہوئی آگ کو نگل لیا مبادا عذرا کی معصوم دوشیزگی کو آنچ لگ جائے۔

''اور یہ ناصر ہیں..... ناصر خورشید!'' عذرا جھجک کے بولی۔۔۔ ''یہ میرے دوست ہیں''۔

ناصر نے مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

''آپ کے والد صاحب کو ایک بار دیکھا تھا''۔۔۔ میں نے عذرا سے کہا۔۔۔ ''برسوں گذر گئے ہیں''۔

''میرے لیے تو وہ فرشتہ ہیں، ماں بھی وہی، باپ بھی وہی''۔۔۔ عذرا نے کہا۔

''مجھے اس قدر یاد ہے کہ ایک مدت گذری ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی تھی''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اور بچی کی پیدائش سے.....''

''وہ میں ہی تھی''۔۔۔ عذرا ملول سی مسکراہٹ سے بولی۔۔۔ ''یہ میرا ہی قدم منحوس تھا کہ میں پیدا ہوئی اور چند روز بعد والدہ فوت ہو گئیں۔ مرحومہ نے میرا نام عذرا جمال رکھا تھا۔ پاپا نے دوسری شادی نہیں کی تھی''۔

''ان کے پاپا کو ان کی ممی سے بے پناہ محبت تھی''۔۔۔ ناصر نے بے تکلفی سے کہا۔۔۔ ''میرے بزرگ کہتے ہیں کہ ان کے پاپا ان کی ممی کی پوجا کیا کرتے تھے''۔

''اسی لیے تو انہوں نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ میں ہی ان کی کل اولاد ہوں''۔۔۔ عذرا نے کہا۔۔۔ ''اب بھی پاپا کبھی کبھی امی کی تصویر سامنے رکھ کر رویا کرتے ہیں''۔

یوں لگا جیسے کشتی نے بڑے زور سے ہچکولا کھایا ہو۔ جیسے کسی بپھری ہوئی لہر نے کشتی کو الٹ دیا۔ مجھ پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی اور میں ہاتھ پاؤں مار کے ابھر آیا۔ خیالوں کے بھونچال کو بڑی مشکل سے ساکن کیا۔

''میں تو ایک سال کی تھی جب ہم کراچی چلے گئے تھے''۔۔۔ عذرا کہہ رہی تھی اور کشتی بہے جا رہی تھی۔۔۔ ''لاہور آئے تو تین چار مہینے ہوئے ہیں..... چلئے ہٹائیے اس موضوع

کو''۔۔۔ عذرا نے اُکتا کر کہا۔۔۔ ''آفتاب صاحب! کوئی گیت سنا دیجئے''۔

''چلئے آفتاب صاحب!''۔۔۔ ناصر بولا۔۔۔ ''آپ تو آواز کے سوز اور چہرے مہرے سے آرٹسٹ معلوم ہوتے ہیں''۔

عذرا بھی کوئی رسمی سا جملہ کہہ رہی تھی کہ میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور میں چھوٹی سی کشتی میں بہتا وقت و زمانہ کی خلیج عبور کر گیا۔ ناصر اور عذرا نے جسے میری آواز کا سوز کہا تھا وہ میرے سینے کا درد تھا جو ایک گیت کے بول بن کر شام کے نمناک دھندلکے میں تیرنے لگا۔

اندھیاروں کے آنگن میں یوں یاد تیری لہرائے
جیسے تند ہواؤں میں کوئی بیٹھا دیپ جلائے

میں آنکھیں بند کئے گا رہا تھا کہ میں چونک اٹھا۔ میری آواز کے ساتھ سارنگی کی سنگت تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں، دیکھا ناصر وائلن بجا رہا تھا۔ کشتی میں وائلن کا بکس کھلا پڑا تھا۔ ناصر مسکرا رہا تھا۔ عذرا بھی مسکرا رہی تھی لیکن چہرے اور آنکھوں کا تاثر بتا رہا تھا کہ کہیں کھو گئی ہے۔ میری آواز میں یا گیت کے بولوں میں یا ناصر کی وائلن میں یا شاید ساز و آواز کی سنگت میں۔ مجھ پر خود فراموشی طاری ہوتی چلی گئی۔

بجھ بجھ جائیں پیار کے دیپک آس کے تارے لرزیں
گھِر گھِر آئیں ڈس ڈس جائیں بیری باؤلے سائے
جیسے تند ہواؤں میں کوئی بیٹھا دیپ جلائے

میں بے خود ہو کے گا رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اپنی آواز کے سوز کو محسوس کیا۔ اس سوز سے وہ دونوں لطف اندوز ہو رہے تھے اور یہ سوز مجھے جلا رہا تھا۔ دیپک راگ کی آنچ سے میرا رواں رواں جل رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کے دیکھا۔ عذرا مجھے تشنہ سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

اور میں نے محسوس کیا کہ وائلن کی سنگت لڑکھڑا رہی تھی۔ ناصر کی انگلیاں بھٹک چلی تھیں۔ سوچا شاید تھک گیا ہو گا۔ کچھ بھی تھا، وائلن کی لَے میرے گیت کے زیر و بم سے بیگانہ ہوئی جا رہی تھی۔

میں نے چونک کے دیکھا، ناصر کے چہرے کا تاثر بدلا ہوا تھا۔ وہ جھنجھلایا سا ہوا کبھی عذرا کو کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ عذرا مجھ پر نظریں گاڑھے گم صم بیٹھی تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ بہے جا رہی تھی اور ناصر ہم دونوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میرا گیت اس کی اور عذرا کی دوستی کا دھاگہ توڑ رہا تھا۔ میں گیت کے آخری بول پہ پہنچا ہی تھا......

کون کہے پھر کب مل بیٹھیں جنم جنم کے ساتھی

ناصر نے کندھے سے وائلن ہٹالی اور اکھڑے ہوئے سے لہجے میں بولا۔۔۔ ''بہت دیر ہوگئی ہے عذرا! چلنا چاہئے''۔

''چل تو رہے ہیں''۔۔۔ عذرا کچھ ایسے لہجے میں بولی جیسے ناصر نے اسے اس وقت جگا دیا تھا۔ جب وہ خواب میں اپنے شہزادے کی آغوش میں سر رکھے اس سے بڑی ہی پیاری کہانی سن رہی تھی۔

ناصر کا اچھا بھلا جواں سال چہرہ اتر گیا۔

عذرا جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ساز و آواز کے اس بھدے انجام پر اسے غصہ آنے لگا تھا۔

ساحل پہ آ کے جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو ناصر نے بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ یہ بے دلی اس کے چہرے پہ جیسے لکھی ہوئی تھی لیکن عذرا اس کی موجودگی کو نظر انداز کر چکی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔۔۔ ''آپ جلدی میں ہیں کیا؟ چلے ہی جائیے گا''۔

ناصر نے اسے کندھے سے پکڑ کر دبائے ہوئے غصے سے کہا۔۔۔ ''عذرا! تمہیں جلدی نہیں ہے تو میں چلتا ہوں''۔

عذرا نے مجھے معذرت طلب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔ جاتے جاتے میرا ایڈریس لیتی گئی۔

ناہید نے اس رات بہت جتن کئے لیکن میں نہ ہی بتا سکا کہ میں کیوں کھویا کھویا اور بے چین ہوں۔ وہ اس رات روٹھی تھی، روئی بھی، محبت کی قسمیں بھی دیں لیکن میں اسے نہ ہی بتا سکا کہ ناہید! جو خواب تم نے میری آنکھوں سے پونچھ ڈالے تھے انہیں میں نے آج راوی کی روانی میں تیرتے دیکھا ہے۔ آج اٹھارہ انیس، برس بعد میں نے انہیں پانی سے

اٹھا کر پھر آنکھوں میں سمو لیا ہے۔

آج اس خواب کے ذرے پھانسی کی کوٹھری میں بکھرے پڑے ہیں۔

میری عمر کا آخری دن آدھا گذر گیا ہے۔ کل اس وقت عذرا اور ناصر میری لاش لے جا چکے ہوں گے۔ ناصر کو یقین تو آ گیا ہے کہ میں اس کا رقیب نہ تھا پھر بھی اس کے سینے میں ہلکی سی خلش ضرور ہے جو میرے مرنے کے بعد بھی نہ نکل سکے گی۔ آج نکال دوں گا۔ دو گھنٹے بعد وہ مجھے ملنے آئے گا۔ عذرا بھی ساتھ ہوگی۔ کاش! وہ دلہن بن کے آئے۔ شاید اس روپ میں مجھے ناہید کا پرتو نظر آ جائے۔

ایک برس گذرا ناہید مر گئی ہے، نو برس کا ساتھ نبھا کر مر گئی ہے۔ مر تو وہ اسی روز گئی تھی جس روز عذرا پہلی بار میرے گھر آئی تھی اور میں اور زیادہ بے چین ہو گیا تھا۔

ناہید نے بہت دکھ سہے۔ مر گئی مگر ترس ترس کر۔ اس کے لیے یہی دکھ کیا کم تھا کہ ہمارے ہاں دو بچے پیدا ہوئے اور دونوں ایک ایک سال زندہ رہ کر مر گئے۔ میں نے اس کے مجروح جگر کو سہلانے کے ہر جتن کئے تھے مگر کامیاب ایک بھی نہ ہوسکتا تھا۔ بچوں کے غم کے ساتھ اس نے عذرا کو روگ بنالیا۔ میں نے قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ مجھے عذرا سے محبت نہیں، اچھی ضرور لگتی ہے لیکن ناہید اسی غم میں گھلتی رہی کہ میں اس کی محبت کو فریب دے رہا ہوں۔

بچوں کا غم اور اپنی محبت کا دکھ۔ اسے ایسا روگ لگا کر دو روز بیمار رہ کر چل بسی اور میں بھٹکنے کے لیے زندہ رہا۔ اچھا ہوا کہ میں زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ ناہید ہی میری پناہ گاہ تھی وہ چھن گئی تو میرے چھپنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔

آہ! ذرا سی لغزش عظیم ترین حادثہ بن گئی!

وارڈروں اور سنتریوں کی وسلیں یک بارگی چیخ اٹھی ہیں جیل کے ماحول میں ہنگامہ بپا ہوگیا ہے۔ قیدیوں کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ یہ پا بجولاں انبوہ، یہ مشقت زدہ ہجوم، فریب خوردہ مخلوق، معاشرے کی لغزشوں کا یہ متحرک انبار اب روٹیوں پر ٹوٹ پڑے گا۔ کاش! انہیں یہی دو روٹیاں اور پتلی سی دال کوئی جیل سے باہر ہی دے دیتا۔ انسان نے انسان کو روٹی بھی دی تو سات تالوں میں بند کر کے، اپنے تالے تڑوا کر اور اپنی جیبیں کٹوا کر۔

اب یہ قیدی ایک دوسرے کو گالیاں دیں گے۔ روٹی تقسیم کرنے والوں سے جھگڑیں گے۔ آپس میں الجھیں گے۔ روٹی کے ساتھ وارڈروں کی گالیاں کھائیں گے۔ جب سب کچھ کھا چکیں گے تو ماحول اونگھنے لگ جائے گا۔ ہرسُو خاموشی طاری ہو جائے گی۔ بیڑیاں پھر بجنے لگیں گی۔

جیل میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ جو ابھی ابھی پاؤں گھسیٹ رہے تھے سرپٹ بھاگ رہے ہیں۔ بیڑیاں اور برتن زور زور سے بجنے لگے ہیں۔ ان میں وہ موسیقیت نہیں رہی جو تھوڑی دیر پہلے تھی۔

قیدیوں کے گیت روٹی میں گم ہو گئے ہیں۔ پتلی دال میں بہہ گئے ہیں۔

میں اب دال روٹی کے دیس سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ ابھی ابھی میری کوٹھڑی کا تالا کھلا تھا اور کسی کے دو ہاتھ دو روٹیاں اور دال کی پلیٹ رکھ گئے ہیں۔ تالا پھر بند ہو گیا ہے، لیکن میں آج روٹی نہیں کھاؤں گا میرا جسم ان ضروریات سے آزاد ہو گیا ہے۔

میری نظریں دال روٹی سے دور ہٹتے ہٹتے بہت دور نکل گئی ہیں جہاں میں نے کشتی میں بیٹھ کے گایا تھا......

بجھ بجھ جائیں پیار کے دیپک
آس کے تارے لرزیں

اس شام ناصر کے اصرار اور اس کی مزاجی کیفیت کو دیکھتے ہوئے عذرا مجھ سے رخصت ہو گئی تھی۔ دوسرے روز میں دفتر سے گھر آیا تو عذرا میرے گھر ناہید کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں قہقہے لگا کر ہنس رہی تھیں۔ دونوں کو ہنستا دیکھ کر میری تمام تر کائنات مسکرا اٹھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے اعصاب تروتازہ ہو گئے۔

عذرا کی وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر ناہید کی موجودگی کو فراموش کرنے لگی۔ اس نے ناصر کی موجودگی کو بھی اسی طرح فراموش کر دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ اس طرح کھل گئی جیسے میرا اس کا ایک مدت کا ساتھ تھا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی ناہید کی موجودگی کو بھول گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ عذرا ناہید سے زیادہ جاذبِ نگاہ تھی بلکہ اس لیے کہ عذرا کی مسکراتی آنکھوں میں مجھے عہدِ رفتہ کے چند لمحات جھانکتے نظر آنے لگے تھے۔ اس کی شوخ مسکراہٹ میں (جو بہت حد

تک شرارت آمیز تھی) مجھے وہی سحر نظر آتا تھا جس نے کبھی مجھے مسحور کر لیا تھا۔

پھر عذرا مجھے ملتی رہی۔ کبھی گھر کبھی باہر اور میری ذات میں مدغم سی ہونے لگی اس کی ایک ہی فرمائش ہوتی تھی ــــ ''کوئی گیت سنائیے'' ــــ ناہید کی بھی یہی ضد ہوا کرتی تھی لیکن میں اکثر ٹال دیا کرتا تھا یا کبھی کبھی دو ایک بول سنا دیا کرتا تھا۔ عذرا تو سن کے ہی ٹلتی تھی۔ اس پر بھی ناہید شک نہ کرتی تو کیوں نہ کرتی؟

عذرا میں جاں فزا قسم کی شگفتگی، زندہ دلی اور بچپن کا کھلنڈرا پن تھا۔ ناہید اس کے سامنے بجھ سی جاتی تھی۔ میں نے اسے ہزار بار سمجھایا کہ عذرا شوخ اور الہڑ لڑکی ہے۔ ابھی اسے بھلے برے کی تمیز نہیں اور میں اس کے بچپنے کے پیشِ نظر اس سے بے تکلف ہو جاتا ہوں لیکن ناہید پر یہ دلیل محض بے اثر تھی۔ یہ میرا ظلم تھا یا بھول تھی کہ میں اسے ساری بات بتا نہ سکا۔

میں نے ناہید کو یہ بھی کہا کہ میری عمر اس وقت چالیس برس کے قریب ہے اور عذرا بمشکل انیس برس کی ہے، وہ کسی صورت مجھ سے وہ محبت نہیں کرے گی جس کا تمہیں شک ہے لیکن ناہید نے آہ لے کر کہا ــــ ''تو کیا ہوا؟ محبت عمر اور شکل و صورت کی پابند نہیں ہوا کرتی۔ اس کے علاوہ آپ کا رویہ اور عادتیں کچھ ایسی ہیں کہ آپ چالیس برس کے لگتے ہی نہیں۔ میں آپ سے دس سال چھوٹی ہوں مگر آپ کی باتیں اور عادتیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے آپ مجھ سے دس سال چھوٹے ہیں۔ بچپن تو آپ کا ابھی گیا نہیں''۔

میں نے دو ایک بار قسمیں بھی کھائیں کہ اب عذرا سے نہ ملوں گا۔ ملوں گا تو اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور اسے کہہ بھی دوں گا کہ آئندہ میرے گھر نہ آیا کرے۔ میں ناہید کی محبت کو کسی قیمت پر مجروح نہ کرنا چاہتا تھا، لیکن عذرا آئی تو تمام قسمیں کانچ کی چوڑیوں کی طرح چکنا چور ہو گئیں۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری روح اور سوچ و فکر عذرا کے ہی ہاتھ میں ہے۔ اسے دیکھ کے میں بے بس سا ہو جایا کرتا تھا۔ عذرا میری اس کیفیت یا کمزوری کو بھانپ چکی تھی۔

ایک روز وہ میرے ہاں آئی تو ناہید اٹھ کے دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ میں نے اسے روک کے بٹھا لیا۔ ناہید کا یہ رویہ میرے لیے بڑا ہی ناگوار ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو عذرا اور میری محفل میں بن بلائی مہمان سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ جونہی عذرا آتی

تھی ناہید اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی اور میں اسے بڑی مشکل سے اپنے پاس بلاتا تھا۔

اس روز وہ تھوڑی دیر ہم میں بیٹھی اور چائے بنانے کے بہانے چلی گئی۔

عذرا نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔۔۔ ''آج شام راوی پہ ملئے...... بارہ دری کے سامنے''۔

جی میں آئی انکار کر دوں لیکن عذرا نے میرا ہاتھ تھام کر اس طرح دبایا جیسے اس نے جبراً ہاں کرالی ہو۔

شام راوی کے کنارے پہنچا عذرا پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے اس شام اسے یکسر بدلی ہوئی ذہنی کیفیت میں دیکھا۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا اور ہم دریا کے کنارے کنارے دور نکل آئے تھے۔

''آفتاب! ایک بات کہوں؟''۔۔۔ وہ چلتے چلتے میرے سامنے آ گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے آفتاب کہا۔ اس سے پہلے آفتاب صاحب کہہ کر مخاطب ہوتی تھی۔ میں یہ تبدیلی دیکھ کر کانپ اٹھا۔ میں اس کا تاثر خوب سمجھتا تھا۔

''عذرا!''۔۔۔ جانے کس قوت نے میرا ہاتھ اٹھا کے اس کے رخساروں پہ رکھ دیا۔ میں نے کہا۔۔۔ ''کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھنا...... یہ بھی نہ بھول جانا عذرا! مجھے ناہید سے محبت ہے''۔

''اور مجھے ناصر سے محبت ہے''۔۔۔ عذرا نے کہا۔

''پھر؟''

''پھر یہ کہ......'' عذرا کہتے کہتے چپ ہو گئی اور دیوانگی کے سے انداز سے میری کلائیاں پکڑ کے بولی۔۔۔ ''آفتاب! تم مجھے اس قدر اچھے کیوں لگتے ہو؟ میں جانتی ہوں تم مجھے چاہتے ہو۔ جھوٹ نہ بولنا آفتاب! کہہ دو مجھے تم سے محبت ہے''۔

''پاگل ہو گئی ہو عذرا؟''

''ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں''۔۔۔ اس نے سر میرے سینے پر پھینک دیا۔ دیکھا اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اس کی ٹھوڑی تھام لی۔ وہ جذبات سے اس قدر دیوانی ہو چکی تھی کہ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ہونٹ میری ہتھیلی پہ رکھ دیئے پھر میرے

ساتھ لپٹ گئی۔

صورتِ حال میرے بس سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ بارے یوں لگا جیسے بیس برس پہلے کے لمحات لوٹ کے میری راہ میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ بیس برس پہلے۔ یہی وقت تھا، اسی طرح کے ہونٹ تھے جو میری ہتھیلی میں پیوست ہو گئے تھے۔ اسی طرح کے بال تھے جن میں اسی طرح کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسا ہی جسم تھا اور جسم کی تپش اور سینے کا بے قابو زیر و بم اسی طرح اشتعال انگیز تھا۔ وہ لمحے اُڑ کے بیت گئے تھے اور شاید لوٹ آئے تھے۔

عذرا کا جسم میرے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا مگر ہمارے درمیان ایک خلیج حائل تھی جسے میں پھلانگ نہ سکتا تھا۔ میں گرد و پیش کو بھول گیا اور میرا ذہن دور بیس برس پیچھے وقت و زمانہ کے لیے گذرے قافلے کے ساتھ جا ملا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ ایک نوخیز دوشیزہ میرے سینے سے لگی جذبات سے پاگل ہو رہی ہے۔

''آفتاب!''۔۔۔ وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی اور میرے کندھے جھنجھوڑ کر بولی۔۔۔ ''کہہ دو مجھے تم سے نفرت ہے''۔

''نہیں!''۔۔۔ میں نے چونک کے کہا۔

''پھر کہہ دو مجھے تم سے محبت ہے''۔

''نہیں!''

''تم جھوٹ کہتے ہو''۔

''نہیں!''

''پھر مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھا کرتے ہو جن میں مجھے اپنا آپ نظر آتا ہے''۔

''یہ فریبِ نگاہ ہے عذرا!''

''آفتاب!''۔۔۔ جیسے وہ چیخ اٹھی ہو۔۔۔ ''خدا کے لیے بتا دو مجھے تم سے اتنا پیار کیوں ہے جتنا ناصر سے ہے''۔

''میرا پیار ناصر والا پیار نہیں عذرا!''۔۔۔ میں نے اسے بہلانے کے انداز میں سے کہا۔۔۔ ''غلط نہ سمجھو۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو''۔

"اوہ خدا!"۔۔۔ وہ بے بس ہو کر یوں ریت پر بیٹھ گئی جیسے ڈھیر ہو گئی ہو اور گھٹنوں میں سر رکھ کے رونے لگی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تو اس نے طویل آہ لی۔

"آفتاب صاحب!"۔۔۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "مجھے معاف کر دیجئے گا کبھی کبھی پاگل سی ہو جاتی ہوں۔۔۔ ناہید سے نہ کہئے گا کہ میں نے ایسی باتیں کی تھیں"۔

میں ہنس پڑا جو دراصل ہنسنے کی ناکام کوشش تھی۔

"عذرا! تم ہو ہی پاگل!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "بھول نہ جایا کرو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری عمر چالیس برس ہے اور تم اٹھارہ انیس برس کی کچی سی لڑکی ہو۔ بھلا میں تمہارے ساتھ عشق و محبت کا خبط اپنے دماغ پر کیسے سوار کر سکتا ہوں"۔

"عمر اور شکل اور شادی محبت کی راہ میں ہلکی سی بھی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "اگر آپ شادی شدہ نہ ہوتے تو بخدا میں آپ سے شادی کی درخواست کرتی۔۔۔"

"ایسے خیال دل میں نہ آنے دیا کرو"۔

"آ ہی جاتے ہی ایسے خیال!"۔۔۔ عذرا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔۔۔ "حالانکہ ناصر میرا منگیتر ہے اور میں اسے چاہتی بھی ہوں"۔

یہ سن کر مجھے روحانی مسرت ہوئی کہ ناصر اس کا منگیتر ہے گو یہ مسرت ملول سی تھی۔

"میں کہنا تو یہ چاہتی تھی آفتاب صاحب!"۔۔۔ اس نے سر میرے کندھے سے ہٹا کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ "آفتاب صاحب!"

"اب مجھے آفتاب ہی کہا کرو"۔۔۔ میں بول پڑا۔۔۔ "چھوڑو اس تکلف کو"۔

"یوں ہی سہی"۔۔۔ وہ اداس سی ہنسی ہنس دی۔ بولی۔۔۔ "ان تکلفات سے مجھے بھی کوفت ہوتی ہے۔۔۔ بات یہ ہے آفتاب! ناصر مجھ سے بدظن ہوا جا رہا ہے۔ اسے یقین ہو چلا ہے کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں نے ہر طرح کی قسمیں کھا کر اسے یقین دلایا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ مان بھی جاتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد پھر شکوک میں الجھ جاتا ہے۔۔۔"۔۔۔ عذرا نے آہ لی اور کہا۔۔۔ "لیکن میں جب قسمیں کھاتی ہوں تو یوں لگتا ہے

جیسے میں جھوٹی قسمیں کھا رہی ہوں۔۔۔ آفتاب! ناصر ہی نہیں میں خود اپنے آپ سے بدظن ہو گئی ہوں۔ مجھے اپنے خلاف شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ میں دو حصوں میں کٹ گئی ہوں۔ پہلے میں ناصر کے تصور میں گم رہتی تھی اب اس کا تصور دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اس پر تمہارا سایہ پڑنے لگا ہے۔ پہلے مجھے صرف ناصر نظر آتا تھا اور اب اس کے ساتھ ساتھ میں ایک پُرسوز آواز، اداس اداس سے گیت اور ہنسی مذاق سے بھرپور باتیں بھی سنا کرتی ہوں۔ یہ آوازیں ناصر کی تو نہیں ہوتیں، تمہاری ہوتی ہیں آفتاب! تمہاری آوازیں۔۔۔" عذرا نے طویل آہ لی اور بولی۔۔۔ "جب تصور میں تمہاری آواز سنتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے تم میری محبت کے گیت گا رہے ہو اور تم صرف میرے لیے گا رہے ہو"۔

"تم جذباتی لڑکی ہو عذرا!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے۔ فلمیں نہ دیکھا کرو"۔

"یہ بات نہیں آفتاب!"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "ڈرتی ہوں کہیں اسی دوراہے پر ناصر نہ مجھ سے چھن جائے اور۔۔۔ اور۔۔۔" وہ ذرا رک کر بولی۔۔۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھ سے چھن جاؤ۔۔۔ میں دوراہے پہ کھڑی ہوں آفتاب! مجھے راہ دکھاؤ۔۔۔ بتاؤ میں کس راہ پہ جاؤں؟"

"ناصر۔۔۔ صرف ناصر۔۔۔" میں نے کہا۔۔۔ "مجھے صرف ہمراز دوست سمجھو"۔

لیکن عذرا اداس ہوتی چلی گئی۔

جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے اس کی پیشانی کے تراشیدہ بالوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیاں میری انگلیوں میں الجھا دیں۔

"جی چاہتا ہے تمہاری گود میں سر رکھ لوں"۔۔۔ عذرا نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر میری گود میں سر رکھ دیا اور لیٹ گئی۔

رات چاندنی تھی۔ نمی نے فضا کو دھو ڈالا تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ راوی کا بہاؤ اس خاموشی میں مترنم ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ماحول پر بے خودی سی طاری تھی۔ عذرا نے میرا ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ لیا۔ میں نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش نہ کی۔

"نیند سی آ رہی ہے!"۔۔۔ عذرا خوابناک آواز میں بولی۔۔۔ "سو لوں؟"

"پاگل نہ بنو۔۔۔" میں نے کہا۔۔۔ "دیر ہو رہی ہے۔ اٹھو چلیں۔ دیکھو تم نے کپڑے

ریت میں خراب کر لئے ہیں۔ اٹھو، جھاڑو انہیں''۔

میں نے اسے اٹھایا، اس کے کپڑے جھاڑے اور اسے ساتھ لئے واپس چل پڑا۔ وہ میرے ساتھ لگی چلی رہی تھی اور قدم قدم پہ آہ سی لیتی تھی۔

''ناصر سے مجھے بہت محبت ہے''___ اس نے کہا۔

''ہونی چاہئے''___ میں نے کہا___ ''وہ ہے ہی محبت کے قابل''۔

''لیکن وہ تمہیں اپنا رقیب سمجھنے لگا ہے''۔

''مجھے معلوم ہے، میں اسے سمجھاؤں گا''۔

''مجھے بھی سمجھاؤ تو جانیں''۔

''تم تو پاگل ہو''۔

عذرا سے رخصت ہو کے میں گھر پہنچا۔ دیکھا ناہید لیٹی ہوئی تھی۔ کہنے لگی طبیعت گری گری سی ہے۔ پوچھنے لگی___ ''کہاں رہے اتنی دیر؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا___ ''عذرا کے ساتھ دریا تک چلا گیا تھا''۔

کاش! میں یوں نہ کہتا مگر تیر نکل چکا تھا جو ناہید کے دل میں جا لگا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ہی علیل سا تھا بجھ کے رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں جانتا تھا اس نے مجھ سے آنسو چھپا لئے تھے۔

''کیا ہے طبیعت کو؟''___ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں!''___ اس نے آہ لے کے جواب دیا۔

''ناہید!''

اس نے کروٹ بدل لی۔

''ناہید!''

وہ زار زار رو پڑی۔

میں نے لپک کر اسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا لیا۔

''احمق نہ بنو ناہید!''___ میں نے کہا___ ''دس برسوں کی محبت پر یوں نہ تھوکو۔ میرے لیے ایک تم ہی تم ہو اور تم ہی پریشان کرنے لگی''۔

''تو جایئے عذرا کے ساتھ راوی تک ہو آیئے، سب دکھ دور ہو جائیں گے''۔

ناہید مجھ سے لڑ نہیں رہی تھی، طعنے نہیں دے رہی تھی، ٹھہری ہوئی غمزدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں نے تو دس سال اپنا آپ، آپ پر قربان کئے رکھا ہے، اب مجھ میں رہا ہی کیا ہے۔ دو بچے جن کے مار چکی ہوں۔ آپ رہ گئے تھے۔ آپ میرے لیے جیتے جی مر گئے''۔

میں نے اسے اور زور سے بھینچا تو اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جیسے درد کی شدت سے بند ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے کہیں تکلیف تھی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگی___ ''دل پہ درد ہوتا ہے''۔

دوسری صبح ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے تشویش کا اظہار کیا اور مریضہ کو آرام اور سکون سے رکھنے کی ہدایت کی۔ انجکشن بھی کیا اور کہا___ ''معلوم ہوتا ہے مریضہ نے یہ تکلیف پہلے محسوس نہیں کی یا اسے چھپائے رکھا ہے۔ مرض پرانا ہو گیا ہے۔ محتاط رہئے گا''۔

دو روز تک تو میں نے اسے چارپائی سے اٹھنے نہ دیا۔ تیسری صبح ناہید اٹھی۔ باورچی خانے تک گئی اور لوٹ کے آ گئی۔ میں نے اسے دیکھا کہ وہ گر پڑنے کے انداز سے چارپائی پر لیٹ گئی اور اس کے منہ سے کراہتی ہوئی سی آواز نکلی___ ''آفتاب صاحب! پانی''۔

میں پانی لینے بھاگ اٹھا۔

لوٹ کے آیا تو دیکھا کہ ناہید کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں اور دونوں ہاتھ دل پہ رکھے تھے۔ میں نے اسے بلایا___ ''ناہید! لو پانی!''___ اس نے میری طرف دیکھا، پھر ہاتھ پرے ہٹا کر میرا خالی ہاتھ تھام لیا۔ میرے ہاتھ کو اس نے دبایا۔ دبا ہی رہی تھی کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کا ہاتھ گر پڑا۔ آنکھیں جو کھلی تھیں کھلی ہی رہیں اور ناہید میرے ہاتھ سے پانی پئے بغیر، دل میں ایک شکوہ لئے، مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔

اور میں اسے اس کے بچوں کے پاس سلا آیا۔

کل اس وقت میں بھی اس کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے ساری بات بتا دوں گا۔ کہوں گا___ ''ناہید! تم تو بلا وجہ روٹھ آئی تھیں''___ پھر اس کے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ بچے تو اس کے پاس ہی ہوں گے۔

آہ! میرے بچے! مرنے کا مجھے دکھ ہو تو کیوں ہو؟ اپنے بچوں میں جا بیٹھنے پہ کون خوش نہیں ہوتا! چالیس بیالیس برس کی طویل مسافت طے کر کے اپنے بیوی بچوں میں

جالٹیوں گا تو ساری تکان دور ہو جائے گی۔

تھک گیا ہوں، شل ہو گیا ہوں۔

ناہید کی وفات سے کئی روز بعد ناصر ایک شام میرے گھر آیا۔ بجھا بجھا سا تھا۔

''آفتاب صاحب! آپ سے چند ایک ضروری باتیں کرنے آیا ہوں''۔۔۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بات کرتے بھی جھجک رہا تھا۔

''کہ مجھے عذرا سے محبت ہو گئی ہے اور وہ مجھے چاہنے لگی ہے''۔۔۔ میں نے اداس سی شگفتگی سے اس کے دل کی بات کہہ دی۔۔۔ ''۔۔۔ اور یہ بھی کہ میں تم دونوں کے درمیان آ گیا ہوں''۔

ناصر ہنس پڑا۔ بولا۔۔۔ ''ہاں! یہی بات ہے''۔

''یہ بات غلط ہے ناصر! عذرا مجھے صرف اچھی لگتی ہے اور بس!''

''لیکن وہ کچھ بدلتی جا رہی ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''بعض اوقات کھوئی جاتی ہے۔ میں کچھ اور باتیں کر رہا ہوتا ہوں اور وہ سنی ان سنی کر کے کہتی ہے۔ آفتاب والا گیت سناؤ۔۔۔۔ میں جھنجھلا اٹھتا ہوں آفتاب صاحب! ایک روز میں اپنے متعلق اسے کوئی بات سنا رہا تھا تو وہ میری ادھوری بات میں ہی بول پڑی۔ ہٹائیے اس موضوع کو، آفتاب کی کوئی بات کرو، بڑا اچھا آدمی ہے''۔

وہ تفصیلات شروع کرنے لگا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ناصر! ہٹاؤ اس جھنجھٹ کو، عذرا تمہاری ہے اور وہ تمہارے ساتھ شادی کرے گی''۔

لیکن ناصر کی جذباتی حالت دگرگوں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا اور اسے یقین دلایا کہ میں کسی صورت ان کے درمیان نہیں آ سکتا۔

ناہید کے مرجانے سے ناصر کو اپنی محبت پہلے سے زیادہ خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔

یہاں سے میری زندگی کا تلخ ترین دور شروع ہو گیا۔ گھر ناہید کے بغیر اجاڑ اجاڑ اور ویران ویران لگتا تھا۔ تنہا راتوں کو مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مرحومہ کے گلے اور شکوے میرے کمرے میں بھٹک رہے ہیں اور ناہید اسی گھر کے کونے میں بیٹھی سسکیاں لے لے کر رو رہی ہے۔ برآمدے میں، باورچی خانے میں اور کمروں میں مجھے ناہید کی آہٹ پا سنائی دیتی رہتی تھی۔

اس کی سسکیاں اور آہٹ پا تو میں پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی سنتا رہا ہوں لیکن کل سے میں ناہید کو دیکھ رہا ہوں۔ نیم کے پیڑ تلے کھڑی مسکراتی ہے اور پتوں کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے۔

ناہید گھر تو ویران کر گئی تھی لیکن پھانسی کی کوٹھڑی کو اسی کے تصور نے آباد رکھا۔

آہ! وہ ویران گھر! ناہید مر گئی تو گھر اجڑ گیا۔ عذرا آ جاتی تھی تو لگتا تھا۔ جیسے گھر میں ناہید والی رونق آ گئی ہے۔ میرے پاس بیٹھتی تھی تو دل کہتا تھا، بڑھ کے سینے سے لگا لو۔ ناہید جو خلا چھوڑ گئی ہے اسے عذرا ہی پُر کر سکتی ہے، لیکن میں کہتا تھا کہ عذرا سے مجھے ناہید والی محبت نہیں۔

ایسے لحات بھی آئے کہ میں نے لپک کر عذرا کو سینے سے لگا ہی لینا چاہا لیکن ایک غیبی ہاتھ نے یا میری اپنی ہی کسی قوت نے مجھے روک دیا۔

لیکن عذرا تو جیسے اس دوراہے سے ہٹ آئی تھی جہاں وہ ناہید کی زندگی میں کھڑی رہتی تھی۔ ایک شام میرے ہاں آئی۔

''ناہید تو آپ کو یاد آتی ہو گی''۔

''بہت!'' میں نے کہا۔

''اس کے بغیر کیسے کٹتی ہے؟''

''جگر کٹ رہا ہے عذرا!''

''کہو تو میں آ جاؤں''۔

''آ جایا کرو''۔

''نہیں! آ ہی جاؤں؟''

''پگلی!''

اور وہ اٹھ کے میرے قریب آ بیٹھی۔ اس کا ایک بازو میرے گلے کے گرد لپٹ گیا اور رخسار میرے رخسار کے ساتھ آ لگا۔

''آفتاب!''۔۔۔ وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولی۔۔۔ ''اپنے آپ کو فریب نہ دو۔ مجھے فریب نہ دو۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے، مجھے تم سے عشق ہے۔ آؤ۔۔۔۔''

میں نے اسے اپنے جسم سے الگ کرنے کی کوشش نہ کی۔ روحانی سا قرار آنے لگا

تھا۔

''میری منگنی ٹوٹ سکتی ہے آفتاب! میرے پاپا میری ہر بات مان جاتے ہیں''۔۔۔ اس نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔۔۔ ''میں تمہیں ناہید والی محبت دوں گی''۔

''لوگ کیا کہیں گے؟'' میں نے کہا۔۔۔ ''کم بخت نے اپنی بیٹی جتنی عمر کی لڑکی سے بیاہ رچا لیا''۔

''لوگ تو جب باتیں کریں گے نا جب میں کہوں گی کہ باپ نے مجھے بڈھے سے بیاہ دیا ہے''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''چالیس برس میں تم بڈھے تھوڑے ہی ہو گئے ہو''۔

بڑی مشکل سے اسے جذبات سے نکالا۔ وہ ٹپٹائی، جھنجھلائی اور روٹھ کے چلی گئی۔

دوسری شام ناصر آ گیا۔ وہی مسئلہ، وہی رٹ۔۔۔ ''عذرا کو تم نے مجھ سے چھین لیا ہے''۔۔۔ ناصر بہت بگڑا۔ میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ کسی بات پر آ ہی نہیں رہا تھا نہ کوئی بات اس کے پلے پڑ رہی تھی۔ قصور اس کا بھی نہ تھا۔ رقابت اندھا ہی تو کر دیتی ہے۔ میں نے چاہنے والوں کو پاگل ہوتے دیکھا ہے۔ ناصر اس حد کو چھو رہا تھا۔ غصے میں کہہ بیٹھا۔۔۔

''آپ کے ساتھ اٹھ بیٹھ کے وہ آوارہ ہو گئی ہے''۔

میں نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا اور میں چیخ اٹھا۔۔۔ ''خبیث! کسی کی بیٹی کو آوارہ کہتے تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا باپ بیٹی کو پاس بٹھا کر آوارہ بنا سکتا ہے؟''

وہ گال سہلاتے ہوئے مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں غصے میں کہے جا رہا تھا۔۔۔ ''میں چاہوں تو کل اس سے شادی کر لوں لیکن کروں گا نہیں۔ تم اس کے پاس بیٹھ کر عورتوں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ ٹسوے بہاتے ہو''۔

ناصر میرے ساتھ بے بس ہو کے لپٹ گیا اور سسکیاں لے لے کے رونے لگا۔ وہ ہار گیا تھا۔ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔۔۔ ''آفتاب دوست! مجھے عذرا لوٹا دو۔ میں پاگل ہو چلا ہوں''۔

یہی اس کی خامی تھی۔ کردار کی بنیادیں کچی تھیں۔

''جاؤ اس کے ساتھ ہنسو کھیلو''۔۔۔ میں نے اسے پیار سے کہا مگر دبدبے سے۔۔۔ ''تمہارے پاس وائلن ہے۔ اسے گیت سناؤ۔ اسے لطیفے سناؤ۔ وہ ہنسنا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ گھومو پھرو، مردوں کی طرح، وہ میرا نام لے تو میری باتیں کرو۔ جلومت، اس کا

ساتھ دو، ہر طرح، ہر رنگ میں، ناصر! میں تمہارا رقیب نہیں ہوں''۔

وہ سمجھ تو گیا لیکن عذرا سے پتہ چلا کہ پھر بھی لڑکھڑا جاتا تھا۔

عذرا مجھ میں اور ناصر میں تقسیم ہو چکی تھی۔

میرا وجود تلوار کی طرح ان کے درمیان آ گیا تھا۔ وہ کٹ رہے تھے۔

عذرا الگ کٹ رہی تھی۔

میں ناہید کے بغیر کٹ رہا تھا۔

ایک اور برس بیت گیا۔ میری زندگی کا چالیسواں برس۔

ناصر کے اعصاب پر میری ذات اور عذرا کی محبت اس بری طرح سوار ہوئی کہ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن اور زود پشیمانی پیدا ہو گئی وہ بات بات پہ بگڑنے لگا اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ایم اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔

ایک شام عذرا نے پھر شادی کی ضد شروع کر دی اور میں اسے ٹالنے میں مصروف ہو گیا۔

''تمہیں ناصر سے محبت نہیں رہی؟''

''ہے!''۔۔۔ وہ بولی۔۔۔ ''اسی طرح ہے''۔

''وہ تو رو رہا ہے کہ تم نے اسے ٹھکرا دیا ہے''۔

''وہ تو پاگل ہے''۔

''پھر؟''

''آفتاب!''۔۔۔ وہ بچوں کی طرح میرے ساتھ لپٹ گئی۔ بولی۔۔۔ ''آج بتا دو تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے؟ کیا میں تمہیں ناہید والا پیار نہ دے سکوں گی؟''

''نہیں دے سکو گی عذرا! وہ پیار تم مجھے دے ہی نہیں سکتی۔ دے بھی سکو تو میں قبول نہیں کروں گا''۔

اس رات وہ بہت روئی بچوں کی طرح روئی، وہ ہے ہی بچی۔ عمر ہی کیا ہے اس کی! اٹھارہ انیس برس۔

اگلی رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا کہ میں نے برآمدے میں تیز قدموں کی آہٹ سنی۔ وہ عذرا تھی۔ بھاگی چلی آ رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیوں عذرا؟ کیا بات ہے؟"

"حامد قتل ہو گیا ہے"۔

"حامد؟"

"ہاں حامد! ناصر کا کلاس فیلو۔ پولیس ناصر کو پکڑ لے گئی ہے..... کچھ کرو..... خدا کے لیے کچھ کرو..... میری محبت کے لیے..... آفتاب! ناصر کو چھڑا لاؤ"۔

میں دم بخود ہو گیا۔ گو یہ خبر میرے لیے حیران کن نہیں تھی۔ عذرا کی محبت میں ناصر کی یہ مزاجی کیفیت قابلِ فہم تھی۔ میرے وجود نے اس کی محبت کی راہ میں آ کر اسے بے طرح بھڑکا دیا تھا۔ وہ تو اب میرے ساتھ بھی الجھتا تھا تو بے طرح الجھتا تھا۔ عذرا اپنے رنگ کی جذباتی تھی اور ناصر اپنے رنگ کا جذباتی ثابت ہوا۔ میں جان گیا کہ ذرا سی بات پہ حامد سے دست و گریباں ہو گیا ہو گا اور بات قتل تک پہنچا دی ہو گی۔

"سوچتے کیا ہو آفتاب؟ کچھ کرو"۔۔۔ عذرا نے مجھے جھنجھوڑا۔۔۔ "تھانے جاؤ، دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ وہ پھانسی چڑھ جائے گا"۔

میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ مجھے سکون سا محسوس ہوا۔ پھر ایسی مسرت جیسے میں نے اپنی محبت کو پا لیا ہو۔

عذرا رو رہی تھی۔ مجھے یوں جھنجھوڑے دے رہی تھی۔ جیسے نیند سے جگا رہی ہو۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا وہ مجھ سوچنے کی فرصت نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹنے کے لہجے میں چلا کر کہا۔۔۔ "عذرا! چپ رہو عذرا!"۔۔۔ وہ سہم سی گئی۔ آہ! ذرا سی بچی کو میں نے ڈرا دیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی اشک آلود آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔

"وہ پھانسی چڑھ جائے گا!"۔۔۔ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہاں تک نوبت پہنچی تو میں پھانسی چڑھوں گا"۔

"نہیں!"۔۔۔ وہ گھبرا کر میرے سینے سے لگ گئی۔ بولی۔۔۔ "میرا مطلب یہ تو نہیں تمہارے دشمن پھانسی چڑھیں"۔

"تم گھر چلی جاؤ عذرا! میں تھانے جاتا ہوں"۔۔۔ وہ جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا۔۔۔ "ذرا ٹھہرو۔ تمہیں کچھ علم ہے اس نے حامد کو کہاں اور کس طرح قتل کیا ہے؟"

"ہاں! مجھے ساری بات کا علم ہے"۔ عذرا نے کہا۔۔۔ "دو گھنٹے ہوئے ناصر

گھبرایا گھبرایا میرے پاس آیا۔ پاپا سٹڈی میں تھے۔ اس کا دم اکھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ میں نے حامد کو قتل کر دیا ہے۔ حامد ایک ہوٹل میں رہتا تھا....." عذرا کو جو کچھ معلوم تھا اس نے سنا دیا.....

دو روز پہلے حامد نے عذرا پہ فحش سا فقرہ چست کیا تھا۔ عذرا نے ناصر سے ذکر کیا۔ وہ حامد کے کمرے میں جا پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ناصر کا ارادہ اس قدر خوفناک تو نہیں تھا لیکن بات بڑھ گئی۔ ناصر کا مزاج پہلے ہی بے ٹھکانہ اور بھڑکا ہوا تھا۔ نوبت گالی گلوچ تک آ گئی۔ حامد کی میز پر چاقو پڑا تھا۔ ناصر نے وہی اٹھا لیا۔ حامد کو توقع نہیں تھی کہ ناصر اسے جان سے ہی مار دے گا۔ اس نے اپنا کوئی تحفظ نہ کیا اور ناصر کی طرف لپکا ادھر ناصر نے ایسا بے قابو سا وار کر دیا کہ چاقو حامد کے دل میں اتر گیا۔

ناصر وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پاگل ہوتا رہا۔ جب مقتول ٹھنڈا ہو گیا تو ناصر بھاگ اٹھا۔ وہ ہوٹل کے پچھواڑے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ ایک بیرے نے اسے دیکھ لیا۔ بیرا اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد قتل کا انکشاف ہو گیا۔ پولیس آ گئی اور بیرے کی نشاندہی پر ناصر کو گرفتار کر لیا۔

میں عذرا کو گھر بھیج کر ہوٹل میں گیا۔ وہاں قتل کے متعلق وہ تفصیلات بھی سنیں جو عذرا کو معلوم نہیں تھیں۔ وہاں ہر میز اور ہر کمرے میں یہی موضوع تھا۔ ہوٹل کا ماحول ہی پُراسرار اور سنسنی آلود بنا ہوا تھا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ناصر پچھواڑے کی سیڑھیاں اترتے آخری سیڑھی سے پھسل کر گر پڑا تھا اور چاقو وہیں گر گیا تھا جو پولیس نے قبضے میں لے لیا تھا۔

وہاں سے میں تھانے کی طرف چل پڑا۔ میرا دماغ مشین کی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میری رگ رگ میں سکون اور اطمینان تھا جیسے سارے دکھ دور ہو گئے ہوں۔ جیسے میں نے اپنے لیے بیس برس پہلے کے ایک گناہ کی سزا تجویز کر لی ہو۔ جیسے میں نے ناہید کی موت کی سزا پا لی ہو لیکن غالب خیال عذرا کا اور اس کے سہاگ کا تھا۔

میں متعلقہ تھانے میں جا پہنچا۔

برآمدے میں عذرا کے والد صاحب اور ناصر کے لواحقین سراپا ماتم بنے بیٹھے تھے۔ اندر کمرے میں تھانیدار بیٹھا تھا۔ دو چار سپاہی ادھر اُدھر کھڑے تھے۔ جس بیرے نے

ناصر کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا وہ فرش پر بیٹھا تھا اور دیوار کے ساتھ بنچ پر ناصر ہتھکڑیوں میں بندھا بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی نے ہتھکڑی تھام رکھی تھی۔ خون آلود چاقو میز پر پڑا تھا۔

ناصر نے مجھے دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔ تھانیدار نے میری طرف دیکھا۔

''میں شاید اس طرح حاضر نہ ہوتا'' ___ میں تھانیدار سے مخاطب ہوا ___ ''لیکن ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ اس قتل کے جرم میں ایک بے گناہ کو پکڑ لائے ہیں۔ میں جسے قتل کرنا چاہتا تھا کر چکا کسی بے گناہ کو پھانسی نہیں چڑھنے دوں گا۔ قاتل میں ہوں۔ حامد کو میں نے قتل کیا ہے۔ میرا بیان لکھئے''۔

''آفتاب!'' ___ ناصر کی دبی ہوئی چیخ سنائی دی۔

''ناصر! اچھا ہوا مجھے جلدی پتہ چل گیا کہ غلط فہمی میں تم دھر لئے گئے ہو'' ___ میں نے ناصر کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ___ ''ورنہ میں رات کی گاڑی سے کہیں بھاگ چلا تھا'' ___ میں نے اسے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو وہ سمجھا کہ میں کوئی چال چل رہا ہوں۔ وہ چپ رہا۔

تھانیدار نے بیرے کو ڈانٹ دیا ___ ''کیوں بے حرام زادے! تُو نے کیسے کہہ دیا تھا کہ تُو نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ جلدی بول ان دونوں میں سے کون تھا ___؟'' تھانیدار نے گرج کر اسے ننگی گالی دی۔

غریب سا بیرا بوکھلا گیا۔ بولنے لگا تو اس کی زبان ہکلا گئی۔ اچھا ہوا کہ اس کی زبان ہکلا گئی اور میں بول پڑا۔

''اس نے بھاگتے ہوئے ضرور دیکھا ہے لیکن مجھے، میں ہوٹل کے پچھواڑے والی سیڑھیوں کی راہ بھاگ رہا تھا اور یہ نیچے کھڑا تھا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ اسے غلطی لگی ہے۔ کیوں رے!'' میں نے بیرے سے مخاطب ہو کے پوچھا ___ ''میں آخری سیڑھی سے گرا نہیں تھا؟ چاقو وہیں نہیں رہ گیا تھا؟''

''ہاں حضور!'' ___ اس نے تھانیدار سے کہا ___ ''یہ آخری سیڑھی سے گرا تھا اور سرپٹ بھاگ گیا تھا۔ یہی تھا''۔

میں نے تھانیدار کو اپنی پتلون دکھا دی جو گھٹنوں سے گرد آلود تھی۔ میں نے تھانے کی

طرف جاتے اندھیرے میں جا کر گھٹنے زمین پر رگڑ لیے تھے۔ میں نے کنکھیوں سے ناصر کی پتلون دیکھی۔ وہ صاف تھی شاید اس نے گرفتاری سے پہلے بدل لی تھی۔

خون آلود چاقو میز پر رکھا تھا۔ میں نے چاقو اٹھا لیا اور کہا ___ ''یہ چاقو دراصل مقتول کا ہے۔ میں نے اسے اسی سے قتل کیا ہے۔ وار دل پہ لگا تھا اور وہ ایک ہی وار میں ختم ہو گیا تھا''۔

میں نے باتیں کرتے کرتے چاقو کے دستے کو ہاتھ میں خوب مسلا پھر اسے یوں ہاتھ میں پکڑا جیسے عام طریقے سے چاقو پکڑا جاتا ہے۔ پھر چاقو تھانیدار کے حوالے کر دیا۔ جو اس نے کاغذ کے ایک لفافے میں رکھ لیا۔

ناصر کو میرے بیانات کے بعد رہا کر دیا گیا اور اس کی ہتھکڑی مجھے پہنا دی گئی۔ دوسرے روز میں نے مجسٹریٹ کے سامنے اقبال جرم کر لیا لیکن قانون کی نگاہ میں بات اب بھی مشکوک تھی۔ ناصر اب بھی زد میں آ سکتا تھا۔ میں نے اس کا تحفظ مکمل کرنے کی خاطر اپنے اقبال جرم میں اضافہ کر دیا کہ چاقو کے دستے پر انگلیوں کے نشانات کا معائنہ کرائیے۔ دستے پر میری انگلیوں کے نشان ہوں گے۔

پولیس نے متعلقہ ماہر سے معائنہ کرایا تو وہ میرے ہی نشان نکلے۔ تھانے میں کوئی بھی محسوس نہ کر سکا تھا کہ میں نے جب تھانیدار کی میز سے چاقو اٹھایا تھا تو اسے ہاتھ میں لے کے باتوں ہی باتوں میں خوب مسلا تھا اور ناصر کی انگلیوں کے نشان ہٹا کر اس پر اپنے نشان ثبت کر دیئے تھے۔

اس دنیا میں اب دو ہی جگہ میرے نشان باقی رہ گئے ہیں۔ اس چاقو پر میری انگلیوں کے نشان اور عذرا کے دل پر میری محبت کے نقوش۔ یہ نشان اور یہ نقوش مٹ جائیں گے۔

مقدمے کے دوران ہی عذرا اور ناصر کی شادی ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم ہوا تو بخدا میں بہت ہی خوش ہوا۔ اگلے روز عذرا مجھے جیل میں ملنے آئی۔ ناصر ساتھ تھا۔ عذرا نے سیاہ قمیض اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے مہندی والے ہاتھ پیٹھ پیچھے چھپا رکھے تھے۔

مجھے بچانے کے لیے عذرا اور ناصر نے دو وکیل کئے تھے لیکن میں نے دونوں وکیلوں کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

عذرا جب بھی ملنے آتی ہے۔ روتی ہے۔ کاش! میں اس ننھی سی گڑیا کو اس سرخ

جوڑے میں دیکھ سکتا جو اس نے شادی کے پہلے روز پہنا تھا۔ جب بھی آتی ہے کہتی ہے۔
''آفتاب! میرا مطلب یہ تو نہ تھا''___ اور میں کہہ دیتا ہوں___ ''عذرا میرا مطلب کچھ ایسا ہی تھا''۔

آج آخری بار ملنے آئے گی۔ ملاقات کا وقت ہو رہا ہے۔ وہ جیل کے دروازے پہ پہنچ چکی ہو گی۔ ملاقات کی اجازت ملنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ آج میں اسے آخری بار دیکھوں گا۔ جب چلی جائے گی تو اس کی آہٹ پاسنوں گا اور اس آہٹ کو ذہن میں محفوظ کر کے کل صبح اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا۔

میں آج اس کے دو سوالوں کا جواب دے دوں گا___ ''تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے؟ اور تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور یہ محبت ناصر والی نہیں''___ ورنہ تمام عمر اس کے دل میں خلش باقی رہے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غلطی اس کی ازدواجی زندگی کو بے مزہ کیے رکھے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بھید کی خلش مجھے قبر میں چین سے نہ سونے دے۔ میں آج ناصر کو بھی......

''آفتاب علی! قیدی نمبر تین سو گیارہ!''

''میں ہوں جمعدار!''

''تمہارے دو ملاقاتی۔ باتیں کر لو۔ کوئی چیز نہ لینا۔ ہاتھ سلاخوں سے باہر نہ کرنا......''

''مجھے معلوم ہے جمعدار!''

عذرا اور ناصر آ رہے ہیں......

''آ گئیں عذرا!...... آؤ ناصر!...... اور عذرا! خدا کے لیے آج نہ رو...... میری زندگی کے آخری دن نہ رو...... اور تم اسی سیاہ قمیض میں آ گئیں! میری بات نہ مانی تو نے...... ناصر!...... اوہ! تم بھی رو رہے ہو...... عذرا! سنو سلاخوں کے قریب آ جاؤ۔ اب باتوں کا وقت نہیں ہے۔ کتنی باتیں کروں! کتنی باتیں نہ کروں! آج تمہیں ایک کہانی سنا جاتا ہوں جو میں کسی کو نہ سنا سکا تھا۔ اس کہانی نے میرے سینے میں چھپ چھپ کر ناہید کو ڈس لیا ہے۔ یہی کہانی تمہاری اور ناصر کی محبت کو ڈنک مارتی رہی ہے۔ کاش! میں پہلے ہی روز سنا دیتا۔ نہ ناہید مرتی نہ ناصر ہی اس قدر غصہ میں بھرتا کہ یہ کسی کو قتل کر دیتا......

''ادھر دیکھو عذرا! میری آنکھوں میں جھانکو''۔

''عذرا روئے جا رہی ہے۔ کیسے بہلاؤں اسے!''

''تجھے میری محبت کی قسم عذرا!...... یوں...... میری طرف دیکھو۔ آنسو پونچھ ڈالو تاکہ میں تمہیں اچھی طرح نظر آ سکوں......

''تم نے مجھ سے کئی بار پوچھا تھا کہ میں کیوں تمہیں نہیں کہتا کہ مجھے تم سے محبت ہے...... عذرا! بیس برس گزرے میں نے ایک عورت سے محبت کی تھی۔ وہ لڑکی نہیں تھی، عورت تھی۔ میری عمر بیس برس تھی اور اس کی عمر تیس برس سے کچھ اوپر، لیکن اس نے لڑکپن کی شوخیاں ابھی تک چہرے کی دل کشی میں محفوظ رکھی ہوئی تھیں اور دوشیزگی کا خمار ابھی تک اس کی نشیلی آنکھوں میں تر و تازہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی عمر کے سال بیت گئے ہیں اور وہ بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ وہ شادی شدہ تھی، اور وہ اس کی ازدواجی زندگی کا آٹھواں سال تھا لیکن اس کی مسکراہٹوں میں کنوار پن ابھی تک چھلک رہا تھا اور اس کی مسکراہٹوں میں ایک گونہ تشنگی بھی تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش انگارے کی طرح تپتا تھا۔ سینے میں جیسے شعلے رکے ہوئے تھے......

''جانے دو ان تفصیلات کو کہ وہ کس طرح میری راہ میں آئی یا میں کس طرح اس کی جلتی ہوئی دنیا میں جا پہنچا۔ اسے واردات سمجھ لو یا حادثہ کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ یہ سامنا اچانک تھا، محض اتفاقیہ، پھر ہم دونوں اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ ایسا ہی اتفاقیہ سامنا پھر بھی ہو......

''ہم دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھا کیے، پھر قریب آئے، پھر اس قدر قریب کہ ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہونے لگے......

''وہ ایک طوفانی رات تھی عذرا! بارش بہت تیز تھی، بجلیاں گرج اور چمک رہی تھیں۔ ہوائیں تند تھیں۔ میں گھر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس عورت کا گھر راہ میں پڑتا تھا۔ میں اس کے گھر کے سامنے پہنچا تو قدم خود ہی رک گئے۔ طوفان اور تیز ہو گیا۔ شاید تیز نہ ہوا ہو لیکن میری داخلی دنیا کا طوفان بہت تند ہو گیا تھا۔ مجھے خیال آ گیا کہ اس کا خاوند دورے پر گیا ہوا ہے اور وہ اکیلی ہے......

''میں نے دروازے پہ دستک دی۔ بہت زور سے دستک دی تھی میں نے۔

طوفان کا شور بہت تھا۔ دروازہ کھلا۔ وہ نیم وا کواڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور کواڑ بند کر لئے اندر لے جا کر مجھے اپنے خاوند کے کپڑے پہنا دیئے......

''ہم تنہا تھے عذرا! اور قریب تر بیٹھے تھے کہ ہم بہت قریب ہو گئے۔ ہم اور قریب ہو گئے۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں اس قدر زور سے بھینچا کہ میں چونک اٹھا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ایک عورت نظر آئی جو ندی کنارے تڑپ رہی تھی اور پانی کے دو قطروں کو ترس رہی تھی۔ آٹھ برس سے تڑپ رہی تھی۔ اس کی اکھڑی سانسوں میں میں نے الاؤ محسوس کیا......

''اس کا انگ انگ پھنک رہا تھا...... دیکھتے ہی دیکھتے وہ سراپا شعلہ بن گئی اور میں اس شعلے کی لپیٹ میں آ گیا...... وہ ایک سرمدی لمحہ تھا عذرا!...... بجلی زور سے کڑکی۔ گھٹا بڑی زور سے گرجی۔ طوفان کا زور اور بڑھ گیا۔ رات کے اندھیرے میں زلزلے بپا ہو رہے تھے۔ دھرتی کانپ رہی تھی۔ چھتیں کانپ رہی تھیں۔ سانسیں ہانپ رہی تھیں...... اور محبت کی کوکھ سے ایک لغزش جنم لے رہی تھی......

''پھر نو ماہ بعد اس لغزش کی کوکھ سے ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام اس کی ماں نے عذرا جمال رکھا اور مر گئی......

''حیرت سے نہ دیکھو مجھے عذرا! تم میری بچی ہو...... میری بیٹی!

تم وہ خلا کیوں کر پُر کر سکتیں جو ناہید میری زندگی میں چھوڑ گئی تھی......

ناصر دوست! میں تمہارا رقیب تو نہ تھا...... میری بچی کو دکھ نہ دینا۔ جب یہ اداس ہو تو اسے گیت سنایا کرنا۔ وہی گیت......

کون کہے پھر کب مل بیٹھیں
جنم جنم کے ساتھی

''اور کل میری لاش لینے آ جانا...... تم ہی آؤ گے اور کون ہے میرا!...... اور ناہید کے پہلو میں دفن کر دینا''۔

وہ چلے گئے ہیں...... عذرا اور ناصر...... میری بیٹی عذرا!

موت دہلیز پہ آ بیٹھی ہے!

اور میں اسے دیکھ رہا ہوں!

چند لمحے، چند سانسیں!

ناہید باہیں پھیلائے نیم کے پیڑ تلے کھڑی ہے!

اور میں اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

آہ! سکون...... کس قدر سکون!

⌘ ⌘ ⌘

تحفہ

حمیدی

نور جہاں اگر بیگم اکبر نہ ہوتی تو یہی ڈاکٹر جن کی کاریں اس کی کوٹھی کے سامنے کھڑی رہتی تھیں اور یہی دوائیاں جو اس کی رگوں میں انڈیلی جا رہی تھیں، سراب کی طرح دکھائی دیتیں اور پیشتر اس کے کہ کوئی اسے بتاتا کہ یہ روگ کیا ہے محلے والے اس کے کفن دفن کا بندوبست کر رہے ہوتے لیکن وہ بیگم اکبر تھی۔ پچیس ایکڑ میں قطار در قطار کھڑے سنگتروں اور مالٹوں کے پیڑوں سے روپوں کی تھیلیاں جھڑتی تھیں۔ کرنل اکبر مرحوم کی آبائی جائیداد کے بیشتر حصے کی وہ مالک تھی اور جو دو مربعے انگریزوں نے پنشن کے وقت دیئے تھے وہ بھی بیگم اکبر کے نام تھے۔ شہر میں یہ اتنی بڑی کوٹھی اور ایسی دو اور کوٹھیاں بھی بیگم اکبر کی تھیں اور جو دولت بنک میں تھی وہ بھی بیگم اکبر کی ہی تھی۔

کوئی دس برس گزرے کرنل اکبر نے نور جہاں سے شادی کی تھی۔ یہ کرنل کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی نے اپنی جوانی کرنل اکبر کی نذر کر دی تھی اور خوب ساتھ نبھایا تھا۔ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے تو کرنل کے قدم رک گئے۔ وہ عمر کی اس منزل سے آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فریب دے دیا اور بڑھاپے کو قبول ہی نہ کیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح گھوڑا بھگا سکتا تھا جس طرح جوانی میں بھگایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ دریا میں کود گیا اور دریا تیر کر پار کر لیا۔ دو روز بعد اس نے چار فرلانگ کی دوڑ لگائی اور یہ فاصلہ اتنے ہی وقت میں طے کر لیا جتنے وقت میں دس سال پہلے طے کر لیا کرتا تھا لیکن اسے بیوی کے چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں نظر آنے لگیں۔ بڑھاپے کے علاوہ وہ اگلے وقتوں کی بیوی تھی مگر زمانے کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ کرنل اکبر نے دونوں گھوڑے بیچ ڈالے اور اصطبل کی جگہ گیراج بنوا لیا۔ ایک روز اس نے اس حقیقت کو ذہن سے نکال دیا کہ دو ماہ بعد

اس کی عمر اڑتالیس سال ہو جائے گی۔ نئے ماڈل کی کار میں بیوی کو بٹھایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کار بڑے ہی پرانے ماڈل کی ہو۔

وہ فوجی تھا۔ فوجی فریب کار نہیں ہوا کرتے۔ اس نے اپنی بیوی کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے پاس نہایت معقول بہانہ تھا۔ وہ یہ کہ اس کی بیوی نے چار بچے جنے تھے مگر چھ برس کی عمر سے کوئی بچہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ دو ٹائیفائیڈ سے مر گئے تھے۔ ایک چیچک سے اور چوتھے کی عمر بمشکل پانچ برس تھی جب گھوڑی نے ایسی دولتی ماری کہ بچے کی کھوپڑی کھل گئی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ کرنل کو معلوم ہوا تو اس نے بندوق میں دو کارتوس ڈالے اور دونوں نالیاں گھوڑی کی کھوپڑی میں خالی کر دیں۔

کرنل اکبر نے جب اپنی بیوی کو کہا کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو بیوی پر بے رحم سی خاموشی طاری ہو گئی جیسے کسی نے سینے پر پستول رکھ کر اس کی زبان بند کر دی ہو۔ اس نے ہاں بھی نہ کہی نہ بھی نہ کہی اور احتجاجاً دو آنسو بھی نہ بہائے۔ وہ پینتالیس برس کی عمر میں ستائیس برسوں کی ازدواجی زندگی کی اچھی بری یادوں کو سینے میں سمیٹ کر میکے گاؤں چلی گئی۔ کرنل نے بیس ایکڑ زمین اس کے نام منتقل کر دی۔ اس نے زمین کے کاغذات کے ساتھ تیس ہزار روپیہ نقد بھی بیوی کو بھیجا۔ بیوی نے کاغذات بھی اور روپیہ بھی واپس بھیج دیا۔ ان کے ساتھ کوئی پیغام نہ تھا۔ چند آنسو تھے جو کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔

اس وقت نور جہاں کی عمر بیس اکیس برس تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے کی گریجویٹ لڑکی تھی۔ کرنل اکبر نے اسے دو چار بار دیکھا تھا۔ نور جہاں صرف حسین نہیں تھی اس میں سنجیدہ سی قسم کی شگفتگی تھی جس نے اسے اس عمر اور اس کلاس کی فیشن پرست لڑکیوں سے الگ تھلگ شخصیت دے رکھی تھی۔ اس امتیازی خوبی میں ایسی دل کشی تھی کہ کرنل اکبر نے اپنے عمر بھر کے ساتھی سے نگاہیں پھیر لیں اور نور جہاں کو شادی کا پیغام دے دیا۔ نور جہاں اپنے فیصلوں میں آزاد تھی، اسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کوئی روکنے والا نہ تھا کہ تو بیس برس کی لڑکی پچاس برس کے بڈھے سے کیوں شادی کرے گی؟

ایک ہی مہینے بعد نور جہاں اونچے حلقوں میں بیگم اکبر کی حیثیت سے متعارف ہوئی۔

چہ میگوئیاں ہوئیں، کھسر پھسر ہوئی اور نور جہاں کے جواں سال امیدواروں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ بدھے کے پاس کب تک رہے گی۔ آخر ہمارے پاس آجائے گی۔ کہاں پچاس برس کا بوڑھا اور کہاں بیس برس کی چھوکری، لیکن نور جہاں کے رویئے نے سب کے منہ بند کر ڈالے۔ خود کرنل اکبر یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ نور جہاں اسے دیوانہ وار چاہنے لگی تھی۔ پہلے پہل تو اسے شک ہوا کہ یہ فریب کاری ہے لیکن نور جہاں کے مزاج میں سنجیدگی اور متانت تھی، اس نے تمام شکوک رفع کر دیئے۔

یہ تو نفسیاتی الجھن تھی جسے کرنل اکبر نے نادانستہ سلجھا دیا تھا۔ نور جہاں کو کرنل کے روپ میں اپنا مرا ہوا باپ مل گیا تھا۔ وہ پانچ برس کی تھی جب اس کا باپ مر گیا تھا۔ کوئی بڑا بھائی نہ تھا جو باپ کی جگہ پُر کرتا۔ دو برس بعد ماں بھی مر گئی اور بچی شفقت سے محروم ہو گئی۔ عزیز رشتہ دار اچھے تھے جنہوں نے بچی کو پیار سے پالا، پڑھایا اور کرنل اکبر کے ساتھ بیاہ دیا۔ جب کرنل نے پہلی بار اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اپنا گال اس کے رخسار سے لگایا تو نور جہاں کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے جذبات کس قدر تشنہ رہے ہیں۔ تشنگی کا یہ تلخ سا احساس عروج پہ جا پہنچا اور جوں جوں کرنل کے بازوؤں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ یہ احساس مرتا چلا گیا اور جب ازدواجیت کی پہلی سحر کا اجالا نکھرا تو اس نکھار نے نور جہاں پر طلسم طاری کر دیا۔ ابھی کرنل کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ نور جہاں نے اسے دیکھا۔ وہ اسے بڑا ہی پیارا لگا مگر سمجھ نہ پائی کہ اس شخص کا احترام کروں یا اس سے پیار کروں۔ ایک جذبہ سا تھا جس نے اس کی رہبری کی۔ اس کے ہونٹ مقناطیسی قوت سے کھنچنے لگے اور دوسرے لمحے یہ ہونٹ کرنل کی پیشانی سے جا لگے۔ اس کا ہاتھ کرنل کے گالوں کو سہلانے لگا اور کرنل کی آنکھ کھل گئی۔

یہ لاشعوری حرکت تھی جس میں جذباتی تشنگی کی تسکین کا عنصر نمایاں تھا۔ کرنل اسے اداکاری سمجھ بیٹھا لیکن لاشعور نے نور جہاں سے بے خیالی میں ایسی اور کئی حرکتیں کروا ڈالیں جنہیں کرنل سمجھ گیا۔ سوسائٹی نہ سمجھ سکی اور کرنل اور بیگم اکبر موضوعِ سخن بنے رہے۔ نور جہاں کرنل کی ذات میں جذب ہو گئی۔

دس سال گزر گئے۔ بیگم اکبر تیس برس کی اور کرنل اکبر ساٹھ کے قریب جا پہنچا۔ بڑھاپے کا عروج شروع ہو گیا ادھر جوانی عروج کو جا پہنچی اور سوسائٹی میں چہ میگوئیاں اور بلند

ہوگئیں لیکن کرنل جوں جوں بوڑھا ہوتا جارہا تھا، بیگم اس کی ذات میں سماتی چلی جارہی تھی۔ اس نے اسے پیار دیا تھا اس پر وہ اپنا آپ قربان کر دینا چاہتی تھی۔ بیگم کی نگاہ میں کرنل کے تین روپ تھے...... باپ بھی، خاوند بھی اور محبوب بھی...... اسے ہر روپ عزیز تھا۔

اور ایک روز شادی کی دسویں سالگرہ کے دو روز بعد بجری سے لدا ہوا ایک ٹرک بیگم اکبر کو بیوہ کر گیا، وہ ایک بار پھر یتیم ہو گئی اور اس کا محبوب کچلی ہوئی کار کے سٹیئرنگ پر لہولہان ہو کے ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ بیگم اکبر نے سر پیٹ لیا۔ رو رو کے پاگل ہونے لگی اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر ننگے پاؤں کوٹھی کے لان میں گھومنے لگی۔ وہ بھی اس روز کرنل اکبر کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن کرنل اسے یہ کہہ کر گھر چھوڑ گیا تھا کہ دو اڑھائی گھنٹوں تک لوٹ آؤں گا۔ وہ اب پچھتا رہی تھی کہ وہ ضد کر کے کیوں نہ ساتھ چلی گئی۔ اگر ساتھ ہوتی تو اکٹھے مرتے۔

تین چار مہینوں میں بیگم اکبر کا حلیہ ہی بگڑ گیا۔ جنوری کے آخری ہفتے کی رات تھی کہ لیٹے لیٹے اس پر ہول طاری ہو گیا۔ کچھ ایسی بے رحم سی گھٹن طاری ہوئی جیسے اسے زندہ دفن کر کے اوپر سیمنٹ کا پختہ مقبرہ تعمیر کر دیا گیا ہو۔ ڈبل بیڈ کی سپاٹ وسعت سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ننگے پاؤں لان میں نکل گئی۔ رات یخ تھی، گھاس بھی یخ اور یخ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ کئی بار اسی طرح رات کو باہر نکل آئی تھی مگر اس رات اس نے ٹانگوں کی ہڈیوں میں میٹھا میٹھا درد محسوس کیا۔ پھر بھی وہ ڈیڑھ دو گھنٹے لان میں ننگے پاؤں گھومتی رہی۔ کمرے میں جا کر سو گئی۔ علی الصبح آنکھ کھل گئی تو وہ پھر نکل آئی۔ گرم کمرے سے یکلخت سردی میں نکل جانے سے ہڈیوں کا میٹھا میٹھا درد شدید ہو گیا۔ درد کی مٹھاس میں تلخی آ گئی۔ دو دنوں بعد یہ حال کہ اسے دیوار کا سہارا لے کر چلنا پڑا اور دس روز بعد وہ ٹانگوں پہ کھڑا ہونے سے بھی معذور ہو گئی۔

اگر وہ ابتدا میں ہی علاج کرا لیتی تو شاید نوبت معذوری تک نہ پہنچتی لیکن اسے اپنے جسم کے ساتھ تو جیسے دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔

یوں تو کرنل اکبر کے مرتے ہی بیگم اکبر کی کوٹھی میں غم خواروں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا لیکن اس کی بیماری کو دیکھ کر یہ ہجوم اور گھنا ہو گیا۔ اس انبوہ میں اس کے پرانے امیدوار بھی تھے اور نئے بھی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اس کے متعلق سیکنڈل تخلیق کئے تھے اور انہیں بڑی محنت

سے نشر کیا تھا۔ اب اس کی کوٹھی کے سامنے سے ایک ڈاکٹر کی کار ہٹتی تو ایک اور آ رکتی تھی۔ ان میں بعض ڈاکٹروں کو تحفتہً بھیجا جاتا تھا۔ بیگم اکبر کے کمرے میں دوائیوں کا انبار لگتا جا رہا تھا۔ ہر ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے نسخوں اور تشخیص پر لکیر پھیر کر اپنا علاج تجویز کر جاتا تھا۔ امیدواروں نے ہمدردی کے پردے میں اپنے اپنے ڈاکٹر مقابلے میں اتار رکھے تھے۔

بیوہ ہو جانے کے علاوہ بیگم اکبر کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ابھی جوان تھی، حسین بھی اور بے انداز جائیداد کی مالک بھی۔ اگر ایک ڈاکٹر کا علاج ہوتا تو شاید بیگم صحت یاب ہو جاتی مگر وہاں بھانت بھانت کی تشخیص اور طرح طرح کے علاج ہو رہے تھے۔ یہ دراصل علاج نہیں تھا بلکہ انجکشنوں اور پیٹنٹ دوائیوں کی زبان میں بولیاں دی جا رہی تھیں۔ ہر امیدوار ایک سے ایک بڑھیا ڈاکٹر لا رہا تھا۔ بعض نے دبی زبان میں عمر بھر کی رفاقت کے دعوے بھی کر دیئے لیکن بیگم اکبر ہمدردوں کی نظروں کے زاویئے بھانپ گئی۔ وہ جان گئی کہ یہ نظریں کوٹھی اور جائیداد کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ تو گدھ تھے جو بیگم کے مرنے کے منتظر تھے۔

اس نے بار بار چاہا کہ ان غم خواروں کو کہہ دے کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔ مجھے سکون سے مرنے دو۔ میری جائیداد آپس میں بانٹ لو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں نے اکبر سے محبت کی تھی۔ یہ تو اس کی بھول تھی کہ اس نے ساری جائیداد میرے نام کر دی تھی۔ مرحوم میری محبت کی قیمت نہ جان سکا۔ کاش وہ زندہ رہتا اور میں اس کی جگہ دولت کے انبار زمین میں دفن کر دیتی۔

وہ کسی کو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اونچی سوسائٹی کے آداب نے اسے بولنے نہ دیا۔ ہڈیوں کا روگ بڑھتا گیا اور وہ اب پہیوں والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کرب واضطراب میں مرحوم خاوند کو رہ رہ کے پکارا۔ تصوروں میں پہیوں والی کرسی پر اس کا تعاقب کیا۔ ہو حق سی ویران اور علیل راتوں میں اسے ڈبل بیڈ پر ٹٹولا۔ بارہا اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ اس نے سرہانوں میں منہ چھپا کر اس کی بو باس سونگھی اور سونے کے کمرے میں اس کی جو تصویر لٹک رہی تھی اس پر ہر صبح تازہ پھولوں کا ہار بھی ڈلواتی رہی۔

ڈاکٹروں، تیمارداروں اور غم خواروں کے انبوہ میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ وہ اختر تھا۔ اڑتیس چالیس برس کی عمر کا آدمی تھا۔ کوئی ایک سال ہوا اس نے بیس لاکھ کے سرمائے سے کپڑے کے ایک چھوٹے سے کارخانے کی ابتداء کی تھی مگر کاروبار خسارے

میں جا رہا تھا۔ وہ بیگم اکبر سے اس وقت ملا جب وہ بالکل ہی معذور ہو کر پہیوں والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کرنل اکبر کے دوست کی حیثیت سے کرایا اور کہا کہ وہ بارہ سال جرمنی میں گزار کر دو چار ہی دن ہوئے واپس آیا ہے۔

اختر کے سلوک برتاؤ میں ظاہر داری اور تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے کرنل اکبر کے غم میں منہ نہ بسورا، نہ اداکاری کا کمال دکھایا، نہ بیگم اکبر سے اس کی بیماری کی تفصیلات سنیں اور نہ کوئی مشورہ دیا۔ صرف اتنا پوچھا۔۔۔ ''علاج کس کا ہو رہا ہے؟''

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں''۔۔۔ بیگم اکبر نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ ''کمبخت خود ہی چلے آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے فالج ہے، کوئی ہڈیوں کا دق بتاتا ہے۔ ایک نے گنٹھیا کہا ہے''۔۔۔ اس کے آنسو نکل آئے۔ سسکی لے کے بولی۔۔۔ ''میرے اپنے ڈاکٹر کو تو اس لشکر نے دھتکار کے الگ کر دیا ہے''۔

''آپ کون سے ڈاکٹر سے مطمئن ہیں؟''

''کسی سے بھی نہیں''۔

اختر نے سر جھکا لیا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ لمحے آہستہ آہستہ رینگنے لگے۔ اختر نے سر اٹھایا بیگم اکبر نے اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسا تاثر دیکھا جو تیمارداروں کے ہجوم سے بہت ہی مختلف تھا۔

''گھر کا اور زمینوں وغیرہ کا حساب کتاب رکھنے والا کوئی ہے؟''۔۔۔ اختر نے دکھ زدہ لہجے میں پوچھا۔۔۔ ''کوٹھیوں کا کرایہ قاعدگی سے آ رہا ہے؟''

''یہی نوکر چاکر ہی ہیں''۔۔۔ بیگم اکبر نے علیل آواز میں جواب دیا۔۔۔ ''ان ہی کے رحم و کرم پر جی رہی ہوں۔ یہ چیک بک رکھی ہے۔ خانساماں دوسرے چوتھے روز چیک کٹوا کر لے جاتا ہے''۔

اختر یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم اکبر کو اس کی عتاب آلود آواز سنائی دینے لگی۔ وہ خانسامے اور نوکروں کو ڈانٹ رہا تھا۔ وہ غصے میں بولتا کمرے میں آیا اور بیگم سے کہا۔

''یہاں نوکروں کی یہ فوج کیوں رکھی ہوئی ہے؟''۔۔۔ اس نے بیگم اکبر کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔۔۔ ''میں نے دونوں نوکروں کو چھٹی دے دی ہے۔ خانساماں سے

پیسے لے کر انہیں آج تک کی تنخواہ دے دی ہے''۔

وہ بول رہا تھا کہ کوٹھی کے سامنے کار رکنے کی آواز آئی۔ اختر نے بیگم کی طرف دیکھا تو اس نے اکتاہٹ سے کہا۔۔۔ ''ڈاکٹر ہو گا''۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ابھی ہیلو مسز اکبر ہی کہا تھا کہ اختر بول پڑا۔۔۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ بڑے شوق سے تشریف رکھیے لیکن انہیں کوئی دوائی نہ دیجیے''۔۔۔ ڈاکٹر نے حیرت زدہ سی نظروں سے اختر کی طرف دیکھا۔ اختر نے کہا۔۔۔ ''میں انہیں کسی سپیشلسٹ کو دکھانا چاہتا ہوں''۔۔۔ ڈاکٹر نے بولنے کی کوشش کی لیکن اختر نے کہا۔۔۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں معافی چاہتا ہوں''۔

ڈاکٹر نے بیگم کی طرف دیکھا تو بیگم نے ہاری ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ ''میں آپ کی بہت مشکور ہوں لیکن مجھے کوئی افاقہ نہیں ہو رہا''۔

ڈاکٹر نے بیگ اٹھایا اور اختر کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ شام تک اختر نے دو اور ڈاکٹروں سے اسی طرح گلوخلاصی کرا لی اور تپائی پر رکھی ہوئی تمام دوائیاں اٹھوا دیں۔ جب وہ جانے لگا تو متانت سے بولا:

''بیگم اکبر! میں کل آؤں گا۔ آپ کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں جو میں پیش کروں۔ مجھے اکبر مرحوم کی دوستی کا حق ادا کرنے سے نہ روکیے گا۔ گھر اور زمینوں کے انتظام پر نگرانی کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ کام کرنے دیں''۔

دوسری صبح اختر آیا تو اس نے خانساماں اور کرایہ اکٹھا کرنے والے نوکر کو بلا لیا۔ ان کا حساب کتاب سیدھا کر کے زمینوں کا کھاتہ دیکھا۔ گزشتہ چار مہینوں سے سنگتروں اور مالٹوں کی فروخت اور آمدنی کا حساب نہ کسی نے لکھا تھا نہ بیگم اکبر کو کسی نے بتایا تھا کہ کچھ آمدنی ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پچاس ایکڑ میں پھیلا ہوا باغ اجڑ گیا ہو۔ اختر کو بتایا گیا کہ اس حساب کے لیے ایک منشی ہے جو گاؤں میں رہتا ہے۔ اگلے روز منشی کو بھی بلوا لیا۔

چند دنوں میں اختر نے آمدنی اور اخراجات کے نئے رجسٹر تیار کر لئے۔ اس دوران وہ گاؤں میں جا کر باغ بھی دیکھ آیا اور وہاں کے کارندوں کو یہ احساس دلا آیا کہ وہ من مانی نہیں کر سکیں گے۔ ان چند دنوں کے دوران اس نے بیگم اکبر کے ساتھ کوئی غیر ضروری

بات نہ کی۔اسے اسی قدر بتاتا رہا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔اس نے تمام ڈاکٹروں کا علاج بند کر دیا۔ڈاکٹر تو منظر سے غائب ہو گئے لیکن تیمارداروں کی قطار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔بیگم اکبر ان کی رسمی اور جذبات سے خالی باتوں سے اس حد تک اکتا چکی تھی کہ ایک روز اس نے اختر سے کہہ دیا:

''یہ لوگ بہت پریشان کرتے ہیں بعض اوقات بات بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ لوگ بیماری کی پوری کہانی سنانے کو کہتے ہیں۔میں جانتی ہوں کہ انہیں میری کہانی زبانی یاد ہو گئی ہے پھر بھی مجھے آرام نہیں کرنے دیتے۔ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے دل میں میرے لیے ذرہ بھر ہمدردی ہو''۔

اسی شام جب پہلے ہی تیماردار کی کار پورچ میں رکی تو اختر باہر نکل آیا۔آنے والا کار سے نکلا ہی تھا کہ اختر نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا:

''مسز اکبر سو رہی ہیں''۔

''میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا ہوں۔جب جاگیں تو......''

''معافی چاہتا ہوں''___ اختر نے کہا___ ''ڈاکٹر نے سختی سے کہہ دیا ہے کہ مریضہ کو پریشان نہ کیا جائے۔اس کا مطلب تیمارداروں سے ہے''۔

یہ تیماردار جا ہی رہا تھا کہ دو اور آ گئے اختر نے انہیں بھی وہیں سے واپس کر دیا اور دوسرے دن تیمارداروں کا ہجوم اختر کا دشمن بن گیا۔دن گزرتے چلے گئے اور اختر چوراچکا، پکا چار سو بیس، سالا، جنگلی اور جانے کیا کیا بن گیا۔اگر کوئی بیگم اکبر کے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھتا کہ اختر کیا ہے تو اس کے سینے سے بے ساختہ آواز اٹھتی___ ''جب اختر شام کے بعد اپنے گھر چلا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کرنل اکبر آ کے لوٹ گیا ہے''۔

بیگم اکبر تیمارداروں سے گھبرا کر تنہائی پسند ہو گئی تھی لیکن تنہا ہوتی تھی تو اس کے دل پر خوف طاری ہو جاتا تھا جیسے اسے جنوں بھوتوں کے مسکن میں پھینک دیا گیا ہو۔اس کا دل کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں بھٹک رہا تھا جو اس کی بیماری کی باتیں نہ کرے۔جھوٹی ہمدردیاں نہ جتائے اور ایسی فضا پیدا کر دے جہاں وہ ٹانگوں کے روگ کو بھول جائے۔بیگم اکبر پیار اور شفقت کی پیاسی تھی۔بچپن میں اسے شفقت ملی تو موت جھپٹا مار کر چھین لے

گئی۔جوانی میں اسے ایک بار شفقت مل گئی مگر وہ بھی موت لے اڑی۔اس نے تیمارداروں اور جھوٹے غمخواروں کی کھوکھلی باتوں میں انس اور کھوئی ہوئی شفقت کو ڈھونڈنا چاہا تھا مگر وہ تو صحرا کے ٹنڈ منڈ پیڑ تھے جن کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔

ایک شام اختر اپنے گھر جانے کے لیے اٹھنے لگا تو بولا___ ''میں نوراں کو بھیج دیتا ہوں۔آپ کو بستر پر لٹا دے''۔

نوراں ہر رات بیگم کو پہیوں والی کرسی یا صوفے سے سہارا دے کر بستر تک لے جایا کرتی تھی۔اس شام اختر نوراں کو بلانے کے لیے اٹھا تو بیگم نے بے ساختہ بازو پھیلا دیئے اور مسکرا کر بولی___ ''ضرور نوراں ہی آئے گی؟ آپ ہی بستر تک لے جایئے نا!''

اختر ہنس پڑا۔بیگم نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ اختر کی ہنسی میں مسرت اور انس رچا ہوا ہے اور یہ ہنسی کسی پرائے آدمی کی نہیں۔اس روز تک اختر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہا تھا۔گو اس کے سلوک برتاؤ نے اجنبیت نہیں رہنے دی تھی لیکن اس کی ہنسی نے غیریت کو بالکل ہی دھو ڈالا۔اختر اٹھا اور ایک بازو بیگم کی کمر کے گرد لپیٹ دیا۔دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بیگم کو اٹھا کر پلنگ کی طرف لے جانے لگا۔اٹھتے اٹھتے بیگم اور اختر کے گال مس کر گئے۔بیگم کے جسم نے جھرجھری لی۔اسے کرنل اکبر کا پہلا لمس یاد آ گیا۔اس کے آنسو نکل آئے۔اختر رک گیا اور بیگم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر بولا___ ''کیوں؟ پھر آنسو؟''___ اس نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔جب وہ پلنگ کے قریب پہنچے تو اختر نے بیگم کو بازوؤں پر اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔وہ جانے لگا تو بیگم نے ہاتھ بڑھا کر جذباتی سے لہجے میں کہا___ ''میں تو آپ کے لیے زحمت بن گئی ہوں۔دوستی کا حق آپ کو مہنگا پڑے گا''۔

''پہلے تو صرف کرنل اکبر سے دوستی تھی''___ اختر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا___ ''اب آپ سے بھی دوستی ہو گئی ہے''۔

بیماری کی یہ پہلی رات تھی کہ بیگم اکبر کو بڑی اچھی نیند آئی لیکن صبح آنکھ کھلی تو وہ بے چین ہونے لگی۔اختر دس گیارہ بجے کے درمیان آیا کرتا تھا۔اس صبح بیگم کو کچھ ایسے محسوس ہوا جیسے وقت کی رفتار سست پڑ گئی ہو۔گھڑی کی سوئیاں جیسے آٹھ پر رک گئی ہوں۔اس انتظار میں جو بے قراری تھی اس میں بیگم جانی پہچانی سی لذت بھی محسوس کر رہی تھی۔

پہلے تو اختر دس بجے کے بعد آیا کرتا تھا لیکن اس روز نو بجے ہی آ گیا۔ اس کے آتے ہی بیگم اکبر کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ آ گئی جو کرنل اکبر کو دیکھ کر آیا کرتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں بیگم کی تشنہ حسیں مسکرا رہی تھیں۔ اختر کرسی یا صوفے پر بیٹھنے کی بجائے آج پہلی بار اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرنل اکبر کی تصویر کی طرف دیکھا اور آہ لے کر بولا:

''ایسا مرد پھر کبھی پیدا نہ ہو گا۔ میں اس شخص کی پوجا کیا کرتا تھا''۔

یہی بات بیگم کے دل میں تھی جو اختر نے کہہ ڈالی۔ اختر نے ایک لمبی داستان سنا ڈالی۔ جس کا ہیرو کرنل اکبر تھا۔ اس کے جواب میں بیگم اکبر نے اسے مرحوم خاوند کی بہت سی باتیں سنائیں۔ یہ باتیں اس کے سینے میں غبار بن کے بھری ہوئی تھیں۔ کوئی نہ تھا جو اس کے سینے سے یہ غبار نکال باہر پھینکتا۔ آج اختر نے کرنل اکبر کا قصہ یوں چھیڑ دیا جیسے وہ اس کا اپنا باپ یا بھائی تھا۔ بیگم اکبر کا سینہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اسے کچھ ایسا روحانی سا سکون محسوس ہوا جیسے ٹانگوں کی ہڈیوں کے روگ میں بھی افاقہ ہو گیا ہو۔

اس روز کے بعد بیگم اکبر اختر کو زیادہ سے زیادہ دیر اپنے پاس بٹھانے لگی۔ موضوعِ سخن کرنل اکبر ہوتا تھا۔ چند دن گزرے تو بیگم نے محسوس کیا کہ اختر کرنل اکبر کی یادوں اور باتوں کے سہارے اس کے دل میں سماتا چلا جا رہا ہے۔ تب اسے خیال آیا کہ کئی بار باتوں باتوں میں وہ اختر کا ہاتھ سہلاتی رہی اور دو تین بار اس کی انگلیاں اختر کی انگلیوں میں الجھ گئی تھیں لیکن وہ پشیمان نہ ہوئی۔ اس کے نفسیاتی تقاضوں کے زیر اثر اسے یہ بے تکلفی بری نہ لگی۔

اور ایک رات ایسی آئی کہ بیگم نے اختر کو کہہ ہی دیا ــــ ''آپ یہیں سو جایا کریں۔ گھر میں بیوی تو ہے نہیں جو انتظار کرتی ہو گی''۔

اختر دوسرے کمرے میں سو گیا۔

اگلی رات وہ بارہ بجے کے بعد بیگم اکبر کے کمرے سے نکلا۔

اور دو راتوں بعد جب نصف شب کے قریب اختر اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا تو بیگم اکبر نے ڈرے ہوئے بچے کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی۔ اختر نے دیکھا کہ بیگم کی آنکھوں میں دو آنسو رکے ہوئے تھے۔ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی ــــ ''نہ جاؤ اختر! چلے جاتے ہو تو دل دُکھنے لگتا ہے۔ تم ہوتے ہو تو اکبر کو بھول جاتی ہوں، بھلی چنگی ہو جاتی ہوں'' ــــ وہ جھجک گئی اور جھینپے ہوئے لہجے میں بولی ــــ ''اسی کمرے میں سو جایا کرو۔ کیا

حرج ہے!'' ــــ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اختر کو تم کہا تھا۔

ڈبل بیڈ پر کرنل اکبر کی جو جگہ خالی تھی اسے اختر نے پُر کر دیا۔

چند ہی دنوں بعد اونچی سوسائٹی نے بھونچال کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ بعض نے اپنے آپ کو فریب دیا کہ یہ خبر صحیح نہیں ہو سکتی۔

''آخر یہ ہوا کیونکر؟''

''یہ افواہ ہے''۔

''جھوٹ ہے''۔

''ڈنر تک نہ دیا''۔

''ہلکی سی گارڈن پارٹی ہی ہو جاتی''۔

''نہیں یہ فراڈ ہے''۔

''یہ درست ہے''۔

''سنا آپ نے بھی؟''

''کیا؟''

''اختر نے بیگم اکبر کے ساتھ شادی کر لی ہے''

''اس اپاہج کے ساتھ؟''

''نہیں، جائیداد کے ساتھ!''

منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ حیرت سے آنکھیں ابل آئیں۔ انگلیاں دانتوں تلے دب گئیں۔ بیگم اکبر اور اختر کی شادی سیکنڈل بن گئی لیکن شادی ہو چکی تھی اور بیگم اکبر کے پژمردہ چہرے پر زندگی کے پُرمسرت تاثرات پھر سے نکھرنے لگے۔ نکاح ایک مولوی نے پڑھایا تھا جس کے دو گواہ تھے۔ تیسرا گواہ کرنل اکبر کی تصویر تھی جس کے گرد اس روز بھی تازہ پھولوں کا ہار ڈالا گیا تھا۔

پھر یہ پھول مرجھانے لگے۔ سوکھی پتیاں جھڑنے لگیں جنہیں ایک روز نوراں اٹھا کر کوڑے کرکٹ میں پھینک آئی۔

شادی کے بعد کوٹھی کے ماحول میں کسی تیماردار کی کار کی جو آواز سنائی دیا کرتی تھی وہ بھی خاموش ہو گئی۔ فضا سے اداسیاں ڈھل گئیں۔ ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے مگر بیگم کی

ٹانگوں کی ہڈیوں کا درد اسی طرح رہا۔

دو ماہ بعد اختر بیگم کی تیمارداری کے لیے اپنی ایک ماموں زاد بہن کو لے آیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی اس خوبصورت لڑکی کی آنکھوں میں شوخی، ہونٹوں پر پیارا سا تبسم اور حرکتوں میں چلبلا پن تھا۔ اس نے بیگم کو اپنی ماں کی طرح سنبھال لیا اور بیٹی کی طرح اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکٹر بھی آ گیا۔ بیگم نے بہت منع کیا تھا کہ علاج کا کوئی فائدہ نہیں لیکن اختر ڈاکٹر کو لے ہی آیا اور ازسرِ نو علاج شروع ہو گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیگم نے دیکھا کہ اختر اور اس کی ماموں زاد بہن ساتھ والے کمرے میں بیٹھے خاصی دیر راز و نیاز کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کے دل میں وسوسہ سا اٹھا لیکن اختر کے برتاؤ میں اس قدر پیار رچا ہوتا تھا اور لڑکی کی تیمارداری میں ایسا والہانہ پن ہوتا تھا کہ بیگم کے وسوسے دل میں ہی مر گئے۔ ان دونوں نے بیگم کی علیل زندگی کا بھیانک خلا پُر کر دیا تھا۔ وہ ان پر شک کیوں کرتی؟

ایک رات اختر اور اس کی ماموں زاد بہن بہت دیر بند کمرے میں بیٹھے رہے۔ دونوں کے سر جڑ گئے۔ کمرے میں سرگوشیاں ابھرتی رہیں اور بند دروازے سے ٹکرا کر کمرے میں ہی دم توڑ گئیں۔ آسمان کی وسعت میں ایک ستارہ دوسرے کی طرف بھاگا اور ٹوٹ گیا اور رات کے پُراسرار سکوت میں بیگم گہری نیند سوتی رہی۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اختر کس وقت اس کے پاس لیٹا تھا۔

صبح آنکھ کھلی تو بیگم نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ اختر کی باتوں میں لڑکھڑاہٹ ہے اور چہرے پر بھی بے چینی سی ہے۔ ناشتے کے وقت بیگم اس کے ساتھ جانے کیا بات کر رہی تھی کہ اس نے اختر کو گم صم پایا۔ بیگم بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی تو بھی اختر گم صم ہی رہا۔ ناشتے کی میز پر تکلیف دہ خاموشی ہو گئی۔ یہ خاموشی انوکھی تھی۔ اختر کی ماموں زاد بہن کی شوخیاں اور کھڑکھڑ ہنسی بھی آج خاموش تھی۔

جب لڑکی ناشتے سے اٹھی تو اختر اپنے خیالوں سے بیدار ہو گیا۔ لڑکی باہر نکل گئی تو اختر نے بیگم کی طرف دیکھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اختر نے لپک کر اس کے کندھے تھام لیے۔

''شادی کرنی ہی تھی تو کسی اچھی بھلی لڑکی سے کرتے'' ___ بیگم نے اداس اداس

سے لہجے میں کہا ___ ''مجھ اپاہج سے شادی کر کے آپ نے اپنی جوانی کو روگ لگا لیا ہے۔ میں تو کبھی صحت یاب نہ ہو سکوں گی۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ مجھے طلاق دے دیجئے''۔

''کیوں ایسی باتیں لے بیٹھتی ہو'' ___ اختر نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ___ ''تم اپاہج ہو میری تمہاری محبت اپاہج نہیں۔ میں نے تمہارے جسم کے ساتھ تو شادی نہیں کی''۔

''میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں'' ___ بیگم نے کہا ___ ''آپ کا ایثار غم زدہ سا تاثر بن کر آپ کے چہرے پر چھاتا جا رہا ہے۔ کاش میں آپ کے ایثار کی قیمت دے سکتی......'' ___ اس کی آواز یکلخت پُرعزم ہو گئی۔ بولی ___ ''میں آپ کے ایثار اور پیار کی قیمت ادا کروں گی۔ آپ نے میری خاطر اپنی جوانی کی امنگیں تباہ کر ڈالی ہیں''۔

''خدا کے لیے یوں نہ کہو نور جہاں......''

''آپ صبح سے پریشان ہیں'' ___ بیگم نے کہا ___ ''میں آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتی''۔

''اوہ خدا!'' ___ اختر نے شگفتہ سے لہجے میں کہا ___ ''میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔ مجھے کل پتہ چلا ہے کہ مری میں پولینڈ کا ایک ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ وہ ہڈیوں کے امراض کا ماہر ہے۔ میں تمہیں کل مری لے جا رہا ہوں۔ ویسے بھی اس موسم میں مری جانا چاہئے تھا۔ وہاں اپنی کوٹھی تو ہے ہی۔ کل ہی کار پہ چلے چلیں گے''۔

''جیسے آپ کی مرضی!'' ___ بیگم نے آہ کے انداز میں کہا۔

وہ دوسرے روز نہ گئے۔ دو روز بعد وہ دونوں مری پہنچ گئے۔ نوکروں اور ماموں زاد لڑکی کو اختر نے ساتھ نہ لیا۔ مری پہنچ کر اس نے بیگم سے کہا کہ یہاں نوکروں کی کمی نہیں۔ شام تک انتظام کر لوں گا۔ فی الحال ہوٹل سے کھانا آ جایا کرے گا۔

اگلے روز اختر نے بیگم سے کہا کہ کل ڈاکٹر کو کوٹھی میں لے آؤں گا لیکن بیگم نے انوکھی سی مسکراہٹ سے کہا ___ ''رہنے دیجئے۔ اب مجھے ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں رہی''۔

اختر نے اس کی مسکراہٹ کے انوکھے پن کو محسوس کیا لیکن اسے سمجھ نہ سکا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیگم اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے اور اس کے ہونٹوں پر جو تبسم ہے وہ اس کے ہونٹوں پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اختر اس کی نظروں کا سامنا کرنے سے گریز کرنے لگا۔

اس نے اپنے ضمیر پر بوجھ سا اٹھا رکھا تھا۔ اختر کو یوں لگا جیسے بیگم نے یہ بوجھ دیکھ لیا ہو۔ وہ اٹھنے لگا تو بیگم نے تشنہ سے لہجے میں کہا۔

''کہاں چل دیئے؟''

''کہیں نہیں......'' ___ اختر نے قدرے ہکلا کر کہا ___ ''ویسے ہی......''

''نہیں، میرے سامنے بیٹھے رہو'' ___ بیگم نے التجا کی ___ ''اب میرے قریب ہی رہو۔ جانے دو ڈاکٹروں کو۔ دیکھو تو میں تندرست ہوتی جا رہی ہوں'' ___ اس نے لپک کر اختر کا ہاتھ تھام لیا اور چونک کر بولی ___ ''آپ کے ہاتھ کانپ رہے ہیں!''

''ٹھنڈ ہے نا!'' ___ اختر نے اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر جیب میں ڈال لیا اور ہنسنے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

مری کی نمناک شام کا اندھیرا تاریک ہو گیا۔ ہوٹل سے کھانا آ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو اختر نے کہا ___ ''چلو ذرا سیر کر آئیں''۔

''اس وقت؟''

''کار میں چلیں گے'' ___ اختر نے کہا ___ ''آؤ تمہیں مری کی چاندنی کا حسن دکھاؤں۔ شبنم سی ڈھلی چاندنی سب دکھ دھو ڈالتی ہے''۔

اس نے بیگم کو بانہوں پہ اٹھایا اور کار کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کار مری سے دور اوپر پہنچ چکی تھی۔ چاندنی کا نکھار پُرکیف تھا۔ کار نے کئی موڑ کاٹے، چڑھائیاں چڑھیں اور دور آگے جا کر سڑک سے اتر کر ایک چٹان کے دامن میں جا رکی۔ مری کے ہرے پیڑوں نے چٹان اور گرد و پیش کو تاریک سائے میں چھپا رکھا تھا۔ اختر نے کار کی بتیاں بجھا دیں۔

بیگم کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ لرزتے ہوئے دو ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ انگلیاں فولادی پنجے کی طرح گردن میں اترتی چلی گئیں۔ شکنجہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ بیگم کا جسم تڑپا۔ اس نے اختر کی کلائیاں پکڑ لیں مگر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے ہاتھ اس کی بے جان ٹانگوں پر گر پڑے۔ ہلکے سے خراٹے سنائی دیئے جنہیں اختر کی انگلیوں کے شکنجے نے خاموش کر دیا۔ ذرا پرے گیدڑ بڑی زور سے چلائے۔ بیگم کا جسم بے جان ہو گیا۔ سر کندھے کی طرف ڈھلکنے لگا۔ اختر نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔

دل خاموش تھا۔ بیگم کی لاش سٹیئرنگ کی طرف لڑھک گئی۔

اختر باہر نکلا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ لاش کو باہر نکالا اور کندھے پر ڈال کر جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کہاں تک جانا ہے۔ جھنڈ کی اوٹ میں بہت گہری کھائی تھی۔ اختر ان کھائیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پیشتر اس کے کہ یہاں کسی انسان کو کسی انسانی لاش کی بو آئے گیدڑ، گدھ اور بھیڑیے لاش کو چٹ کر جائیں گے۔ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ صبح تک گیدڑ اور بھیڑیے لاش کا سراغ بھی نہ رہنے دیں گے۔ اس نے لاش کے گلے سونے کا ہار، انگلی سے دو انگوٹھیاں اور کانوں سے رِنگ اُتار لئے اور لاش کو جھاڑیوں کے جھنڈ میں پھینک دیا۔ اسے لاش کے لڑھکنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ کھائی بہت گہری تھی۔ اس قدر گہری کہ اسے لاش کے گرنے کی آواز نہ سنائی دی۔

اختر کو ایسا سکون محسوس ہوا جیسے پرانا بخار یک لخت اتر گیا ہو۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور یوں ہلکا پھلکا ہو کر کار کی طرف چل پڑا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ کار میں آ بیٹھا۔ اطمینان سے لبریز انگڑائی لی۔ اس کی ہڈیاں چٹخیں تو چونک اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے کار کی پچھلی سیٹ پر کوئی عورت بیٹھی سسک رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا وہاں کوئی نہ تھا۔ اختر نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ یہ سسکی نہیں تھی مگر وہ اپنے آپ کو یقین نہ دلا سکا کہ تیز ہوا نے جھاڑیوں سے گزرتے سسکی کی آواز پیدا کی ہے یا کار کی اگلی سیٹ نے اس کے وزن تلے سسکی بھری ہو گی۔ اس کے دل پر خوف طاری ہو گیا۔

اس نے کار کی بتیاں جلائیں۔ انجن سٹارٹ کیا۔ سیاہ گھٹا نے چاند کو چھپا لیا اور بجلی چمکی۔ اس نے کار چلائی اور جونہی کار کو موڑا یک لخت بریکیں لگیں۔ اسے بیگم کار کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ چپ چاپ حسین پیکر، آنکھیں بند، ہونٹ نیم وا...... اس نے کار کی بتیاں بجھا دیں اور ایکسی لیٹر پر پاؤں دبا کر کار کو تیزی سے موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ وہ رفتار تیز کرنے ہی لگا تھا کہ اسے یوں سنائی دیا جیسے کوئی کار کی چھت کو بڑی زور زور سے تھپتھپا رہا ہو۔ اس نے گاڑی روک لی۔ مری کی ٹھنڈ کے باوجود اس کا پسینہ نکل آیا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ کھڑکی سے جھانک کے دیکھے کہ چھت پر شور کیسا ہے۔ چند منٹ گزر گئے تو اس نے تنگ آ کر اس شور کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے بتیاں

جلائیں تو دیکھا کہ بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔

اس کے باوجود اس کے دل پر خوف کی گرفت اور سخت ہوگئی۔ کار چلانے ہی لگا تھا کہ کسی چیز نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ساتھ ہی اسے خراٹے سنائی دیئے۔ اس کے سامنے بیگم کا اس وقت کا چہرہ آ گیا جب وہ اس کے ہاتھوں میں دم توڑ چکی تھی۔ اسے ہولناک سا خیال آیا کہ بیگم کی بدروح نے اس کی گردن دبوچ لی ہے۔ اس نے گھبرا کر گردن پر ہاتھ رکھ لئے۔ وہاں کسی کا ہاتھ نہ تھا۔ اس نے ٹائی کی گانٹھ ڈھیلی کر دی۔ اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا مگر کوئی چیز حلق میں ایسی اٹکی جسے کوشش کے باوجود وہ نگل نہ سکا۔

اس نے کار چلائی اور بتیاں جلا کر رفتار تیز کر دی۔ بارش اور تیز ہوگئی۔ سامنے موڑ تھا۔ ایک طرف پہاڑی کا دامن اور دوسری طرف گہری وادی۔ جب کار یہ موڑ مڑی تو اختر کو وادی کی طرف بیگم کھڑی نظر آئی۔ چپ چاپ حسین پیکر، آنکھیں بند، ہونٹ نیم وا...... بجلی چمکی اور یہ واہمہ غائب ہوگیا۔ اختر نے اب کے گاڑی نہ روکی۔ سٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے دل کو خوف کی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے ان واہموں کا تجزیہ شروع کر دیا۔ گاڑی چلتی رہی اور اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ بیگم مر چکی ہے۔ قتل کا سراغ ملنا ناممکن ہے اور یہ جو بار بار گاڑی کے سامنے آتا ہے وہ محض واہمہ اور نظر کا فریب ہے۔ بیگم کی بدروح نہیں۔

اسے سکون محسوس ہونے ہی لگا تھا کہ کار کی آواز اور بارش کے شور سے آواز آئی ــــ ''قتل کر لینا آسان ہے، خون ہضم کرنا ممکن نہیں ہوتا'' ــــ وہ گھوم کے پیچھے دیکھنے ہی لگا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے کہ اس نے اپنی آواز پہچان لی۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی اور بلند آواز سے کہا ــــ ''یہ تو میری آواز تھی۔ بیگم مر چکی ہے''۔

اس نے اس ذہنی کیفیت پر قابو پا لیا اور تصوروں میں اپنے آپ کو کرائے پر چڑھی ہوئی چار کوٹھیاں، سنتروں اور مالٹوں کا وسیع وعریض باغ، سونا اگلنے والی کھیتوں کے مربعے اور بیگم کی دالت کے انبار دکھائے۔ اس نے سوچا کہ بیگم کی یہی ایک کوٹھی دو لاکھ پر بک جائے گی۔ اس کے خیالوں میں اس کا کپڑے کا چھوٹا سا کارخانہ ایک سو برقی کھڈیوں کی مل بن گیا۔ پھر اس نے اپنی ماموں زاد بہن کو اپنی بیوی کے روپ میں دیکھا۔ اس خوبصورت اور شوخ لڑکی کے تصور نے اس کے ڈرے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کر دیا۔ وہ اس بات پر مسکرا بھی

دیا کہ اس لڑکی نے بیگم اکبر کی تیمارداری کی اداکاری کس مہارت سے کی تھی۔

ماموں زاد بہن کے ساتھ بنائی ہوئی سکیم کے مطابق اسے اب اس لڑکی کو تار دینا تھا کہ بیگم حرکت قلب بند ہو جانے سے مر گئی ہے اور اسے مری ہی میں دفن کر دیا گیا ہے۔ اختر کو قانون کا خیال آیا تو ذرہ بھر ڈر محسوس نہ ہوا کیونکہ قانون کو فریب دینے کے لیے دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس نے بیگم سے کم وبیش بیس خالی چیکوں پر دستخط کروا رکھے تھے۔ اور چیک بک اس کے قبضے میں تھی۔ اس پر فتح کا نشہ طاری ہونے لگا۔ ساری سکیم پر مکمل کامیابی سے عمل ہو رہا تھا۔ اس سکیم کی بھیانک ترین کڑی قتل تھا جو اس نے خلافِ توقع نہایت کامیابی سے کر لیا تھا۔

کار ایک اور موڑ پر آ گئی۔ اختر ان دل کش تصوروں سے چونک کر بیدار ہو گیا۔ عین اس وقت اسے دلدوز چیخ سنائی دی۔ یہ بیگم کی چیخ تھی۔ اختر کا دل اچھلا اور حلق میں اٹک گیا۔ جسم لرز گیا۔ اس نے گھبرا کر سٹیئرنگ کو قابو میں کر لیا۔ کار نے بےطرح موڑ کاٹا۔ سامنے بیگم کا حسین پیکر کھڑا تھا۔ اب کے یہ پیکر سڑک کے وسط میں کھڑا تھا۔ اختر نے ایکسی لیٹر سے پاؤں اٹھا کر کلچ اور بریک پر پاؤں رکھ دیئے۔ اسے ایک اور نسوانی چیخ سنائی دی۔ بیگم کا پیکر موسلا دھار بارش میں انجن کے قریب آ گیا۔ اختر نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ دل کی دھڑکن صاف سنائی دینے لگی۔ بارش کے شور سے اس کے دل پر ہول طاری ہوگیا۔

اس نے آنکھوں سے آہستہ آہستہ ہاتھ ہٹائے۔ ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا۔ کار سڑک سے اتر کر ایک جھاڑی کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ کار کی تیز روشنی میں برستی بارش میں کھڑی جھاڑی یوں لگ رہی تھی جیسے کسی عورت نے چمکدار ساڑھی لپیٹ رکھی ہو۔ مگر اختر کو یقین نہ آیا کہ اس نے اسی چمکتی جھاڑی کو بیگم کے روپ میں دیکھا تھا نہ اسے یہ علم ہوا کہ اس نے جو دو نسوانی چیخیں سنی تھیں وہ اس کی اپنی کار کی بریکوں اور تیزی سے موڑ کاٹتے پہیوں کی آوازیں تھیں۔ اس کا دماغ اب پوری طرح مجرم ضمیر کے قبضے میں آ چکا تھا۔ وہ سوچ اور فکر سے معذور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ذہن اس قدر بھیانک جرم کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

اس نے گاڑی چلا دی۔ ذرا آگے گیا تو اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ کوئی گاڑی میں ہی بیٹھا کلمۂ شہادت پڑھ رہا تھا۔ اب نے گاڑی تیز کر دی کلمے کا ورد بھی بلند ہو گیا۔ یہ شر شرار کی آواز تھی۔ اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا چاہیں مگر دونوں ہاتھ سٹیئرنگ پر

تھے۔ اچھا ہوا کہ کوٹھی آ گئی۔ جب اس نے کار روکی تو کلمۂ شہادت بدستور سنائی دیتا رہا۔ وہ کار سے نکل کر کوٹھی میں بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن کار سے نکلنے کی جرأت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا رہا اور غیبی آواز کا کلمہ شہادت سنتا رہا۔ دو چار لمحوں بعد اس نے اس آواز کو پہچان لیا یہ اس کی اپنی آواز تھی۔ وہ خود بلند آواز سے کلمۂ شہادت کا ورد کر رہا تھا۔

وہ کار سے نکلا اور برآمدے میں داخل ہوا۔ جب مقفل دروازے کے سامنے رکا تو اسے اپنے تعاقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بدک کر پیچھے دیکھا۔ اسے یوں نظر آیا جیسے بیگم کا پیکر برآمدے کی نکڑ سے پرے ہو گیا ہو۔ اس کے پاؤں زمین کے ساتھ چپک کے رہ گئے۔ اس نے چاہا کہ ادھر جا کر اس پیکر کو بلا لے اور اس کا سامنا کرے ورنہ خوف سے اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی لیکن اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالا کھولا، اندر گیا اور دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ ٹٹول کر بتی کا بٹن دبایا۔ سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں دیواروں کو دیکھا۔ موسلام دھار مینہ نے چھت کی سلیٹوں پر اودھم مچا رکھا تھا۔ اسے آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔۔۔ ''بیگم کہاں ہے؟۔۔۔۔۔۔نور جہاں کو کہاں چھوڑ آئے؟''

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس کے ذہن کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ضمیر بلند آواز سے چلانے لگا۔۔۔۔ ''قاتل۔۔۔۔۔۔قاتل۔۔۔۔۔۔قاتل''۔۔۔۔ اس نے خوفزدگی کے عالم میں سامنے دیکھا۔ دیوار کے ساتھ کرنل اکبر کی دو فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی تصویر لٹک رہی تھی۔ کرنل وردی میں تھا۔ چہرے پر کرنیلوں والا رعب اور آنکھوں میں جنگجوؤں کی چمک تھی۔ یہ تصویر ایک عرصے سے اس کوٹھی میں آویزاں تھی۔ مری میں یہ کرنل کی اپنی کوٹھی تھی۔

اختر نے کرنل کی تصویر سے نگاہیں ہٹا لینا چاہیں مگر تصویر کی تیز آنکھوں نے اسے ہپناٹائز کر لیا۔ اس کی ٹانگیں اس طرح لرزیں جیسے وہ ابھی گھٹنوں کے بل فرش پر آ رہے گا۔ اس نے بلند آواز سے کہا:

''کرنل! میں گنہگار ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے بخش دو کرنل! تم میرے دوست تھے۔ میں کمزور ہوں۔ میں نے اسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ وہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ میں تمہاری بیوہ کا قاتل ہوں لیکن اس اعتراف کو سینے میں رکھنا بھی اسے محال نظر آ رہا تھا۔ اسے ابکائی محسوس ہوئی۔ اس نے چاہا کہ قے کر دے اور جو کچھ کھایا پیا ہے اُگل دے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اختر نے اسے بھی ڈراؤنا واہمہ سمجھا۔ دروازہ پھر کھٹکا۔ اس کے ساتھ ہی اسے برآمدے میں باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس میں دروازے تک جانے کی تاب نہیں تھی۔ جب دروازہ تیسری بار کھٹکا تو وہ تھر تھر کانپتے قدموں کو گھسیٹتا دروازے تک گیا اور ڈرتے جھجکتے چٹخنی اتار دی۔

دروازے کا ایک کواڑ کھلا تو اختر کو چکر آ گیا۔ اسے آواز سنائی دی۔۔۔۔ ''آپ مسٹر اختر ہیں''۔

''پولیس؟۔۔۔۔۔۔''۔۔۔۔ اختر نے حیرت زدہ سرگوشی میں پوچھا۔۔۔۔ ''پولیس؟ پولیس کو کس نے اطلاع دی؟ میں نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا''۔۔۔۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اس کے سامنے پولیس کا ایک انسپکٹر اور دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔

''جی ہاں پولیس!''۔۔۔۔ باوردی انسپکٹر نے کہا۔۔۔۔ ''میں انسپکٹر خان زماں ہوں اور یہ میرے دو کانسٹیبل ہیں، ہم راولپنڈی سے آئے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہم اندر آ سکتے ہیں؟''۔۔۔۔ تینوں اختر کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے میں آ گئے اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اختر نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے۔ اس نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا لیکن انسپکٹر کے پہلو میں لٹکتے ریوالور کو دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ گم صم کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بیگم کہاں ہیں؟''۔۔۔۔ انسپکٹر نے پوچھا۔

''اوہ۔۔۔۔۔۔بیگم۔۔۔۔۔۔''۔۔۔۔ اختر کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ اس نے کرسی کے بازو مضبوطی سے پکڑ لئے جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

''ذرا انہیں بلوا دیجئے''۔۔۔۔ انسپکٹر نے کہا۔۔۔۔ ''آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ ہم شاید دیر سے پہنچے ہیں۔ راستے میں گاڑی خراب نہ ہو جاتی تو ہم وقت پر پہنچ جاتے''۔

''بیگم شام کو شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی''۔۔۔۔ اختر نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔۔۔۔ ''معلوم نہیں ابھی تک۔۔۔۔۔۔''

''شاپنگ کے لیے چلی گئی تھی؟''۔۔۔۔ انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا اور کہنے لگا۔۔۔۔ ''وہ چلنے سے معذور نہیں تھی؟ آپ کی گاڑی تو باہر کھڑی ہے دوسری گاڑی پر گئی ہوں گی؟''

اختر پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسپکٹر کو دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نے

اس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اختر کے ہونٹ لرزے۔ اس نے عتاب آلود آواز میں کہا۔۔۔ ''میں نے اسے قتل کر دیا ہے......'' ۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔۔۔ ''جاؤ، اس کی لاش کھائی سے نکال لو۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہو، کہتے کیوں نہیں کہ تم نے مجھے اسے قتل کرتے دیکھا تھا''۔

انسپکٹر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا اختر کے پاس آرکا۔ اختر چپ ہو کر خلاؤں میں تکنے لگا۔

''بولیے، بولیے......'' ۔۔۔ انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔۔۔ ''گھبرائیے نہیں۔ آپ نے اس کی لاش کھائی میں پھینکی تھی نا!''

اختر نے ہاری ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ ''مجھے یقین تھا کہ میں نے یہ قتل کامیابی سے کیا ہے اور کھوج نہیں چھوڑا۔ انسپکٹر صاحب قتل کر لینا آسان ہے، خون ہضم نہیں ہو سکتا۔ میں نے اقبال جرم کر کے سکون پایا ہے ورنہ میں پاگل ہو چکا ہوتا''۔

''کوئی بات نہیں'' ۔۔۔ انسپکٹر نے اس سے اور باتیں اگلوانے کے لیے دوستانہ انسیت سے کہا۔۔۔ ''قتل تو ہوتے ہی رہتے ہیں''۔

''آپ کو کس طرح سراغ ملا ہے؟'' ۔۔۔ اختر نے پوچھا۔

''آپ کے اقبال جرم تک ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ آپ اپنی بیوی کو قتل کر چکے ہیں'' ۔۔۔ انسپکٹر نے کہا۔۔۔ ''مجھے آج آپ کی بیگم کا خط ملا ہے۔ میں بیگم کو دیکھنے آیا تھا۔ میں آپ کو خط پڑھ کر سناتا ہوں۔ اگر آپ اسے قتل نہ کرتے تو وہ خودکشی کی کر چکی ہوتی۔ اس کا اور کوئی غمخوار نہیں تھا۔ میں کرنل اکبر کی پہلی بیوی کا دور پار کا رشتہ دار ہوں۔ کرنل مرحوم میرے دوست تھے۔ بیگم مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ ایک تو اس لیے اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ میں اس کے خاوند کا دوست تھا اور دوسرا اس لیے کہ میں پولیس کا افسر ہوں......''

انسپکٹر نے ہلکے سبز رنگ کے لفافے سے خط نکالا اور پڑھنے لگا بیگم نے لکھا تھا۔۔۔

''یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میں مفلوج ہو چکی ہوں۔ میرا ہمدرد کوئی نہ تھا۔ سب کی نگاہیں میری جائیداد پر تھیں۔ مسٹر اختر جو میرے موجودہ شوہر ہیں فرشتے کے روپ میں آئے اور اپنی زندگی کا آرام و سکون میری خاطر قربان کر دیا۔ امید تھی کہ میں صحت یاب ہو کر اختر کی محبت اور اس کے ایثار کا معاوضہ محبت اور ایثار سے ہی دوں گی لیکن قدرت نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مجھے اختر سے محبت ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکتی کہ جس انسان کو

میں دل و جان سے چاہتی ہوں اسے اپنے مفلوج جسم کا غلام بنائے رکھوں۔ میں اس کی اُمنگوں کو مفلوج نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے آزاد کر دوں اور وہ میری تمام تر جائیداد اور بنک میں جس قدر روپیہ ہے سنبھال لے۔ میں نے اس ایک بار کہا بھی تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے لیکن اس کا خلوص دیکھئے کہ وہ ناراض ہو گیا تھا......

''اسے آزاد کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں زہر کھا کر خودکشی کر رہی ہوں۔ میں کل رات کسی وقت زہر کھا لوں گی۔ میں ایک خط اختر کے نام بھی چھوڑ جاؤں گی اور اسے خدا کا واسطہ دے کر کہوں گی کہ میرے مرنے کے بعد شادی کر لے۔ اس کی شادی کے لیے میں حقیر سا تحفہ چھوڑ چلی ہوں۔ یہ تحفہ میری تمام جائیداد اور بنک کا روپیہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اختر یہ تحفہ قبول کر لے گا۔ میں وصیت نامے کی ایک نقل آپ کو بھی بھیج رہی ہوں۔ آپ کرنل اکبر مرحوم کے دوست تھے اور آپ پولیس کے آفیسر بھی ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد اختر کو پریشان نہ کیا جائے اور جائیداد کی منتقلی میں اس کی مدد کیجئے گا''۔

اختر کو چکر آ گیا۔ انسپکٹر نے اسے سنبھال لیا اور کہنے لگا۔۔۔ ''میرا خیال تھا کہ میں وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گا اور بیگم کو خودکشی سے بچا لوں گا۔ آج پچھلے پہر خط ملا تو میں وردی میں ہی ان دونوں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ مگر آپ مجھ سے زیادہ تیز نکلے......'' ۔۔۔ انسپکٹر نے اسے بازو سے تھاما اور کہا۔

''آیئے چلیں''۔

''کہاں؟''

''حوالات میں!''

دوسرے دن اختر کی نشاندہی پر بیگم کی لاش کھائی سے نکلوائی گئی۔ لاش آدھی کھائی ہوئی تھی۔ اختر نے قتل کی تمام واردات رات کو پولیس سٹیشن میں لکھوا دی تھی۔ لاش کو گاڑی میں رکھا گیا اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے اختر کو بھی اسی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

⌘ ⌘ ⌘

اتنی سی بات

حمیدی

حمیدی

سونے کے کمرے میں ساتھ ساتھ بچھے ہوئے دو پلنگوں پر جب کلثوم نے نئی چادروں کی سلوٹیں سیدھی کیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بکھرے بکھرے بالوں میں ڈھکی ہوئی گردن پر کسی کی جانی پہچانی انگلیاں گدگدی کر رہی ہوں۔ جذبات اور رومانوں سے مخمور نگاہیں چادروں پر گھومنے لگیں، چادروں کے پھولوں اور بیلوں کے ایک ایک خط کو بڑے پیار سے دیکھنے لگیں۔ چادروں کے ساتھ میچ کرتے ہوئے تکیوں کے غلاف پُر کیف سی رونق پیدا کر رہے تھے۔ وہ تو کبھی کا یہ سیٹ خریدنے کی سوچ رہی تھی مگر روزمرہ کے اخراجات سے اتنے پیسے ہی نہیں بچتے تھے۔ خاوند سے وہ فالتو پیسے لینا نہیں چاہتی تھی۔ آخر اس نے انتظام کر ہی لیا اور خاوند کو بتائے بغیر سیٹ خرید لیا۔

اس نے چادریں پلنگوں پر بچھا دیں اور تکیوں پر نئے غلاف چڑھا کر تکیے ساتھ ساتھ رکھ دیئے۔ سیٹ کی دلکشی نے سارا کمرہ جیسے مسکرا اٹھا ہو۔ ایسی ہی مسکراہٹ کلثوم کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اس کے بازو آپ ہی آپ سر سے اوپر اٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں الجھ گئیں۔ وہ جذباتی سی انگڑائی لینے ہی لگی تھی کہ جھینپ گئی۔ اس نے بازو نیچے کر لیے اور دوپٹے کو آگے سرکا کر پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو یوں چھپا لیا جیسے کسی نے دیکھ لیا ہے۔

شیفون کے دوپٹے کی اوٹ سے نئی چادروں کو کنکھیوں دیکھتی، وہ سونے کے کمرے سے نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں اس کی ننھی سی بچی تپائی کا سہارا لے کر کھڑی ہو چکی تھی اور اس کا پھول جیسا ہاتھ ریڈیو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کلثوم نے لپک کر بچی کو اٹھا لیا اور اسے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ بچی نے ماں کے بالوں کو مضبوطی سے مٹھی میں لے کر منہ کھولا اور

ماں کے سپیدی مائل گلابی گال کو چوسنے لگی۔ کلثوم کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے ہاتھ ننھی کے سر کے پیچھے رکھ کر اس کے منہ کو اپنے گال پر اور زیادہ دبا لیا۔ ننھی گال چوستی رہی اور کلثوم کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ اس کے رگ و ریشے میں جانا پہچانا سا گداز اور لذت آ گئیں ہیجان بیدار ہونے لگا۔

دیوار کے ساتھ لٹکتے کلاک کی ''ٹنگ، ٹنگ'' نے طلسم توڑ دیا۔

بچی نے چونک کر بال اور گال چھوڑ دیئے اور ننھے سے ہاتھ سے کلثوم کا منہ کلاک کی طرف گھما کر بولی— ''او......او''— ذرا ذرا جاگتی آنکھوں کی خوشنما ہیروں جیسی پتلیاں کلاک کے پنڈولم کی رفتار سے دائیں بائیں ہلنے لگیں اور کلثوم کے دل کی دھڑکنیں پنڈولم سے زیادہ تیز ہوگئیں۔ وہ بچی کو اٹھائے برآمدے میں چلی گئی۔ اس کا بڑا بچہ جو ابھی تین سال کا تھا صحن کے باغیچے میں تتلی کا تعاقب کر رہا تھا۔ کلثوم کی نگاہیں بڑے دروازے پر جم گئیں۔

منٹوں کی طوالت زیادہ ہوگئی۔ وقت کے پر بھیگ گئے۔ سرخ پھولوں سے لدے ہوئے انار کے پودے کا سایہ رک گیا۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اکرام ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کلثوم کو آج ایک بار پھر کوفت سی محسوس ہوئی کہ سارا دن گزر جاتا ہے لیکن پانچ بجتے ہی وقت کو جانے کیا ہو جاتا ہے کہ ایک ایک منٹ تھکے ماندے راہرو کی طرح ڈگمگانے کھڑانے لگتا ہے۔

بڑا دروازہ کھل گیا۔ وقت کی رکی ہوئی گاڑی دھچکے سے چل پڑی۔ اکرام آ گیا۔

بچہ تتلی کو چھوڑ کر باپ کی طرف بھاگ اٹھا۔ کلثوم کا سارا چہرہ ایک پیار بھری مسکراہٹ بن گیا۔ ننھی بے بی ماں کے بازوؤں سے ایسی اچھلی کہ ماں ہاتھ نہ رکھ لیتی تو ننھی بری طرح گرتی۔

برآمدے تک پہنچتے ہی بچے نے ٹانگوں سے لپٹ کر اور ننھی نے بغیر ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی بانہیں گردن کے گرد لپیٹ کر اور کھردرے گال سے گال رگڑ کر اکرام کی دن بھر کی تھکان دور کر دی اور اس کی تھکی تھکی مسکراہٹ کو کلثوم کی پُر شباب اور پیار سے لبریز مسکراہٹ نے تر و تازہ کر دیا۔

جب یہ ننھا سا خاندان چائے سے فارغ ہوا تو بچہ پھر تتلیوں کے تعاقب میں نکل گیا۔

ننھی پھر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل سرکتی رینگتی ریڈیو والی تپائی تک جا پہنچی اور کلثوم اکرام کو سونے کے کمرے میں لے گئی۔ وہ اسے نئی چادریں دکھانا چاہتی تھی۔ اکرام نے پلنگوں پر نئی چادریں بچھی دیکھیں تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

کلثوم اکرام کے چہرے کے اس تاثر کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ تاثر کبھی کبھی نمودار ہوتا تھا اور کلثوم کی ازدواجی زندگی میں کئی بار بے مزگی پیدا کر چکا تھا۔ کئی بار اکرام کے اس تاثر نے عشق و محبت کی بنیادوں پر کھڑی ازدواجیت کی عمارت میں زلزلے کا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ دو تین دفعہ یہ ارتعاش شدید جھٹکا بن گیا تھا۔ محبت کی بنیادیں مضبوط تھیں، عمارت کھڑی رہی۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی اس انداز سے تھے کہ میاں بیوی کم اور دوست زیادہ لگتے تھے۔ ان کی محبت شادی کے بعد کی نہیں، شادی سے بہت پہلے کی تھی۔ اکرام پر کبھی کبھی خاوندوں والی مزاجی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ آج جب اس نے پلنگوں پر نئی چادریں بچھی دیکھیں تو اس پر یہی کیفیت طاری ہوئی۔

''کتنے میں خریدی ہیں یہ چادریں؟''— اس نے بے مزہ سے لہجے میں پوچھا۔

''ساڑھے بائیس روپے کا پورا سیٹ لیا ہے''— کلثوم نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''پیسے کہاں سے دیئے؟''— اکرام کے لہجے میں حاکمیت آ گئی۔

''ساڑھے سات روپے اپنے پاس تھے''— کلثوم نے متزلزل سی آواز میں جواب دیا— ''پندرہ روپے پڑوسن سے لیے تھے''۔

''گویا یہ پندرہ روپے اب مجھے ادا کرنے پڑیں گے''— اکرم نے خفگی سے کہا اور کمرے سے نکلنے لگا۔ دروازے میں رک کے بولا— ''کلثوم! مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ یہ غیر ضروری اخراجات مجھے پسند نہیں''۔

کلثوم پلنگوں کے پاس کھڑی ہی رہی اور اکرام کی آوازِ پا جس میں خاوند کے قدموں کی آہٹ نمایاں تھی ریڈیو والے کمرے سے ہوتی ہوئی تیسرے کمرے میں جا ختم ہوئی لیکن یہ آہٹ کلثوم کے ذہن میں اور زیادہ بلند اور کرخت ہوگئی جیسے لال سرخ لوہے پر کوئی ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہا ہو۔ اس کا دل جل اٹھا۔ اس نے چاہا کہ ان نئی چادروں کو اٹھا باہر پھینکے اور جڑے ہوئے پلنگوں کو گھسیٹ کر دور دور کر دے۔ ایک اس دیوار سے

ساتھ دوسرا اس دیوار کے ساتھ اور دونوں کے درمیان دہکتے انگارے بچھا دے۔

کلثوم کا سینہ غصے اور احتجاج سے پھٹنے لگا۔ محبت سے خون رسنے لگا۔ اس نے غیر ارادی طور پر قدم گھسیٹے اور کھڑکی کے سامنے جا رکی۔ اس کی نگاہیں انار کے پیڑ کی ہریالی اور سرخ پھولوں میں الجھ گئیں۔ اسے انار کے ایسے ہی تین پیڑ یاد آ گئے جو اس کے میکے گھر کے پچھواڑے والے باغیچے میں اس کے مرحوم باپ نے اس کی تیسری سالگرہ پر قریب قریب لگائے تھے۔ اس وقت وہ ننھے ننھے پودے تھے۔ کلثوم کی طرح پیارے پیارے۔ اس کا باپ اگلے برس چوتھا پودا لگانے سے تین مہینے پہلے فوت ہو گیا تھا اور اس کی ماں نے شباب بھری امنگوں کو یاسیت، مایوسی اور بیوگی کی گھٹا ٹوپ گھٹاؤں میں چھپا کر زندگی کلثوم کی خاطر وقف کر دی تھی اور جوانی کا دھارا ننھی سی بچی کی طرف موڑ دیا تھا۔

دوسری شادی کے پیغام آئے...... سائیکلوں پر بھی، پیدل بھی، تانگوں اور کاروں پر بھی...... محبت کے سندیسے بھی آئے...... خطوں میں، راہ چلتے اشاروں میں، بڑی بوڑھیوں کی زبانی، سہیلیوں کی معرفت...... کسی سہیلی کا بھائی لاکھوں میں ایک تھا اور کسی کا دیور مربعوں اور کوٹھیوں کا مالک تھا۔ کلثوم کی ماں کی عمر ہی کیا تھی۔ چوبیس برس کا سن تھا اور ازدواجی زندگی کے دو ہی سال پورے ہو پائے تھے کہ خاوند اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہاتھ تھامنے کو بہت ہاتھ بڑھے لیکن بیوہ نے کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دیا۔ اپنے ہاتھوں میں وہ ننھی کلثوم کو اٹھائے پھرتی رہی، لوریاں دیتی رہی۔ ہلارے دیتی رہی اور اس کی ہر لوری کی تان یہیں پہ آ ٹوٹتی تھی۔

کون رٹھے ہوئے یار مناوندا ای
بھلا موئے تے وچھڑے کون ملے
ایسا کوئی نہ ملیا ڈھونڈ تھکی
دل لے کے کسے دا نسیئے کیوں
کوئی خوشی نہ ہوئے تو ہسیئے کیوں

اور وہ اونگھتی ہوئی کلثوم کو پلنگ پر لٹا کر آنسو پونچھ ڈالتی تھی۔ اس نے صرف ایک بار اپنی ایک ہمراز سہیلی سے کہا تھا۔۔۔ ''جسے چاہا تھا وہ ساتھ چھوڑ گیا۔ اب کسی کو نہ چاہ سکوں گی۔ کسی کا ساتھ دے ہی نہ سکوں گی۔ وہ تو مٹی سے جا ملا ہے۔ میں اس کی محبت کو تو مٹی

میں نہیں ملنے دوں گی''۔

وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے اور زمینوں کی آمدنی الگ تھی۔ جس محبت کو وہ مٹی میں نہیں ملانا چاہتی تھی اسے اس نے کلثوم کی بھولی بھالی شخصیت میں سمو دیا تھا۔ اس نے کئی بار بچی کے گال چوم کر کہا تھا۔۔۔ ''میں نے محبت کی تھی، تو بھی محبت کرے گی لیکن میری گڑیا! تجھے اس کے ساتھ کبھی نہ بیاہوں گی جو دو سال میں ہی تھک کے الگ جا سوئے''۔

انار کے تین پودے جو کلثوم کے باپ نے لگائے تھے بڑھ کر درخت بن گئے تھے۔ ماں کے بالوں کا نکھار پھیکا پڑنے لگا۔ کنپٹیوں کے چند بال سفید ہو گئے اور ان بالوں کی چمک اور جاذبیت کلثوم کے سیاہی مائل بھورے بالوں میں منتقل ہو گئی۔ ماں نے جیسے اپنی جوانی کی قیامت خیزیاں سرو کی طرح بڑھتی ہوئی بیٹی کے سراپا میں سمو دی تھیں۔

انار کے تینوں پیڑوں کی شاخوں نے آپس میں الجھ الجھ اور گتھم گتھا ہو کر چھتری بنا ڈالی تھی۔ ڈالیاں جھک آئی تھیں۔ پیچھے مکان کا پچھواڑا تھا اور سامنے سے عشق پیچاں کی بیل درختوں پر چڑھ گئی تھی۔ عشق پیچاں اور اناروں کی ڈالیوں نے ایسی اوٹ بنا ڈالی تھی کہ کوئی اندر چلا جائے تو باہر سے نظر ہی نہ آ سکے۔ لال لال پھول کھلتے تھے، چند دن جوبن دکھا کر مرجھا جاتے تھے اور ان کی جگہ سبز سبز گول گول انار جنم لیتے تھے جنہیں گلہریاں کھا جاتی تھیں۔ کلثوم کو ان گلہریوں پر کبھی غصہ نہ آیا تھا۔ اسے اناروں پر غصہ آیا کرتا تھا جو خود نکلنے کے لیے پھولوں کا منہ بند کر دیتے تھے۔

اسے اکرام پہلی بار انہی تین درختوں اور عشق پیچاں کے جھنڈ میں ملا تھا۔ پھر وہ یہیں ملتے رہے تھے۔ کلثوم کے ہونٹ پہلے بوسے کے کیف سے اسی ہری بھری اوٹ میں متعارف ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے بظاہر بے ضرر سے لمس نے اس کی ہستی میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ لمس بے ضرر اور ایک ثانیے جتنا مختصر ہی سہی لیکن اس کی زندگی کی اتنی لمبی داستان بن گیا جو کہیں ختم ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ اس لمس کی سنسنی اور قیامت خیزی نے اس کی نوخیز جوانی میں حشر بپا کر دیا تھا۔ کلثوم کی دنیا کائنات کا ایک راز بن کر اناروں کی اوٹ میں جا چھپی تھی۔ اس کی ساری دنیا سمٹ کر اس اوٹ میں آ گئی تھی۔ وہ اب اسی گھنیری چھاؤں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ جانا چاہتی تھی۔ اکرام کے انتظار میں، اسی کے خیال کو دل

میں لیے ہوئے!

کلثوم کا یہ خیال کس قدر طفلانہ اور معصوم سا تھا کہ اس کی ہر حرکت اور ہر بات پر اناروں کی شاخوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ وہ سمجھتی تھی جیسے وہ پہلی لڑکی ہے جس نے کسی مرد کو چاہا ہے اور اس کے رخسار پہلے رخسار ہیں جنہیں کسی مرد نے چوما ہے۔ جانے کس نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا کہ عشق کے اسرار صرف اسی پہ کھلے ہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی ماں نے اسی روز اس کے جہیز کی فہرست بنانا شروع کر دی تھی جس روز اس نے اکرام کو پچھواڑے کے باغیچے کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کے جاتے اور تھوڑی دیر بعد کلثوم کو آئینے کے سامنے کھڑے اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھالتے دیکھا تھا۔

کلثوم کی ماں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کلثوم ہر روز انار کے درختوں اور عشق پیچاں کی بیل کو بڑے پیار اور باقاعدگی سے پانی دینے لگی ہے اور یہ بھی کہ دسمبر کی یخ راتوں کو بھی کلثوم کا دم گھٹنے لگتا تھا اور وہ باغیچے میں نکل جایا کرتی تھی اور یہ بھی کہ گھر میں ہر بات کی تان اکرام پر ہی ٹوٹنے لگی تھی، بات خواہ نئے کرایہ داروں کی ہو یا کسی مزارع کی۔ کلثوم کی ماں انجان بن گئی تھی۔ وہ سب کچھ جانتی تھی — اس نے بھی چھپ چھپ کر محبت کی تھی۔ وہ بھی جوان ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ انار کے درخت تھے اور وہ جنتر کی جھاڑ تھی۔ سرگوشیاں وہی تھیں، عہد و پیمان وہی تھے، ساتھ لگ کے بیٹھنا وہی تھا، انگلیاں اسی طرح الجھتی تھیں، انگلیوں میں بھی، بالوں میں بھی، دل قریب تر ہو کر ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے تھے۔ سانسیں ٹکراتی تھیں، اکھڑتی تھیں، سنبھالے سنبھلتی نہ تھیں۔ خوابوں کا روپ نکھر آیا تھا اور تصوروں میں پیاری پیاری تفصیلات کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ماں کلثوم اور اکرام کو چور چھپے دیکھ رہی تھی۔ راہ میں نہ آئی۔ اسے اطمینان تھا کہ یہ اکرام ہے کوئی اور نہیں۔ اسے اکرام اچھا لگتا تھا۔ قریبی برادری کا دیکھا بھالا لڑکا تھا۔ گھر بھی اچھا، ماں باپ بھی اچھے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں قریبی برادری کا یہ لڑکا اس قدر قریب آ گیا کہ اکرام اور کلثوم کی شادی ہو گئی۔

ازدواجیت کی پہلی رات کلثوم نے اکرام کو جو پہلی بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ مجھے بیوی نہ سمجھنا۔ ہم دوستوں کی طرح رہیں گے مگر چند ہی مہینوں بعد کلثوم پر یہ انکشاف ہوا کہ شادی محبت کی موت ہے۔ اس لیے نہیں کہ اکرام محبت کی راہ سے بھٹک گیا تھا بلکہ اس لیے کہ کلثوم

کی نگاہ کے زاویے حقائق سے مختلف تھے۔ وہ جس فضا میں اور جس انداز سے پلی اور بڑی ہوئی تھی اس کے زیر اثر اس کے دل و دماغ نے یہ نظریہ تخلیق کر لیا کہ شادی محبت کرنے والے دو دلوں کا حزنیہ ہوتا ہے۔ مرد انسان کے روپ میں ہی بھلا لگتا ہے، خاوند کے بہروپ میں آ کر وہ کلیوں کو بھی مسل ڈالتا ہے۔

اگر اسے اکرام سے محبت نہ ہوتی تو ازدواجی زندگی سے بھاگ کر ماں کے ہاں جا پناہ لیتی۔ اس نے اکرام کی محبت کی خاطر کڑوا کسیلا گھونٹ پی لیا۔ شادی کے دوسرے سال اس نے محسوس کیا کہ اکرام میں خاوندوں والی حاکمیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کی اپنی انفرادیت اس حاکمیت کی نذر ہوتی جا رہی ہے تو اس نے پہلی بار اپنے ردعمل کا اظہار کیا لیکن جھگڑے کی صورت میں نہیں، آنسوؤں کی زبان میں۔ اکرام اس کے آنسو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کہے گا جس سے کلثوم کے دل کو تکلیف ہو۔ کلثوم مان گئی لیکن ایسی بات پھر ہو گئی تو کلثوم پھر رو دی۔ اکرام نے پھر وعدہ کیا مگر ایسی بات پھر کئی بار ہوئی۔ کلثوم جھگڑے پہ اتر آئی۔

آج اس نے دو نئی چادریں خریدی تو اکرام نے پھر وہی بات پیدا کر دی۔ بظاہر بات تو اتنی سی تھی کہ اس نے ساڑھے بائیس روپے خرچ کر دیے تھے اور اکرام نے اس خرچ کو غیر ضروری کہہ دیا تھا لیکن کلثوم کے لیے اتنی سی بات بڑی بن گئی کیونکہ اکرام نے خاوند کے روپ میں آ کر اس کے جذبات کو کچل ڈالا تھا۔ اس نے تو چادروں کے پھولوں اور بیلوں میں رومان سمو کر پلنگوں پر اکرام کے لیے بچھا دیے تھے۔ وہ تو اکرام سے اس قسم کے الفاظ سننا چاہتی تھی کہ یہ چادریں ان چادروں سے اچھی ہیں جو ہم نے پہلی رات بچھائی تھیں۔

بات تو ذرا جتنی تھی مگر گزشتہ پانچ برسوں میں ایسی کئی ایک ذرا ذرا جتنی باتیں جو ہوئی تھیں وہ کلثوم کے ذہن میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح جمع ہو گئیں۔ ایسی بدبو اٹھی کہ کلثوم کا دماغ چکرا گیا۔

اکرام اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور کلثوم کھڑکی میں کھڑی انار کے درخت کو دیکھنے لگی جو باغیچے میں تن تنہا کھڑا تھا۔ اسے اپنے میکے گھر کے اناروں کے تین پیڑ یاد آئے۔ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی کلثوم ٹپٹا اٹھی۔ گھوم کے کمرے میں دیکھا۔ سامنے انگیٹھی پر اس

کی اور اکرام کی تصویر رکھی تھی۔ یہ تصویر انہوں نے شادی کے دوسرے روز کھنچوائی تھی۔
اس کی نگاہیں اپنی تصویر پہ جم گئیں۔ پیشانی پر بکھرے ہوئے چند ایک کٹے ہوئے بال عجیب دلکشی پیدا کیے ہوئے تھے۔ کلثوم کو کل کی بات کی طرح یاد تھا کہ یہ بال پہلی بار اکرام نے اپنے ہاتھوں کاٹے تھے۔ یہ شادی سے چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ وہ اسے رات وہیں اناروں کے نیچے ملا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مونچھیں تراشنے والی قینچی تھی۔ اس نے تاروں کی دھندلائی ہوئی روشنی میں کلثوم کے یہ چند ایک بات کاٹ کر اس کی سپید پیشانی پر سجا دیے تھے اور کٹے ہوئے لمبے لمبے بال لپیٹ کر جیب میں ڈال لیے تھے۔ کلثوم جانتی تھی کہ اکرام نے وہ بال ابھی تک ایک خوبصورت سی ڈبیا میں خوشبو لگا کر اپنے اٹیچی کیس میں رکھے ہوئے ہیں۔

اس نے اکرام کی تصویر کو دیکھا تو اس کے سینے سے بگولا سا اٹھا۔۔۔ ''کیا یہ وہی اکرام ہے جسے میں نے دیوانہ وار چاہا تھا؟...... نہیں۔ یہ وہ اکرام نہیں...... صورت وہی ہے دل وہ نہیں رہا...... یہ کوئی خاوند ہے۔ جانے کس کا خاوند ہے؟''۔۔۔ کلثوم کا سینہ ابھر ابھر کے بیٹھنے لگا اور ذہن میں تلخ خیال ابھرتے چلے گئے۔۔۔ ''کہاں گئے وہ وعدے؟...... محبت...... دوستی...... ساتھی...... محبوبہ...... نہیں۔ اس نے دوستی توڑ ڈالی ہے۔ وہ ساتھ چھوڑ رہا ہے...... یہ اکرام نہیں، کوئی اجنبی ہے...... میں نے اس سے تو کبھی محبت نہیں کی تھی۔ اسے تو میں نے کبھی منہ ہی نہ لگایا تھا......''

کلثوم نے تصویر میں ایک بار پھر اپنے کٹے ہوئے بال دیکھے۔ اس نے غصے سے اپنی پیشانی پر پڑے ہوئے بالوں کو پیچھے کر کے لمبے لمبے بالوں میں چھپا دیا۔ سوچا، یہ بال اسے بہت پسند ہیں۔ وہ ہر بات میں اپنی پسند کو ترجیح دیتا ہے۔ میری ہر بات کو ٹھکرا دیتا ہے جیسے گھر میں میرے وجود کی کوئی اہمیت ہی نہیں، جیسے میری کوئی ذات ہی نہیں...... بیوی...... میری بیوی...... مسز اکرام...... میرا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے۔ اس کے ذہن میں تلخ خیالوں کی آندھی تند ہوتی چلی گئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اکرام جب بھی اس کا تعارف کراتا ہے، یہی کہتا ہے۔۔۔ ''یہ مسز اکرام ہیں۔ میری وائف''۔۔۔ یعنی کلثوم لا پتہ۔

کلثوم کی ذات میں ماں کی اکلوتی بیٹی بیدار ہو گئی جو ماں سے اپنی ہر بات منوایا کرتی

تھی۔ اس نے ماں کے گھر میں حکمرانی کی تھی، من مانی کی تھی اور جو منہ سے نکلا پورا کرایا تھا۔ ماں نے اس کی ہر فرمائش پوری کی تھی۔ آخر اس روز وہ بیوی کا خول اتار کر اکلوتی بیٹی بن گئی۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔

ساتھ والے کمرے میں اسے اکرام کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ تیز قدم اس کمرے میں گئی۔ اکرام ریڈیو کے سامنے بیٹھا ریڈیو کی سوئی گھما رہا تھا۔

''میں آپ سے چند ایک باتیں کرنا چاہتی ہوں''۔۔۔ کلثوم فیصلہ کن لہجے میں بولی لیکن اکرام نے کوئی توجہ نہ دی۔ کلثوم کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ بولی۔۔۔ ''میں کہہ رہی ہوں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے''۔

''آ لوٹ کے آ جا میرے میت''۔۔۔ ریڈیو بول اٹھا۔۔۔ ''تجھے میرے گیت بلاتے ہیں''۔

کلثوم کا غصہ موسیقی اور گیت کی لہروں میں بہنے لگا۔

جانے کس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔۔۔ ''یہ وہی اکرام ہے کلثوم! لوٹ آئے گا۔ تم بھی لوٹ آؤ۔ اتنی سی بات پر دل نہیں توڑا کرتے''۔۔۔ اکرام کا دوسرا روپ بھی اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے ذرا سنبھلی سلجھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ''اکرام صاحب! میں بھی گھر میں موجود ہوں۔ ذرا سی توجہ......''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''۔۔۔ اکرام نے گھوم کر ترش سے لہجے میں کہا۔۔۔ ''پھر دورہ پڑ گیا ہے آج؟۔۔۔ ذرا یہ گانا تو سن لینے دو''۔

''میں کہہ رہی ہوں مجھے بھی ذرا سا سن لیجئے''۔

اکرام نے منہ پھیر کر ریڈیو کی آواز بلند کر دی۔ یہ وار ایسا بھرپور پڑا کہ وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے لپک کر ریڈیو کا سوئچ آف کر دیا۔

''اف خدایا!''۔۔۔ اکرام نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ ''کلثوم! تمہارا بچپن نہ گیا۔ کہو کیا کہنا چاہتی ہو''۔

''صرف یہ کہ میں اپنے گھر جا رہی ہوں''۔۔۔ کلثوم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی۔۔۔ ''میں امی کی پاس جا رہی ہوں۔ اس گھر میں داشتہ بن کے نہیں رہوں گی۔ نہ میں نوکرانی ہوں نہ میں بیوی بن کر رہوں گی''۔

''تم تو پاگل ہو کلثوم!'' ___ اکرام نے صلح جوئی سے کہا ___ ''اتنی سی بات یہ اس قدر طوفان......''

''یہ بات اتنی سی نہیں......'' ___ کلثوم نے بپھر کر کہا ___ ''آپ ہر مہینے پچاس روپے کی سگریٹ پھونک سکتے ہیں لیکن میں گھر کے استعمال کے لیے دو چادریں نہیں خرید سکتی۔ یہ بات اتنی سی نہیں۔ ذرا ان پانچ برسوں کی ایسی سینکڑوں اتنی اتنی سی باتیں یاد کیجئے۔ آپ نے میری انفرادیت کو کچل ڈالا ہے۔ میری ذات اور محبت کو اپنا غلام بنا کر آپ نے مجھے باورچی خانے میں قید کر دیا ہے۔ میری انانیت کو مسل ڈالا ہے......''

''یہی وجہ ہے کہ میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کے خلاف ہوں'' ___ اکرام نے کہا ___ ''اگر تم نے انفرادیت اور انانیت کے الفاظ نہ پڑھے ہوتے تو آج اپنے ساتھ میرا بھی دماغ خراب نہ کرتی''۔

''جی ہاں!'' ___ کلثوم نے طنز آلود لہجے میں کہا ___ ''آپ کو اَن پڑھ بیوی چاہیے تھی جو آپ کے حضور دست بستہ کھڑی رہتی۔ آپ اپنی تفریح پہ آدھی تنخواہ خرچ کر لیتے اور وہ دو چادروں کے لیے آپ سے درخواست کرتی۔ آپ مجھے بھی ویسی ہی بیوی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں''۔

''سنو کلثوم!''

''ریڈیو خریدنے گئے تو آپ نے میری پسند کو ٹھکرا کر اپنی پسند کا ریڈیو خریدا۔ میں صوفہ پسند کر کے آئی تو آپ نے ناک بھوں چڑھائی اور اپنی پسند کا سیٹ خرید لائے''۔

''کلثوم!'' ___ اکرام نے صورتِ حال پہ قابو پانے کی خاطر کہا ___ ''تم نے جو چاہا میں نے لے دیا۔ جتنے کپڑے تمہارے پاس ہیں......''

''جی آپ ٹھیک کہتے ہیں......'' ___ کلثوم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ___ ''میرے پاس سوٹوں کا ڈھیر پڑا ہے لیکن ایک بھی ایسا نہیں جو میں نے آزادی سے اپنی پسند کا خریدا ہو۔ میں نے جس کپڑے پہ ہاتھ رکھا آپ نے اسے الگ پھینک دیا اور یوں دکاندار کے سامنے میری توہین کر کے اپنی پسند کا کپڑا لے دیا۔ سینڈلوں کے جو ایک درجن جوڑے ہیں وہ سب آپ کی پسند کے ہیں۔ میرے پہناوے پر بھی میرا اختیار نہیں۔ ابھی اُس روز کی بات یاد کیجئے۔ منا ضد کر رہا تھا تو میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ زیادہ چینی اچھی

نہیں ہوتی۔ آپ نے اپنے ہاتھوں چمچ بھر چینی اس کے دودھ میں ڈال دی تھی۔ صرف اس لیے کہ آپ مجھ سے الٹ چلنا چاہتے ہیں نا! اس لیے کہ بچوں پر بھی میرا کوئی اثر اور رعب نہ رہے......''

''تم بچے کو بگاڑنا چاہتی ہو کلثوم! اور میں......''

''جی نہیں، بگاڑ آپ رہے ہیں کیونکہ آپ خود بگڑے ہوئے بچے ہیں۔ آپ کو اپنے جذبات سے پیار ہے۔ آپ کو اپنے آپ سے محبت ہے۔ اس گھر میں اب میرے جذبات کا بھی دخل نہیں رہا میں نے شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ......''

''کلثوم!'' ___ اکرام نے بات ختم کرنے کے انداز سے کہا ___ ''خدارا ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ دن یاد کرو جب میں تمہیں کہاں سے ملنے آیا کرتا تھا''۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے......'' کلثوم طنز آلود لہجے میں بولی ___ ''اس وقت بھی آپ نے اپنے ہی جذبات کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ اس وقت آپ ایک بیوی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ آپ میرے ساتھ کھیلتے رہے۔ اب آپ مجھ سے محبت نہیں کر رہے۔ آپ مجھے استعمال کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو دل دیا تھا مگر آپ نے میرے جسم کو قبول کیا۔ میرا ضمیر بھی ہے اور میری الگ شخصیت بھی ہے۔ میرے بھی جذبات اور احساسات ہیں۔ آپ نے مجھے......'' اس کی آواز رقت میں ڈوبنے لگی مگر سنبھل گئی اور سخت تیکھی آواز میں بولی ___ ''میں اپنے گھر جا رہی ہوں اکرام صاحب! آپ کو بیوی چاہیے۔ کوئی بیوی تلاش کر لیجئے''۔

''بات صرف پندرہ روپوں کی ہے نا! جو تم نے پڑوسن سے ادھار لیے ہیں......'' ___ اکرام کو بھی غصہ آنے لگا۔ بولا ___ ''وہ میں ادا کر دوں گا۔ تم نے میرے سر تھوپ جو دیئے ہیں''۔

''جی نہیں! آپ کے سر نہیں تھوپ رہی۔ میں امی سے لے کر دے دوں گی۔ وہاں تو مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ میں جا رہی ہوں''۔

''تم مجھے دھمکی دے رہی ہو!''

''دھمکی نہیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے''۔

اور بات پھر نئی چادروں پر آن پہنچی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ اکرام کا انداز جو پہلے صلح

جو تھا اب اس میں جوابی حملے کا رنگ آ گیا۔ دونوں نے کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن کا اثر دلوں تک جا پہنچا۔ اکرام نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ میں ہی تھا جو تمہیں بیاہ لایا تھا اور کلثوم نے کہہ دیا کہ آپ نے میری امی کو بے وقوف بنا کر جہیز بھی اپنی مرضی کا بنوالیا تھا۔ اکرام اٹھ کے باہر چلا گیا اور کلثوم سونے کے کمرے میں پلنگ پر جا گری۔

وہ رات کلثوم کی زندگی کی بڑی ہی لمبی رات تھی۔ رات وہ دوسرے کمرے میں سوئی۔ اکرام اسے صرف ایک بار بلانے گیا۔ بازو سے پکڑ کر کھینچا بھی لیکن کلثوم برف کا تودہ بنی رہی۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے سامنے آتا رہا۔ اس اکھڑی ہوئی مزاجی کیفیت میں اسے کوئی ایک بھی ایسی بات یاد نہیں آ رہی تھی جس میں شگفتگی کا ذرہ بھر عنصر ہو۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں اکرام سے دور ہٹتی چلی گئی، دونوں کے درمیان ایک خاوند حائل ہو گیا تھا۔ غم و غصہ بڑھتا ہی گیا۔ کلثوم نے اکرام کو شادی سے پہلے والے روپ میں دیکھا۔ یہ تصور بھلا لگا تو اس کا غصہ ماند پڑنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے حاکم قسم کے ایک خاوند نے اناروں والے اکرام کا گلا گھونٹ دیا۔ کلثوم تڑپ اٹھی۔ غصہ پھر بیدار ہو گیا۔ اسے اپنی ماں کا گھر یاد آیا اور شادی سے پہلے کی زندگی جب اس کی ہر فرمائش ایک اشارے سے پوری ہو جاتی تھی۔ کلثوم کیونکر برداشت کر لیتی کہ کوئی اس سے اپنی منواتا چلا جائے۔ اسے یہ بھی خیال آ گیا کہ یہ مکان اس کا اپنا ہے۔ شادی کے بعد ماں نے خالی کروا کر کلثوم کے نام کروا دیا تھا تاکہ اکرام اور وہ الگ تھلگ زندگی جئیں۔

کلثوم نے اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اکرام سے برتر پایا اور اس سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ بھی کہ وہ آ کر ہزار منتیں کرے اس کے ساتھ نہیں آئے گی۔

صبح ہوئی تو اکرام ناشتہ کیے بغیر دفتر چلا گیا۔ گھر کی فضا میں تلخی اور تناؤ کا اضافہ ہو گیا۔ کلثوم نے اکرام کو جاتے ہوئے یوں دیکھا جیسے ہوٹل میں رہنے والے کبھی ایک دوسرے کو اچٹتی سی نگاہ سے دیکھ لیتے ہیں۔ اکرام دروازے سے نکل گیا تو کلثوم کا دل بیٹھ سا گیا مگر سنبھل گئی۔ اسے خیال آ گیا کہ اکرام اسی طرح دو چار روز بغیر ناشتے کے دفتر گیا تو اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔

بچے بھی جاگ اٹھے تھے۔ اس نے بچوں کو نہلایا، کپڑے تبدیل کرائے، اپنا سامان

باندھا اور نوکر سے تانگہ منگوا کر گھر نوکر کے حوالے کیا۔ بچوں کو ساتھ لیا اور ماں کے گھر چلی گئی۔ اسے توقع تھی کہ ماں اسے اور اس کے بچوں کو سینے سے لگائے گی، اکرام کو کوسنے دے گی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے وقار اور خودداری کو برقرار رکھے گی۔

اس نے ماں کو پانچ برسوں کی شکایتیں سنا ڈالیں اور فیصلتہً کہا کہ وہ اب اکرام کے پاس نہیں جائے گی مگر ماں بولی تو کلثوم کو یوں لگا جیسے ماں نے اس کی ایک بھی نہ سنی ہو۔ ماں اسے سمجھانے بیٹھ گئی۔ اس کی باتوں میں اکرام کی وکالت یا دوسرے لفظوں میں خاوند کی برتری کا عنصر غالب تھا۔

''سنو بیٹی!'' ـــــ ماں نے کلثوم کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ـــــ ''خاوند عورت کے سر کی کلغی ہوتا ہے۔ خاوند بنا عورت جی سکتی ہے نہ مر سکتی ہے۔ عورت کی تو کوئی ذات ہی نہیں ہوتی بیٹا! تیرے ابا کو اللہ بخشے، زندہ تھے تو سینکڑوں ہزاروں کی آمدنی تھی۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو بھی آمدنی میں کوئی فرق نہ پڑا۔ پیسے بھی آتے رہے، دانے بھی آتے رہے۔ ہم ماں بیٹی نے اچھا کھایا، اچھا پہنا۔ تیرے لیے نیا مکان بنوایا، زیور بنوایا، پیسہ ختم ہوتے نہ ہوتا تھا نہ اب ختم ہو رہا ہے، پر سر پر تیرے ابا کا سایہ نہ ہونے سے یوں لگتا تھا جیسے بھرے بازار میں کسی نے میرا دوپٹہ اتار لیا ہو۔ مزارعے ہاتھ باندھے غلام تھے۔ برادری جھک کے سلام کرتی تھی مگر بندے بندے سے ڈر لگتا تھا......''

ماں نے اسے پیار سے سمجھایا کہ عورت خاوند کے وجود کا ایک حصہ ہے اور خاوند کے تابع ہے۔ خاوند سے الگ عورت کی کوئی ذات ہی نہیں۔ کلثوم کو اسی فلسفے سے چڑ تھی۔ ازدواجی زندگی کا یہ تصور اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ خاوند کی غلامی سے ہی تو بھاگ کے آئی تھی۔ جب اس نے اکرام کو خاوند کی حیثیت سے یوں آسمان تک چڑھتے دیکھا اور اس کی وکالت میں اس قدر دقیانوسی دلیلیں سنیں تو وہ جل بھن کے رہ گئی۔ اس نے ماں کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی تو ماں نے اسے مطلقہ عورت کی تصویر ایسے زاویے سے دکھائی کہ اس پر ہول طاری ہو گیا۔

''لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں بیٹی!'' ـــــ ماں نے کہا ـــــ ''باتوں کے بتنگڑ بنتے ہیں۔ کہنے والے فاحشہ اور بدکار تک کہہ جاتے ہیں۔ سکھی سہیلیاں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔ بچے بھی بڑے ہو کر لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ جو کوئی سنتا ہے کہ فلاں

کو طلاق مل گئی تو وہ پہلی بات یہ کہتا ہے ــــ ''تھی ہی ایسی، خاوند نے دیکھ لیا ہوگا کسی کے ساتھ......''

کلثوم کا دل جو محبت کے لیے بنا تھا اور صرف محبت کا ہی متلاشی تھا، ڈوبتا چلا گیا اور دم یوں گھٹنے لگا جیسے منوں مٹی تلے دفن کی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ماں کے گھر کی دیواریں بھی اس پر آوازے کس رہی ہوں ــــ ''فاحشہ، بدکار، مطلقہ......''

وہ اٹھی اور تیز قدم دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پلنگ پر جا گری اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ماں نے سوچا رو لینے دو، شاید اس سے غبار ہلکا ہو جائے۔ اسے کلثوم کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ بہت دیر گزر گئی تو ماں نے دروازے پہ دستک دی۔ کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ ماں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا پھر بھی اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

دروازے کے گرے ہوئے پردوں کے درمیان انچ ڈیڑھ انچ جگہ خالی تھی۔ دونوں پردے پورے طرح ملے ہوئے نہیں تھے۔ ماں نے شیشے اور پردوں میں سے جھانکا تو اس کا دل دہل گیا۔ کلثوم دروازے کی طرف پیٹھ کیے کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ اور میز پر خواب آور گولیوں کی بھری ہوئی شیشی رکھی تھی۔ ماں کا سینہ لرز گیا۔ کلثوم کے مزاج کو وہ خوب سمجھتی تھی۔ جب بگڑتا تھا تو سنبھلے نہ سنبھلتا تھا۔ یہ اسی کے لاڈ اور پیار کا نتیجہ تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا کہ چند دنوں سے اسے نیند اچھی طرح نہیں آ رہی تھی تو کسی کے کہنے پر وہ خواب آور گولیوں کی پوری شیشی خرید لائی تھی۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب اس نے یہ شیشی سامنے انگیٹھی پر رکھ دی تھی۔ اسے انتہائی بھیانک خیال آیا ــــ ''کیا میں یہ گولیاں اپنی اکلوتی بچی کو ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے خرید لائی تھی؟''

اس کا دماغ چکرا گیا لیکن سنبھل گئی۔ اچھا ہوا کہ اس نے گھبرا کر دروازے کو دھکے دینے شروع نہ کر دیئے۔ وہ دبے پاؤں کھڑکی کی طرف گئی۔ اس کھڑکی کی چٹخنی عموماً کھلی رہتی تھی۔ اس نے دل میں دعا کی ــــ ''یا اللہ! کلثوم کو یہ کھڑکی بند کرنے کا خیال نہ آیا ہو'' ــــ اس نے کھڑکی کے کواڑ کو آہستہ سے دھکیلا تو کواڑ کھل گیا۔ وہ کود کر اندر چلی گئی اور جھپٹا مار کر شیشی اٹھا لی۔ پیشتر اس کے کہ کلثوم سنبھل پاتی، ماں نے اسے کندھوں سے

پکڑا اور کرسی سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ کلثوم ماں کی مضبوط گرفت سے آزاد ہونے کو بہت تڑپی لیکن ماں کی گرفت مضبوط تر ہو گئی۔

ماں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا اور اس کی مزاجی کیفیت کو ٹھکانے لائی۔ گولیوں والی شیشی چھپا دی اور وہ کاغذ بھی اٹھا لیا جس پر وہ اکرام کے نام آخری خط لکھ رہی تھی۔ ماں اسے ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑ رہی تھی اور اسے سمجھا رہی تھی کہ اتنی سی بات پر وہ اس حد تک پاگل ہو گئی ہے کہ......

لیکن کلثوم اتنی سی بات کو زندگی اور موت کا سوال کہہ رہی تھی۔

رات کے نو بج رہے تھے کہ اکرام آ گیا۔ وہ پہلے کلثوم کی ماں سے ملا۔ تھوڑی دیر بعد کلثوم کے کمرے میں گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکست کا تاثر تھا اور چہرہ اترا ہوا۔ اکرام کو دیکھ کر اس نے کروٹ بدل لی۔ اکرام نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا پھر ایک ہاتھ گردن کے نیچے اور دوسرا کمر کے نیچے سرکا کر اسے اٹھا لینا چاہا مگر کلثوم کے آنسو بہنے لگے۔ اکرام نے اس کا منہ اپنی طرف کر کے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ کلثوم کی ہچکیاں نکل گئیں۔

''چلو اٹھو، بہت ہو چکی'' ــــ اکرام نے کہا ــــ ''میں تمہیں لینے آیا ہوں''۔

''چلے جایئے یہاں سے......'' ــــ کلثوم نے منہ پھیر کر کہا ــــ ''بات ختم ہو گئی ہے''۔

''اتنی سی بات پر اس قدر طوفان؟'' ــــ اکرام نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''یہ بات اتنی سی نہیں تھی'' ــــ کلثوم نے کہا اور اس کا ہاتھ جھٹک ڈالا۔

''اچھا...... بات ختم کرنے سے پہلے میری ایک بات سن لو۔ کلثوم! صرف ایک بات''۔

''نہیں''۔

''اس محبت کے نام پر جو تم نے مجھ سے کی تھی''۔

''وہ محبت نہیں فریب تھا جو آپ نے مجھے دیا اور شاید...... شاید، میں بھی آپ کو فریب دیتی رہی ہوں''۔

''فریب ہی سہی......'' ــــ اکرام کے لہجے میں جذباتیت کا رنگ جھلکنے لگا۔ اس نے

مخموری اور رندھی ہوئی آواز میں کہا ـــــ ’’آؤ کلثوم! انار کے انہی درختوں تلے چل کے ایک دوسرے کو دیئے ہوئے وعدے واپس کر دیں۔ میری انگلی سے اپنے ہاتھوں اپنی انگوٹھی اتار لینا۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔ تمہاری راہ میں کبھی نہیں آؤں گا۔ اگر بلاؤ گی۔ تو آ جاؤں گا‘‘۔

رات آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ چاند کی چمک میں تارے ماند پڑ گئے تھے اور دو سائے حویلی کے پچھواڑے اناروں کے جھنڈ میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پتوں میں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ لمحات کا کارواں پیچھے کو چل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ برس پیچھے لوٹ گیا۔

اکرام نے انار کا ایک پھول توڑ کر کلثوم کے بالوں میں ٹانک دیا اور اس کے دونوں گال تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ کلثوم نے پیشانی کے کٹے ہوئے بالوں کو لمبے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔ اکرام نے ان بالوں کو اس کی پیشانی پر بکھیر دیا۔ اس نے کلثوم کے گالوں کو پھر ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ کلثوم نے اکرام کی کلائیاں پکڑ لیں اور اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اسے کہہ دینا چاہا ـــــ ’’اکرام! چلے جاؤ۔ اب یہ الجھن سلجھ نہ سکے گی‘‘ ـــــ لیکن اس کے ہاتھ بے جان ہو گئے اور اکرام کی کلائیوں سے چپک کے رہ گئے۔ پھر اس کا جسم بھی بے بس ہو گیا۔ کوئی قوت اسے آگے دھکیلنے لگی۔

اس نے اکرام کے ہاتھ گالوں سے ہٹا کر اپنے کندھوں پہ رکھ دیئے اور ذرا آگے بڑھ کر سر اس کے سینے سے لگا دیا۔ اکرام کے بازو اس کی گردن کے گرد اور کلثوم کے بازو اکرام کی کمر کے گرد لپٹ گئے۔

کلثوم نے چہرہ اوپر کیا تو اکرام نے کہا ـــــ ’’سنا ہے تم خودکشی کرنے لگی تھیں؟‘‘

’’اونہہ!‘‘ ـــــ کلثوم نے مسکراتی ہوئی سی سرگوشی کی ـــــ ’’اتنی سی بات پہ کوئی مر تھوڑے ہی جاتا ہے‘‘ ـــــ اور اکرام کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

⌘ ⌘ ⌘

جب سوزِ عشق جاگا

حمیدی

نور چا چا گاؤں کی آبرو کا رکھوالا تھا۔ یوں تو بڑے شاہ جی مرحوم کے مزار کا بھی گاؤں پہ سایہ تھا اور اب ان کی گدی پر چن چراغ شاہ بیٹھے تھے جن کی دعا و برکت سے گاؤں شر شرار، بھوت پریت، جن، چڑیل، پکڑ سایہ اور ہر بلا سے محفوظ تھا اور دشمن کا سر نیچا رہتا تھا لیکن گاؤں کے دشمن چن چراغ شاہ سے کم اور نور چا چا سے زیادہ بد کتے تھے، نور چا چا کی کرامات ہی ایسی تھیں۔

گاؤں کے دشمن کہیں دور دراز نہیں رہتے تھے۔ ان کا گاؤں وہ سامنے نظر آتا تھا یہی کوئی پون کوس کا فاصلہ ہوگا۔ نور چا چا کے گاؤں اور اس گاؤں کی کھیتیوں کے مینڈھ سانجھے تھے، دونوں گاؤں کے درمیان بہتا سرکاری کھڈ سانجھا تھا، ہری کھیتیوں کی آغوش میں شیشم کے پیڑوں تلے قبرستان بھی سانجھا تھا۔ اُدھر کی بیٹیاں اِدھر اور اِدھر کی بیٹیاں اُدھر بیاہی ہوئی تھیں۔ ڈیڑھ کوس پرے ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن بھی سانجھا تھا۔ دونوں گاؤں کے فوجی جوان اسی سٹیشن پر اترتے تھے اور اپنے اپنے گاؤں میں چھٹی کاٹ کر اسی سٹیشن سے رات کی مسافر گاڑی سے دور پردیس چلے جایا کرتے تھے۔ اس سٹیشن پر یہی ایک گاڑی رکا کرتی تھی، وہ بھی رات بارہ بجے۔ ڈھور ڈنگر چرتے چگتے اور بچے کدکڑے لگاتے اس گاؤں سے اس گاؤں تک جا پہنچتے تھے لیکن دلوں میں جو فاصلے حائل ہو گئے تھے وہ بڑی کٹھن مسافت تھی جسے نہ اس گاؤں کے گبھرو پاٹ سکے نہ اُس گاؤں کے جیالوں نے کبھی طے کرنے کی ہمت کی۔

کرتے بھی کیسے؟ صرف سرکاری کھڈ ہوتا تو وہ پھلانگ کے پار کر جاتے لیکن درمیان میں ناک حائل ہوگئی تھی۔ ناک پر پاؤں رکھ کر گزرنا ممکن نہ تھا حالانکہ اسی ناک پہ

پاؤں رکھ کر دونوں گاؤں کے بیسیوں آدمی جیل جا چکے تھے۔ کئی عمر قید بھگت رہے تھے اور کئی نعرے لگاتے پھانسی چڑھ گئے تھے۔ جو قتل ہو گئے تھے ان کے اور جو پھانسی چڑھ گئے تھے ان کے بھی جنازے دونوں گاؤں نے مل کر پڑھے تھے اور قاتلوں اور مقتولوں کی قبریں بھی پہلو بہ پہلو کھدی تھیں۔

یہ سلسلہ ایک مدت سے جاری تھا اور طویل مدت تک جاری رہنے کے امکانات بھی روشن تھے۔ باراتیں بھی آتی تھیں، ڈولیاں بھی جاتی تھیں اور جنازے بھی اٹھتے تھے۔ رشتے ناطے جو گڑ شکر سے طے ہوتے تھے، ڈھولک کی تھاپ پر کنوارے گیتوں میں پروان چڑھتے بنیڈ باجے بجتے، لوگے چلتے، پھر میکے اور سسرال کے تین چار پھیروں میں کوئی بات پیدا ہو ہی جاتی تھی جس سے سہاگن جو ڈولی پہ جاتی تھی طلاق لے کر پا پیادہ لوٹ آتی تھی اور اس کے جواب میں کوئی ایک دو بچوں کی ماں سسکیاں لیتی اسی آنگن میں جا بیٹھتی تھی جہاں سے برسوں پہلے اس کی ڈولی اٹھی تھی!

نور چاچا نے تو رشتوں ناطوں کا سلسلہ ہی توڑ دیا تھا۔ اس کی عمر آج پچاس برس ہو چکی تھی لیکن اسے وہ واردات کل کی بات کی طرح یاد تھی جب وہ دس گیارہ برس کا بچہ تھا تو اس کا باپ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا تھا۔ آج نصف صدی گزرنے والی تھی لیکن باپ کی لاش ابھی تک اس کی نظروں تلے تڑپ رہی تھی۔ جوہڑ کے قریب لڑائی ہوئی تھی۔ یہ جوہڑ پیپل کی چھاؤں تلے دونوں گاؤں کے درمیان تھا۔ دونوں گاؤں کے بچے اس میں تیرا کرتے تھے۔ نور چاچا اس وقت نور چاچا نہیں، نادان سا نور تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ ان کی بھینس پار والوں کی ایک بھینس سے لڑ پڑی۔ نور کے باپ نے دوسری بھینس کو لاٹھی دے ماری تھی۔ اس گاؤں کے دو آدمی قریب ہی کھیتوں میں پانی لگا رہے تھے وہ کدالیں لیے نور چاچا کے باپ پہ ٹوٹ پڑے تھے۔ دو آدمی ادھر سے بھی پہنچ گئے تھے۔

نور چاچا کو آج صرف اسی قدر یاد تھا کہ اس کے باپ کا سر کھل گیا تھا اور وہ جیٹھ کی جھلستی دھوپ میں دہکتی دھرتی پہ تڑپ رہا تھا۔

لڑائی تو بظاہر بھینسوں پر ہوئی تھی لیکن اس کے پس منظر میں نصف صدی کی سیاست تھی جو اب روایت بن گئی تھی اور جسے بڑے بوڑھے ورثے کے طور پر گاؤں میں چھوڑ گئے تھے۔ نور چاچا کا باپ قتل ہو گیا اور چار ہی سال بعد اس کی ماں بھی مر گئی اور وہ تپتے خلاؤں

میں بھٹکنے کے لئے اکیلا رہ گیا تھا۔ باپ کی زمین خاصی تھی۔ نھیال والوں نے اسے گود لے لیا اور گاؤں والوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور یتیم بچے کی کھیتیاں ویران نہ ہونے دیں، مگر بچے سے جو پیار چھن گیا تھا وہ اسے کوئی نہ دے سکا۔

شفقت اور پیار کی محرومی نے نور چاچا کے ذہن میں باپ کی تڑپتی لاش کے تصور کو اور زیادہ اجاگر کر دیا تھا اور انتقام کا زہر اس کی سوچ اور فکر پہ جمتا گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا، بڑوں کی طرح سوچ سکتا تھا نہ لڑ سکتا تھا لیکن وہ جلد اور بہت ہی جلد انتقام لینے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ ہجولیوں میں کم اور بڑوں کی ان چنڈال چوکڑیوں میں زیادہ اٹھتا بیٹھتا تھا جہاں پار والے گاؤں کے خلاف نت نئی سازشیں تخلیق ہوا کرتی تھیں۔ وہاں ان کے مویشی چوری کر لانے، کھلیاں جلا دینے، کسی لڑکی کو اٹھا لانے اور پانی کی باری پر دنگا فساد کرنے کے منصوبے بنا کرتے تھے۔ تخریبی باتیں نور چاچا کے کچے ذہن میں قندیلیں روشن کرتی جا رہی تھی۔ اس کی نفسیاتی خلش اور جذباتی ہیجان کو ان ہی باتوں سے تسکین ملتی تھی۔ وہ جب بڑوں کی محفل سے اٹھتا تھا تو تنہائی میں کتنی ہی دیر تصوروں میں انتقام کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں نفرت و حقارت اور انتقامی جذبات کے سوا کچھ نہ رہا۔

لڑکپن میں وہ بڑوں کی سی پختہ باتیں کرنے لگا تھا اور جب لڑکپن جوانی میں مدغم ہو گیا تو اس کے چہرے پر مردوں کی پختگی کا پُرکشش روپ چڑھ گیا۔ اس کا خوبرو تصور گاؤں کی گوریوں کو کنواری تنہائیوں میں گدگدانے لگا لیکن نور چاچا کی تنہائیوں کو باپ کی لاش تلخ بنائے رکھتی تھی۔ وہ جب تنہا ہوتا تھا تو تصوروں میں باپ کی لاش اور زیادہ نکھر آتی تھی اور نور چاچا کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔

بیس برس کی عمر میں نھیال والوں نے اس کے باپ کی تمام زمین اس کے نام منتقل کرا دی اور نور چاچا جو چہرے سے خوبرو اور جسم و جثہ کا دل نشین گبھرو تھا۔ ان تمام والدین کو پیارا لگنے لگا جن کی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ وہ اب گاؤں کا راجہ تھا اور کئی بے چین نگاہوں اور پُر شباب آہوں کا مرکز، لیکن نور چاچا کی نگاہیں کھٹے کے پار اس گاؤں پر جمی رہتی تھیں۔ جس کے دو آدمیوں نے دس برس گزرے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا اور عدالت میں جا کر صاف بری ہو آئے تھے۔ نور چاچا تو کسی بھی روز پانی کی باری پہ یا جوہڑ پر ڈھور ڈنگروں سے ہی کوئی بات پیدا کر کے لڑائی کر سکتا تھا۔ اب تو اس کے بازوؤں میں

بے پناہ قوت تھی اور دماغ صرف لڑنے مرنے کی ہی سوچتا تھا لیکن اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ قتل کروں گا، بدلہ لوں گا لیکن ایک بار نہیں، بدلہ لیتا ہی رہوں گا اور ہر روز تماشہ دیکھا کروں گا

"نور بیٹا!" ـــــ ایک روز بڑے چوہدری نے اسے پیار سے کہا تھا ـــــ "اب گھر بسا لو جوانی یوں اکیلے نہیں کٹا کرتی۔ گاؤں والے الگ انگلیاں اٹھاتے ہیں"۔

"چاچا جی!" ـــــ نور نے پُراسراری مسکراہٹ سے کہا تھا ـــــ "شادی اپنے گاؤں سے نہیں کروں گا۔ نہ میری بارات جائے گی نہ میں کہیں سے ڈولی لاؤں گا، پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت جوان ہوگئی ہے۔ اسے اٹھا لاؤں گا۔ اپنے گاؤں کے بیچ بیٹھ کر نکاح پڑھاؤں گا اور ایک مہینہ بعد طلاق دے دوں گا" ـــــ نور نے متانت سے کہا تھا ـــــ "پھر اسی گاؤں کی ایک اور لڑکی کو اٹھا لاؤں گا اور زبردستی نکاح کر کے تھوڑے دنوں بعد طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا"۔

چوہدری نے چونک کر نور کو دیکھا لیکن وہ خراماں خراماں کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ رُت چیت بیساکھ کی تھی۔ گندم کے خوشے پک کے سنہرے ہو چکے تھے اور بیساکھ کی پُرکیف تپش نے جوان سینوں میں ہل چل مچا رکھی تھی۔ خوشے تن کے جھوم رہے تھے اور الہڑ جوانیاں مٹک مٹک کر گھوم رہی تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے دلوں کی باتیں زیرِلب تبسم میں آ بسی تھیں اور اس تبسم میں انگڑائیاں مسکرا رہی تھیں۔ بازو آپ ہی آپ انگڑائیوں کے لیے پھیل جاتے تھے۔

"نور!" ـــــ اسے یوں آواز سنائی دی جیسے گندم کے کسی خوشے نے سرگوشی میں بلایا ہو۔ وہ رک گیا ـــــ "کہاں چلے نور!" ـــــ اس نے دیکھا، دو کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر مہراں بیٹھی تھی۔ وہ کہیں جا رہی تھی لیکن نور کو دیکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مہراں گاؤں کی حسین لڑکی تھی اور کنواری۔ جانے کتنے امیدواروں کی آنکھیں اس کی راہ میں سجدہ ریز رہتی تھیں لیکن مہراں کی اپنی جبیں نور کے قدموں میں جھکی جا رہی تھی۔ نور کو معلوم نہ تھا۔

"کیوں!" ـــــ نور نے مسکرا کر پوچھا ـــــ "یہاں کیوں بیٹھ گئی؟"

"کوئی دیکھ نہ لے" ـــــ مہراں نے مسکراتی ہوئی سی آہ لے کے کہا ـــــ "تم کہاں چلے؟...... بیٹھ جاؤ نا"۔

"کیوں؟"

"کوئی دیکھ نہ لے"۔

"پگلی مہراں!" ـــــ اس نے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔

مہراں نے اس کا راستہ روک لیا۔ نور بھی رک گیا اور سنجیدہ سے لہجے میں بولا۔

"مہراں! میں گاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں اور تم گاؤں کی بیٹی ہو"۔

"میں بے آبرو تو نہیں نور!" ـــــ مہراں نے دھیمے مگر باوقار لہجے میں کہا ـــــ "میں گاؤں کی آبرو ہوں اور اپنی رکھوالی بھی کر سکتی ہوں، پر فرق اتنا سا ہے کہ تم مرد ہو میں عورت ہوں" ـــــ اس نے آہ لی اور سسکی سی لے کر بولی۔

"جا، نور! پھر کبھی تیری راہ نہ آؤں گی"۔

نور کے جی میں جانے کیوں آئی کہ مہراں کے پاس بیٹھ جائے لیکن مہراں آنچل سے آنسو پونچھتی اٹھی بیٹھی تھیں۔ نور کو دھچکا سا لگا۔ بولا۔

"برا مان گئی مہراں؟...... میں تو گاؤں کی ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتا ہوں"۔

"اُونہہ!" ـــــ مہراں گردن کو پیارا سا خم دے کر بڑی سادگی سے بولی ـــــ "ہر لڑکی کو بہن سمجھتا ہے تو بیاہ کس سے کرے گا؟"

"پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت سے"۔

"ہائیں!" ـــــ مہراں چونک اٹھی ـــــ "اپنے باپ کے قاتلوں سے جا کر رشتہ جوڑے گا؟"

"نہیں" ـــــ نور نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا ـــــ "رشتہ مانگنے نہیں جاؤں گا نہ رشتہ جوڑوں گا۔ زینت کو اٹھا لاؤں گا"۔

اور وہ مہراں کو خلاؤں میں بھٹکتا چھوڑ کے آگے چلا گیا۔

اس رات نور بہت دیر بعد گھر آیا۔ سارا گاؤں گہری نیند سو گیا تھا۔ اگلی صبح پڑوسیوں نے پوچھا کہ رات کہاں رہے تو وہ مسکرا کر بات گول کر گیا اور کسی کو پتہ نہ چلنے دیا کہ وہ شام کے اندھیرے میں باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے گرد گھومتا رہا ہے اور زینت کے باپ چوہدری کرم دین کے گھر کا جائزہ لیتا رہا ہے۔

پھر نور اکثر غائب رہنے لگا اور رات بہت دیر سے گھر آنے لگا۔

فصل کٹ کے کھلیانوں میں ڈھیر ہوگئی۔ کھلیانوں میں پکی گندم کی پہاڑیاں سی کھڑی ہوگئیں اور دھوپ میں سوکھنے لگیں۔ ایک رات نور چاچا کے گاؤں والوں کو پار والے گاؤں کے کھلیانوں سے مہیب سے شعلے اٹھتے نظر آئے۔ تاریک رات سرخ ہورہی تھی۔ کھلیان جل رہے تھے اور دھوئیں کے بھوت شب کی تیرگی میں اٹھ اٹھ کر گم ہو رہے تھے۔ صبح نور کے گاؤں میں خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ ہر کوئی ہر کسی سے فاتحانہ لہجے میں پوچھ رہا تھا— ''کس نے لگائی تھی؟''— لیکن ہر کوئی سر ہلا کے چپ ہو رہتا تھا۔ گاؤں والے اس مرد کا منہ چوم لینا چاہتے تھے جو ان کے دشمنوں کی فصل جلا آیا تھا۔ صرف نور تھا جو ابھی جاگا ہی نہیں تھا۔ دن کا پچھلا پہر گزر چکا تھا۔ جب نور آنکھیں ملتا باہر نکلا تو تین چار آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ پوچھا— ''نورا! سنا تو نے بھی، رات پار والوں کا ایک کھلیان جل گیا ہے؟''

''ایک کھلیان؟''— نور کے چہرے کا تاثر یوں بدل گیا جیسے اسے دکھ ہوا ہو۔

''کیوں؟''— ایک آدمی نے طنز آلود لہجے میں کہا— ''تمہیں رنج ہوا ہے کہ تیرے باپ کے قاتلوں کا کھلیان جل گیا ہے؟''

''بہت رنج ہوا ہے بھائیو!''— نور نے کہا— ''میں نے تو ان کے دو کھلیانوں میں انگارے رکھے تھے اور آگ بھڑکنے سے پہلے بھاگ آیا تھا''۔

''ارے دونوں جل گئے ہیں''— اس نے اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا— ''تو نے انتقام لے لیا نورا!''— اور نور کے چہرے پر رونق آگئی بولا— ''ابھی نہیں، انتقام تو میں تمام عمر لیتا رہوں گا۔ یہ تو بسم اللہ کی ہے''۔

بڑے بوڑھوں نے نور کو سینے سے لگا لیا۔ وہ خوش تھے کہ پار والے دشمنوں کے خلاف جنگ کو زندہ رکھنے کے لیے ایک اور ہیرو میدان میں اتر آیا ہے۔

عین اس وقت پار والے گاؤں کے بیس پچیس آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لیے کٹھے پہ صف آرا ہوئے اور للکار للکار کر نور کے گاؤں والوں کو گالیاں دینے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے سوا ان کے کھلیانوں کو اور کوئی آگ لگانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ نور کے گاؤں کے چھوٹے بڑے چھویاں اور کلہاڑیاں لے کر نکل آئے لیکن نور نے راہ روک لی اور بولا۔

''سر کھل جائیں گے مردو! بچوں کو یتیم نہ کرو، بچوں کی ماؤں کو بیوہ نہ کرو۔ ان گالیوں

کا جواب اب نور دے گا۔ اب ڈانگ سوٹا نہیں چلے گا۔ تم اپنے کھلیانوں پر پہرے بٹھا دو، باقی میں سنبھال لوں گا''۔

لیکن نور کے گاؤں کے مرد اس کی ایک بھی سننے پہ آمادہ نہ تھے۔ اُدھر سے گالیاں تیروں کی طرح سنسناتی چلی آرہی تھیں۔ اِدھر نورا اپنے گاؤں والوں کی راہ روکے کھڑا تھا۔ بول بول کر اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ آخر یہ جھاگ ضائع نہ گئی اور اس نے خون خرابہ ہوتے ہوتے بچا لیا۔

دو ہی روز بعد نور نے گالیوں کا انتقام لے لیا۔ وہ اس طرح کہ ایک رات وہ پھر گھر بہت دیر سے آیا اور دوسری صبح پتہ چلا کہ پار والے چوہدری کرم دین کے دو بیل اور چوہدری رب نواز کی ایک بھینس مرگئی ہے۔ چند دنوں بعد خبر ملی کہ کسی نے چارے میں زہر ملا دیا تھا۔ یہ مویشی گرمیوں کی وجہ سے باہر کی کھرلی پہ بندھے تھے اور نور گاؤں کے چوکیدار اور باہر سوئے ہوئے آدمیوں کی نظر بچاتا کھرلی میں زہر کی پڑیا بکھیر آیا تھا۔ نور بے حد مسرور تھا اور اس کے چہرے پر انوکھی سی رونق آگئی تھی۔

دوسرے روز پار والے گاؤں کے تین آدمی نور کے گاؤں کے دو آدمیوں سے الجھ پڑے۔ وہ اپنے دو بیلوں اور ایک بھینس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ جوہڑ کا کنارا میدانِ جنگ بن گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کوئی قتل نہ ہوا۔ نور چن چراغ شاہ کے پاس گیا اور عرض کی کہ دونوں گاؤں کا راضی نامہ کرا دیں۔ دونوں گاؤں شاہ جی کی مریدی میں تھے۔ ان کا کہنا حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ جی دونوں فریقوں کو تعویذ دیا کرتے تھے اور لوگ پھانسی چڑھ جانے تک ان کے تعویذ گلے میں لٹکائے رکھتے تھے۔ وہ انتقام لینے کی شبھ گھڑی بھی بتایا کرتے تھے۔ اب نور ان کے پاس دونوں فریقوں میں راضی نامے کے لیے گیا تو انہوں نے دونوں گاؤں کے پنچوں کو بلا کر دونوں گاؤں کی تاریخ میں ایک اور راضی نامے کا اضافہ کر دیا اور بات تھانے تک نہ پہنچنے پائی۔ نور کا مقصد ہی یہی تھا۔

کھلیانوں سے دانے گھروں میں آگئے تھے اور جن کے کھلیان جل گئے تھے وہ سینے کی آگ ٹھنڈی آہوں سے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاں ایک مہینہ پہلے کھڑی فصلوں کی لہریں تھیں، وہاں اب دور دور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔

راضی نامے کے دس روز گزر گئے تھے۔ جمعرات کا دن تھا۔ دونوں گاؤں سے

بوڑھے، بچے، عورتیں کھیتوں کے میدان میں جمع ہوگئی تھیں۔ اردگرد کے دیہات کے لوگوں نے بھی اسی میدان میں آکر ہجوم کیا اور میلے کا سا سماں بندھ گیا۔ دونوں گاؤں کے میراثی ڈھول پیٹ رہے تھے اور دس بارہ بیل گاڑیاں میدان میں گھوم رہی تھیں۔ گاڑیوں سے جتے بیلوں کو صابن سے نہلایا گیا تھا۔ گردنوں میں گھنٹیاں، اٹھنیوں اور چونیوں کے ہار اور ٹانگوں سے بندھے گھنگھرو سُر تال میں چھنک رہے تھے۔ بعض نے بیلوں کے سینگوں سے ریشمی رومال باندھ رکھے تھے اور ان کی پیٹھوں پر رنگ برنگ دوپٹے پھیلا کر باندھ دیئے تھے۔

یہ ''گڈوں'' (بیل گاڑیوں) کی دوڑ کا مقابلہ تھا جو نور نے پار والے گاؤں سے طے کیا تھا۔ راضی نامے کے دوسرے روز نور پار والے چوہدری کرم دین کے ہاں چلا گیا تھا اور اس کے گھٹنے چھو کر بڑے ادب اور احترام سے کہا تھا۔

''چاچا جی۔ میں ثبوت دینے آیا ہوں کہ یہ راضی نامہ پہلے راضی ناموں کی طرح ٹوٹنے کے لیے نہیں کیا گیا۔ اگر آپ بھی ہماری طرح سچے دل سے دشمنی ختم کر دینا چاہیں تو آیئے مل جل کر ہنسیں کھیلیں اور ایک دوسرے کے غم بانٹ لیں۔ دونوں گاؤں کے گبھرو حرام موت مر رہے ہیں۔ کوئی قتل ہو جاتا ہے اور کوئی پھانسی چڑھ جاتا ہے''۔

نور نے ایسے لہجے میں بات کی تھی کہ چوہدری کرم دین کے آنسو نکل آئے تھے اور اس نے نور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ــــ ''نور بیٹا! یہ عہد تیرا باپ کرتا تو قتل نہ ہوتا۔ بہت خون خرابہ ہو چکا بیٹا!'' ــــ اور کرم دین پر رقت طاری ہوگئی تھی۔

یہ وہی چوہدری کرم دین تھا جس کی بیٹی زینت کو نور نے اٹھا لانے، زبردستی نکاح پڑھوانے اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دینے کا عہد کیا تھا۔

کرم دین کے آنسو دیکھ کر نور نے سر جھکا لیا، پھر بولا ــــ ''چاچا، آؤ ہم دنیا کو دکھا دیں کہ ہم ایک ہو گئے ہیں۔ آؤ چاچا، اس جمعرات کے روز دونوں گاؤں مل کے گڈوں، کی دوڑ کریں اور ہنسیں کھیلیں''۔

اور یوں نور نے دونوں گاؤں کو ''گڈوں'' کی دوستانہ دوڑ پر راضی کر لیا تھا لیکن نور کے اپنے گاؤں کے چند آدمی نور کے اس اقدام پر خوش نہیں تھے وہ جگہ جگہ کہتے پھر رہے تھے کہ راضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن دشمنوں سے یوں گھل مل جانا کہاں کی غیرت

ہے۔ خود نور کا باپ انہی دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

اس احتجاجی چہ میگوئیوں کے باوجود ''گڈوں'' کی دوڑ ہو رہی تھی اور جمعرات کے روز دونوں گاؤں کے درمیان خالی کھیتوں کے وسیع میدان میں ہزاروں دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔

نور کا گڈا بھی دوڑ میں شامل تھا۔ اس نے اپنے کالے بیل کو دولہا کی طرح سجا رکھا تھا اور گڈے اور بیل کے سینگوں کو کڑوا تیل مل کر چمکایا ہوا تھا۔ نور نے چارخانے کا لاچہ، دو گھوڑے کی بوسکی کا کرتہ اور سر پر فیروزی رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔ اس کا کلف سے اکڑا ہوا شملہ سب سے زیادہ اونچا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز سے گڈے کو میدان میں چکر دے رہا تھا اور پار والے گاؤں کے بچے بچے کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ہنس ہنس کر سلام کر رہا تھا۔

پار والے گاؤں کا ایک گڈا اس کے قریب آ کر رکا۔ نور نے گھوم کر دیکھا وہ پار والے مہدی حسین کا گڈا تھا۔ مہدی حسین نور کا ہم عمر تھا اور اسی کی طرح گبھرو اور خوبرو۔ نور کے باپ کو مہدی حسین کے باپ نے ہی قتل کیا تھا لیکن وہ عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا اور اب بڑھاپے نے اس کی کمر دوہری کر دی تھی۔ مہدی حسین کو اس نے دشمنوں کے سامنے کبھی نہ جھکنے کے سبق دیئے تھے اور لٹھ بازی میں طاق کر دیا تھا۔ گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ مہدی حسین کی لاٹھی ستر گز تک مار کرتی ہے۔

اس نے اپنا بیل اور گڈا نور کی طرح سجا رکھا تھا۔ نور کے قریب گڈا روک کر اس نے نور کو مسرت اور انسیت سے سلام کیا۔ نور اپنے گڈے سے اس کے گڈے میں کود گیا اور اس قدر زور سے بغل گیر ہوا کہ مہدی حسین کا چہرہ لال ہو گیا اور اس کی ہنسی نکل گئی۔ میدان میں بکھرے ہوئے ہجوم میں سرگوشیاں سنائی دینے لگیں جو سمٹ سمٹا کر ایک قہر آلود طعنے میں سمٹ آئیں ــــ ''بے غیرت، باپ کے قاتل کے بیٹے کو سینے سے لگا رہا ہے'' ــــ نور کے گاؤں والے اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

پنچ میدان میں آ گئے۔ ڈھول یکبارگی بج اٹھے۔ بکھرے ہوئے ہجوم میں کھلبلی مچ گئی اور میدان خالی ہو گیا۔ گڈے ایک طرف چل پڑے اور دور ایک صف میں جا کھڑے ہوئے۔ تماشائی میدان کے دونوں طرف دیواروں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ دونوں گاؤں کے چھ چھ گڈے دوڑ کے لیے آئے تھے۔ چوہدری کرم دین میدان کے وسط میں

ہاتھ میں چادر لئے کھڑا تھا۔ گڈوں کے بیل صف میں کھڑے بے تابی سے کھر مار رہے تھے۔ سواروں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور وہ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔

نور نے اپنا گڈا درمیان میں رکھا۔ دو گڈے بائیں، مہدی حسین کا گڈا تھا۔ نور بار بار مہدی کو دیکھ کر مسکراتا تھا اور مہدی کی پُر شباب مسکراہٹ اور زیادہ کھل گئی تھی۔ نور کے گاؤں والے نور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

''کم عقل کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ راضی نامے تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن راضی نامے کا یہ مطلب نہیں کہ دشمنوں کو یوں ہنس ہنس کر سلام کرتے پھریں''۔

میدان کے وسط میں کھڑے چوہدری کرم دین نے چادر اونچی کرلی۔ ڈھول یکبارگی خاموش ہوگئے۔ تماشائیوں کے ہجوم پہ سناٹا چھا گیا۔ سواروں نے بیلوں کی رسیاں تان لیں اور چابک لہرانے لگے۔ چوہدری کرم دین نے چادر ہلا کر جھٹکے سے نیچے کی اور بھاگ کر میدان سے نکل گیا۔ کائنات کا سکوت دہل گیا ''ہلا نیلے...... اللہ بیلی بگے...... اللہ ای اللہ''۔۔۔ اور بیلوں کے گھنگھروؤں، گھنٹیوں اور قدموں کی بے ہنگم آوازوں اور مہیب جھنکار ہجوم کی ''ہلا شیری'' اور نعروں اور ڈھولوں کے شور سے قیامت کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔

سامنے پون کوس کھلا میدان تھا۔ راہ میں اونچی نیچی مینڈھیں اور کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ کٹھے کا موڑ بھی تھا اور گڈوں کو پون کوس کی یہ ناہموار مسافت چشم زدن میں طے کر کے سبز جھنڈے تک پہنچنا تھا جو ویران سے ریلوے سٹیشن سے ڈیڑھ دو سو گز اس طرف نصب کیا گیا تھا۔ ہجوم گڈوں کے ساتھ ساتھ بھاگ پڑا اور گڈے سو ڈیڑھ سو گز تک جس طرح ایک صف میں بھاگے تھے ابھی تک ایک ہی صف میں بھاگ رہے تھے۔ تازہ دم بیل جیسے سمجھ گئے تھے کہ یہ ان کے گاؤں کی عزت اور ناک کی دوڑ ہے۔ اگر پیچھے رہ گئے تو نہ کوئی انہیں صابن سے نہلائے گا، نہ سینگوں پر تیل چپڑے گا، نہ یوں چھبی کے رنگ رنگیلے دوپٹوں سے سجائے گا۔ بیل عزت و ناموس کے نام پر ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ گڈے ناہموار کھیتوں میں فٹ فٹ بھر اچھلتے تھے اور ان کے پہیئے اچھل اچھل کر گھوم رہے تھے۔

آگے جا کر گڈوں کی ترتیب بکھرنے لگی۔ نور نے اپنے بیل کی رسی کو بائیں طرف جنبش دی تو اس کا گڈا مہدی حسین کے قریب چلا گیا۔ مہدی کے پیچھے اسی کے گاؤں کا گڈا

تھا جس کا سوار مہدی اور نور کی طرح گٹھا ہوا جوان تھا۔ یہ دونوں پار والے گاؤں کی آبرو اور لاج کے رکھوالے تھے۔ ذرا آگے جا کر مہدی اور نور کے گڈے پہلو بہ پہلو ہوگئے۔ دونوں سینہ پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگا رہے تھے۔ مہدی حسین سے پیچھے والے سوار کو آگے بڑھنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ اس نے اپنے بیل کی رسی کھینچ کر گڈا نور کے پہلو میں کرنا چاہا لیکن نور نے دیکھ لیا اور اس نے گڈا دائیں کر کے اس کا راستہ روک لیا۔ پھر اس نے گڈا نور اور مہدی کے درمیان سے نکالنا چاہا تو نور نے اپنے بیل کو مہدی کے قریب کرلیا۔ تیسرا گڈا مہدی کے پیچھے ہی رہا۔

گرد کے بادل اور نعرے آسمان تک جا پہنچے تھے۔ ہجوم بھاگ بھاگ کر پسینہ پسینہ ہونے لگا۔ سب کی نظریں اب نور اور مہدی پر تھیں۔ باقی گڈے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اگلی مینڈھ زیادہ اونچی تھی۔ تینوں گڈے بڑی زور سے اچھلے۔ نور مشکل سے سنبھلا مہدی حسین گڈے میں گر پڑا لیکن اٹھ بیٹھا۔ اس کا بیل جانفشانی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ مہدی کے گاؤں کا دوسرا گڈا جو اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا مہدی کے بائیں پہلو میں ہونے لگا مگر نور نے اپنا گڈا مہدی کے پہلو میں دبا کر اسے دائیں ہو جانے پر مجبور کر دیا اور تیسرا گڈا مہدی حسین کے پیچھے ہی رہا۔ یہ نور کا کمال تھا۔

میدان آدھا طے ہوگیا تھا اور تماشائیاں کا ہجوم تھک کر تتر بتر ہوگیا تھا۔ صرف وہی ساتھ دے رہے تھے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ نور نے اچانک اپنا گڈا دائیں کو کرلیا اور مہدی حسین کے گڈے کا ایک پہیہ کسی گڑھے میں دھنس گیا۔ پھر گڈا کئی فٹ ہوا میں اچھلا، مہدی گیند کی طرح اچھل کر بیل کے آگے جا پڑا اور اس کا گڈا اور بیل لڑھکنی کھا کر مہدی کے اوپر جا پڑے۔ پیچھے اسی کے گاؤں کا دوسرا گڈا اس کے ساتھ لگا چلا آ رہا تھا۔ ایک دو گز کا ہی فاصلہ تھا۔ گڈا روکنے کا وقت ہی نہ تھا۔ یہ گڈا بھی اچھلا اور مہدی کے اوندھے پڑے گڈے سے دھماکے سے ٹکرایا اور اس کا سوار اس تصادم میں پس گیا۔

گرد گھٹا کی طرح اٹھی اور اس گرد سے صرف نور کا گڈا بدستور بھاگتا باہر نکلا۔ دوسرے دونوں گڈوں کو گرد نے چھپا لیا تھا۔ تھکا ہارا ہجوم تیزی سے بھاگا۔ پچھلے گڈوں نے رخ موڑ لئے اور رک گئے۔ ان کے سوار کود کر بھاگے۔ گھوڑ سواروں نے باگیں موڑ لیں اور یہ سارا انبوہ گرد پہ ٹوٹ پڑا۔ دیکھا مہدی حسین بھی اور اس کے گاؤں کا دوسرا سوار

بھی مر چکے تھے۔

ایک بیل کی گردن اور دوسرے کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ نور گڈے سے اتر کر بھاگ کر آیا اور اس نے اپنا شملہ والا صافہ سر سے اتار کر چہرے پہ رکھ لیا جیسے سسکیاں لے لے کر رو رہا ہو۔

سب نے دیکھا کہ وہاں ایک گہرا گڑھا تھا جس میں مہدی حسین کے گڈے کا پہیہ آ گیا تھا۔ مہدی کے گاؤں کے لوگوں نے نور کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور ایک نے لرزتے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔۔۔ ''نور، تُو مہدی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے گڈا پرے کیوں لے گیا تھا؟''۔۔۔ ایک اور آواز آئی۔۔۔ ''نورے، یہ خون تجھے ہضم نہیں ہوگا۔ تجھے معلوم تھا کہ یہاں گڑھا ہے''۔

''جو اللہ کو منظور تھا بھائیو!''۔۔۔ نور نے اداس اور ملتجی لہجے میں کہا۔۔۔ ''میرا بیل بے قابو ہو کر پرے چلا گیا تھا۔ اپنی اپنی تقدیر ہے بھائیو۔ کہو تو میں بھی اپنے گڈے تلے آ کر مر جاؤں گا''۔

اس میدان میں جہاں نعرے گونج رہے تھے اور ڈھول بج رہے تھے۔ مردوں کی ہچکیاں اور عورتوں کے بَین گونجنے لگے۔ بیلوں اور گھنٹیوں اور گھنگھروؤں کی اداس اداس جھنکار نوحہ کرنے لگی۔ شام کو دونوں گاؤں نے مل کر مہدی حسین اور اس کے ساتھ مرنے والے کا جنازہ پڑھا۔ قبرستان میں ایک آواز سنائی دی۔

''نورے! مرد اس طرح بدلہ نہیں لیا کرتے۔ تجھے معلوم تھا وہاں گڑھا ہے ورنہ تم گڈا پرے نہ کرتے۔ مہدی کو بھی خبردار کر دیتے''۔

''نورے!''۔۔۔ ایک اور دشمن کی آواز ئی۔۔۔ ''تُو نے باپ کے خون کا بدلہ لے لیا ہے اب ہماری باری ہے''۔

نور نے چن چراغ شاہ کے مرحوم باپ کے روضے کی قسم کھا کر کہہ دیا۔۔۔ ''مجھے معلوم نہ تھا وہاں گڑھا ہے۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ جس روز انتقام لوں گا للکار کر لوں گا''۔

لیکن نور نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ اس نے انتقام لے لیا تھا۔ وہ جس روز پار والے

گاؤں میں گڈوں کی دوڑ کا دن مقرر کر کے آیا تھا۔ اسی رات جب سارا گاؤں سو گیا تھا وہ کدال لیے میدان میں چلا گیا تھا اور اس نے اطمینان سے یہ گڑھا کھودا تھا۔ اس میں سوکھی جھاڑیاں رکھ کر کاریگری سے اوپر مٹی بچھائی تھی اور مٹی اِدھر اُدھر بکھیر کر گندم کے خشک پودے اور جھاڑیاں رکھ دی تھیں۔ دوڑ میں ابھی تین روز باقی تھے۔ ان تین دنوں میں سورج نے تازہ مٹی کو خشک کر کے کھیتوں کے رنگ سے ملا دیا۔ دوڑ کے دوران نور نے بڑی ہوشیاری سے اپنا گڈا مہدی حسین کے قریب رکھا تھا اور مہدی کے پیچھے والے گڈے کو اسی کے پیچھے ہی رہنے دیا تھا۔ اس نے گڑھے پر نشانی رکھی ہوئی تھی جو قریب آئی تو نور نے اپنا گڈا ایک طرف کر لیا۔ اس نے اپنے باپ کے خون کا انتقام قاتل کے بیٹے سے لے لیا تھا۔

استادی سے دو آدمی قتل کر دینے کے باوجود نور کی نظروں تلے اس کے باپ کی لاش تڑپتی ہی رہی۔ اس کے سینے میں جو آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ صرف ایک روز تک ٹھنڈی رہی۔ جب مہدی حسین اور اس کے ساتھی کی لاشیں قبروں میں اتر کر نور کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس کی نظروں کے سامنے اس کے اپنے باپ کی خونچکاں لاش تڑپنے لگی۔ سینے کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ بچپن کی جو خون آلود یادیں ذہن میں جم گئی تھیں، وہ دو خون کر کے بھی نہ دھل سکیں۔ اس سے پہلے وہ دشمنوں کے دو بیل اور ایک بھینس زہر دے کر مار چکا تھا۔ ان کے کھلیان جلا چکا تھا۔ پھر بھی وہ بے چین تھا۔ وہ شفقت اور پیار کی محرومی میں پل کے جوان ہوا تھا اور اس کے ذہن میں پیار کی جگہ باپ کی خون آلود لاش کا بسیرا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ دونوں گاؤں کی دشمنی اور گہری ہو گئی۔ پہلے راضی نامے ٹوٹا کرتے تھے، اب رشتے ناطے بھی ٹوٹ گئے۔ اب نہ اِدھر سے بارات جاتی تھی، نہ اُدھر سے ڈولی آتی تھی۔ گاؤں کی شادیاں گاؤں میں ہی ہو جاتی تھیں۔ دونوں گاؤں میں اب دو دو چوکیدار رات بھر جاگتے تھے۔

نور شام کے بعد گاؤں سے غائب رہنے لگا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ پھر اس کے متعلق مشہور ہو گیا کہ وہ پار والے گاؤں کے چوہدری کرم دین کی بیٹی، زینت کو اٹھا لانے کی فکر میں ہے جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھا کیونکہ گاؤں میں اب سبھی اس کے پیچھے پڑے گئے تھے کہ وہ شادی کر لے اور اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کو اٹھا لاؤں گا۔ زبردستی نکاح پڑھاؤں گا اور تیسرے مہینے طلاق دے کر گاؤں سے نکال دوں گا''۔

اس دوران مہراں نے کئی بار اس کی راہ روکی اور ایک بار نور کو کہہ دیا۔

''نورا! بیاہ کروں گی تو تیرے ساتھ کروں گی، کسی اور نام کے ساتھ رجسٹر پر انگوٹھا نہیں لگاؤں گی، نہیں تو جس روز تیری بارات جائے گی اس روز میرا جنازہ اٹھے گا''۔

نور مسکرا دیا۔ مہراں کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر نور کا گریبان پکڑ لیا اور مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

''سچ بتا نورے! تیرے سینے میں دل ہے یا پتھر؟''

''جو کچھ تھا، دے آیا ہوں''___ نور نے متانت سے کہا۔

''کس چڑیل کو؟''___ مہراں نے اس کا گریباں چھوڑ کر یوں پوچھا جیسے صدمے سے ہچکی لی ہو۔

''مہراں! وہ چڑیل ہی ہے''___ نور نے دکھی ہوئی سی آہ لے کر کہا___

''دیکھتا ہوں وہ مجھے کھاتی ہے یا میں اسے کھاتا ہوں''___ مہراں کا سر جھک گیا۔ نور نے اس کی ٹھوڑی تھام کر کہا___ ''چند روز اور انتظار کر لے مہراں، نظر تو یہی آتا ہے کہ میرا گھر تُو ہی بسائے گی''___ اور نور مہراں کے دل میں ایک معمہ ڈال کر کھیتے کی طرف چل دیا۔

ایک سال گزر گیا۔

پار والے گاؤں سے راتوں کو ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیوں کے گیت سنائی دینے لگے اور نور پر خاموشی چھاتی چلی گئی۔ پھر ایک روز اس گاؤں سے گولوں کے دھماکوں اور ڈھول کے ساتھ باجے بھی بجتے سنائی دیئے۔ نور جو شام کو غائب ہو جایا کرتا تھا، اس شام کھانا کھائے بغیر لیٹ گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ شام پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کی شادی اسی گاؤں کے ایک آدمی سے ہو گئی تھی۔ اسی زینت کو نور اٹھانا چاہتا تھا، لیکن وہ نور کے انتقام کا نشانہ بننے سے صاف بچ گئی تھی۔

ایک وہ وقت تھا کہ مہراں نور کی راہ روکا کرتی تھی اور اب یہ وقت آیا کہ زینت کی شادی کے تیسرے روز نور نے مہراں کو راہ میں روک لیا اور اداس سی مسکراہٹ سے کہا۔

''مہراں! کہو، تمہارے ماں باپ سے بات کروں؟''

اور اسی چاند کی سترہویں رات مہراں کی ڈولی نور کے آنگن میں آن اتری۔ وہ رات بڑی حسین تھی۔ سارا گھران کا اپنا تھا۔ مہراں کی نہ ساس تھی نہ سسر، نند نہ بھاوج، بس اللہ کا نام تھا اور مہراں نور کی پوجا کر رہی تھی۔

پھر عروسی کی شب گزر گئی اور پچیس برس گزر گئے۔

نور اور مہراں اکیلے ہی رہے، نہ بچی نہ بچہ۔

نور کی جوانی اب گئے وقت کا قصہ کہانی بن گئی۔ نور آج وہ گھبرو نور نہیں، نور چاچا بن گیا تھا۔ عمر کے پچاس برس بیت گئے تھے۔ سر اور مونچھوں کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ چہرے پر جوانی کی جو رونق تھی اس پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھنے لگا تھا۔ مہراں نے جوانی نور چاچا کی خدمت میں گزار دی یا خانقاہوں اور مزاروں پر اولاد کے لیے نذر و نیاز دیتے گزر گئی۔ پر مہراں کی گود ہری نہ ہوئی لیکن نور چاچا کو چنداں افسوس نہ تھا۔ گاؤں کا ہر بچہ اس کا اپنا ہی بچہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو کر گاؤں کے بچوں میں گھل مل گیا تھا اور انہیں اپنی جوانی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ بچوں میں وہی زہر گھول رہا تھا جو بڑے اس کے سینے میں بھر گئے تھے لیکن نور چاچا ان بزرگوں سے مختلف تھا۔ وہ نوجوانوں کو دشمن کے آمنے سامنے آ کر لڑنے سے روکا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ دشمن کو استادی سے مارو، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مہدی حسین کے استادانہ قتل کے بعد اس نے زندگی کے پچیس برس پار والوں پر زمین دوز حملوں میں گزار دیئے۔ اس نے یہاں تک کیا تھا کہ دس برس گزرے قریب کے ایک اور گاؤں کا ایک آدمی جوہڑ کے قریب ایسے پُراسرار طریقے سے قتل ہو گیا تھا کہ مہینہ بھر قاتل کا سراغ نہ ملا تھا۔ نور چاچا نے جھوٹی شہادتیں اور ثبوت فراہم کر کے پار والے گاؤں کے ایک بے گناہ آدمی کو پکڑوا کر عمر قید دلوادی تھی۔ نور چاچا نے بڑی ہوشیاری اور دانش مندی سے کڑیاں ملائی تھیں جنہیں قانون نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

چند ہی برس گزرے ایک رات نور چاچا شہر سے لوٹ رہا تھا، آدھی رات کا وقت تھا۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوا۔ ہر سو اندھیرا سکوت تھا۔ اسے ایک آدمی کا سایہ نظر آیا جو دبے پاؤں گلی میں دیوار کے ساتھ جا رہا تھا۔ نور چاچا اسے دیکھنے کے لیے رک گیا پھر

اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور بعض گھروں کے ڈھور ڈنگر باہر کی کھرلیوں پہ بندھے تھے۔ وہ آدمی ایک کھرلی کی طرف بڑھا تو نور چاچا کو اپنی جوانی کی ایک رات یاد آگئی۔ وہ بھی پار والے گاؤں اسی طرح آدھی رات دبے پاؤں گیا تھا اور ایک کھرلی میں زہر کی پڑیا بکھیر آیا تھا۔

نور چاچا دبے پاؤں تیزی سے بڑھا اور پیچھے سے اس آدمی گردن بازو کے گھیرے میں لے کر بازو کا شکنجہ دبا دیا۔ اس آدمی کے ہاتھ سے کوئی چیز زمین پر گری۔ نور چاچا نے بازو کا شکنجہ اور تنگ کر کے اس آدمی کے پیٹ میں زور زور سے گھونسے مارے۔ ذرا دیر بعد بازو ڈھیلا کیا تو وہ آدمی لڑھک کر گر پڑا۔ نور چاچا نے نبضیں دیکھیں، پھر دل پہ ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ نور چاچا نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے جو چیز گری تھی وہ ایک پڑیا تھی۔ ویسی ہی پڑیا، جیسی وہ برسوں گزرے پار والے گاؤں کی ایک کھرلی میں ڈال آیا تھا۔

وہ آدمی پار والے گاؤں سے آیا تھا۔ نور چاچا نے اس کی لاش کو کندھے پہ ڈالا اور گاؤں سے باہر نکل گیا۔ رات کی گاڑی گزرنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ریلوے لائن کوس بھر دور تھی نور چاچا لاش اٹھائے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔

دوسری صبح ریلوے لائن پر لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور ہر سُو یہ خبر پھیل گئی کہ پار والے گاؤں کا ایک آدمی گاڑی تلے آ کر کٹ گیا ہے۔

ایسے بے شمار ہی قصے تھے جو اب عمر کے پچاسویں برس نور چاچا گاؤں کے بچوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس کی فتح کا قابلِ داد پہلو تو یہ تھا کہ اس نے ڈھور ڈنگر بھی مارے تھے۔ کھلیان بھی جلائے تھے۔ قتل بھی کئے تھے اور پار والوں کو رہ رہ کر ایسے ڈنک مارے تھے کہ وہ رو پیٹ کر چپ ہو رہتے تھے لیکن پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے نہ پنچوں میں بیٹھ کے کوئی جواز پیش کر سکتے تھے۔ پار والوں نے چن چراغ شاہ سے بڑے بڑے زوردار اور تباہ کن تعویذ لکھوائے تھے جن میں کچھ نور چاچا کے کھیتوں میں دبائے گئے لیکن چن چراغ شاہ کی کرامات نور چاچا کی استادی کے سامنے بے اثر رہی۔

چن چراغ شاہ کے باپ کے مزار اور دونوں گاؤں کے مشترکہ قبرستان کے درمیان پیڑوں کا گھنا جھرمٹ تھا۔ جھرمٹ تلے جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ قبرستان سے مزار کی طرف جاؤ تو جھرمٹ کا چکر کاٹ کے جانا پڑتا تھا۔ جھرمٹ گھنا بھی تھا وسیع بھی۔ اندر سے گزرنا

آسان نہ تھا اور اس وجہ سے بھی کوئی جھرمٹ کے اندر سے نہیں گزرتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی تھیں۔ گاؤں کے اکثر لوگ چن چراغ کی گدی کی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے وہاں چڑیلوں کو دیکھا ہے۔ ایک روز نور چاچا وہاں سے گزر رہا تھا تو ٹھٹک کے ایک پیڑ کے تنے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اسے جو منظر دکھائی دیا اس سے اس کا پسینہ نکل آیا۔ اسے یوں لگا جیسے پار والے اس کی لاش پہ ڈھول پیٹ رہے ہوں اور اس کی ناک کتے چاٹ رہے ہوں۔

اس نے دیکھا کہ پیڑوں کے جھرمٹ تلے جھاڑیوں کی اوٹ میں اس کے گاؤں کی ایک کنواری لڑکی رضیہ پار والے گاؤں کے ایک جواں سال آدمی کے ساتھ بیٹھی ہنس کھیل رہی تھی۔ رضیہ کا باپ فوج میں صوبیدار تھا۔ وہ باپ کے ساتھ چند مہینہ کراچی بھی رہ آئی تھی اور وہ آدمی فوج میں لیفٹیننٹ تھا اور ان دنوں چھٹی آیا ہوا تھا۔ نور چاچا کو چکر سا آیا اور اس نے معاً سوچا کہ پہلے جا کر رضیہ کے باپ کو قتل کر دے جس نے لڑکی کو شہر کی ہوا لگا کر اس قدر بے حیا بنا دیا تھا۔

نور چاچا کے ہاتھ میں بڑی خوبصورت چمکدار پھل والی کلہاڑی تھی، وہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کی جس آبرو کا وہ رکھوالا تھا وہ دشمن کے ایک جواں سال آدمی کی گود میں پڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور وہ دونوں اس کی موجودگی سے بے خبر رہے۔

دو جوانیاں دنیا سے بے خبر ہو کے ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں۔ نور چاچا اس آدمی کو خوب جانتا تھا۔ اس کا نام انور تھا۔ پچیس چھبیس برس کا وہ خوبصورت نوجوان چوہدری کرم دین کی اسی لڑکی زینت کا بیٹا تھا جسے نور چاچا جوانی میں اغوا کرنا چاہتا تھا لیکن نور جو آسمان سے تارے بھی توڑ لاتا تھا اسے اغوا نہ کر سکا تھا۔ آج وہ بھی پچاس برس کی بڑھیا ہو چکی تھی اور اس کا بیٹا انور خوبرو نوجوان فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔

نور چاچا، انور اور رضیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ وہ ان کی طرف بڑھا تو رضیہ نے اپنا سر انور کے کندھے پہ پھینک دیا اور انور نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھالیں۔ نور چاچا رک گیا۔ اس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا اور طویل آہ بھر کر دبے پاؤں پیچھے کی طرف چل پڑا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے گاؤں میں داخل ہوا۔ گھر گیا اور لیٹ گیا۔ وہ چھت کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایسی خاموشی کبھی طاری نہیں ہوئی

تھی۔ اس کا سر کبھی یوں نہیں جھکا تھا۔ مہراں نے بہت پوچھا لیکن اس نے اداس سی مسکراہٹ سے اسے ٹال دیا۔ صرف ایک بار کہا۔

''مہراں! بڈھا ہو گیا ہوں، اب تھک جاتا ہوں''۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے دونوں کو قتل کیوں نہ کر دیا، لیکن یہ خیال بھی آ گیا کہ اچھا ہوا وہ وہاں سے کھسک آیا اور انہیں قتل نہ کر بیٹھا۔ وہ مطمئن بھی تھا، بے قرار بھی اور اطمینان اور بے قراری کا تصادم اسے بے حال کر رہا تھا۔

اسی رات کے دوسرے پہر نور چاچا کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے باہر آ کر دروازہ کھولا۔ باہر پھٹے پرانے کمبل میں لپٹا ہوا ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ بغیر سلام کئے اندر آیا اور بولا۔

''پردیسی ہوں۔ بڑی دور سے آیا ہوں، صبح چلا جاؤں گا''۔

نور چاچا اسے اندر لے آیا۔ جب اس نے لالٹین جلائی تو اس آدمی نے کمبل اتار پھینکا اور بولا۔

''نور چاچا! چاہو تو مجھے بھی قتل کر دو۔ خالی ہاتھ تمہارے گاؤں آیا ہوں''۔

وہ پار والے گاؤں کا انور تھا۔ مہراں بھی جاگ اٹھی تھی اور حیرت زدہ نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ایک بات کرنے آیا ہوں چاچا!''___ انور نے کہا۔

نور چاچا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور گہری سانس لے کر آہستہ سے بولا___ ''بیٹھ جاؤ''۔

''میں جانتا ہوں ہمارے گاؤں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں''___ انور نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا___ ''اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے گاؤں میں یوں چوروں کی طرح آ کر زندہ نکل جانا ممکن نہیں لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں میں تم واحد آدمی ہو جو صحیح معنوں میں مرد ہو۔ تمہارا دل گردہ دور دور مشہور ہے اور نور چاچا! جو مرد ہو وہ گھر آئے مہمان کو بے آبرو نہیں کرتا''۔

نور چاچا عجیب طرح ہنس دیا۔ خالی خالی لہجے میں بولا۔

''ہمیں تم لوگ اس قدر وحشی سمجھتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم فوج میں لیفٹیننٹ بن گئے

ہو لیکن ہم کوئی ایسے گئے گزرے تو نہیں''۔

''مہدی حسین اور افضل کو تم نے قتل کیا تھا چاچا!''___ انور نے مسکرا کر کہا___ ''شباب خان کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر تم نے پھینکا تھا''۔

''تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے انور!''___ نور چاچا نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا___ ''تمہیں کہانیاں سنانے والوں نے شاید یہ نہیں بتایا کہ مجھے مہدی کے باپ نے اس وقت یتیم کیا تھا جس وقت میں ننھا سا بچہ تھا...... خیر، یہ قصے بڑے لمبے ہیں بیٹا!''___ اس نے گھر آئے دشمن کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا___ ''کہو تم میرے گھر کیوں آئے؟''

''میں تمہیں طعنے دینے نہیں آیا چاچا!''___ انور نے کہا!___ ''تم وحشی ہو تو ہمارے گاؤں والے بھی درندے ہیں...... وہ تم سے اچھے تو نہیں۔ میں اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ ہمارے گاؤں کے رشتے ناطے کلہاڑیوں، برچھیوں اور ٹوکوں سے کٹ گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب دونوں گاؤں سے باراتیں اور ڈولیاں آتی جاتی تھیں''۔

''خون خرابے اس وقت بھی ہوتے تھے''___ مہراں بول اٹھی___ ''سہاگنوں کے سہاگ اجڑ جاتے تھے اور......''

نور چاچا نے ہاتھ کے اشارے سے مہراں کو چپ کرا دیا اور بولا۔

''تم بات کئے جاؤ بیٹا! لیکن ایک بات بتا دوں۔ میں راضی نامے کی بات نہیں سنوں گا۔ راضی نامے بہت ہوئے تھے اب نہیں ہوں گے۔ تم پڑھ لکھ کر عزت غیرت شہروں میں ڈبو آئے ہو لیکن ہم لوگ اب بھی یہاں ناک کی قدر خوب جانتے ہیں''۔

''نہیں نہیں چاچا!''___ انور نے کہا___ ''میں تم پر الزام دھرنے نہیں آیا، نہ اپنے بزرگوں کی وکالت کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا......'' وہ کہتے کہتے رک گیا اور مہراں کی طرف دیکھ کر ملتجی لہجے میں بولا___ ''چاچی جی! اگر تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ تو......'' نور چاچا نے مہراں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا، تو انور نے آہ بھر کر کہا___ ''ہمارے رشتے ناطے ٹوٹ چکے ہیں نور چاچا! لیکن دلوں کے رشتے ٹوکوں سے نہیں کاٹے جا سکتے......'' انور کے لہجے میں جذباتیت کا رنگ نکھر آیا اور اس نے رنجیدہ سی آہ بھر کر کہا___ ''میں تم

سے بھیک مانگنے آیا ہوں چاچا!...... پتہ نہیں تم نے جوانی میں کسی کو دل دیا تھا یا نہیں؟ پتہ نہیں تم نے کسی سوہنی کو اپنی ران کے قتلے بھون کے کھلائے تھے یا نہیں؟ کوئی سوہنی تیرے لئے کبھی چناب کا سینہ چیر کر تیرے پاس پہنچی تھی یا نہیں......؟ معلوم نہیں چاچا۔ تم نے جوگی بن کے اپنے کان کبھی چھدوائے تھے یا نہیں اور دردر پہ صدائیں لگائی تھیں یا نہیں؟...... تیرا دل مرجھا گیا ہے نور چاچا تجھے شاید دل کی دھڑکنیں یاد نہیں رہی ہوں گی......"

رات کا اندھیرا بہت گہرا تھا اور سکوت اس سے بھی زیادہ گہرا۔ انور کی جذبات بھری باتوں نے نور چاچا پر کچھ اور ہی کیفیت طاری کر دی۔ عین اس وقت دور کہیں رات کے سکوت سے کسی کی بڑی ہی پُرسوز لے سنائی دی۔ جانے کون شب کی خاموش تیرگی میں بیت الاپتا جا رہا تھا۔

رے رات کالی تانگ یار والی دل وچ شوق ملن دا تیر کھڑکے
اک در بند دوجا دربان دشمن جے میں در کھولاں در بے پیر کھڑے
ستے ہوئے دربان نوں ویکھ کے دبے پیریں چلاں تے پیریں زنجیر کھڑکے
سائیاں جنہاں نوں غم اے یار والا سنے ہڈیاں انہاں سر پر کھڑکے

ادھر انور کی باتیں عشق کا سحر جگا رہی تھیں۔ ادھر رات کی تاریکی سے ابھرتے ہوئے مترنم بول طلسم طاری کر رہے تھے۔ نور چاچا کے جسم نے جھرجھری لی۔

"میں نے وہ سوہنی دیکھی تھی انور!" ـــــ نور چاچا یوں بولا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بڑی دور جھانک رہی تھیں ـــــ "وہ مجھے چناب کی لہروں پہ نہیں، جلتے کھلیانوں اور خون کے بہتے دریا میں تیر کے ملنے آیا کرتی تھی......" نور چاچا کی آواز دب گئی۔

"آج ایک اور سوہنی بھڑکتے شعلوں میں تیر کے میرے پاس آتی ہے نور چاچا!" ـــــ انور نے جذباتی لہجے میں کہا ـــــ "اور آج رات میں بھی ان شعلوں میں کود کر آیا ہوں۔ انگ انگ جل رہا ہے چاچا!"

نور چاچا کے چہرے کا تاثر یکسر بدل چکا تھا اور اس کی آنکھیں بے چینی سے خلاؤں میں بھٹکنے لگی تھیں، جیسے یادیں اور تصور اسے بڑھاپے سے اٹھا کر انور کی عمر میں لے گئے ہوں۔

"انور!" ـــــ نور چاچا نے اپنائیت سے کہا ـــــ "تمہیں رضیہ کا رشتہ نہیں مل سکے گا"۔

انور نے چونک کے کہا ـــــ "تم نے کیسے جانا کہ میں رضیہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں؟"

"میں کیا نہیں جانتا بیٹے!" ـــــ نور چاچا نے کہا ـــــ "لیکن میرے گاؤں کا رشتہ تیرے گاؤں نہیں جائے گا۔ کوئی صورت ہی نہیں"۔

"تم چاہو تو اس کے ماں باپ راضی ہو جائیں گے" ـــــ انور نے کہا۔

"نہیں!" ـــــ نور چاچا نے سر ہلا کر کہا ـــــ "میں اس گاؤں کی آبرو کا رکھوالا ہوں، میں کس طرح کہہ دوں کہ آبرو دشمن کے حوالے کر دو۔ میں ہی ہاں کر لوں؟ یہ ممکن نہیں"۔

"رضیہ میرے ساتھ نکل جانے کو تیار ہے" ـــــ انور نے کہہ تو دیا لیکن وہ لرز اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ نور چاچا اپنی ناک پر اتنی غلیظ مکھی نہیں بیٹھنے دے گا۔

"تو نکل جاؤ" ـــــ نور چاچا نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن تمہارے گاؤں سے ایک تنکا بھی اٹھا لے جانا آسان تو نہیں" ـــــ انور نے کہا ـــــ "اگر رضیہ کو نکال لے جانا آسان ہوتا تو میں تمہارے پاس آتا ہی کیوں؟ مجھے اپنا ڈر نہیں چاچا! پکڑے گئے تو تم لوگ رضیہ کی بوٹی بوٹی کر دو گے اور تم اپنا بڑھاپا میرے خاندان کا بچہ بچہ زمین کے نیچے نیچے آکر ختم کرنے میں گزار دو گے"۔

"تم نے زینت سے بات کی ہے؟" ـــــ نور چاچا نے پوچھا۔

"زینت؟" ـــــ انور نے پوچھا! ـــــ "یعنی اپنی ماں سے؟"

"ہاں، ہاں!" ـــــ نور چاچا بولا ـــــ "تم زینت کے بیٹے ہو نا؟"

"ہاں چاچا!" ـــــ انور نے کہا ـــــ "میری ماں میری راز داں ہے۔ سچی بات بتاؤں چاچا، مجھ سے ماں نے ہی کہا تھا کہ چوری چھپے نور چاچا کے پاس چلے جاؤ۔ وہ نہ مانے تو اسے کہنا کہ زینت نے کہا ہے۔ یہ کام ضرور کرنا ہے"۔

نور چاچا کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ دروازے تک گیا اور سر جھکائے لوٹ آیا پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات کے سکوت کو گیدڑوں کی بھیانک چیخوں نے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ جب گیدڑوں کی چیخ چنگھاڑ بند ہوئی تو کتے یکبارگی بھونک اٹھے۔ نور چاچا سرتاپا کانپ اٹھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا ـــــ "آؤ چلیں"۔

تھوڑی دیر بعد مہراں اس کے کمرے میں آئی تو کمرہ خالی تھا اس نے آہ بھری اور

زیرِ لب بولی ___ ''آہ یہ خون بھی نور کے نام لکھا تھا'' ___ وہ جانتی تھی کہ نور نے پار والے کسی انسان کو کبھی نہیں بخشا۔

بہت دیر بعد نور چا چا آ گیا۔ مہراں نے فوراً پوچھا ___ ''لاش کہاں پھینک آئے؟''

نور چا چا چپ چاپ کمرے میں ٹہلنے لگا اور افسردہ سے لہجے میں بولا ___ ''نہیں مہراں میں اسے کھٹے سے پار چھوڑ آیا ہوں...... وہ میرے ہاتھ سے زندہ نکل گیا ہے۔ میں اسے خود ہی چھوڑ آیا ہوں'' ___ نور چا چا رنجیدہ تھا اور ہنس بھی دیا۔ سوگوار سی ہنسی، حیرت زدہ مہراں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ___ ''تم حیران ہو رہی ہو لیکن مہراں! یہ لڑکا آج میرے سامنے وہی خواب بکھیر گیا ہے جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ بھولی بسری باتیں یاد کرا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے مہراں جب تم نے جوانی میں مجھے راہ میں روکا تھا تو میں نے کہا تھا کہ میں دل کسی کو دے چکا ہوں۔ تم نے بہت پوچھا تھا لیکن میں نے نہیں بتایا تھا۔ پھر شادی کے بعد پوچھتی رہی تھیں کہ وہ کون ہے، لیکن میں نے یہ راز اپنے سینے میں رہنے دیا...... آ مہراں آج تمہیں ایک کہانی سناؤں''۔

مہراں حیران تھی کہ نور کو کیا ہو گیا ہے۔ اسے اس نے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

نور چا چا پلنگ پر بیٹھ گیا اور جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولا ___ ''تم نے شاید سنا ہو گا کہ میں نے جوانی میں قسم کھائی تھی کہ میں پار والے چوہدری کرم دین کی بیٹی زینت کو اٹھا لاؤں گا۔ اس سے نکاح پڑھواؤں گا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔ میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا مہراں!...... میں کئی راتیں پار والے گاؤں چوروں کی طرح جاتا رہا اور اندھیرے اندھیرے میں چوہدری کرم دین کے گھر کے چکر کاٹ کر اس کی بیٹی، کو اٹھا لانے کی راہیں ڈھونڈتا رہا لیکن وہاں چوکیدار بھی تھے اور کتے بھی''۔

نور چا چا نے آہ بھری اور آنکھیں سکیڑ کر بولا ___ ''ایک شام میں گاؤں میں سے جلدی نکل گیا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں پیڑوں کے جھنڈ سے گزر رہا تھا کہ مجھے چوہدری کرم دین کی وہی بیٹی اکیلی آتی دکھائی دی جسے میں راتوں کے اندھیرے میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ وہ مزار پہ سلام کر کے آ رہی تھی...... آہ زینت! وہ بہت حسین لڑکی

تھی۔ تمہیں اس کی جوانی اور حسن یاد ہے نا مہراں؟ اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہے لیکن مجھے اسی طرح نظر آ رہی ہے جس طرح پیڑوں کے جھنڈ تلے دیکھی تھی۔ میں نے اسے زبردستی اٹھا لانے کی جو قسم کھائی تھی اسے دیکھ کر ٹوٹنے لگی لیکن میں سنبھل گیا اور اسے روک کر کہا، میں تمہیں اٹھا لے جاؤں گا زینت! اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی! سچ کہتے ہو نور؟ قسم کھاؤ تم مجھے اٹھا لے جاؤ گے، اس نے میرے ہاتھ تھام لئے اور ادھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''اللہ قسم نور! میں ابھی ابھی شاہ جی کے مزار پر منت مان کر آئی ہوں کہ نور میرے ماں باپ کے ہاں رشتہ مانگنے آئے اور وہ ہاں کر دیں، مہراں! میں نے کلہاڑی پھینک کر اسے سینے سے لگا لیا اور زینت نے اپنا لال انگارہ گال اس قدر زور سے میرے سینے پر رکھ کر دبایا کہ میری قسمیں ٹوٹ گئیں۔ جانے ہم کتنی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ اس نے کہا ___ ''میں مرد کی بچی ہوں اور کسی مرد سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ جو حوصلہ تم میں ہے وہ دونوں گاؤں کے کسی مرد میں نہیں''۔

مہراں کے آنسو جاری ہو گئے۔

نور پلنگ پر مہراں کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا ___ ''پھر ہم پیڑوں کے اسی گہرے جھرمٹ تلے ملتے رہے۔ وہ مجھے اپنے ماں باپ کے پاس جا کر رشتہ مانگنے پر مجبور کیا کرتی لیکن میں نہ اسے دل سے اتار سکا نہ اس سے ملنے سے باز رہ سکا اور اس کے ماں باپ کے پاس رشتہ مانگنے بھی نہ جا سکا۔ باپ کے قاتلوں کے گاؤں میں غیرت والے بھیک مانگنے نہیں جایا کرتے مہراں!......

''پھر وہ روز آیا کہ زینت کو کھیڑے اٹھا لے گئے۔ شادی سے چند راتیں پہلے وہ مجھے ملی اور کہنے لگی ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں لیکن نور! آ قسم کھائیں کہ ہم اپنے بیٹے بیٹیوں کو ایک دوسرے سے بیاہیں گے اور میں نے سب کدورتیں بھول کر قسم کھائی کہ میں اپنی پہلی بیٹی تمہارے پہلے بیٹے کو دوں گا''۔

نور چا چا نے چپ چاپ بیٹھی مہراں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''لیکن میرے اولاد نہ ہوئی اور آج زینت کا بیٹا مجھے میری قسم یاد دلا گیا ہے!''

''اوہ!'' ___ مہراں نے چونک کر پوچھا ___ ''انور زینت کا بیٹا ہے نا! انور کو معلوم ہے کہ تم نے قسم کھائی تھی؟''

''نہیں'' ـــــ نور چاچا نے کہا ـــــ ''یہ راز خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ آج صرف تمہیں سنا رہا ہوں۔ انور نے کہا تھا کہ مجھے ماں نے کہا ہے نور کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ رضیہ کا رشتہ دلا دے، لیکن مہراں، انور کو معلوم نہیں کہ جس اوٹ میں اس کی ماں مجھے ملا کرتی تھی وہیں آج وہ میرے گاؤں کی آبرو سے آ کر ملتا ہے۔ اپنی کوئی بیٹی نہیں، پر رضیہ اپنے گاؤں کی بیٹی ہے! میں نے اسے گود لیا ہے، اسے کہانیاں سنائی ہیں، میں شہر سے اس کے لیے ریوڑیاں لایا کرتا تھا۔ ذرا دل پہ ہاتھ رکھو مہراں! تم نے بھی مجھ سے محبت کی ہے......''

نور چاچا چپ چاپ ہو گیا اور یک لخت بلند آواز سے بولا ـــــ ''مہراں، عمر کے پچاس برس انسانوں کو ڈنک مارتے گزار دیئے ہیں۔ میں نے تمام عمر جھوٹی قسمیں کھائی ہیں مہراں! جی میں آتی ہے کہ ایک نیکی کر کے مروں۔ زینت کو جو قسم دی تھی وہ پوری کر دکھاؤں۔ پچیس برس گزرے زینت نے مجھے کہا تھا کہ مرد کی بچی ہوں اور جو حوصلہ تم میں ہے وہ کسی مرد میں نہیں...... مہراں! زینت یہ نہ کہے نور مرد نہیں تھا...... کہو مہراں! میرا ساتھ دو گی؟''

''میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا نور!'' ـــــ مہراں نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـــــ ''مرنا جینا تیرے ساتھ ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟''

''بس یہی کہ میں جو کچھ کروں اسے راز سمجھ کر اپنے سینے میں لے کر مر جانا''۔

نور چاچا پہ خاموشی طاری ہو گئی۔ رات گزر گئی پھر سات روز گزر گئے اور نور چاچا پر خاموشی ہی طاری رہی۔ اس نے دو چار مرتبہ ارادہ کیا کہ رضیہ کے ماں باپ سے کہے کہ رضیہ کا رشتہ انور کو دے دیں لیکن دونوں گاؤں کے رشتے اسی نے خود توڑے تھے۔ اب اپنی ناک کی بے حرمتی گوارا نہ تھی۔

آٹھویں رات نور چاچا گھر سے غائب ہو گیا۔ مہراں بہت بے چین تھی وہ بے تابی سے نور کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں لیکن نور چاچا آج کی رات لوٹ آنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ مہراں کے سینے میں ایک زہریلا بچھو ڈنک مار رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مہراں نے بھاگ کر دروازہ کھولا لیکن نور نہیں تھا، رضیہ کا باپ تھا۔ اس نے نور چاچا کے متعلق پوچھا تو مہراں نے کہا کہ کسی کام سے نکلا تھا ابھی لوٹا نہیں، بس آ ہی رہا ہوں گا۔

رضیہ کا باپ اندر آ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ مہراں اس کے دل کا

حال جانتی تھی لیکن انجان بن کر بولی۔

''کیوں بھائیا جی! کوئی خاص بات ہے؟''

''رضیہ کا کچھ پتہ نہیں'' ـــــ باپ نے کہا ـــــ ''ہر جگہ تلاش کر آئے ہیں۔ شام کو کہہ گئی تھی کہ مزار پر دیا جلانے جا رہی ہوں پھر واپس نہیں آئی'' ـــــ بوڑھے باپ کے آنسو نکل آئے۔

رضیہ کا مہراں کے سوا کسی کو پتہ نہ تھا۔ نور چاچا کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق رضیہ شام کو ہی اس کے گھر آ چھپی تھی اور تھوڑی سی دیر پہلے نور چاچا اسے کمبل میں لپیٹ کر ساتھ لے گیا تھا اُدھر سے انور سوا کوس دور ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے گھر والوں کو اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر جا رہا ہوں اور رات دیر سے لوٹوں گا۔ اس کی چھٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ روز باقی تھے۔ وہ بہت دیر سے ریلوے سٹیشن کے اُدھر اندھیرے میں کھڑا انور چاچا اور رضیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ آدھی رات کو ایک مسافر گاڑی ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی تھی۔ انور کو یقین نہیں تھا کہ نور جیسا زہری آدمی اپنے گاؤں کی بیٹی اس کے لیے اغوا کر لائے گا۔ اسے خدشہ نظر آ رہا تھا کہ نور چاچا اکیلا آئے گا اور اسے قتل کر کے لاش ریلوے لائن پر پھینک دے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر اس نے اپنا پستول ساتھ لے لیا تھا۔

مسافر گاڑی آنے ہی والی تھی اور ریلوے سٹیشن کا ایک ہی قلی تھی جو اونگھتے ہوئے سٹیشن ماسٹر کے پاس کھڑا تھا۔ انور کو اندھیرے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس نے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن نور چاچا نے کمبل میں لپٹی رضیہ اس کے سامنے جا کھڑی کی۔

''انورا!'' ـــــ نور چاچا نے رقت آمیز لہجے میں کہا ـــــ ''میں اپنی عزت اور غیرت تیرے قدموں میں ڈالے جا رہا ہوں۔ اب اپنا وعدہ نبھاؤ، کہ تم یہ راز اپنے سینے میں لے کر مر جاؤ گے اور یہ بھی کہ تم اپنے گاؤں کبھی واپس نہیں آؤ گے'' ـــــ اس نے انور کو سینے سے لگا لیا اور زیر لب بولا ـــــ ''تم زینت کے بیٹے ہو''۔

''نور چاچا!'' ـــــ انور نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبایا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا ـــــ ''میں نے اس روز بھی قسم کھا کر کہا تھا کہ رضیہ مل جائے تو ساری عمر گاؤں نہیں آؤں گا۔ اس گاؤں میں آ کر کروں گا بھی کیا؟ یہاں انسانوں کے روپ میں بدروحیں بستی اور ایک دوسرے کو لہولہان کرتی رہتی ہیں۔ یہاں پیروں اور ان کے تعویذوں

کی حکمرانی ہے لیکن میں تلوار کا دھنی ہوں۔ میں اس دیس کا باسی نہیں۔ میری دنیا اور ہے۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں"۔

"نور چاچا!" ــــ رضیہ بول پڑی ــــ "چن چراغ شاہ کی ڈیوڑھی کی قسم، مر جاؤں گی پر تیری ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دوں گی"۔

گاڑی ابھی دور تھی لیکن انجن کی مدھم سی بتی دکھائی دے رہی تھی۔ نور چاچا نے انور اور رضیہ کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"سنبھل کے اندھیرے میں گاڑی میں بیٹھ جانا" ــــ اور اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

نور چاچا تیزی سے چل پڑا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا لیکن وہ گاؤں کی طرف نہیں بلکہ وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہی اسی سمت جا رہا تھا جس سمت گاڑی کو جانا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ انور کی ماں سے اس نے قسم کھا کر جو وعدہ کیا تھا، آج پچیس برس بعد اسے نبھا رہا تھا لیکن اسے خیال آ گیا کہ وہ گاؤں کی آبرو دشمنوں کی اولاد کے قدموں میں ڈال آیا ہے۔ وہ تو اس آبرو کا رکھوالا تھا اس کے سینے میں بچھو ڈنک مارنے لگے۔ وہ تڑپ اٹھا اور رک گیا۔

اس نے گھوم کر دیکھا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن پہ رکتے ہی چلنے کی وسلیں دے رہی تھی۔ نور چاچا بہت دور نکل گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ بھاگ کر رضیہ کو انور سے چھین لے اور انور کا گلا گھونٹ کر ریلوے لائن پر پھینک دے۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ خون آنکھوں میں چڑھ آیا اور وہ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا لیکن اس کے سامنے انور کا بھرا بھرا خوبصورت چہرہ آ گیا اور اسے آواز سائی دی ــــ "نور چاچا! تُو نے کسی سوہنی کو کبھی اپنی ران کے تِقتلے بھون کے کھلائے ہیں؟"

وہ رک گیا اور اندھیرے میں اسے ایک رنجیدہ سی نسوانی آواز بھری ــــ "نور! ہماری منزلیں جدا ہو گئی ہیں۔ آؤ قسم کھائیں کہ ہمارے بیٹے بیٹیاں......"

ایک آواز کل پرسوں ہی اس نے سنی تھی اور دوسری آواز پچیس چھبیس برس پرانی تھی، لیکن دونوں آوازیں کتنی قریب آ گئی تھیں۔ نور چاچا رک گیا اور اس کی نظروں کے سامنے انور کا تصور اور زیادہ نکھر آیا۔ جب تصور نکھرا تو انور کی آنکھوں سے زینت جھانکنے

لگی۔ زینت کے رس بھرے ہونٹ ہلنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں ــــ "نور! انور میرے جگر کا ٹکڑا ہے اسی جگر میں تیرے پیار کو چھپا رکھا ہے نور!"

اور نور سر جھکائے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ تصورات اسے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ پچیس برس گزر رہے۔ بیتے لمحوں کا قافلہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لوٹ آیا اور نور، زنیت کو گھٹے ہوئے بازوؤں کے گھیرے میں لے کے اونگھنے لگا۔ وہ چلتا چلا گیا جیسے خوابوں کی دنیا میں چل رہا ہوں۔ زینت کے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے زینت یاد آ گئی تھی۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ نور چاچا کو قریب ہی انجن کی وسل سنائی دی۔ تصوروں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ گاڑی اس کے قریب آ گئی تھی۔ انجن کی چھک چھکا چھک سے شب کی تیرگی لرز رہی تھی۔ گاڑی کے شور نے نور چاچا کو جھنجھوڑ کر یاد دلایا کہ اس گاڑی میں انور اور رضیہ جا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی ـــ "انور میری زینت کا بیٹا!" ــــ اس نے زیر لب کہا ــــ "میں نے مردوں کی طرح اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے"۔

جب انجن اس کے قریب آیا تو ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے نور چاچا کا سینہ دہلنے لگا اور اس بھیانک شور سے اسے برسوں پرانی گڈوں کی دوڑ یاد آ گئی، پھر اسے مہدی حسین یاد آ گیا اور یہ بھی یاد آیا کہ مہدی حسین اس کے باپ کے قاتل کا بیٹا تھا اور اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ اپنے گاؤں کی بیٹی کا ہاتھ اپنے باپ کے قاتلوں کے گاؤں کے لڑکے کے ہاتھ میں دے آیا ہے۔ وہ تو خود گاؤں کی آبرو کا رکھوالا تھا!

انجن اور قریب آ گیا۔ نور چاچا کا سینہ بڑی زور سے کپکپایا جب انجن بالکل قریب آ گیا تو نور چاچا کلہاڑی تان کر ریل کی پٹڑی کے وسط میں انجن کے سامنے آ گیا اور تیز رفتار انجن پہ کلہاڑی کا بھرپور وار کر کے للکار کر بولا ــــ "رک جا میرے گاؤں کی آبرو کو یہیں اتار جا......"

گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی اور نور چاچا کے جسم کے کئی ٹکڑے کرتی، بل کھاتی، انور اور رضیہ کو آغوش میں لیے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

⌘ ختم شد ⌘